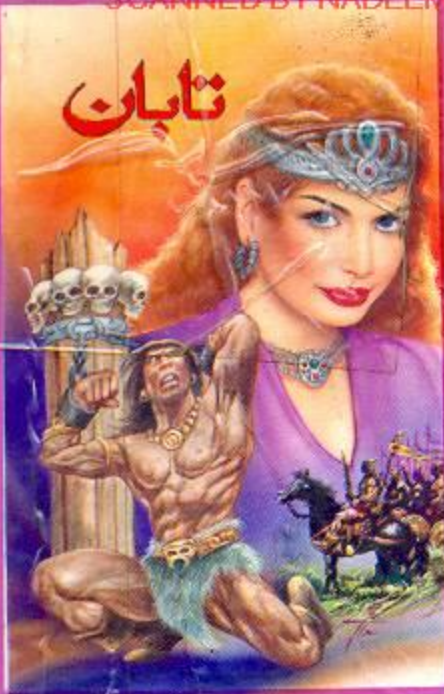


تائبان



فاتح عالم سکندر اعظم کے دور کے ایک یونانی غلام کی سرگزشت

- ایک شوریدہ سرغلام تائبان کی سرگزشت جس نے غلامی کا طوق سے اتار پھینکا۔
- ایک ایسے سرکش انسان کی داستان جو دیوانہ وار آگ اور خون سمندر میں کود پڑا۔
- وہ نوجوان یونان کے آقاؤں کے لئے ایک ناقابل فہم معمہ بن گیا تھا
- یونانی آقاؤں کی کوئی زنجیر اسے قید نہ کر سکی لیکن وہ ایک حسین و شہزادی کے تیر نظر کا شکار ہو گیا۔

طاہر جاوید مغل کے قلم سے ایک یادگار ناول

عرض مصنف

تابان ایک ایسے غلام زادے کی کہانی ہے جو ایک حسین یونانی شہزادی کے تیر نظر کا شکار ہو گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ زمین ہے اور جسے وہ جانتا ہے وہ آسمان ہے۔ ان دونوں کا ملاپ کبھی نہیں ہو سکتا۔ لیکن وہ اس جذبہ کا کیا کرتا جس نے ایک یادگار لمحے میں اس کے اندر سر اٹھایا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک مہیب طوفان بن کر اس کے پورے وجود کو لپیٹ میں لے لیا تھا یہ وہی سرکش جذبہ تھا جو ہر مصلحت سے بالاتر ہوتا ہے۔ جو انسانی کو ہونی کر کے دکھاتا چاہتا ہے اور زمین کو آسمان سے ملانا چاہتا ہے۔ اس جذبے نے اپنے فولادی ہاتھوں سے غلام زادے کی زنجیریں توڑیں اس کی انگلی تھامی اور اسے اپنے ساتھ اڑا کر ایسی فضاؤں میں لے گیا جن کے بارے میں اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

پھر اس کہانی میں ایک عظیم الشان کردار داخل ہوا، فاتح عالم سکندر اعظم۔ اس کی مہم شہس نگاہ غلام زادے پر پڑی اور اس نے غلام زادے کو اپنے اس جری لشکر میں شامل کر لیا جو مقدونیہ سے روانہ ہوا تھا اور پوری دنیا کو زیر نگین کرنے کے لئے سیلاب کی طرح آگے بڑھ رہا تھا۔ یوں غلام زادے کے عشق نے اسے ایسی راہوں پر چلا دیا کہ وہ تاریخ کا حصہ بن گیا۔ وہ اپنے ہاتھوں سے تاریخ بناتا رہا لیکن اس کا ذہن اس یادگار لمحے میں انکار رہا جب اس نے آسمان کو چاہا تھا اور اسے چھوئے کی تمنا کی تھی۔ یہ ان حوصلہ مند جذبات کی کہانی ہے جو مر کر بھی نہیں مرتے، جو آخری ہنگامی اور آخری دھڑکن تک حالات سے لڑنے کا عزم رکھتے ہیں۔ یہ جذبہ ”آرزو“ کو شدت کی اس انتہا تک پہنچا دیتے ہیں کہ ان کی تڑپ دیکھ کر قدرت کی آنکھ میں بھی آنسو آ جاتے ہیں۔

یہ تاریخی کہانی نہیں بلکہ تاریخی پس منظر میں لکھی ہوئی کہانی ہے۔ تمام اس روایتی ادب میں آپ کی معروف واقعات پڑھیں گے اور جانے پہچانے چہرے دیکھیں گے۔ مجھے امید ہے کہ میری دیگر کہانیوں کی طرح یہ کہانی بھی آپ کو پسند آئے گی۔

طاہر جاوید مغل

KHAN BOOKS
& LIBRARY
S-527, BASKA BAZAR, RANGPUR, D.D.
Cell: 0345-8048834 - 0345-8048833
Rep: Ali Khan

اس کا نام تابان تھا۔ وہ بڑی لاپرواہی سے ایک ٹانگہ وزن ڈالے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ ایک مضبوط رسی سے پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ گے میں طوق تھا۔ طوق کی زنجیر ایک ادھیڑ عمر شخص کے ہاتھ میں تھی۔ وہ اس جگہ کوئی اہل قیدی نہیں تھا۔ اس کی طرح بہت سے مرد و زن پابہ زنجیر تھے۔ یہ یونان کے عظیم الشان شہر ایچینس غلاموں کی منڈی تھی۔ تین روز پہلے اس منڈی میں بے پناہ رش تھا لیکن اب فقط پچاس ساٹھ غلام ہی بچنے باقی رہ گئے تھے۔ یہ بھی وہ افراد تھے جو بیمار یا کمزور تھے ان میں کوئی جسمانی عیب تھا۔۔۔۔۔۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ تابان میں بھی کوئی ایسی ہی غامی تھی۔ وہ دیکھنے میں ایک بہترین غلام نظر آتا تھا۔ لمبا ترنگا، ورزشی جسم، مضبوط ہڈی، چوڑے ہاتھ، آنکھیں روشن اور پیشانی کشادہ تھی۔ اس کی عمر تین سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ صرف ایک لنگوت پہنے ہوئے تھا۔ اس کے مالک نے اس کے جسم پر زقن کا تیل مل دیا تھا، جس کی وجہ سے اس کے جسم کا سونا کچھ اور بھی دھنکے لگا تھا۔ اگر تابان اب تک فروخت نہیں ہو سکا تھا تو اس کی وجہ کچھ اور تھی اور یہ وجہ جتنی ٹھوس تھی اتنی دلچسپ بھی تھی۔

سورج اب سر پر آگیا تھا۔ فضا میں کچھ جس سایہ ہونے لگا تھا۔ برہ فروش اپنے اپنے غلاموں کے ساتھ سایہ دار جگہوں پر کھڑے ہو گئے تھے کچھ بیٹھ کر سستانے لگے تھے یا گپ شپ میں مصروف ہو گئے تھے۔ لمبے پھنوں والے کچھ خریدار بے مقصد ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ دفعتاً منڈی کے داخلی دروازے پر ایک ہم خریدار کی صورت نظر آئی اور سارے برہ فروش چاروں خانے چو کس ہو گئے۔ ایک چمکتا دکھتا رتھ منڈی میں داخل ہوا۔ رتھ کے آگے اور پیچھے تین تین ہم رنگ گھوڑوں کی چار قطاریں تھیں۔ رتھ کے گھوڑے کی طرح یہ گھوڑے بھی خوب سجے سنورے تھے۔ گھوڑوں کے سوار مسلح اور تومند تھے۔ رتھ میں قریباً پچاس برس عمر کا ایک نیم لڑکا شخص نظر آ رہا تھا۔ اس نے سرخ ریشم کا نمایت قیمتی چندہ پہن رکھا تھا۔ پیشانی پر ایک زرنگار ہنی تھی جس پر

سامنے کی طرف ایک بڑا سبز ہیرا جھول رہا تھا۔ اس شخص کا نام غارس زئوب تھا۔ یہ شاہ
ایجنٹر کا بڑا بھائی تھا۔ جانے والے جانتے تھے کہ یہ شخص کتنا پارسوخ ہے۔

غارس رتھ سے اتر کر غلاموں کی جانب بڑھا اور اس کے آگے پیچھے چاق و چوبند
سپاہی نیزے اٹھا کر چلے گئے۔ غارس کو غلاموں کی ضرورت تھی
ورنہ وہ میلے کے تیسرے روز منڈی میں نہ آتا۔ غلاموں کے سامنے سے گزرتے ہوئے
اس نے تہاں کو دیکھا اور چونک اٹھا۔ رخ پھیر کر وہ تہاں کے سامنے پہنچا۔ تہاں کا مالک
اسے معزز خریدار کو دیکھ کر کانپنے لگا۔

غارس نے اپنی بھاری بھر کم آواز میں پوچھا۔ ”کیا قیمت ہے اس کی؟“
تہاں کے مالک نے سر جھکا کر کہا۔ ”ہم سب آپ کے غلام ہیں حضور.....
ہماری کیا قیمت ہو سکتی ہے؟“

غارس کے چہرے سے ظاہر ہوا کہ وہ اس جواب سے خوش ہوا ہے۔ اس نے کہا۔
”ہمیں یہ غلام پسند آیا ہے اور پسند کی چیز ہم مول دے کر لیتے ہیں، ہمیں قیمت بتاؤ؟“
ادویہ عمر شخص نے ہاتھ باندھ کر کہا۔ ”چوتھائی ٹیلنٹ حضور۔“

غارس زئوب کے چہرے پر رہی کی جھکن نمودار ہوئی۔ وہ غصے سے بولا۔ ”ہمیں
حکم عدولی پسند نہیں، وہ قیمت بتاؤ جس پر تم یہ غلام بیچنا چاہتے تھے۔“
ادویہ عمر شخص عاجزی سے بولا۔ ”حضور! اس کی یہی قیمت ہے۔“

غارس اور اس کے سپاہیوں نے غور سے تہاں کو دیکھا۔ انہیں اس میں کوئی ایسا
خاصی نظر نہیں آئی جو اس کی قیمت کو چوتھائی ٹیلنٹ تک پہنچا دیتی۔ صرف کندھوں اور
پشت پر ایک دو زخم تھے یا ایک پنڈلی میں کسی نیزے کا پرانا گھاؤ تھا، مگر ان معمولی نشانات
کی وجہ سے غلام کی قیمت اتنی کم نہیں ہو سکتی تھی۔

غارس نے پوچھا۔ ”کیا خاصی ہے تمہارے غلام میں؟“
تہاں کے مالک نے سر جھکا کر کہا۔ ”حضور..... یہ بھاگ جاتا ہے۔“
”بہت خوب۔“ غارس نے اپنا نیم گھنچا سر ہالہ۔ ”ہمیں خوش ہے کہ تم نے اپنے
مال کا عیب چھپانے سے گریز کیا ہے۔“

ایک دوسرے بردہ فروش نے آگے بڑھ کر کورنش بنایا اور ادب سے کہا۔
”حضور! اس نے تو عیب چھپانے کی بھرپور کوشش کی تھی لیکن جی بات ظاہر ہو کر
رہی۔“

”کیا مطلب؟“ غارس زئوب نے پوچھا۔

”حضور! اس نے غلام کی قیمت پانچ ٹیلنٹ لگائی تھی لیکن اس کے ایک ناراض
ساتھی نے منڈی میں سب کو بتا دیا کہ یہ غلام بھاگے میں مشہور ہے۔ پہلے کا تو معلوم نہیں
لیکن پچھلے دو برس میں یہ چار آقاؤں کو چکے دے کر بھاگا ہے۔ ان چاروں سے ایک کو
اس نے قتل بھی کر دیا تھا۔ جب یہ بات منڈی میں پھیل گئی تو کوئی بھی اس کا خریدار نہیں
لگا۔ یہ صورت حال دیکھ کر اس بوڑھے نے غلام کی قیمت نصف کر دی، پھر مزید کمی کر
دی اور اب چوتھائی ٹیلنٹ پر آ گیا ہے۔“

غارس کی دلچسپی غلام میں بڑھ گئی۔ اس نے قریب سے غلام کا بازو لینا شروع کیا
وہ اسی طرح لاپرواہی سے ایک ٹانگ پر وزن ڈالے کھڑا تھا۔ آنکھیں گرمی اور خاموش
تھیں۔ چہرے پر ایک ڈھٹ سی مسکراہٹ جم کر رہ گئی تھی۔ جیسے یہ زبان خاموشی اعلان
کر رہا ہو کہ ”ہاں میں بھاگ جاؤں گا تم اپنی زنجیریں جتنی بھی مضبوط اور اپنی دیواریں جتنی
بھی اونچی کر لو میں انہیں توڑ جاؤں گا۔ اپنے آقاؤں کو دھوکہ دینا میری سرشت میں شامل
ہے۔ کیونکہ خدا نے مجھے آزاد پیدا کیا ہے۔“

اب تین چار اور بردہ فروش وہاں اکٹھے ہو چکے تھے۔ ایک بردہ فروش جو کسی
ساحلی علاقے کا باشندہ لگتا تھا، آگے بڑھ کر شانی خریدار سے بولا۔

”حضور والا! میں جزیرہ سردانیہ کا رہنے والا ہوں۔ اس غلام کو اچھی طرح جانتا
ہوں۔ بے حد کام چور اور خطرناک ہے۔ اسے نہ خریدنا ہی جناب کے لیے بہتر ہوگا۔“

غارس نے آگے بڑھ کر تہاں کے لیے لہو گھو گھریا لے ہال مٹھی میں جکڑے، ان بالوں
میں لٹوں کو سنبھالنے والی چھوٹی سی آہنی چوٹی لگی تھی۔ یہ چوٹی عجیب وضع کی تھی اور
بالوں میں نمایاں نظر آتی تھی۔ غارس نے بال سمجھ کر تہاں کا چہرہ اوپر اٹھایا اور بولا۔ ”ہم
ایسے بھگوڑوں پر قابو پانا جانتے ہیں۔“ پھر اس نے اپنے ایک مصاحب سے مخاطب ہو کر
کہا۔ ”سلوک! اس کے مالک کو پانچ ٹیلنٹ دے دو۔“

پانچ ٹیلنٹ کا سن کر ادویہ عمر شخص کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ وہ جھک جھک کر شانی
خریدار کو ادب پیش کرنے لگا۔ غارس کے مصاحب نے قیمت چکا کر غلام کی زنجیر ہاتھ میں
تھام لی۔ تہاں اپنی جگہ اڑیل گھوڑے کی طرح کھڑا تھا۔ مصاحب نے زنجیر کو کئی زوردار
جھٹکے دیے، تب کہیں جا کر وہ اپنی جگہ سے ہلنے پر آمادہ ہوا۔

شروع ہو گئے تھے۔ رات بچھلے پھر تیز ہوا چلنے لگی۔ وہ ساری شعلیں بجھ گئیں جنہوں نے احاطے کی بیرونی دیوار کو روشن کر رکھا تھا۔ تالابن نے بڑے اطمینان کے ساتھ اپنے سر کے بالوں سے وہ عجیب و غریب کی چنی نکال لی جس کا ایک سرا مل کھائے ہوئی آہنی تار کی طرح تھا۔ وہ اس چنی کی مدد سے اپنی بیڑی کا قتل کھولنے میں مصروف ہو گیا۔ وہ ایک مضبوط اور وزنی قفل تھا۔ ذہن نہیں مانتا تھا کہ تالابن اس چھوٹے سے تار کے ساتھ قفل کھولنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ تاہم اس کا شہناک غیر معمولی تھا۔ وہ کافی دیر اپنی کوشش میں مصروف رہا اور آخر یہ انمولی ہو گئی۔ مدھم کھٹکے سے قفل کھل گیا۔ قفل کھلنے کے باوجود زنجیر کا دوسرا سرا تالابن کے پاؤں میں تھا۔ اس نے زنجیر کو سنبھال کر کندھے پر ڈال لیا اور بے آواز چلتا ہوا احاطے کی دیوار تک پہنچ گیا۔ اس کی حرکات و سکنات میں ہلاکی پھرتی تھی اور آنکھوں کی چٹیلیاں تیزی سے حرکت کر رہی تھیں۔ دیوار کی اونچائی کافی زیادہ تھی۔ اس اونچائی سے بچنے کے لیے تالابن نے چند روز پہلے ہی انتظام کر لیا تھا۔ کسی بھی کاٹھنڈا ہوا ایک طویل بانس احاطے میں درختوں کے نیچے پڑا تھا۔ یہ بانس تالابن نے دیوار کی جڑ میں پتوں کے نیچے چھپا دیا تھا۔ اندھیرے میں نکل کر اس نے بانس پر آمد کیا۔ اس نے کھیل تماشوں میں ان گنت مرتبہ بازی گروں کو بانس کے ذریعے اونچی چھلانگیں لگاتے دیکھا تھا۔ اولپیائی کھیلوں میں بھی اس قسم کے بہت سے مقابلے ہوتے تھے۔ تالابن خود بھی اس طرح کی چھلانگ لگا سکتا تھا۔ اس نے کندھے پر رکھی ہوئی زنجیر کو گھلے میں ڈال کر ایک گرد دی۔ پھر دیوار سے اپنا فاصلہ مقرر کیا اور بھاگ کر بانس کے ذریعے چھلانگ لگا دی۔ اگلے ہی لمحے وہ بندر کی طرح دیوار سے اڑکا ہوا تھا۔ اس نے کوشش کر کے بانس کو بھی گرنے سے بچا لیا تھا۔

تیز ہوا میں دو باشت چوڑی دیوار پر چلتا خاصا دشوار تھا۔ تالابن نے پانچ چھ گز کا فاصلہ بمشکل طے کیا اور محل کی چھت پر پہنچ گیا۔ جبکہ کر چلتا ہوا وہ چھت کے مشرقی سرے کی طرف بڑھتا۔ اسے معلوم تھا کہ مدبر سے لڑنے کے لیے آسانی محل کی بظنی گلی میں چھلانگ لگا سکتا ہے۔ اس چھلانگ کے کامیاب ہونے کا مطلب تھا وہ غار سے نکل کر رکتا ہوا گرد و غبار کے باوجود اس کی تیز نظروں نے منڈیر پر کچھ سایوں کو متحرک دیکھ لیا تھا۔ چھٹی ہوئی مشعلوں کے قریب وہ چوہے کی نظر آ رہے تھے۔ تالابن اوندھے منہ چھت پر گر گیا اور ریتلتا ہوا میڑھیوں کی طرف سرک گیا تھا۔ بہتر یہی تھا کہ اب وہ چھت سے گزرنے کا ارادہ

تالابن یہ سب کچھ خاموشی سے سنتا رہا۔ وہ ایسی باتوں سے ڈرنے والا نہیں تھا۔ مارہٹ، جسمانی اذیت اور تذلیل اس کے لیے بے معنی لفظ بن چکے تھے۔ باقی رہی موت، تو وہ تو اس کی محبوبہ تھی۔ وہ جسم اور سائے کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ رہتے تھے۔ آنکھ پھولی کھیلے تھے، اٹھیلیاں کرتے تھے۔ تالابن چو سات برس کا تھا جب اسے ایران کے ایک ساحلی علاقے سے غلام بنا کر یونان لایا گیا تھا۔ اس وقت سے اب تک وہ بھاگتا ہی رہا تھا۔ کبھی کسی آقا کی زنجیر توڑ کر، کبھی کسی آقا کی دیوار پھاند کر، کبھی کسی کو زخمی کر کے، کبھی کسی کی جان لے کر، وہ ایک دائمی مفروز تھا۔ یونان کے جنگل ویرانے اور ساحل اس کی سرکشی کے گواہ تھے۔ بھاگنا، پکڑے جانا، اذیتیں سہتا اور پھر بھاگ لکھنا، یہ تھا تالابن کی زندگی کا دائرہ۔ اسے معلوم تھا کہ اسے یہاں سے بھی بھاگ لکھنا ہے۔ اس شاہی محل کی اونچی دیواریں اس کی پرداز روکنے کے لیے ناکافی تھیں۔ وہ اپنے ساتھیوں کی باتیں سنتا اور دل ہی دل میں ہنس دیتا۔

شام کو باغ میں مشقت ختم ہونے کے بعد انہیں کھانا کھلایا جاتا اور زنجیروں سے باندھ کر ایک احاطے میں ڈال دیا جاتا۔ اس احاطے کو بندی خانہ کہتے تھے۔ بندی خانے میں وہ کڑی عمرانی ختم ہو جاتی جو باغ میں مشقت کے دوران کی جاتی تھی۔ صرف دو یا تین نگران رسمی طور پر احاطے کے دروازے پر پیرا دیتے۔ کبھی کبھی ان کا آقا غار سے بھی ٹھٹھا ہوا اس جانب آنکھتا اور غلاموں کا معائنہ کرتا۔ تالابن کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں مضحکہ خیز چمک نمودار ہو جاتی۔ وہ خاص طور پر اس کا حال احوال پوچھتا۔

"اوہ فارسی بھگوڑے! تم ابھی نہیں ہو، میں تو سمجھتا تھا نکل بھاگے ہو گے۔"

غارس کے ساتھ آنے والے محافظ بھی اسے مسکراتی نظروں سے دیکھتے۔ جیسے کہہ رہے ہوں، بڑا دعویٰ تھا بھاگ جانے کا اب بھاگتے کیوں نہیں، کہاں گئی تمہاری چلاکی ہو شیاری، ان نگاہوں کو محسوس کر کے تالابن کے رگ و پے میں برق سی کوند جاتی۔ اس کا جی چاہتا وہ ان تماش بیڑوں کو ابھی کچھ کر کے دکھا دے، لیکن پھر وہ اپنے جذبات پر قابو پا لیتا اور یونی گم صم بیٹھا رہتا۔ بے حس و حرکت، جیسے مٹی کا ڈھیر ہو یا درخت کا ٹکڑا ہوا تاج۔ پچھلے تیرہ برس کی بھاگ دوڑ میں اس نے کچھ اور چاہے نہ سیکھا ہو لیکن اپنے دلی جذبات کو چھپاتا اسے ضرور آگیا تھا۔

غارس کی ملکیت میں آئے ہوئے تالابن کو بیس ایکس روز ہوئے تھے۔ جب اسے وہ موقع ملا جس کا وہ انتظار کر رہا تھا، وہ ایک طوفانی شب تھی۔ شام ہی سے بادل چھانے

ترک کر دے اور محل کی زیریں منزل پر پہنچ کر کسی کھڑکی سے نکلنے کی کوشش کرے۔ یہ حربہ وہ پہلے بھی کئی مکانوں پر آزما چکا تھا۔

میرزا حیات اتر کر وہ محل کے اس حصے میں پہنچ گیا جہاں ایک طویل قطار میں ملازمتوں اور کنیزوں کی کونٹریاں تھیں۔ یہاں پہلے کا انتظام نہ ہونے کے برابر تھا۔ ان کو ٹھکانوں کی عقبی کھڑکیاں جس راہداری میں کھلتی تھیں وہاں سے بیرونی چار دیواری زیادہ دور نہیں تھی۔ تاجان نے سوچا کہ وہ کسی خالی کونٹری میں گھس کر باہر نکل جائے۔ دفعتاً ایک قرعہ سی کو ٹھکانے سے اسے مدہم آواز سنائی دی۔ کسی عورت نے سسکی لے کر کوئی بات کی تھی۔ تاجان نے اس کو ٹھکانے میں جھانکنے کی کوشش کی۔ ایک کھڑکی کی درز میں سے وہ اندر کا منظر دیکھنے میں کامیاب رہا۔ تنگ سی کونٹری تھی جس میں ایک عورت کی ضرورت کا معمولی سامان پڑا تھا۔ دو صندوق، ایک چارپائی، کھونٹیوں پر لٹکے ہوئے چند زیناں لباس، زیوس دیوتا کی ایک پرانی مورتی، ایک انگلیشی اور چند برتن۔ ایک عورت جو شکل و صورت سے معمولی خادمہ لگتی تھی، چارپائی پر بیٹھی تھی۔ اس کی گود میں تین چار ماہ کا بچہ تھا، اتنی ہی عمر کا ایک اور بچہ چارپائی پر پڑا تھا۔ غالباً دونوں بچے بڑاں تھے۔ ان تین نفوس کے علاوہ کمرے میں ایک اور فرد بھی تھا۔ یہ ایک دوشیزہ تھی لیکن اسے دیکھ کر تاجان کو اپنی آنکھوں کا بھروسہ جاتا رہا۔ اسے لگا جیسے وہ کوئی انوکھا خواب دیکھ رہا ہے۔ انوکھا اور ہوشیار۔ تاجان کے لیے دھڑکنوں کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ اسے محسوس ہوا کہ کسی نے آنکھوں کے راستے دنیا کا تیز ترین نقشہ اس کے جسم میں انڈیل دیا ہے اور اب وہ ایک نہ نوٹنے والے شمار میں ڈوبتا جا رہا ہے۔ وہ دوشیزہ کوئی آسمانی مخلوق لگتی تھی۔ اس کی رعنائی کو احاطہ الفاظ میں لانا ناممکن تھا۔ خوبصورتی کے لیے یونانی، ترکی اور فارسی میں جتنے الفاظ استعمال ہوتے تھے، تاجان کو معلوم تھے لیکن یہ سارے الفاظ ان کونوں میں اسے قیچ محسوس ہوئے۔ وہ بے پناہ حسن آنکھ کو عاجز اور ذہن کو ماؤف کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ وہ دل ہی دل میں پکار اٹھا۔ ”اے خالق کائنات! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟ کیا چند گئے چنے انسانی نقوش میں اتنا بے شمار حسن سما سکتا ہے۔ کیا کوئی چیز اتنی جاذبِ نظر اور کوئی پیکر اتنا دلکش بھی ہو سکتا ہے؟“ یکایک ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا۔ کمرے میں رگے ہوئے شمعداں میں شمعیں لرز اٹھیں۔ دوشیزہ کے سر کا زردار آچل لہرایا اور اس کا چہرہ گھونگھٹ کی ادھ میں چھپ گیا۔ تاجان تڑپ اٹھا۔ اس کے رگ و پے سے جان کشید ہو کر اس کی آنکھوں میں سمٹ آئی۔ اسے لگا دنیا ایک لمحے میں دیران ہو گئی

ہے۔ اب یہاں دیکھنے اور چھونے کے لیے کچھ باقی نہیں رہا۔ پھر اس ناز میں ہی سیریں آواز کرے میں گونٹی۔ تاجان کے کانوں میں ہزاروں جلتنگ جاتھیں۔ وہ اپنے سامنے بیٹھی ہوئی خادمہ سے مخاطب تھی۔

”یہ لو کھاؤ۔“ اس نے خوان پوش سے ڈھکی ہوئی ایک رکابی خادمہ کے سامنے رکھ دی۔

خادمہ کی آنکھوں سے آنسو پکپکے لگے۔ اس نے لرزاں ہاتھوں کے ساتھ رکابی پر سے کپڑا ہٹایا۔ وہ کئی دنوں سے بھوکی لگتی تھی۔ کھانا دیکھ کر اس کے لیے خود پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔ وہ بے تابی سے نوالے لینے لگی۔ دوشیزہ کے سر میں ہاتھ آچل کی ادھ سے نکل کر صراحی کی طرف بڑھے۔ اس نے پیالے میں پانی انڈیل کر کھانا کھاتی عورت کے پاس رکھ دیا اور اپنی مسکورت کن آواز میں بولی۔

”ہم روز تمہیں کھانا پہنچایا کریں گے۔ کھانا نہیں کھاؤ گی تو بچوں کو دودھ کیسے پلاؤ گی؟“

عورت نے لرز کر کھانے سے ہاتھ روک لیا۔ ”تمہیں شہزادی! دیوتاؤں کے لیے کچھ پر رحم کریں۔ اگر آقا کو پتہ چل گیا تو مجھے اور میرے بچوں کو کنیزوں سے چھید دیں گے۔ اگر ایک روز مشقت نہ کر سکتے کی سزا دس روز کی فاقہ کشی ہے تو اتنے بڑے جرم کی سزا نہ جانے کیا ہو گی۔“

”کچھ نہیں ہو گا۔“ دوشیزہ کی مہربان سرگوشی کمرے میں گونٹی۔ ”کیا ہم ایسا ہونے میں گئے؟“

بچہ عورت کی گود میں رونے لگا۔ دوشیزہ نے بچہ تھامنے کے لیے دونوں ہاتھ عورت کی طرف بڑھا دیئے۔ ”لاؤ، بچہ ہمیں دے دو، تم اطمینان سے کھانا کھاؤ۔“

لرزتی کائناتی عورت نے ہچکچا کر بچہ شہزادی کی گود میں دے دیا۔ شہزادی نے کمال پہانی سے بچے کو کندھے سے لگا لیا۔ ایسے میں ایک بار پھر اس کے چہرے سے آچل عکس گیا۔ گھپ اندھیری رات میں یکایک سورج نصف نماز پر چمک اٹھا۔ تاجان کی آنکھیں خیرہ ہوئے لگیں۔ اسے خدشہ لاحق ہوا کہ کچھ دیر اسی طرح کمرے میں دیکھتا رہا تو اس کے حواس کام کرنا چھوڑ جائیں گے اور وہ راکھ کے ڈھیر کی مانند فرش پر پڑا نظر آئے گا۔ تاہم اس خدشے کے باوجود وہ اس چہرے سے نگاہیں ہٹانا نہیں ہٹاتا تھا۔ ہٹا ہی نہیں سکتا تھا۔ ایکایک ہوا کا ایک جھونکا اور آیا۔ یہ جھونکا پہلے جھونکوں سے شدید تھا۔

جب اس کی قید ختمی ختم ہوئی تو وہ پھر اپنے ساتھیوں سے آملہ روزمرہ کی مصروفیات شروع ہو گئیں۔ تہاں کی نگاہیں محل کے در دیوار میں ہر وقت اس حسن بے مثال کی متلاشی رہتیں۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے بھی سن گئی لی..... پتہ چلا کہ عارس زونب کی ایک ہواں سال بٹی ہے جسے شہزادی مارشا کہا جاتا ہے۔ سنا ہے وہ بے حد حسین ہے لیکن اس کی صورت بہت کم لوگ دیکھنے پاتے ہیں۔ مرد تو مرد وہ عام عورتوں سے بھی پردہ کرتی ہے۔ صرف اس کی آنکھیں نقاب سے باہر رہتی ہیں۔ اسی وجہ سے بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ وہ حسین نہیں بلکہ بد صورت ہے۔ اس کے چہرے پر کوئی بد نما داغ ہے جسے وہ چھپانے کی کوشش کرتی ہے۔ ویسے وہ بے حد ہمدرد اور نیکوکار ہے۔ ہر شخص اس کی تعریف کرتا ہے۔ شہزادی کے خاص غلام اور کنیرس ایسے لوگوں کی جتنی میں رہتے ہیں جنہیں کسی بھی طرح کی مدد کی ضرورت ہو۔ وہ خود بھی ایسا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی۔ ہر شخص اس بات پر متفق ہے کہ شہزادی کے اندر کسی نہایت نیک پاک روح کا بکیرا ہے۔ تہاں کے ایرانی ساتھی نے ایک واقعہ سنا ہے جو بے گناہ چند ماہ پہلے اپنے والد سے دو غلاموں کی جان بخشی کرانے کے لیے شہزادی نے کھانا پینا چھوڑ دیا تھا۔ جب تین چار روز وہ بھوک پیاسی رہی تو محل میں کھرام مچ گیا۔ محل کے سب غلاموں اور ملازموں نے شہزادی کا ساتھ دیتے ہوئے بھوکا رہنا شروع کر دیا۔ چھپے روز آقا عارس کو گھٹنے ٹیکنے پڑے اور دونوں غلاموں کی جان بخشی کرنا پڑی۔ ایسے ہی بے شمار واقعات ہیں جنہوں نے شہزادی کو محل میں اور محل سے باہر ہر لعزیز بنا رکھا ہے۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں ایسی ہر لعزیز کی کسی کو نصیب ہوتی ہے۔

شہزادی کو دوبارہ دیکھنے کا اشتیاق تہاں کے دل میں دن بدن بڑھتا جا رہا تھا۔ مگر وہ ان درو دیوار سے بہت دور تھا۔ تہاں اس ملکہ حسن کا گزر ہوتا تھا۔ باغ کا کام مکمل ہو چکا تھا اور آج کل تہاں اپنے ساتھیوں کے ساتھ محل سے باہر کام کر رہا تھا۔ محل کی تین اطراف میں ایک خندق کھودی جا رہی تھی۔ یہ خندق تین قدم چوڑی اور ایک عام سرے دو گنی گہری تھی۔ چالیس پچاس غلام صبح سے شام تک کھدائی میں مصروف رہتے تھے۔ تہاں نے دیکھا تھا کہ چند دوسرے امراء کے مکانوں کے گرد بھی ایسی ہی خندقیں کھودی جا رہی تھیں۔ بعض مکانوں کے صدر دروازے یا بیرونی فصیل کو بھی مضبوط بنایا جا رہا تھا۔ تہاں ان تیاریوں کی وجہ سمجھتا تھا۔ درحقیقت شہر میں یہ افواہیں گردش کر رہی تھیں کہ غریب ایجنٹ پر شدید حملہ ہونے والا ہے۔ حملہ آور ایک مقدونی شہر "پلا" کے لوگ بتائے

جاتے تھے اور ان کے سردار کا نام سکندر لیا جاتا تھا۔ سکندر کے بارے میں تہاں بہت کم جانتا تھا۔ ہاں سکندر کے باپ شاہ فیقوس کا نام اس نے کئی بار سنا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ شاہ فیقوس ایک ہمدرد جری سپہ سالار تھا اور دو تین برس پہلے اس نے اہل ایجنٹ پر حملہ کر کے انہیں زبردست شکست دی تھی۔

تہاں کے ساتھی سکندر اور اس کی سپاہ کا اکثر ذکر کرتے رہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ سکندر اگرچہ کم عمر ہے لیکن وہ اپنے باپ کا صحیح جانشین ثابت ہو گا اور اگر اس نے مشتعل ہو کر ایجنٹز کا رخ کر لیا تو اہل ایجنٹز کو غیر تنگ شکست سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔ ایک روز جب تہاں اور اس کے ساتھی غلام سخت دھوپ میں کھدائی کا کام کر رہے تھے۔ شمال سرحد سے آنے والے چند اور غلام ان کے ساتھ شریک ہو گئے۔ وہ اپنے ساتھ شالی سرحد کی بہت سی خیریں لے کر آئے تھے۔ سکندر اور اس کی فوج کے متعلق بھی انہیں معلومات حاصل تھیں۔ ان میں سے ایک نے بتایا کہ سکندر ان دنوں اپنے دار الحکومت "پلا" سے نکلا ہوا ہے اور باغی قبیلوں کی سرکوبی میں مصروف ہے۔ "ہائی ماس" نامی پہاڑ کی نواحی وادیوں میں سکندر کی فوج ان بربری قبائل سے برسرِ پیکار ہے جو پہاڑوں سے اتر کر شہری آبادی میں لوٹ مار کرتے ہیں۔ اس شخص نے بتایا کہ بربری قبائل کے ساتھ نوجوان سکندر کا ایک معرکہ ان کی آنکھوں کے سامنے ہوا تھا۔ بربری قبیلے بندی پر تھے۔ انہوں نے اپنے سامنے جنگی گاڑیوں سے ایک دیوار بنا رکھی تھی۔ منصوبہ یہ تھا کہ جب سکندر اپنی فوج کے ساتھ یلغار کرے ان کی طرف بڑھے گا تو وہ اوپر سے جنگی گاڑیاں لڑھکا دیں گے۔ سکندر کو اس چال کا علم بروقت ہو گیا لیکن حملہ بھی ضروری تھا۔ اس نے اپنے ہمدردوں کو حکم دیا کہ لمبی ڈھالوں کے ساتھ یلغار کریں۔ جب اوپر سے دشمن کی گاڑیاں لڑھکتی ہوئی آئیں تو اپنی صفوں میں خلا پیدا کر کے گاڑیوں کے گزرنے کا راستہ بنائیں۔ جو سپاہی بروقت ایسا نہ کر سکیں وہ آوندھ مٹے مگر کر ڈھالیں اپنی سر پر رکھ لیں۔ گاڑیاں ان کے اوپر سے باغیٹ گزر جائیں گی۔ سکندر کے ہونٹوں سے لپٹی ہوئی ہر بات پر اس کے جاں نثاروں نے بے خوف و خطر عمل کیا۔ حملے کے دوران جب میپ گزر گزرا ہٹ سے گاڑیاں لڑھکتی ہوئی آئیں تو سپاہیوں نے سمجھ کر ان کے لیے راستے بنا دیے۔ جہاں راستہ نہ بن سکے وہاں سپاہی ڈھالیں اوڑھ کر لیٹ گئے۔ اس ترکیب سے ناقابل ذکر نقصان ہوا۔ مقدونی فوج دھواں بولتی ہوئی دشمن پر ٹوٹ پڑی اور اسے تھس تھس کر دیا۔ یہ اور ایسے ہی بہت سے واقعات سکندر کے بارے میں سننے اور سنائے جا

شران سپاہیوں سے سخت خار کھاتے تھے اور غواہی جیسوں میں مقرر لوگوں کو ابھارتے تھے کہ وہ ان انجینی سپاہیوں کو قلعہ سے اٹھا کر باہر پھینک دیں۔۔۔۔۔۔ اور آج وہی بات ہو گئی ہے۔۔۔۔۔۔ اہل ایجنٹر قابض مقدونوی فوج کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔

"اب کیا ہو گا؟" تابان نے پوچھا۔

ہوشمند کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں لہرائیں۔ وہ بولا۔ "سکندر اپنے افسروں کی موت کا خوفناک انتقام لے گا۔ سمجھو جنگ کچھ اور قریب آگئی ہے۔"

تابان نے پوچھا۔ "کیا اہل شہر جنگ کے لیے پوری طرح تیار ہیں جو انہوں نے ایسا کام کیا ہے؟"

ہوشمند بولا۔ "میں تو سمجھ نہیں آ رہی۔ ابھی تو بغاوت کی داغ بیل ڈالی جا رہی تھی۔ اپنی فوج بنانے اور ہتھیار جمع کرنے کی باتیں ہو رہی تھیں۔ ابھی یہ کام نہیں ہونا چاہئے تھا۔"

اسی دوران سامنے گلی میں لغو زنی کا شور سنائی دیا۔ بہت سے لوگ نیزے اچھالتے اور بازو لہراتے آ رہے تھے۔ تابان اور ہوشمند بھی اٹھ کر دیکھنے لگے۔ اس جلوس میں زیادہ تر رؤسا اور امراء کے بیٹے ان کے مصاحبین اور خادم شامل تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس جلوس کے شرکاء بڑھنے لگے۔ لوگ گھروں اور کانوں سے نکل نکل کر جلوس میں شامل ہو گئے۔ ہرچہرہ جوش سے تھمرا رہا تھا۔ تابان اور ہوشمند کے کانوں میں یہ آوازیں اترتی خبر پہنچی کہ مقدونیہ کا سکندر الیسا کے جنگلوں میں مارا گیا ہے اور تھوڑی دیر قبل قلعے میں جو بغاوت ہوئی ہے اس کی وجہ بھی یہی اطلاع ہے۔ لوگ سکندر کے خلاف اور اپنے مذہبی پیشواؤں کے حق میں زور دار نعرے لگا رہے تھے۔ پھر ایک ادھیڑ عمر یونانی پیشوا کو کندھوں پر اٹھا کر ایک چوڑے پر کھڑا کر دیا گیا۔ اس دہلے پٹے شخص نے تاریکی چھپا کر رہا تھا۔ جوش اور دلولے سے اس کا جسم کاپ رہا تھا۔ اس نے تقریر کرنے والے انداز میں کہا۔

"دوستو! آج ہماری سامنتوں میں رس پکا ہے۔ آج ہم نے اس شخص کی موت کی خبر سنی ہے جس نے ہماری آزادی سلب کر رکھی تھی اور ہمارے حق اٹھارے پہرے بٹھا رکھے تھے۔ آج وہ شخص اپنے انجام کو سدھارا ہے جو ہماری آنے والی نسلوں کے لیے غلامی کا جوتا تیار کر رہا تھا۔ مقدونیہ کا وہ خاندان آج بے چراغ ہو گیا ہے جو ہمارے شہروں پر تاریکی کا راج قائم کرنا چاہتا تھا۔ یہ سب دیوتاؤں کی کرم فرمائی ہے۔ اگر ہم نے اس سنہری موقع سے فائدہ نہ اٹھایا تو آئندہ نسلیں ہمیں بے وقوف اور بزدل گردائیں گی۔ یہ

رہے تھے۔ شہر بھر میں جنگ کا چرچا تھا۔ کچھ لوگ سکندر مقدونوی سے خوفزدہ تھے اور کچھ اسے ناقابل فراموش سبق کھانے کی باتیں کرتے تھے۔ عجیب بے یقینی کی فضا نے شہر کو ڈھانپ رکھا تھا۔

وہ ایک خوشگوار دوپہر تھی۔ خندق کھودنے والے کارندوں کو ایک گھڑی آرام کی مہلت تھی۔ تابان اپنے ایرانی ساتھی کے ساتھ ایک سایہ دار بیڑے تلے آ بیٹھا۔ اس ایرانی کا نام ہوشمند تھا۔ چند سال پہلے ہوشمند نے اپنے کسی آقا کے پاس سے فرار ہونے کی کوشش کی تھی جس کی سزا میں اس کے ایک پاؤں کی انگلیاں کاٹ دی گئی تھیں لہذا ہوشمند تھوڑا سا لنگڑا کر چلتا تھا۔ وہ دونوں سائے میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔

ہوشمند نے سرگوشی میں کہا۔ "اب کس دن بھاگنے کا ارادہ ہے؟"

تابان نے کہا۔ "بھاگتے بھاگتے تھک سا گیا ہوں۔"

ہوشمند نے کہا۔ "چند روز پہلے تو تمہاری سوچ یہ نہیں تھی۔ میرا خیال ہے آقا غارس کا کوڑا کافی سخت ہے۔"

تابان نے ایک آدھ کر کہا۔ "میں سمجھ لو۔"

دفعاً سامنے گلی میں شور سنائی دیا۔ دو حواس بانٹ آدی بھاگتے ہوئے آئے اور غلاموں کی گھرائی کرنے والوں کو کوئی اہم خبر نہ لگے۔ چند غلام اور خادم بھی یہ خبر سننے کے لیے پاس جا کھڑے ہوئے۔ خندق کے کنارے چھوٹا سا مجمع لگ گیا۔

ہوشمند نے کہا۔ "میں سن کے آتا ہوں کیا بات ہے۔" وہ لنگڑاتا ہوا مجمع میں پہنچا۔ چند لمحے بعد وہ ہراساں چہرے سے تابان کی طرف لوٹ آیا۔

"کیا ہوا ہے؟" تابان نے پوچھا۔

"پوچھو کیا نہیں ہوا ہے۔" ہوشمند نے لرزیدہ لہجے میں جواب دیا۔ "یونانی سپاہیوں نے دو مقدونوی افسروں کو ہلاک کر کے قلعے میں بغاوت کر دی ہے۔"

"میں کچھ سمجھا نہیں۔" تابان نے کہا۔

ہوشمند نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔ "بہت عجیب بات ہوئی ہے۔ اب بڑی سنگین خبریں آئیں گی۔"

تابان نے ہزاری سے کہا۔ "مگر ہوا کیا ہے؟"

ہوشمند بولا۔ "تین برس پہلے جب شاہ فیلقوس نے ایجنٹر قبضہ کیا تو قلعے میں اپنی مستقل فوج رکھنا شروع کی تاکہ شہر تسلط قائم رہے۔ یہ فوج اب بھی قلعے میں تھی۔ اہل

انتخاب برپا کرنے کا وقت ہے، یہ اپنے حقوق چھین لینے کا مرحلہ ہے۔"
مقرر کا جوش اور سامعین کا جہوم بڑھتا جا رہا تھا۔ تاہم تہاں اور اس کے ساتھی یہ
ہنگامہ مزید نہ دیکھ سکے کیونکہ ان کے گمرانوں نے کوڑے لہرا کر انہیں واپس کام پر
آنے پر مجبور کر دیا تھا۔

☆-----☆

ایجنٹز اور یونان کے طول و عرض میں حالات بہت تیزی سے بدلے۔ سکندر کی
موت کی خبر پیشتر جنگوں پر خوشی سے سنی گئی اور لوگ خود کو مقدونی تسلط سے آزاد سمجھنے
لگے۔ ایجنٹز میں جشن کا مہاں تھا۔ راگ رنگ کی مٹھلیں برپا ہو رہی تھیں۔ خیر خیرات بانٹی
جا رہی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ دفاعی تیاریاں بھی جاری تھیں۔ وہ مقدونی
فوج جو قلعے میں موجود تھی محصور کر لی گئی تھی اور کسی بھی وقت قلعے پر بلر بول کر اسے
ختم کیا جاسکتا تھا۔ اس بات کا بہت امکان تھا کہ مقدونیہ کے سردار اپنی گھری ہوئی فوج کو
بچانے کی کوشش کریں گے۔ اس کوشش کا مطلب ایجنٹز پر بھرپور حملہ بھی ہو سکتا تھا۔
بہر حال اب لوگوں پر "سکندر کی موت" سے پہلے والا خوف و ہراس طاری نہیں تھا۔
انہیں معلوم تھا اب شہر پر دھاوا بولنا اور اسے تھخیر کرنا آسان کام نہیں۔ تہاں کی پرانی
نظریں مسلسل اس رشک جہاں کی تلاش میں تھیں جس نے ایک رات ایک بوسیدہ سے
کمرے میں اپنی جھلک دکھا کر اس کا کیچہ چھلنی کر دیا تھا۔ اسے آہ کشی کا روگ لگا کر وہ نہ
جانے کن ایوانوں میں جا چھپی تھی۔ تہاں ایک دھنکارا پٹکارا ہوا حقیر غلام، وہ ایک
نازنین شہزادی، سات پردوں میں چھپی ہوئی۔ اٹلس و کھواب کے لبادوں میں لپیٹی ہوئی،
صنف نازک کے لیے بھی جس کی جھلک دیکھنا آسان نہیں تھا تہاں کی آنکھوں سے یہ کیسی
جان لیوا بھول ہو گئی تھی۔ نہ جانے وہ کیسے اس پسندے میں آگیا تھا۔ وہ کوئی انجان شخص
نہیں تھا اور نہ ہی عورت اس کے لیے کوئی پہلی تھی۔ اس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا
اور در در کی فھو کرس کھائی تھیں۔ آقاؤں کے کوڑے کھا کھا کر اور ان کے متلاشی
گھوڑوں کے آگے بھاگ بھاگ کر تہاں نے جینے کا ایک نیا ذھنک سیکھ لیا تھا۔ وہ شد
ڈھائی اور بے جسی کا جسم بن چکا تھا۔ سزا پا کر چٹنا چلانا اور پھر جرم کر کے مکرانا اس کی
فطرت ہو گیا تھا۔ شب و روز کی سختیوں نے اسے ایک مختلف انسان کے روپ میں ڈھال
دیا تھا۔ چپے کی طرح پھر پٹلا، لومڑی کی طرح عیار، بھیڑیے کی طرح خونی اور کچھوے کی
طرح ڈھب، ظالم کے مسلسل ظلم نے اسے مظلوم بنانے کی بجائے خود سراور بے جس بنا

دیا تھا۔ آقاؤں کے ہاتھوں اس کی ذلتوں کا تماشا تو ایک دنیا نے دیکھا تھا لیکن جہاں کہیں
اسے موقع ملا تھا وہ بھی ذلالت پر اترنے سے باز نہیں رہا تھا۔

معلوم نہیں کیوں اب سب کچھ بدلا بدلا لگ رہا تھا۔ کوئی ایسا درد اس کے دل میں
نہا گیا تھا جس نے اسے ساری خرمستیاں بھلا دی تھیں۔ سوتے جاگتے، صبح و شام وہ ہر وقت
شہزادی مارشا کی دید کا آرزو مند رہتا تھا۔ پھر ایک روز اسے شہزادی دکھائی دی لیکن اس
دیکھنے سے نہ دیکھنا بہتر تھا۔ تہاں کے سینے کی پیش کچھ اور بڑھ گئی۔ وہ شہزادی کا صرف
سر اپائی دیکھ پلا اور وہ بھی پچاس ساٹھ قدم کے فاصلے سے۔ یہ واقعہ سہ پہر کے وقت پیش
آیا۔ خندق پر کام کرتے ہوئے تہاں نے محل سرا کے بیرونی دروازے کی طرف دیکھا۔
وہاں مٹاجوں اور مظلوموں کی ایک قطار نظر آئی۔ یہ لوگ بڑی عاجزی سے فرش زمین پر
ٹپٹے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں سٹکول اور برتن تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ قطار طویل ہونے
لگی۔ چند گھنٹوں میں وہاں کافی لوگ جمع ہو گئے۔ ان کے ارد گرد غاس زنبوب کے مسلخ
پسیدار منڈا رہے تھے۔ شام سے ذرا پہلے محل سرا کا بیرونی دروازہ کھلا اور چند پسیداروں
و خداموں کے ساتھ شہزادی مارشا برآمد ہوئی۔ اس کا چہرہ مکمل طور پر شہری چادر میں
پوشیدہ تھا۔ ہاتھ پاؤں کا کوئی حصہ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ سونے کے تاروں والے
ایک فیروزہ لباس میں تھی۔ اسے دیکھ کر تہاں کو یوں لگا جیسے آفتاب ایک ہی ہست کے
ساتھ غروب ہو گیا ہے اور ہر طرف جادوئی روشنی پھیل گئی ہے۔ اس کی آنکھیں پتھرا کر
رو گئیں۔

شہزادی مارشا جبک جبک کر مٹاجوں کے سٹکول میں خیرات ڈالتے لگی۔ اس کا
مترک جسم دور سے ایک جھلکا آستارہ دکھائی دے رہا تھا۔ نہ جانے کب تک تہاں بچو
نظارہ رہا۔ یکایک ایک طوفانی تھنڑ اس کے رشار پر پڑا وہ اچھیل کر خندق میں جا گرا۔
خندق میں کائنات دار جھاڑیاں بھری جا رہی تھیں۔ درجنوں کائنات تہاں کے جسم میں ٹوٹ
گئے۔ بالائی ہونٹ سے خون کی دھار بہہ نکلی۔ اس نے بوکھلا کر خندق کے کنارے پر
دیکھا۔ کم از کم چار گمران اسے خونی نظروں سے گھور رہے تھے۔ وہ حیران رہ گیا کہ کیلے
بعد دیگرے چار گمران اس کے سر پر پتے اور اسے ان کے آنے کی خبر ہی نہ ہوئی۔ وہ
شہزادی مارشا کے لیے اپنی دوا لگی پر خود ہی مسکرا دیا۔ گمرانوں کے کوڑوں سے لٹک کر وہ
خندق سے باہر نکلا۔ گمران اعلیٰ نے اسے زمین پر اوندھالینے کا حکم دیا اور ننگی پشت پر بے
درغ کوڑے پراسائے۔ جب تہاں چیختے چلانے لگا تو اسے چھوڑ دیا گیا۔ تب ایک بار پھر وہ

دوسرے غلاموں کی طرح اسے بھی زنجیر بٹادی۔ آج یکایک یہ زنجیر اسے ہٹ بھاری لگنے لگی تھی۔ اس نے کھانا بھی ٹھیک سے نہیں کھایا۔ ایک بے نام سی اداسی دگ وپے میں سرایت کر گئی تھی۔

معلوم نہیں آئندہ گھڑیوں میں یہ اداسی کیا رخ اختیار کرتی۔ بڑھتی یا گھٹتی لیکن اسی دوران ایک اور ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ تابان نے دیکھا دو گھڑسوار سریت گھوڑے بٹکاتے بندی خانے کے سامنے رکے۔ ان میں سے ایک گھڑسوار گھوڑے سے اتر کر بٹکاتا ہوا بندی خانے کے دروازے پر پہنچا۔ بندی خانے کے دروازے پر نگران شیطی روشن کر رہا تھا۔ گھڑسوار نے نگران سے دریافت کیا کہ آقا غاس کہاں ہوں گے۔ نگران نے جواب میں بتایا کہ تھوڑی دیر پہلے وہ گشت پر آئے تھے، اب باغ کی طرف نکل گئے ہیں۔ گھڑسوار جس تیزی سے آئے تھے اسی تیزی سے عقبی باغ کی طرف چلے گئے۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ شای محل سے کوئی اہم خبر لے کر آئے ہیں۔ محل سرا میں کچھ عجیب سی پہل نظر آنے لگی تھی۔ پریڈر تیز قدموں سے اندر باہر آ جا رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد یہی بے قراری بندی خانے کے نگرانوں میں بھی دکھائی دینے لگی۔ اتنے میں ایک قیدی نے مغربی افق کی طرف دیکھا اور پکارا۔

”یہ کیا ہے؟“

احاطے میں موجود ہر قیدی نے اس کی نگاہ کا تعاقب کیا۔ شام کے چھپنے میں افق پر گرد و غبار گادیز بادل نظر آ رہا تھا۔ تابان نے بھی غور سے اس گرد و غبار کو دیکھا۔ وہ جاننا تھا ایسا منظر یا آندھی سے پہلے سے نظر آتا ہے یا کسی بڑی فوج کی یلغار کے وقت۔ وہ اوندھے منہ زمین پر لیٹ گیا اور کان مٹی سے لگا کر کچھ سننے لگا۔ ایک گونج سی محسوس ہوئی۔ اس کا خون رگوں میں اچھل کر رہ گیا۔ کوئی لشکر تیزی سے پیش قدمی کرتا شرکی جانب آ رہا تھا۔ یہ کیا لشکر تھا؟ آنے والے دوست تھے یا دشمن؟ ان کی تعداد کیا تھی؟ بہت سے سوال تابان کے ذہن میں گونجے۔ پھر محل نشینوں کے گہرائے ہوئے چہرے اس کی نگاہوں میں گھوم گئے۔ اس کے دل نے پکار کر کہا، یہ مقدونی فوج ہے جو اپنے محصور دستوں کی مدد کے لیے پہنچی ہے۔

رات کے دوسرے پہر تک محل میں یہی اضطرابی کیفیت برقرار رہی۔ سرگوشیوں میں باتیں ہوتی رہیں اور مختلف افواہیں گردش کرتی رہیں۔ جس وقت نصف شب کا ٹھنڈا بجواہل ایتھنز یہ روح فرسا خبر سن رہے تھے کہ ایک بڑی مقدونی فوج شہر کے سامنے ڈیرہ

ساتھی کارندوں کے ساتھ مل کر کانٹے دار جھاڑیاں گھیسے اور انہیں خندق کے اندر گرانے میں مصروف ہو گیا۔..... شام کے بعد تک وہ اس کام میں مصروف رہے پھر نگرانوں نے کوڑے لہرائے اور وہ جھگے ماندے بندی خانے کے احاطے کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں ہوشمند نے سرگوشی کی۔

”کیوں بے تابان! بڑی نگاہ گاڑی تھی تو نے اس کی طرف؟“

”کس طرف؟“

”شہزادی مارشا کی طرف، پتھر ہی ہو کر رہ گیا تھا۔“

تابان کے ہونٹوں پر کھسیانی مسکراہٹ کھیل گئی، بولا۔ ”سب کہتے ہیں وہ بڑی حسین ہے، کسی نے اسے دیکھا بھی یہ نہیں۔“

ہوشمند بولا۔ ”دیکھنے والوں نے دیکھا ہوگا، ہم تم تو صرف تصور ہی کر سکتے ہیں بلکہ ہم جیسوں کو تو تصور بھی نہیں کرنا چاہئے۔ یہ آسمانوں کی چیزیں ہوتی ہیں پیارے، ہم خاک نشینوں کو ان کے تصور سے کیا نسبت۔“

تابان نے ایک ٹھنڈی اور عمیق آہ بھر کر کہا۔ ”معلوم نہیں اس رشبک قمر کی کریمیں کس کے دل میں اجالا کریں گی۔“

ہوشمند نے کہا۔ ”اس خوش نصیب کا انتخاب بھی ہو چکا ہے۔ سنا ہے تھیلی کا کوئی شہزادہ ہے۔ اس کی دولت کا کوئی حساب نہیں۔ درحقیقت اس نے شہزادی کو دولت ہی کے بل پر بیٹھا ہے۔ وہ جس گھوڑے پر بیٹھ کر شہزادی کو بیٹھنے آئے گا، اس گھوڑے کے صرف ساز پر چار ہزار مینٹ خرچ کئے جا چکے ہیں۔ اب تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ اس شخص کی ثروت مندی کا کیا عالم ہو گا۔“

تابان حیرت اور حد سے گلگ یہ باتیں سن رہا تھا۔ نہ جانے کیوں اس کے اندر، سینے میں کوئی نہایت قیمتی اور نہایت نازک شے چھناکے سے ٹوٹ گئی تھی۔ اس نے بچھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”کب ہو رہی ہے شہزادی کی شادی؟“

”چند روز میں، شاید اسی ہفتے کے آخر میں۔ حالات بہت مندوش ہیں بہت سے لوگ اپنی جوان نشینوں کے بوجھ سے فارغ ہو رہے ہیں۔ خاص طور پر امراء کے طبقے میں بہت ہراس پایا جاتا ہے۔ انہیں اپنی اپنی جانوں کے ساتھ مال و دولت کی فکر بھی ہے۔“

تابان مرے مرے قدموں سے پلٹا، بندی خانے میں داخل ہوا۔ نگرانوں نے

ذال چکی ہے اور حفاظت کے پیش نظر شر کے تمام دروازے بند کر دیئے گئے ہیں۔ اس خبر کی شگینی دوچند کرنے کے لیے ایک اور خبر بھی موجود تھی اور وہ یہ کہ فیثوس کا بیٹا سکندر زندہ ہے اور وہی فوج کی قیادت کر رہا ہے۔ سکندر کو اپنے مقابل پا کر اہل ایجنز کو سانپ سو گھڑ گیا تھا۔ کل تک جس کی موت کی خوشیاں منائی جا رہی تھیں آج اس کی زندگی کا نام کیا جا رہا تھا۔ ایک جھوٹی خبر نے اہل شو کو ان کی زندگیوں کے سب سے بڑے امتحان سے دوچار کر دیا تھا۔ خوف کی ایک تند لہر پورے شر کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی۔ اہل ایجنز کو اپنی غلطیاں یاد آ رہی تھیں۔ انہوں نے سکندر کے خلاف اشتعال انگیز تقریریں کی تھیں اور سنی تھیں۔ انہوں نے اس کے خلاف ہتھیار جمع کرنے اور فوج بنانے کا عزم کیا تھا۔ انہوں نے اس کے دو اہم افسروں کو قتل کیا تھا اور قلعے پر بل بول کر علی الاطلاق بغاوت کی تھی۔ اب اس بغاوت کا انجام کیا ہو گا۔ یہ سوچ کر ان کی روح فاقہ ہو رہی تھی۔ اہل سپارٹا یونانیوں کے حلیف تھے اور سپارٹا کے کچھ دستے ان کی مدد کے لیے موجود بھی تھے۔ اس کے علاوہ جمیت متحدہ یونان بھی ان کی ہم نوا تھی مگر سکندر اور اس کے جری لشکر کا خوف اپنی جگہ برقرار تھا۔ یہ لشکر قریباً تین سو میل کا فاصلہ بڑی رازداری سے طے کر کے اچانک نمودار ہوا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے "ایجنز" کی شررگ پر آ بیٹھا تھا۔

علی الصبح یہ معلوم ہوا کہ سکندر نے شر سے باہر ایک قبرستان میں پڑاؤ ڈالا ہے۔ وہ لڑنا نہیں چاہتا اور اس نے بات چیت کے لیے اپنے قاصد شر میں بھیجے ہیں۔ ان قاصدوں نے مطالبہ کیا ہے کہ مقدونیہ کی محصور فوج کو باہر آنے دیا جائے۔ اس کے علاوہ اہل شر اپنی عسکری اہمیت کی جگہیں خالی کر دیں۔ یہ بات چیت سارا دن جاری رہی۔ اہل ایجنز سکندر کی شرائط ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ انہیں یقین پیدا ہو چا تھا کہ وہ سکندر کو بات چیت میں الجھائے رکھیں گے اور اس دوران یونان کے مختلف علاقوں سے ان کو کمک پہنچ جائے گی۔ انہوں نے شرط پیش کی کہ سکندر صلح کرنا چاہتا ہے تو اپنے دو اہم سرداروں کو شر کی انتظامیہ کے حوالے کر دے۔

ایک طرف یہ بات چیت جاری تھی اور دوسری طرف اہل ایجنز شر کے دفاع کو آخری شکل دے رہے تھے۔ شر کے گرد لکڑی کی فصیل تھی۔ اس فصیل کے چند شکستہ حصوں کو کئی روز پہلے ہی مرمت کر لیا گیا تھا۔ اب اس فصیل پر دفاعی ہتھیاروں کے ڈھیر لگائے جا رہے تھے۔ سب امراء و رؤساء نے اپنی اپنی ساری قوت لڑائی کی تیاری میں جھونک دی تھی۔ تہاں کے آقائے بھی اپنے غلاموں کی زنجیریں کھلا دیں اور ان کی

گردنوں میں لوہے کے مخصوص کڑے پھنسا دیئے۔ ان کڑوں پر غلام کی شناخت اور اس کے آقا کا نام درج ہوتا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ اگر کوئی غلام جنگ کے ہنگام سے فائدہ اٹھا کر فرار ہونے کی کوشش کرے تو اسے بعد میں ڈھونڈا جاسکے۔ غارس زئوب نے اپنے تمام نو مند غلام، گمران اہل کی قیادت میں فصیل کی طرف بھیج دیئے۔ تہاں اور ہوشمند بھی غلاموں کے اس جتے میں شامل تھے۔ انہوں نے فصیل پر بڑی گھما گھمی اور مصروفیت دیکھی۔ کہیں بڑے بڑے کڑا ہوں میں تیل کھول رہا تھا۔ کہیں سنگ باری کے لیے پتھروں کے ڈھیر لگائے جا رہے تھے۔ کہیں تیروں سے بھرے ہوئے چٹکڑے اتر رہے تھے۔ ہتھیار بند یونانی سپاہی فصیل پر مورچے درست کرنے میں مصروف تھے۔ دوسرے غلاموں کی طرح تہاں اور ہوشمند کو بھی چٹکڑے کھینچنے اور وزن ڈھونڈنے پر لگا دیا گیا۔ سارا دن اور ساری رات یہ مصروفیت جاری رہی۔ اگلے روز صبح سویرے فصیل پر جھڑپیں شروع ہو گئیں۔ گاہے گاہے نعرے گونجنے لگے اور تیروں کی بارش ہونے لگی۔ اہل ایجنز اپنے دفاع کی طرف سے بہت مطمئن تھے لیکن دوپہر کے وقت یہ دل ہلا دینے والی خبر ملی کہ سکندر کے ایک سردار پرڈاکس نے زوردار تملہ کر کے مشرقی جانب سے فصیل توڑ دی ہے اور مقدونی فوج تدریلے کی طرح شر میں داخل ہو رہی ہے۔ یکایک شر میں کمر بٹھ گیا۔ یونانی سالاروں نے اپنے دستوں کو ٹوٹی ہوئی فصیل کی طرف دوڑایا۔ اسی دوران سکندر بھی اپنے برق پا سواروں کے ساتھ لپکتا ہوا پرڈاکس کی مدد کو پہنچ گیا۔ جس وقت تہاں موقعہ جنگ پر پہنچا وہاں قیامت برپا ہو چکی تھی۔ مقدونی فوج سپاڑی ندی کے منہ زور دھارے کی طرح اندر آ رہی تھی اور یونانی سپاہی قطار اندر قطار اسے روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ نیزے چمک رہے تھے۔ ڈھالیں بج رہی تھیں اور زنبوں کی آواز کا نغمہ نے شر ہلکا کر رکھا تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے لڑائی شر کے تنگ گلی کوچوں میں ہونے لگی۔ مقدونی فوج کا زور بے پناہ تھا۔ لشکریوں کے چہرے بوش غضب سے جھٹک رہے تھے۔ ان کے سالار قبرناک آوازوں میں چلا رہے تھے۔ یہ مناظر دیکھتے تو تہاں کی چھٹی حس نے پکار کر کہا۔ "آج اس شر کی اینٹ سے اینٹ بجنے والی ہے۔ یہاں کی گھیں خون سے رنگین ہونے والی ہیں۔" اس کی نگاہوں میں وہ حسین چہرہ گھوما جو اپنی مثال آپ تھا۔ وہ لب و رخسار اس کے تصور میں چمکے جن پر تہاں اپنی ایک ہزار جانیں بچھا کر سکتا تھا۔ اس نے ایک زخمی سپاہی کے ہاتھ سے نیزہ لیا اور سر پہ غارس زئوب کے مکان کی طرف بھاگا۔ شر کی پرجوش گلیوں میں دیوانہ وار بھاگتا ہوا وہ شاہی مملات کے علاقے میں پہنچا تو

آ رہی تھی۔ ان دونوں عورتوں سے ذرا ہٹ کر ایک شاندار مسمری کے پاس شہزادی مارشا کھڑی تھی۔ وہ ہمیشہ کی طرح سر تاپا ایک زرتار لباس میں لپٹی ہوئی تھی۔ سفید دھوئیں کے مرغولوں میں ساکت کھڑی وہ کوئی ظلمانی کردار لگتی تھی۔ پورے جسم میں سے صرف اس کی آنکھیں نظر آ رہی تھیں اور ان آنکھوں کی روشنی سے پورا کمرہ بھرا ہوا تھا۔

"کون ہو تم؟" شہزادی کی محافظ عورت نے جتنی لہجے میں پوچھا۔

"آقا غارس کا ایک ادنیٰ غلام۔" تہاں نے جواب دیا۔

"کس لیے آئے ہو؟"

"شہزادی معظمہ کی مدد کے لیے، دشمن کے سپاہی چاروں طرف دنگ رہے ہیں۔ وہ کسی بھی لمبے میاں پہنچ جائیں گے۔ میں شہزادی محترمہ کو یہاں سے یہ خالٹ نکال سکتا ہوں۔"

تہاں نے اتنا ہی کہا تھا کہ مقدونوی سپاہیوں کی آوازیں قریبی راہداری میں سنائی دینے لگیں۔ وہ محل کی آرائشی چیزوں کو توڑتے پھوڑتے اندرونی کمروں کی طرف آ رہے تھے۔ یہ آوازیں سن کر شہزادی کی محافظ عورتوں کے چہروں پر اضطراب گہرا ہو گیا۔ شہزادی نے بھی بے چینی سے ایک قدم آگے بڑھایا۔ شہزادی کی نظریں ایک سماعت کے لیے تہاں کی نظروں سے ٹکرائیں۔ تہاں کے جسم میں سینکڑوں جلیلیں کوند گئیں۔ اس نے آگے بڑھ کر اپنا سر جھکایا اور انسانی منہ پر لہجے میں بولا۔

"شہزادی محترمہ! یہاں رکنا خطرناک ہے۔"

دھوئیں کے سبب شہزادی کھانسنے لگی۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں ایک سیاہ فام محافظ کو مخاطب کیا۔ "ڈوالہ! تم ہمارے ساتھ آؤ۔"

ڈوالہ نامی محافظ نے جلدی سے آگے بڑھ کر ایک چھوٹا سا آبنوی دروازہ کھول دیا۔ یہ دروازہ شہزادی مارشا ڈوالہ اور تہاں کو ایک نیم تاریک راہداری میں لے آیا۔ ڈوالہ نے تہاں کو بتایا کہ یہ راہداری انہیں محل کے عقبی باغ میں لے جاسکتی ہے۔ تہاں جانتا تھا کہ اصطل اور باغ کی دیوار ملی ہوئی ہے۔ وہ شہزادی مارشا اور ڈوالہ کے آگے آگے چلتا انہیں باغ تک لے آیا۔ نیزہ اس کے داہنے ہاتھ میں تھا اور چال ڈھال میں کسی درندے کی سی پھرتی تھی۔ مقدونوی سپاہی ابھی باغ کی طرف متوجہ نہیں ہوئے تھے۔ کیلے اور سنگترے کے درختوں کے نیچے سے بھاگتے ہوئے وہ میتوں اصطل میں پہنچ گئے۔ اصطل میں چند خچروں اور تین چار گھوڑوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ تہاں نے تیزی

ٹھٹک کر رہ گیا۔ سکندر کی فوج کا ایک بازو شر کے اس حصے پر بھی حملہ آور ہو چکا تھا۔ گلیوں میں لاشیں ترپ رہے تھے اور در و دیوار شعلہ فشاں تھے۔ بیشتر گھروں کے مکین مزاحمت کر رہے تھے لیکن مقدونوی فوج کے پھرے ہوئے سپاہیوں کے آگے یہ مزاحمت کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔

وہ سیلاب کے تند ریلے کی طرح ہر چار دیواری میں گھستے چلے جا رہے تھے۔ تہاں نے دیکھا غارس زنوب کے محل سے بھی آگ کے شعلے بلند ہو رہے ہیں۔ محل کے تین اطراف کھدی ہوئی خندق میں کئی لاشیں پڑی تھیں اور ایک جنگی گاڑی کا ملبہ بکھرا ہوا تھا۔ تہاں ننگے پاؤں بھاگتا ہوا محل کی عقبی سمت میں پہنچا۔ وہ یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ عقبی دیوار کا ایک بہت بڑا حصہ منہدم ہو چکا ہے۔ وہ بھاگتا ہوا اس شکاف میں سے گزر کر محل میں داخل ہوا۔ جگہ جگہ ملازموں کی لاشیں پڑی تھیں۔ کچھ شدید زخمی حالت میں ترپ رہے تھے۔ محل کی بالائی منزل پر دشمن ابھی موجود تھے۔ تہاں نے دیکھا مقدونوی سپاہی محل کی قیمتی اشیاء کھڑکیوں میں سے نیچے پھینک رہے تھے جہاں ان کے ساتھی یہ اشیاء ایک ڈھیر کی صورت میں جمع کرتے جا رہے تھے۔ تہاں کو چند عورتیں حملہ آور سپاہیوں کے چنگل میں پھنسی نظر آئیں۔ ان حیا سوز مناظر نے تہاں کو شعلہ جوا بنا دیا لیکن یہ وقت جذباتی پن کا نہیں تھا۔ تہاں مقدونوی سپاہیوں کی نظر بچاتا ہوا محل سرا کے اندرونی حصے میں گھس گیا۔ محل سرا کی راہداری میں اسے سب سے پہلی لاش آقا غارس کی نظر آئی۔ ایک چھوٹی گھوڑا اس کے پیٹ سے آہار ہو چکی تھی۔ چند قدم دور میڑھیوں پر خاتون خانہ کی لاش پڑی تھی۔ تہاں ان لاشوں کے پاس سے گزرتا ہوا زنانہ حصے کی طرف دوڑ پڑا۔ جگہ جگہ چوٹی دروازوں اور ریشم کے دیبے پر دوں کو آگ لگی ہوئی تھی۔ یہ محل کا وہ حصہ تھا جہاں تہاں جیسا معمولی غلام قدم رکھنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ آج یہ در و دیوار لاوارث پڑے تھے اور اس کی آنکھوں کے سامنے برباد ہو رہے تھے۔ اچانک تہاں کو مدہم کھانسی کی آواز آئی۔ یہ آواز ایک بند دروازے کے پیچھے سے آ رہی تھی۔ کھانسنے والا کوئی نوجوان لڑکا یا عورت تھی۔ تہاں نے پہلے نیزے کے دستے سے دروازہ کھٹکھٹایا پھر ایک کھڑکی توڑ کر اندر گھس گیا۔ کمرے میں دھواں بھرا ہوا تھا۔ ایک عورت گھوڑا سونت کر اس کی طرف بڑھی۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے ایک ہی وار میں تہاں کا سرتن سے ہذا کر دے گی۔ تاہم تہاں کی صورت دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی۔ وہ بھاری جسم کی ایک جیش عورت تھی۔ ایک ایسی ہی عورت چند قدم پیچھے کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں بھی برہنہ شمشیر نظر

سے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی تو گھوڑوں پر ڈالنے والے چند بورے نظر آئے۔ اس نے ایک صاف پوریا شراوی مارشا کی طرف بڑھا دیا۔ شراوی نے اس کا دبا سمجھتے ہوئے یہ پوریا شال کی طرح سر پر اوڑھ کر بدن سے لپیٹ لیا۔ یوں شراوی کا قیمتی پمکیلا لباس بورے میں چھپ گیا۔ شراوی گھوڑے کی طرف بڑھی تو دستور کے مطابق تہاں ہاتھوں پاؤں کے بل چوہا کی طرح جھک گیا۔ شراوی اس کی سر پر پاؤں رکھتی ہوئی گھوڑے پر سوار ہو گئی۔ چند ہی لمحے بعد وہ تینوں تیزی سے گھوڑے دوڑاتے محل سے باہر نکل رہے تھے۔ راستے میں انہیں تباہی و بربادی کے لرزہ خیز مناظر نظر آئے۔ پورے شہر پر قیامت ٹوٹی پڑ رہی تھی۔ اہل شہر کی مزاحمت ختم ہو چکی تھی اور مقدونوی سپاہی بریت کی انتہا کو چھو رہے تھے۔ پورے شہر میں صرف تاریخی اہمیت کی جگہیں محفوظ تھیں اور ان کے گرد سکندر کے خاص سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔

لوٹ مار میں مصروف فاتح سپاہیوں کی خونخوار نولیوں سے بچتے بچاتے وہ تینوں فیصل کے قریب پہنچے تو چند گھڑسواروں نے انہیں دیکھ لیا۔ گھڑسوار لگاتار بولے ان کی طرف ہلکے۔ ایک نیزہ تیرا ہوا تہاں کے سر پر سے گزر گیا۔ دو تیرے یکے بعد دیگرے ڈوال کی گردن میں بیوست ہوئے اور وہ ایک جگہ کے ساتھ گھوڑے سے نیچے گری۔ تہاں نے ایک طرف جھک کر شراوی کے گھوڑے کی لگام پکڑی اور دونوں گھوڑوں کو ایک تنگ گلی سے گزار کر فیصل کی طرف بھگتا پلا گیا۔ فیصل کے شگاف میں سے گزر کر شراوی مارشا اور تہاں نے اپنے گھوڑے سرپٹ کر دیئے۔ فیصل سے باہر دور تک سرو کے جھنڈ تھے۔ وہ ان درختوں کو پار کر کے مضافاتی علاقے کی طرف لپکے۔ نصف کو س دور جانے کے بعد تہاں نے مڑ کر دیکھا۔ ایک مقدونوی دست ان کا تعاقب کر رہا تھا۔

اونچی نیچی گھاٹیوں، گھنے درختوں اور خطرناک ڈھلوانوں پر وہ ایک طویل کشمکش تھی۔ تہاں اور شراوی مارشا مقدونوی سواروں کے آگے آگے بھاگ رہے تھے۔ ایک دو موقعوں پر تو متعاقب دست اس قدر قریب آگیا کہ وہ اپنی گرفتاری کو یقینی سمجھ گئے لیکن پھر کسی نہ کسی طرح تہاں مقدونوی سواروں کو یکدم دینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس دور وھوب میں شراوی مارشا کے گھوڑے کی پمکیلا ٹانگ پر ایک تیر بھی لگا تھا۔ گھوڑے کے زخم سے مسلسل خون بہہ رہا تھا اور اس کی رفتار دست پڑتی جا رہی تھی۔ تہاں نے دیکھا درختوں کی سبز شاخوں کے اندر سے دور کوہ پٹنی لیکس کی چوٹی جھانک رہی تھی۔ راستے کے دونوں جانب چھوٹے بڑے نیلیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ تہاں کو اندازہ ہوا کہ

یہاں چھپنے کے لیے کوئی جگہ میسر آسکے گی۔ اس اندازے کی تصدیق ہونے میں کچھ زیادہ دیر نہیں لگی۔ جو خونی وہ درختوں کے ایک گھنے جھنڈ میں داخل ہوئے، تہاں کو محسوس ہوا کہ گھوڑے کے پاؤں کے نیچے زمین کھوکھلی ہے۔ اس کا مطلب تھا وہ کسی غار یا کھودہ نمہ جگہ کی چھت سے گزر رہے ہیں۔ تہاں نے اس کھینچ کر گھوڑے کی رفتار سست کی اور اسے ڈھلوان پر موڑا۔ پندرہ میں قدم نیچے انہیں ایک غار کا دہانہ نظر آیا۔ اس دہانے کے چاروں طرف اخروٹ کے تنور درخت تھے۔ ان درختوں کے سائے سے سر پیر میں بھی شام کا سہل نظر آتا تھا۔ کہیں قریب ہی چشمے کا پانی کرتا تھا۔ خوش قسمتی سے غار کا دہانہ اتنا کشادہ تھا کہ وہ دونوں گھوڑوں سمیت اندر داخل ہو سکتے تھے۔ اور انہوں نے ایسا ہی کیا۔ غار میں پہنچ کر دونوں گھوڑے رک گئے۔ تہاں جلدی سے نیچے اترے۔ حسب سابق چوہا کی طرح جھک کر شراوی اس کی پشت پر پاؤں رکھتی ہوئی نیچے اتر آئی۔ اس غار میں سبک مرمر کثرت سے نظر آ رہا تھا۔ نہ جانے کہاں سے روشنی پھوٹی تھی کہ دیواریں روشن روشن دکھائی دیتی تھیں۔ تہاں دونوں گھوڑوں کو کھینچتا ہوا طویل غار کے آخری سرے پر لے گیا اور انہیں ایک پتھر سے پائندہ دیا پھر اس نے ایک ہموار پتھر کو پھونکیں مار مار کر صاف کیا اور ادب سے بولا۔

”تشریف رکھئے شراوی۔“ اس کی آواز پورے غار میں گونجی اور دیر تک بازگشت سنائی دی۔

شراوی باوقار قدموں سے چلتی ہوئی پتھر پر بیٹھ گئی۔ وہ دونوں دم سلاہ کر باہر سے آنے والی آوازوں پر غور کرنے لگے۔ کئی گھوڑے دوڑتے ہوئے غار کی چھت پر سے گزر گئے۔ کچھ دیر بعد گھڑسواروں کی آوازیں فاصلے سے آنے لگیں وہ جنگل میں انہیں تلاش کر رہے تھے۔ تہاں شراوی سے چند قدم کے فاصلے پر دو زانو بیٹھ گیا۔ اس نے دذبیہ نگاہوں سے شراوی کی طرف دیکھا۔ مرمریں غار میں پتھر پر ساکت بیٹھی ہوئی وہ کوئی قدیم یونانی دیوی معلوم ہوتی تھی۔ اس نے بورے کی شال کندھوں سے جھٹک دی تھی اور اب اس کا شالی لباس غار کی قدرتی روشنی میں دمک رہا تھا۔ کل تک تہاں نے تصور بھی نہ کیا تھا کہ سات حریری پردوں میں مچھی ہوئی یونانی شراوی کے ساتھ اخروٹ کے تاریک جنگل میں ایک مرمریں غار میں بیٹھا ہوگا اور غار کے دہانے پر کسی شفاف چشمے کا پانی گنگنا ہوا سنگریزوں پر رقص کرے گا۔ تہاں کا دل چاہا وقت ختم جائے۔ یہ غار اسی طرح خوشبوؤں سے لہریز رہے۔ وہ اسی طرح بیٹھے رہیں اور صدیاں گزر جائیں دفعتاً

شہزادی کی ادنیٰ آواز کسی ریلے نغمے کی طرح غار میں گونجی اور یوں لگا جیسے غار کا ہر پتھر جلتی رنگ کی طرح بج اٹھا ہے۔ اس کی آواز میں بے حد نرمی اور لوج تھا۔ وہ بولی۔

”غلام..... کیا اس غار میں ہمارے سوا کوئی اور بھی موجود ہے؟“

تباہان نے آواز کے سحر سے چونک کر ادھر ادھر دیکھا اور اس کے احساس نے تصدیق کی کہ شہزادی اس سے زیادہ تیز نگاہ ہے۔ یقیناً غار میں کوئی تیسرا فرد بھی موجود تھا۔ ایک بڑے پتھر کے عقب سے تیز سانسوں کی صدا آرہی تھی۔ جیسے کوئی سانسوں ہی سانسوں میں کرا رہا ہو۔ تباہان لپک کر پتھر کی اوٹ میں پہنچا۔ اس کا تیز جارحانہ انداز میں افقی رخ پر تھا۔ پتھر کی اوٹ میں ایک سفید ریش بوڑھا زخمی حالت میں پڑا نظر آیا۔ اس کے جسم پر فوجی لباس تھا۔ تباہان نے جبکہ کر دیکھا ایک تیز زخمی کی پسلیوں میں ٹوٹا ہوا تھا۔ زخم عظیم تھا۔ خون نے سارا لباس ترہتر کر رکھا تھا۔ تباہان نے تیر نکالنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو بوڑھا کراہ اٹھا۔

”نہیں بیٹا۔ اسے رہنے دو۔ یہ تکلیف جمیل کر بھی انجام تو موت ہی ہے۔“

شہزادی مارشا بھی پتھر سے اٹھ کر اب بوڑھے کے سر ہائے کھڑی ہو گئی تھی۔ تباہان نے دیکھا اس کی حسن گیر آنکھوں میں بوڑھے کے لیے ہمدردی کا سمندر موجزن تھا۔ اپنے شاہی لباس کی پرواہ کئے بغیر وہ زمین پر بیٹھ گئی اور جبکہ کر بوڑھے کا زخم دیکھنے لگی۔ بوڑھا غور سے شہزادی کی طرف دیکھ رہا تھا درد بھری آواز میں بولا۔

”تم..... تم شاہی خاندان سے ہو؟“

شہزادی نے کہا۔ ”ہاں۔ ہم شہزادی مارشا ہیں۔“

بوڑھے کی آنکھوں میں پہلے حیرت پھر شکریم اور آخر میں تشویش کے آثار نظر آئے۔ اس نے شہزادی کے احترام میں زمین سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن شہزادی نے جلدی سے اس کے کندھے تھام لیے۔ بوڑھے نے کراہتی ہوئی آواز میں رک رک کر کہا۔ ”شہزادی حضور۔ میں آپ کے خاندان کے ادنیٰ غلاموں میں سے ہوں۔ قریب ہی ایک فوجی چوکی ہے۔ میں وہاں کا گھرانہ اعلیٰ ہوں۔ مقدونوی فوج اسی راستے سے گزر کر شہر پر حملہ آور ہوئی ہے۔ میری چوکی کے زیادہ تر جوان وطن ملاف کی آن پر قریان ہوئے ہیں۔ میں بھی شدید زخمی حالت میں کھشتا ہوا یہاں تک پہنچا ہوں۔ شہزادی حضور! جتنی جلدی ہو سکتے آپ یہاں سے دور چلی جائیے۔ سکندر اور اس کی فوج کے ارادے سے بہت سنگین ہیں۔ وہ ایتھنز کو پیونہ خاک کرنے کے لیے آئے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس شہر کو پورے یونان

کے لیے مثال بنادیں اور آئندہ مقدونیہ کی کوئی نوآبادی سر اٹھانے کا سوچ بھی نہ سکے۔“

بوڑھے کی آواز مرمریں غار میں گونج رہی تھی اور اس گونج نے بوڑھے کے الفاظ میں عجیب سا زور پیدا کر دیا تھا۔

شہزادی مارشانے پوچھا۔ ”اے بزرگ! آپ یہ سب کچھ کیسے جانتے ہیں؟“

بوڑھے نے کہا۔ ”شہزادی! کچھ عرصہ پہلے میں اہل ایتھنز کی جانب سے جاسوسی کے فرائض انجام دینے کے لیے مقدونیہ گیا تھا۔ مقدونیہ میں چڑچڑے ہیں کہ فیلقوس کا بیٹا سکندر مغربیہ ایشیا فتح کرنے کے لیے مشرقی زمینوں کا رخ کرنے والا ہے۔ اس طویل مہم پر روانہ ہونے سے پہلے وہ مقبوضہ علاقوں میں اپنی دھاک بٹھا دیتا چاہتا ہے تاکہ اس کے بعد کسی کو بغاوت کی جرأت نہ ہو۔ دیوتا نہ کریں میرے اندازے صحیح ہوں..... لیکن میرا دل کہتا ہے کہ آج ایتھنز راگھ کا ڈھیر بن جائے گا اور چند دن میں شہر کے تمام مرد و زن غلام بنا کر فروخت کر دیے جائیں گے۔“

بوڑھے کی آواز درد و کرب میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اپنے شہر کی بربادی کے تصور نے اس کی آخری سانسیں محال کر دی تھیں۔ وہ حسرت زدہ آواز میں بولا۔ ”کاش ہمارے پیشواؤں نے اس وقت فیلقوس کے بیٹے کو لالاکارنے کی حماقت نہ کی ہوئی۔“

ایکایک قریبی جنگل میں گھوڑوں کی بے شمار ٹائیں گونجتی لگیں۔ بوڑھے نے ٹوٹی سانسوں کے ساتھ کہا۔ ”شہزادی حضور! یہاں سے چلی جائیے۔ اپنی جان بچا لیجئے۔ وہ آپ ہی کو ڈھونڈ رہے ہوں گے۔“

تباہان نے شہزادی کی طرف دیکھا۔ ”آئیے شہزادی معطلہ!“

شہزادی نے تباہان کی بات کی طرف توجہ ہی نہیں دی۔ وہ بدستور بوڑھے پر جنگی ہوئی، اس کے زخم سے خون روکنے کی کوشش کرتی رہی۔ بوڑھے نے پھر کہا۔

”چلی جائیے شہزادی صاحبہ۔ ہم غلاموں پر رحم کیجئے۔“

”نہیں محترم بزرگ! ہم آپ کو اس حالت میں چھوڑ کر نہیں پاسکتے۔“ شہزادی کے لہجے میں سادگی اور سچائی تھی۔ مگر یہ کشمکش زیادہ دیر جاری نہیں رہ سکی۔ معرخص کی سانسیں اکھڑی ہوئی تھیں۔ تھوڑی دیر میں اس نے چند ہتھکیاں لیں اور جان ہار دی۔ شہزادی گم سم بیٹھی رہ گئی۔ تباہان نے بے حد ملتی لہجے میں کہا۔

”شہزادی حضور! غلام آپ کے حکم کا منتظر ہے۔“

غار سے باہر اب اندھیرا چھا چکا تھا۔ گھوڑوں اور سپاہیوں کی قوازیں دور کہیں

مشرقی جانب سنائی دے رہی تھیں۔ غار چھوڑنے کے لیے یہ موقع مناسب تھا۔ یہ شہر کا مضائقہ علاقہ تھا اور یہاں وہ دونوں زیادہ دیر تک محفوظ نہیں رہ سکتے تھے۔ شہزادی کے حکم پر تہاں نے پورے کے دو ٹکڑے کئے اور ایک ٹکڑا جاں بحق ہونے والے معمر شخص پر ڈال دیا۔ دوسرا ٹکڑا شہزادی نے خود اڑھ لیا۔ تب وہ دونوں گھوڑوں کی طرف بڑھے۔ شہزادی والا گھوڑا زخم سے مدھال ہو کر لیٹ چکا تھا اب ان کے پاس صرف ایک گھوڑا تھا۔ حسب سابق تہاں نے نیچے جھک کر شہزادی کو سوار کرایا۔ پھر گھوڑے کی لگام تھامی اور غار سے نکل آیا۔ شام گہری ہو چکی تھی۔ آخرت کا جنگل دور تک سنسان نظر آ رہا تھا۔ عمر یہ دیرانی عارضی بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ تہاں لگام تھام کر گھوڑے کے آگے آگے بھاگنے لگا۔ اس کے پائیں ہاتھ میں نیزہ تھا۔ پاؤں ننگے تھے اور جسم پر حسب معمول ایک لنگوٹ۔ راستے کے کنارے اور کانٹے تہاں کے پاؤں میں چبھ رہے تھے لیکن وہ بھانسا جا رہا تھا۔ ایک عجیب سرشاری اور خود فراموشی کے ساتھ۔ اس کے لیے یہ احساس کچھ کم فرحت بخش نہیں تھا کہ وہ اس وقت شہزادی کی محافظت کر رہا ہے۔ وہ شہزادی جو حسن و رعنائی کی اس سرزمین میں اپنی مثال آپ تھی۔ شہزادی کے قرب کا تصور اسے ہر خطرے سے بے نیاز کئے ہوئے تھا۔ تاریک جنگل میں بھاگتے بھاگتے تہاں نے اپنے دل کو ٹولا۔ شہزادی اس کے لیے محترم تھی لیکن کیا وہ صرف اس لیے اپنی جان خطرے میں ڈال رہا تھا کہ وہ شہزادی کا احترام کرتا تھا..... ہرگز نہیں۔ پھر وہ کون سا جذبہ تھا جو اسے اس بڑے خطرہ جنگل میں کشش کشاں لیے جا رہا تھا۔ اس کا سیدھا سچا اور بے لاگ جواب یہ تھا کہ شہزادی ایک عورت تھی۔ وہ عورت جس کے ہیکر میں قرونوں سے نسل در نسل سفر کرنے والا حسن بیکھا ہو گیا تھا وہ اس حسن کو دیکھنا چاہتا تھا۔ اس سے اپنے دل کو سیراب اور روح سوچ آزاد تھی۔ جس طرح وہ خود آزاد تھا۔ غلام ہو کر بھی آزاد تھا۔ اس کے ذہن پر شوخ رنگ کے لہریں دار خیالات کی یلغار ہونے لگی۔ ان خیالوں میں ہیکٹریاں تھیں، تتلیاں تھیں، زرد رنگ کے انگوروں کے خوشے تھے۔ شہد کے چھتے تھے اور وہ خوش الحان بندے تھے جو سرا میں شمال کی چوٹیوں سے پرواز کر کے جنوبی یونان کے چمن زاروں میں پھیلتے تھے۔ ان رنگین خیالوں کا عکس تہاں کے چہرے پر نظر آنے لگا۔ تہاں کے نقش ہدے تھے لیکن ان میں ایک طرح کی جاذبیت پائی جاتی تھی۔ جب وہ کچھ سوچتا تھا تو اس

کا چہرہ اپنے خیالات کا آئینہ بن جاتا تھا..... بھاگتے بھاگتے وہ سوچنے لگا کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ نرم دل شہزادی اس کے پیادہ بھاگنے سے آزرده ہو جائے یا تیز رفتاری سے سفر کرنے کا خیال اسے یہ کہنے پر مجبور کر دے۔ "غلام! آؤ ہمارے ساتھ گھوڑے پر سوار ہو جاؤ۔" اگر اس نے ایسا کہا تو کیا..... کیا وہ اس حکم پر عمل کر سکے گا۔ کیا خوشی اور حیرت سے اس کے دل کی دھڑکن تو بند نہیں ہو جائے گی۔ وہ اپنی خیالوں میں مگن بھاگا جا رہا تھا جب اچانک اس کی تیز ساعت میں ایک دم آواز گونئی۔ اس کا نیزہ والا ہاتھ خود بخود تن گیلہ کچھ فاصلے پر درختوں میں مشعلوں کی روشنی چلی۔ تہاں روشنی کی طرف متوجہ تھا جب دائیں پہلو پر گھوڑوں کی ٹانگیں گونجیں۔ وہ کم از کم چار سوار تھے۔ انہوں نے قریب پہنچتے ہی اپنے طویل نیزے تہاں کی گردن سے لگا دیے۔ وہ مقدونی فوج کے سوار تھے۔ تہاں کے جسم میں بجلی دوڑنے لگی۔ اس سے پیشتر کہ مقدونی سواروں میں سے کوئی اپنی زبان کھولا۔ تہاں نیچے جھکا اور اس کا نیزہ ایک سوار کی ڈھال سے پھسلتا ہوا اس کے پیٹ میں ٹکس گیا۔ سوار کرہنک جھج کے ساتھ زمین پر گرا اور اس کے ساتھ ہی تین سواروں اور تہاں میں خوفناک لڑائی چھڑ گئی۔ تہاں جانتا تھا کہ پلہ برابر کرنے کے لیے اسے فوری طور پر ایک اور سوار کو موت کے گھاٹ اتارنا ہو گا اور یہ کام اس نے پہلی فرصت میں کیا۔ ایک دراز قد سوار کی شمشیر کا وار بجا کر اس نے اپنا نیزہ اس کی پسیوں میں ترازو کر دیا۔ نیزے کا دوسرا سرا تہاں کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے سوار کو پوری قوت سے نیزے پر اٹھا کر دوسرے سوار پر دے مارا۔ طاقت اور پھرتی کا یہ مظاہرہ مرموعہ کن تھا۔ باقی دونوں سوار جن میں سے ایک پیدل ہو چکا تھا، تنہا ہی نظر آئے۔ یہی تنہا تہاں نے قیامت توڑ گیا۔ تہاں نے اپنا خون آلود نیزہ بے پناہ قوت سے گھڑ سوار پر پھینک دیا۔ گھڑ سوار نے نیزہ ڈھال پر لینے کی کوشش کی لیکن اس کے سینے پر آیا اور آریار ہو گیا۔ تہاں نے لپک کر ایک مردہ سوار کی گھوڑا اٹھالی اور سامنے والے سوار سے نبرد آزما ہو گیا۔ عزم قاتل سکندر کی فوج کا کوئی افسر نظر آتا تھا۔ اس نے تہاں کا ڈاٹ کر مقابلہ کیا لیکن آخر تہاں کی ایک عیارانہ چال سے مات کھائی اور شدید زخمی ہو کر گر گیا۔ اسی دوران تہاں کو عقب سے مزید آوازیں آئیں اس نے مڑ کر دیکھا چند اور گھڑ سوار پہنچ گئے تھے ان کے ہاتھوں میں مشعلیں تھیں۔ وہ یہ دیکھ کر دم گھٹ گیا کہ شہزادی نے اپنے لمبا سے سوار سے گھوڑا نکال لی ہے اور گھڑ سواروں کی بھرپور مزاحمت کر رہی ہے۔ وہ دیوانہ دار شہزادی کی اعانت کے لیے بڑھا لیکن یہاں اس سے ایک بھول ہو گئی۔ وہ اپنے

لایا گیا۔ یہاں ایک بند گھوڑا گاڑی کھڑی تھی۔ اس کی کھڑکیوں میں آہنی سلاخیں تھیں۔ گاڑی میں چند قیدی اور بھی تھے۔ تباہان کے بیٹھے ہی گاڑی روانہ ہو گئی۔ ایک یا دو کوس چلنے کے بعد گاڑی ایجنٹر کے شاہی محل کے سامنے رکی قیدیوں کو باہر نکالا گیا۔ تباہان نے دیکھا شاہی محل کے صدر دروازے سے باہر لوگوں کا ہجوم ہے۔ ایک طرف بلندی پر تین پھانسیاں گڑی تھیں۔ پھانسیوں کے پھندے ہوا میں جمول رہے تھے اور ہر دے کے قریب سیاہ لباس والا ایک جلاہ بے حرکت کھڑا تھا۔ جیسے گوشت پوست کا انسان نہ ہو سنگی جسم ہو۔ تباہان کا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ اس کے ساتھی قیدیوں کے چرے بھی زرد ہو گئے۔ وہ سب موت کو اپنی آنکھوں کے دوبرو دیکھنے لگے۔ مقدونی سپاہیوں نے انہیں گلے کی زنجیروں سے کھینچ کھینچ کر گھوڑا گاڑی سے نیچے اتارا۔ تماشاویوں کے دو روپہ ہجوم سے گزر کر وہ ایک چوڑے کے سامنے پہنچے۔ اس قالین پوش چوڑے پر چند طلائی اور نقرئی کرسیاں رکھی تھیں۔ ان کرسیوں پر مقدونی سلاہ بیٹھے تھے۔ درمیان کی بڑی کرسی پر گھوٹریالے ہاؤں والا ایک وجہہ باوقار نوجوان براہمن تھا۔ تباہان دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ یہی سکندر ہے۔ سکندر کے شانے چوڑے پریشانی روشن اور آنکھیں تیز تھیں۔ وہ اپنے سر کو تھوڑا سا ایک طرف جھکا کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی عمر بیس سال کے قریب تھی۔ دیکھنے والے کو اس کی شخصیت مرعوب کرتی تھی۔ تباہان دوسرے غلاموں کے ساتھ اپنے ڈھیلے ڈھالے انداز میں چلتا ہوا سکندر کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ مسلح سپاہی ان کے عقب میں تھے۔ سکندر اپنے ایک مصاحب سے بات کر رہا تھا۔ چوڑے کی دائیں جانب ایک خوش شکل خاتون اپنے دو بچوں کے ساتھ کھڑی تھی۔ خاتون کے پیچھے دو نیزہ بردار سپاہی تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ خاتون کوئی قیدی ہے۔ مصاحب سے گفتگو ختم کر کے سکندر عورت کی طرف متوجہ ہوا اور اپنی بارعب آواز میں اس سے باتیں کرنے لگا۔ ان باتوں سے معلوم ہوا کہ سکندر کے سامنے ایک مقدمہ پیش ہے۔ خوبرو عورت شہر کے ایک خوشحال گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ جس روز شہر فتح ہوا مقدونی فوج کا ایک کماندار "عورت" کے مکان میں ٹھس آیا۔ اس نے عورت کو بچوں سے جدا کر کے اس کی بے رحمی کی پھر اس تلاش میں لگ گیا کہ گھر کا مال و دولت کہاں چھپایا گیا ہے۔ عورت نے اسے بتایا کہ ان کے ہیرے جواہرات باغ کے کنویں میں ہیں۔ وہ عورت کو ساتھ لے کر کنویں پر پہنچا تو عورت نے اسے کنویں میں دھکیل دیا اور اس سے پہلے کہ کوئی اس کی مدد کو پہنچتا اسے پتھر مار مار کر ہلاک کر دیا۔ عورت نے اقبل جرم کر لیا تھا اور اب سزا سننے کے لیے تیار

کھڑی تھی۔ قتل کی مجرمہ ہونے کے باوجود اس کے چہرے پر اطمینان تھا۔ مقدے کی پوری روداد سننے کے بعد سکندر نے عورت کو بری کر دیا۔ وہ آنکھوں میں آنسو لیے اپنے بچوں کے سرچو متی ہوئی چوڑے کے سامنے سے ہٹ گئی۔

اس معاملے سے فارغ ہو کر سکندر نے تباہان اور دوسرے قیدیوں کی طرف دیکھا۔ اس کی تیز چٹکی نگاہ بر قیدی کو اپنے جسم میں اترتی محسوس ہوئی۔ ایک کاتب نے آگے بڑھ کر ایک قیدی کا نام پکارا۔ سپاہیوں نے اسے کھینچ کر چوڑے کے عین سامنے لا کھڑا کیا۔ کاتب نے اس کے ان جرائم کی تفصیل پڑھنا شروع کی جو اس بد نصیب قیدی پر عائد کئے گئے تھے۔ تفصیل ختم ہوئی تو دوسرے قیدی کا نام پکارا گیا۔ یہ کوئی سنگتراش تھا جس نے سکندر کے مخالف یونانی رہنما کے بیٹے بنائے تھے۔ اس کے بعد ایک تاجر کا نام پکارا گیا۔ اس نے سکندر کے خلاف ہتھیار جمع کرنے کی مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اور ہتھیاروں کے لیے خطیر رقم فراہم کی تھی۔ اس کے بعد سکندر کے خلاف شعلہ بیانی کرنے والے ایک مقرر پر فرد جرم عائد کی گئی۔ چند طریموں کے مقدمے پیش ہو چکے تو سکندر نے ہاتھ اٹھا کر کاتب کو روکا اور دریافت کیا۔

"وہ شخص کون ہے جس نے ٹرانس 'یرغاور تالق کو ہلاک کیا ہے؟"

تباہان سمجھ گیا کہ یہ تینوں افراد سکندر کی فوج کے اعلیٰ افسروں کے اور انہیں کسی شخص نے زہر دیا ہے۔ دے کر یا دعوے سے ہلاک کر دیا ہو گا۔ اب اس شخص کو کوئی عبرت ناک سزا سننے کے لیے طلب کیا جا رہا تھا۔ کاتب نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی فرست پر نظر دوڑائی۔ پھر اسے مطلوب نام لگ گیا۔ وہ پکارنے والے انداز میں بولا۔

"معلم تباہان کو حاضر کیا جائے۔"

اپنا نام دھماکے کی طرح تباہان کی سماعت میں گونجا۔ وہ ہکا بکا کھڑا رہ گیا۔ ایک سپاہی نے اس کی زنجیر کو زور سے جھکا دیا اور کھینچ کر سکندر کے سامنے کھڑا کر دیا۔ تباہان حیران نظروں سے ارد گرد دیکھ رہا تھا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس کا نام کیوں پکارا گیا ہے۔ سکندر کی پاٹ دار آواز نے تباہان کو چونکا دیا۔

"تو وہ تم ہو، جس نے ہمیں ہمارے تین ہماروں سے محروم کیا ہے۔"

تباہان کی بجائے کاتب نے جواب دیا۔ "سلاہ اعظم! یہ ایرانی ہے۔ اس کا نام تباہان ہے۔ اس کے گلے سے عارس زئوب کے نام کا کڑا اترتا تھا۔ یہ شخص عارس زئوب کی دختر شہزادی مارشا کے ساتھ فرار ہو رہا تھا۔ شہر سے چند کوس دور ہمارے ایک دستے نے اسے

دیکھ لیا۔ اسے روکنے کی کوشش کی گئی تو اس نے دھوکے سے حملہ کر دیا۔ بڑی عیاری کے ساتھ اس نے سردار تالق کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ بعد میں سردار ٹرائس بھی ہلاک ہوئے۔ سردار یرغا کو شدید زخم آئے۔ انہیں شفاخانے میں پہنچایا گیا لیکن وہ جانبر نہ ہو سکے۔

سکندر نے پوچھا۔ ”کیا اس کے ساتھ کوئی اور بھی اس جرم میں شریک ہے۔“
کاتب نے کہا۔ ”سلاوا عظم! یونانی شہزادی نے بھی لڑائی میں اس کا ساتھ دیا تھا۔“
سکندر نے گرج کر کہا۔ ”ہم پوچھتے ہیں کوئی تیسرا بھی ان کے ساتھ شامل تھا؟“
کاتب لرز کر بولا۔ ”نہیں سلاوا عظم۔“

سکندر کی تیز نگاہیں تہاں پر مرکوز ہو گئیں۔ اس کے چہرے پر دکھ کی پرچھائیاں نظر آتی تھیں۔

حسب دستور تہاں کو بھی کھینچ کر ایک طرف کھڑا کر دیا گیا۔ کاتب نے ایک اور قیدی کا نام پکارا۔ یہ سلسلہ تھوڑی دیر جاری رہا۔ سب قیدیوں کے مقدمے پیش ہو چکے تو انہیں مشترکہ طور پر سزائے موت سنائی گئی۔ بیشتر قیدی رونے اور گڑگڑانے لگے۔ ان میں سے دو نازک مزاج بے ہوش ہو کر گر گئے۔ بے رحم سپاہیوں نے تین قیدیوں کو کھینچ کر علیحدہ کیا اور انہیں نیزوں سے دھکیلتے ہوئے پھانسی گھاٹ کی طرف لے چلے۔ یہ منظر بڑا دلدور تھا۔ تہاں کو احساس ہوا کہ دنیا کا سب سے ترسناک سفر وہ ہوتا ہے جو پھانسی گھاٹ کی طرف کیا جاتا ہے اور اٹھنے والے قدموں میں سے سب سے بھاری قدم تختہ دار کی طرف لے جانے والے قدم ہوتے ہیں۔ نیزوں کے چروں سے قیدیوں کے جسم لولہاں ہو گئے اور طوقوں نے ان کی گردنیں پھیل دیں۔ تختہ دار پر لے جا کر ان کے چروں کو غلاف سے ڈھانپ دیا گیا۔

چند ہی لمحے بعد ان کی لاشیں اندھے کنوؤں میں جھول رہی تھیں۔ یہی عمل چار بار دہرایا گیا اور بارہ بد نصیب موت کے گھاٹ اتر گئے۔ آخر تہاں کی باری بھی آگئی۔ اس کا چہرہ پتھر کی طرح سخت اور بے حس تھا۔ جب ایک مقدونوی سپاہی نے اسے نیزے کی آئی سے پھانسی گھاٹ کی طرف دھکیلا تو سکندر کی آواز گونجی۔

”نہیں۔ یہ سزا نہیں پائے گا۔“

جہاں تک یہ آواز پہنچی وہاں تک حیرت کا شدید حملہ ہوا۔ سکندر کے پاس بیٹھے ہوئے ایک مصائب نے اس خیال سے کہ شاید یہ سلاوا کو کوئی غلط فہمی ہو رہی ہے، اٹھ

کر نہایت ادب سے کہا۔

”اے زیوس دیوتا کے فرزند! یہ وہ قیدی ہے جس نے ہمیں تین قیمتی بازوؤں سے محروم کیا ہے۔“

سکندر نے برہنہ کہا۔ ”قیمتی بازو وہ نہیں تھے جو کٹ گئے۔ قیمتی بازو یہ ہے جس نے انہیں کاٹا ہے۔ اگر اس نے ہمارے ایک سردار کو ہلاک کیا ہوتا تو ہم یقیناً اسے موت کے گھاٹ اتارتے لیکن اس نے تین سرداروں کو ہلاک کیا ہے۔ لہذا یہ سزا کی بجائے انعام کا حق دار ہے۔“

کسی کو بولنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ تہاں اپنی جگہ گنگ کھڑا تھا۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ یہ بات اس کے لیے نہایت حیران کن تھی کہ اس شب اس نے جن چار افراد کو موت کے گھاٹ اتارا تھا ان میں سے تین مقدونوی فوج کے چوٹی کے سردار تھے۔ وہ خود اپنے کارنامے پر حیرت زدہ ہو رہا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ کیا وہ واقعی ایسی صلاحیتوں کا مالک ہے۔ ایسا کیسی اسے خود پر فخر محسوس ہونے لگا۔ اس نے نگاہ اٹھا کر سکندر کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ تہاں کے فولادی جسم میں پھریری سی دوڑ گئی۔ سکندر نے کہا۔ ”اس شخص کو چھانوئی کے قید خانے میں رکھا جائے۔ ہم اس کے متعلق بعد میں فیصلہ کریں گے۔“

☆-----☆-----☆

چھانوئی کے بندی خانے میں تہاں کے شب و روز بڑے تکلیف دہ تھے۔ یہ تکلیف جسمانی اور ذہنی دونوں طرح کی تھی۔ جسمانی تکلیف یہ تھی کہ اس کے سینے کا زخم ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ رات بچھلے پھر جب سرد ہوا چلتی تو داکیں پسلو سے ٹپٹیں اٹھنے لگتیں۔ وہ خود کو اونی کپڑے میں لپیٹ کر گرم صم پڑا رہتا۔ بعض اوقات یہ تکلیف اتنی بڑھتی کہ تہاں کی پیشانی عرق آلود ہو جاتی۔ تاہم وہ اس تکلیف کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا۔ ایسے درد وہ بہت سہہ چکا تھا۔ اصل درد تو وہ ذہنی کرب تھا جس سے وہ گزر رہا تھا۔ یہ دو آنکھوں کا کرب تھا۔ وہ آنکھیں جنہوں نے دشمن کے زخموں میں گھیر کر مدد طلب نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ وہ منظر تہاں کے تصور سے چپک کر رہ گیا تھا۔ ہر گھڑی شہزادی کی آنکھیں اس کے تعاقب میں رہتی تھیں۔ وہ سوچتا اس معصوم صورت فرشتہ حیرت لڑکی کے ساتھ مقدونوی سپاہیوں نے نہ جانے کیا سلوک کیا ہوگا۔ اگر اس کے ساتھ کوئی ظلم ہوا تو یہ کتنا بڑا ظلم ہوگا۔ تہاں کو محسوس ہوتا جیسے شہزادی کی حفاظت میں

رہا تھا جب ایک تیر سنا تا ہوا اس کے دونوں پاؤں کے درمیان زمین میں بیست ہو گیا۔ تباہ نے مڑ کر دیکھا۔ نیز برداروں کے عقب میں تین گھڑسوار کھڑے تھے۔ درمیان والے شاندار گھوڑے پر سکندر خود سوار تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ رکھے تھے۔ سر بڑے انداز سے ایک طرف جھکا ہوا تھا۔ لگتا تھا وہ بڑے غور سے یہ مقابلہ دیکھتا رہا ہے۔ اس کے پہلو والے سالار کے ہاتھ میں کمان تھی اور اندازہ ہوتا تھا کہ تیر اسی سالار نے چھوڑا ہے۔ سکندر کے اشارے پر نیزہ بردار آگے بڑھے اور انہوں نے لپک کر تباہ کو زخمی میں لے لیا۔ اب تباہ کی سمجھ میں یہ بات آ رہی تھی کہ لڑائی کے دوران نیزہ بردار رک کیوں گئے تھے۔ یقیناً انہیں سکندر کی طرف سے حکم ملا تھا۔ سکندر اپنے چمکیلے گھوڑے کو دھکی چلا تا تباہ کے قریب پہنچا۔ کچھ دیر گری نظروں سے اسے دیکھتا رہا پھر عجیب سبب میں ہرلا۔

”فارسی بول سکتے ہو؟“

یہ سوال غیر متوقع تھا۔ تباہ نے گڑبڑا کر کہا۔ ”میں..... میں سمجھا نہیں۔“

”فارسی بول سکتے ہو؟“ سکندر نے ہر لفظ پر زور دے کر کہا۔

”جی ہاں۔ بول سکتا ہوں۔“

سکندر کے سرخ ہونٹ مسکرانے والے انداز میں سمجھ گئے۔ اس نے اپنے سالار کی طرف جھک کر کوئی سرگوشی کی۔ چند لمبے دونوں نے تبادلہ خیال کیا۔ پھر سکندر اور اس کے ساتھی سوار بندی خانے سے روانہ ہو گئے۔ نیزہ برداروں نے بڑی چوکی سے تباہ کو دھکیل دھکیل کر واپس کوٹھڑی میں پھنچا دیا۔ اس کے سینے کے زخم سے دوبارہ خون برسنے لگا تھا۔ اسی وقت معالج کو بلایا گیا۔ اس نے مرہم پٹی کی اور کھانے کے لیے چند زرد اثر دوائیں دیں۔ دواؤں کے زیر اثر تباہ جلد ہی گہری نیند سو گیا۔

اگلے روز سہ پہر کو ایک حجام اس کی کوٹھڑی میں پہنچا۔ اس نے بڑے سینے سے تباہ کے بال تراشے۔ اس کی ڈاڑھی مونڈی۔ بعد ازاں تباہ کو غسل کرایا گیا اور نئے کپڑے پہنے کو دیئے گئے۔ ایک عرصے بعد تباہ کو کپڑے نصیب ہوئے تھے۔ وہ بڑا حیران نظر آ رہا تھا۔ کپڑے کا لمس محسوس کر کے اسے اپنے جسم پر گدگدی ہونے لگی۔ شام کے کھانے سے کچھ دیر بعد دو سپاہی اندر داخل ہوئے۔ ان کی در دیاں خوب صاف ستھری تھیں اور تباہ نے اس سے پہلے انہیں بندی خانے میں نہیں دیکھا تھا۔ تباہ کے بازو پیچھے موڑ کر اسے ہتھکڑی لگائی گئی۔ پھر دونوں سپاہیوں کے ساتھ وہ کوٹھڑی میں سے باہر

تھا۔

برباد شدہ اجتماع کے بے نشان گلی کو پہنچے کر تا ہوا رتھ اس ٹٹائی محل کے سامنے پہنچ کر رکا جہاں چند روز پہلے تباہ نے سکندر کی عدالت دیکھی تھی۔ پچاسیاں اکھاڑ دی گئی تھیں اور اب وہاں چھیل میدان نظر آ رہا تھا۔ اس میدان میں کس کس پھولوں کی کیاریاں بنائی جا رہی تھیں۔ شاید یہ کیاریاں اس بات کی علامت تھیں کہ سکندر کا غصہ اب فرو ہو چکا ہے اور وہ اپنے چمکیلے اہل اجتماع سے مہربانی کا سلوک کرنا چاہتا ہے۔ خوش پوش وردیوں والے سپاہی تباہ کو لے کر شاہی محل میں داخل ہوئے۔ محل کی بلند چھتیں اور وسیع عریض فرش دیکھ کر تباہ حیران رہ گیا۔ اس نے کبھی خواب میں بھی نہ سنا تھا کہ وہ کسی آرام دہ رتھ میں سفر کرے گا اور شاہی محل میں بیچے ہوئے دیر قاتلوں پر پاؤں رکھے گا۔ وہ کچھ ہراساں نظر آنے لگا۔ سنگ مرمر کے سفید براق زینے طے کرتے ہوئے وہ محل کی تیسری منزل پر پہنچ گئے۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا وہ کہاں لے جایا جا رہا ہے اور نہ ہی وہ اس بارے میں سوچنا چاہتا تھا۔ اسے آئندہ کے بارے میں سوچنے کی عادت ہی نہیں تھی۔ محل کی چھت پر ایک خوبصورت چوکور کمرہ تھا۔ کمرے کی بڑی بڑی کھڑکیوں میں نیلے کواب کے نفیس پردے جھول رہے تھے۔ دروازے پر دو چوہدار نیزے تھامے کھڑے تھے۔ تباہ کے ہمراہ آنے والے سپاہیوں کو دیکھ کر ایک چوہدار دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد اسی چوہدار نے باہر آ کر تباہ کی جامہ تنائی لی۔ پھر اس نے سپاہیوں سے کہا کہ ہتھکڑی کھول دی جائے۔ سپاہیوں نے چوہدار کی ہدایت پر فوراً عمل کیا۔ چوہدار نے تباہ کو ساتھ لیا اور کمرے میں چلا آیا۔

کمرے کا منظر حیران کن تھا۔ دو بڑی بڑی شفاف میزوں پر کئی کتابیں اور نقشے بکھرے ہوئے تھے۔ ایک بہت بڑا چرمی نقشہ سامنے دیوار پر آویزاں تھا اس نقشہ پر سیاہ اور سرخ قلم سے جگہ جگہ نشان لگائے گئے تھے۔ کمرے میں بیچھے ہوئے ایرانی قاتلوں پر کسی قدیم مسودے کے بہت سے بوسیدہ اوراق پڑے تھے۔ ایک شخص دونوں ہاتھ سینے پر بندھے مشرق کی طرف کھٹنے والی کھڑکی کے سامنے کھڑا تھا۔ تباہ کی طرف اس کی پشت تھی۔ پھر بھی تباہ دیکھتے ہی پہچان گیا۔ وہ سکندر تھا۔ چوہدار تباہ کو کمرے میں پہنچا کر واپس چلا گیا۔ چوہدار کے دروازہ کھولنے اور بند کرنے سے آہٹ ہوئی تھی اس کے بازو کھڑکی میں کھڑے سکندر نے مڑ کر تباہ کی طرف نہیں دیکھا۔ تباہ کمرے کے وسط میں حیران و پریشان کھڑا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ شاہ مقدونیہ سکندر کے کمرے میں

حیران و پریشان کھڑا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ شاہ مقدونیہ سکندر کے کمرے میں نہیں آیا کسی حکیم اور ریاضی دان کے دارالاطلاع میں آگیا ہے۔ کہاں ایک جنگجو سپہ سالار اور کہاں یہ فلسفیانہ مصروفیات! تابان نے اپنی قید کے دوران سکندر کے بارے میں جو کچھ سنا تھا اس سے معلوم ہوا تھا کہ وہ مقدونیہ کے دارالخلافہ "پیلہ" سے کچھ فاصلے پر ایک درس گاہ میں تعلیم پاتا رہا ہے جو پریوں کے ایک ویران مندر میں قائم ہے۔ میزائانی اس درس گاہ میں وقت کے بڑے بڑے عالم اور فلسفی جمع رہتے ہیں۔ سکندر کے باپ فیلتوس نے سکندر کو بچپن میں ہی اس درس گاہ میں بھرتی کرا دیا تھا تاکہ وہ محلات کی بیش کوشی سے دور رہ کر جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کو ترقی دے سکے۔ باپ کی تیاری اور پھر موت کے بعد اسے مجبوراً کاروبار مملکت میں کودنا پڑا تھا ورنہ پہلے اسے ان کاموں سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ اس کمرے میں پہنچنے کے بعد تابان نے جو کچھ دیکھا اس سے اندازہ ہوا کہ سکندر کے بارے میں اس کی معلومات بہت حد تک درست ہیں۔ دفعتاً کمرے میں سکندر کی بھاری بھر کم آواز گونجی۔

"کیا نام ہے تمہارا؟ ہمیں بتایا گیا تھا مگر ہمارے ذہن سے اتر گیا ہے۔"

"میرا نام تابان ہے شاہ مقدونیہ!"

"ادھر ہمارے پاس آؤ کھڑکی میں۔" سکندر کی آواز ابھری۔

تابان نے سکندر کی آواز میں غماز محسوس کیا۔ وہ جیسے قدموں سے چلتا سکندر کے قریب کھڑا ہو گیا۔ کن آنکھیں سے اس نے دیکھا سکندر کے ہاتھوں میں بلوری جام تھا۔ اس کی آنکھیں دور کیس بہت دور مشرق میں دیکھ رہی تھیں۔ پوری رات کا چاند کوہ اولمپس کی فلک پوس چوٹیوں کے عقب سے برآمد ہو رہا تھا۔ اس کی روشنی جیسے براہ راست سکندر کے چہرے پر منعکس ہو رہی تھی۔ سکندر نے کہا۔

"تم جانتے ہو مشرق میں کیا؟..... تم نہیں جانتے۔ کوئی بھی نہیں جانتا۔ شاید تاریخ دان ہیرو ڈوٹس بھی نہیں جانتا تھا۔ میں نے اس کی سب تحریریں پڑھی ہیں۔ اس کی تاریخ بس بحیرہ اسود کی یونانی نو آبادیوں تک پہنچتی ہے اس سے آگے افسانہ طرازیوں شروع ہو جاتی ہیں اور افسانوں کا کیا ہے وہ تو جہاز ران اور سیاح بھی بہت سناتے ہیں۔ تم نے بھی تو ایسے افسانے سنے ہوں گے؟"

سکندر جواب طلب نظروں سے تابان کی طرف دیکھنے لگا۔ تابان نے کہا۔ "جی ہاں۔ بہت سے افسانے مشہور ہیں۔"

سکندر نے چند گھنٹ بھرے اور نیسکے نیسکے انداز میں کہا۔ "افسانوں کو میں بھی نہیں مانتا لیکن افسانہ حقیقت کا سایہ ضرور ہوتا ہے۔ جیسے خواب تعبیر کا سایہ ہوتا ہے اور خوشبو پھول کا پرتو ہوتی ہے۔..... یہ چاند جو تم سامنے دیکھ رہے ہو کسی نہ کسی سرزمین سے تو نکلتا ہے نا؟ کوئی جھیل ہوگی، دلدل ہوگی، سمندر جنگل یا ریگستان ہو گا اور سورج جو روز مشرق سے نکل کر مغرب میں ڈوبتا ہے اس کے ابھرنے اور غروب ہونے کا بھی کوئی مقام ہے۔ بڑے بڑے دریا جو ہمارے جنگلوں میں بہتے ہیں اور ہمارے کھیتوں کو سیراب کرتے ہیں کہیں سے تو شروع ہوتے ہوں گے۔ کبھی تم نے سوچا ہے کہ یہ زمین کتنی وسیع ہو سکتی ہے اور اس میں تمہاری آنکھ کے دیکھنے کے لیے کیا کچھ ہو سکتا ہے۔"

تابان ان سوالوں کا بھلا کیا جواب دیتا۔ وہ جانتا تھا سکندر اپنی رو میں بہہ رہا ہے اور وہ باتیں کر رہا ہے جو اسے کسی اور سے کرنی چاہئے تھیں۔ سکندر نے جام طلائی میز پر رکھا اور لکڑی کی چوکھٹ پر دونوں کھنیاں نکا کر آگے کو جھک گیا۔ بحیرہ روم سے آنے والی گرم مرطوب ہوا اس کے گھونگھریالے بالوں سے اٹھیلیاں کر رہی تھی۔ وہ کھوئے ہوئے لہجے میں بولا۔

"تم نہیں جانتے کہ مشرق میں کیا ہے لیکن کیا تم جانتے ہو کہ مغرب میں کیا ہے۔"

شمال اور جنوب میں کون سی قومیں آباد ہیں؟"

تابان نے کہا۔ "نہیں شاہ مقدونیہ! میرا علم بہت کم ہے۔"

"جسوت مت بولو۔" سکندر نے کہا۔ "کچھ نہ کچھ تم جانتے ہو گے۔ صرف اس خیال سے چھپا رہے ہو کہ ہم تمہاری معلومات کا مذاق نہ اڑائیں۔"

سکندر نے تابان کے دل کی بات بوجھی تھی۔ تابان خاموش ہو گیا۔ سکندر نے کہا۔ "جو کچھ بھی تمہیں معلوم ہے سناؤ۔ ہم سنا چاہتے ہیں۔"

تابان نے صاف گوئی سے کہا۔ "شاہ مقدونیہ! میں پڑھنا لکھنا ضرور جانتا ہوں لیکن کتابیں پڑھنے کے میں نے صرف خواب ہی دیکھے ہیں۔ میری معلومات وہی ہیں جو آپ کی رعایا کے ایک عام فرد کی ہو سکتی ہیں۔ ہم بڑے بوڑھوں سے یہی سنتے آئے ہیں کہ اس زمین کے چاروں طرف ایک بہت بڑا اور ناقابلِ عبور دریا بہہ رہا ہے۔ اس دریا کے اندر ہی کہیں وہ مقامات ہیں جہاں سے سورج نکلتا اور غروب ہوتا ہے۔ ان مقامات کے بارے میں صرف دیوتا جانتے ہیں جو کوہ اولمپس کی چوٹی پر آسمان کی چھت تلے ایک روشن شہر میں رہتے ہیں۔ یہ ملک جہاں ہم آباد ہیں زمین کا مرکز ہے۔ ہمارے شمال کی طرف سفید

بالوں والی ایک خوشحال قوم آیا ہے جسے ہانچوہرین کہتے ہیں۔ اس شمالی خطے میں ہمیشہ برفانی ہوائیں چلتی ہیں۔ جنوب میں حبشہ کے لوگ بستے ہیں جو دیو گاؤں کے محبوب ہیں۔ مغرب کی طرف مقدس جزیرے ہیں جہاں اچھے لوگ ابدی آرام اور چین کی زندگی گزارنے کے لیے بھیج دیئے جاتے ہیں۔

سکندر دلچسپی سے تابان کی باتیں سن رہا تھا۔ تابان خاموش ہوا تو اس نے کہا۔ ”شرق کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“

تابان نے کہا۔ ”سالار اعظم! تین برس پہلے جب میں سیراس کے جزیرے میں تھا تو ملائوں کی ایک محفل میں بیٹھا کرتا تھا۔ ہر ہفتے کی آخری شب یہ محفل بندرگاہ کے قریب ایک مکان میں جیتی تھی اور داستان گو اپنی اپنی کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ ملائوں کی ان کہانیوں سے پتہ چلتا ہے کہ بحیرہ اسود میں دور تک جانے والے جہاز رانوں کو سمندر کی آخری حد پر ایک فلک بوس پہاڑی دیوار نظر آتی ہے۔ اس دیوار کو قدیم زمانے سے ہفتاد کا نام دیا گیا ہے۔ اس پہاڑی دیوار میں ایک دروازہ ہے جس سے گزر کر غیر معلوم مشرقی سرزمینوں میں جاتے ہیں۔ ایشیائی باشندوں کا عقیدہ ہے کہ اس دیوار سے آگے ایک زمین بند بحیرہ واقع ہے جس کا نام قزوین ہے۔ یہاں دیوبیکر پرندے، جنگجو عورتیں یا دیونیاں اور نامعلوم آسمانی اوتار پائے جاتے ہیں۔“

سکندر نے سرخ آنکھوں سے تابان کو دیکھا اور مسکرا کر بولا۔ ”جو کچھ تم ہمیں بتا رہے ہو اس پر تمہیں کس حد تک یقین ہے؟“

سکندر کا سوال الجھا دینے والا تھا۔ تابان نے محتاط لہجے میں کہا۔ ”سالار اعظم! یقیناً ان کہانیوں میں جھوٹ کی آمیزش ہے۔ واقعات کو شاعری کے رنگ میں بیان کیا گیا ہے۔ بہر طور حقیقت جو بھی ہے اس افسانے سے ربط رکھتی ہے۔“

سکندر بولا۔ ”تم ٹھیک کہتے ہو۔۔۔۔۔ ہم پھر بھول گئے۔ تم نے کیا نام بتایا تھا اپنا؟“

”تابان۔“ تابان نے جواب دیا۔

”تابان۔۔۔۔۔ اچھا نام ہے۔ ہاں تو ہم کہہ رہے تھے کہ ہم تمہارے خیال سے اتفاق کرتے ہیں۔ ہمیں جو کچھ معلوم ہے یہ جھوٹ اور سچ کا آمیزہ ہے۔ اس سچ کو جھوٹ سے علیحدہ کرنے کے لیے کسی نہ کسی کو تو قدم بڑھانا ہوگا۔ کسی کو تو آگے آنا ہوگا۔ مجھے تمہیں یا دو ہزار سال بعد کسی تیسرے شخص کو۔ آخر ہم کب تک اندھیروں میں بھٹکتے

رہیں گے۔ ابلا صرف کتابوں میں نہیں ملے گا۔ اچالے کی تلاش میں گھوڑے پر سوار ہونا ہوگا۔ سینے میں حوصلہ جمع کرنا ہوگا اور طویل فاصلوں کو گزرنا ہوگا۔ پھر روشنی ملے گی۔ پھر آگاہی حاصل ہوگی۔ تم۔۔۔۔۔ تم ہماری باتیں سمجھ رہے ہو ناں؟“

تابان کے پاس اثبات میں سر ہلانے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ سکندر ایک آرام دہ نشست پر نیم دراز ہو گیا۔ اس نے ٹانگیں اٹھا کر اس کھڑکی کی چوکھٹ میں رکھ دیں جس میں سے کچھ دیر پہلے وہ مشرق کی سمت تھوڑا رہا تھا۔ اب اس کی نگاہیں دیوار پر آویزاں نقشے پر جمی تھیں۔ تابان نے بھی غور سے یہ نقشہ دیکھا۔ وہ یہ جان کر حیران ہوا کہ اس چری نقشے پر بے شمار جوڑ لگے ہوئے ہیں۔ غالباً کچھ عرصہ پہلے یہ نقشہ پھٹ گیا تھا یا پھاڑ دیا گیا تھا۔ بعد ازاں اسے پھر جوڑا گیا تھا۔ اس نقشے میں بہت سے پہاڑ دریا شہر اور راستے دکھائے گئے تھے۔ چابھانٹان لگے تھے اور حاشے لکھے تھے۔

سکندر نے کہا۔ ”اس نقشے کو پہچانتے ہو۔ تم نہیں پہچانتے ہو گے۔ یہ نقشہ ہم نے پانچ برس پہلے میزا کی درس گاہ سے حاصل کیا تھا۔ یہ روئے زمین کا نقشہ ہے اور ایک قدیم یونانی تاریخ دان نے تیار کیا تھا۔۔۔۔۔ اس نقشے میں یہ خاستری رنگ کی بلند دیوار دیکھ رہے ہو؟ یہ دیوار جو اس سمندر سے آگے شمالاً جنوباً پھیلی ہوئی ہے؟ یہی دیوار ہے جس میں سے مشرق کو جانے والے دروازے کھلتے ہیں۔ نقشے میں اس دیوار کا اضافہ ہم نے خود کیا تھا۔ درحقیقت اس نقشے میں نصف سے زیادہ کام ہمارا ہے۔ یہ جو مقامات کے فاصلے اور پہاڑوں کی بلندیوں درج ہیں یہ ہماری ہی تحریر کردہ ہیں۔ بہت محنت کی تھی ہم نے اس نقشے پر لیکن درس گاہ کے قوطی فلسفیوں نے ہمارا مذاق اڑایا۔ اس لیے کہ وہ درس گاہ کے اہل تھے اور ہم ایک نو جوان طالب علم۔ اور تو اور انہوں نے ہمارے استاد محترم کو بھی پریشان کر دیا اور استاد محترم کو ہم سے کہنا پڑا کہ ہمیں ایسے خیالی نقشے تیار نہیں کرنے چاہئیں۔ یہ آنے والے لوگوں کو گمراہ کریں گے۔ طیش میں ہم نے اس نقشے کے ٹکڑے کر دیئے تھے لیکن نقشے کو ٹکڑے کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ یہ نقشہ تو ہمارے دل پر بن چکا ہے۔ اب اسے کوئی نہیں مٹا سکتا۔ شاید۔۔۔۔۔ شاید استاد محترم بھی نہیں۔“

تابان خاموشی سے یہ گفتگو سن رہا تھا۔ کچھ باتیں اس کی سمجھ میں آرہی تھیں اور کچھ سر کے اوپر سے گزر رہی تھیں لیکن وہ بدستور اثبات میں سر ہلانے پر مجبور تھا۔ مشرق سے طلوع ہونے والا چاند اب بلند ہو کر کھڑکی کے وسط میں آگیا تھا۔ باتیں کرتے

کرتے سکندر نے اچانک گفتگو کا رخ موڑ دیا۔ بالکل جیسے کچے راستے پر سرٹ دوڑتا ہوا
رختہ ایک دم ہموار پختہ راستے پر آجائے۔ وہ تہاں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

"جانتے ہو ہم نے تمہیں یہاں کیوں بلایا ہے؟"

"نہیں سالار اعظم!"

"ہم نے کل قید خانے میں پھریداروں سے تمہاری لڑائی دیکھی تھی۔ اس سے پہلے
تم ہمارے تین سرداروں کو بھی جیت چکے ہو۔ ہم تمہاری دلیری سے متاثر ہیں۔"

"بہت شکریہ سالار اعظم۔" تہاں نے اپنا سر جھکایا۔ زندگی میں پہلی بار یہ رساوا
رغبت اس نے اپنا سر جھکایا تھا۔

سکندر نے کہا۔ "تمہیں یاد ہے ہم نے تم سے ایک سوال پوچھا تھا۔" تہاں کے
چہرے پر الجھن نظر آئی۔ سکندر نے کہا۔ "ہم نے تم سے فارسی زبان کے بارے میں پوچھا
تھا اور تمہارا جواب تھا کہ تم فارسی جانتے ہو۔"

"آپ درست فرما رہے ہیں سالار اعظم۔"

"ہم تم سے ایک کام لینا چاہتے ہیں تہاں!"

"یہ میری خوش بختی ہوگی جناب! لیکن....."

"لیکن کیا؟"

"سالار اعظم! معلوم نہیں میں اس کام کے اہل بھی ہوں گا یا نہیں۔"

"تمہیں ہماری مردم شناسی پر شبہ ہے؟"

"سالار اعظم! میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔"

سکندر نے جام سے ایک گھونٹ بھر کر مشرق کی جانب دیکھا اور کھوئے کھوئے لہجے
میں بولا۔ "ہم بہت جلد ایک عظیم سفر شروع کرنے والے ہیں۔ یہ مشرق کی دریافت اور
تغیر کا سفر ہوگا۔ ہم اکیلے نہیں ہوں گے۔ ہمارے ساتھ ایک جم غفیر ہوگا۔ ہم چاہتے ہیں
کہ ایشیا کے ساحل پر قدم رکھنے سے پیشتر ہمیں اپنے راستے کے بارے میں بنیادی
معلومات حاصل ہوں۔ ہم نے اس کام کے لیے چار باہمت نوجوان منتخب کئے ہیں۔ صرف
ایک شخص کی کمی تھی اور ہمارا خیال ہے تم وہ کمی پوری کر سکتے ہو۔" ایک لمحہ رک کر
اس نے تہاں کے تاثرات کا جائزہ لیا پھر بولا۔ "تم حوصلہ مند اور سخت جان ہو۔ ایرانی ہو
اور فارسی جانتے ہو۔ انہی اوصاف کی ہمیں ضرورت ہے۔"

تہاں کے ذہن میں جھمکا سا ہوا۔ وقت کا بادشاہ اپنی ایک غرض کے سبب اس پر

مہمان ہو رہا تھا۔ یہ کچھ مانگنے کا وقت تھا۔ تہاں کی آنکھوں کے سامنے وہ پھول چہرہ کھل
اٹھا جو وقت کی وصول میں گم ہو گیا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن کیلہاری مارشا مارشا بکار
اٹھی۔ وہ سر جھکا کر چند لمحوں اس حسن بیکراں کا تصور کرتا رہا پھر لرزاں آواز میں بولا۔

"اے شاہ مقدونیہ! آپ کا اقبال بلند ہو۔ میں اس عزت کے قائل نہیں جو آپ
مجھے بخش رہے ہیں۔ صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ اپنے خون کا آخری قطرہ اور اپنے سینے
کی آخری سانس آپ پر نچھاور کر کے بھی اپنی نگاہ میں شرمندہ رہوں گا۔"

سکندر نے کہا۔ "یہ نہیں پوچھو گے کہ ہم نہیں کیا ذمہ داری سونپنا چاہتے ہیں؟"

تہاں نے کہا۔ "آپ ذمہ داری سونپنے کا فیصلہ کر چکے ہیں تو پھر مجھے پوچھنے کی
ضرورت ہے اور نہ خواہش۔"

سکندر اس جواب سے متاثر ہوا۔ کچھ دیر تہاں کو کھوجی نظروں سے دیکھتا رہا پھر
بولا۔ "ٹھیک ہے۔ اب تم جا سکتے ہو۔ ہم تمہیں جلد طلب کریں گے۔"

تہاں نے موقع ہاتھ سے نکلنے دیکھا تو زبیاں کولنے کی ہمت پیدا کر لی۔ سر جھکا کر
بولا۔ "شاہ مقدونیہ! میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔"

سکندر نے کہا۔ "کو..... ہم سن رہے ہیں۔"

تہاں بولا۔ "مسلے کے روز مجھے گرفتار کیا گیا تو میرے ساتھ شاہی خاندان کی ایک
شہزادی بھی تھی۔ اس کا نام مارشا ہے۔ میری بیوہ کی بعد مقدونی سپاہیوں نے اسے
پکڑ لیا تھا۔"

سکندر اس کا مدعا سمجھ کر بولا۔ "تو تم اسے واپس حاصل کرنا چاہتے ہو؟"

تہاں نے کہا۔ "ہاں! شاہ مقدونیہ۔"

سکندر بولا۔ "تمہاری یہ خواہش پوری کی جائے گی۔ ہم ابھی بندی خانے کے
داروغہ کو طلب کرتے ہیں۔ تم کچھ دیر باہر ٹھہرو۔ ہم داروغہ سے بات کر کے تمہیں دوبارہ
طلب کریں گے۔"

تہاں کے دگ و پے میں مسرت و شادمانی کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے بمشکل اپنے
جذبات پر قابو پایا۔ فوجی انداز میں سکندر کو تعظیم پیش کر کے وہ الٹے قدموں کمرے سے
باہر نکل آیا۔ باہر ایک دیوار کے ساتھ بادشاہ کے ملاآچوں کے لیے نشستوں کا اجتماع تھا۔
وہ ایک نشست پر بیٹھ کر بے چینی سے پہلو بدلتے لگے تھوڑی ہی دیر بعد اس نے ایک
نومند شخص کو دیکھا جو دو سپاہیوں کے ساتھ تیز تیز قدم اٹھاتا سکندر کے کمرے کی جانب آ

جسم کو چھپانے کی بجائے اور نمایاں کرنا تھا۔ وہ قدم قدم پر بجلیاں گراتی اندر آئیں تو ان کے حسن کی چکاچوند سے کمرے کی ہر شے دکھ انھی۔ انہوں نے دلنشین انداز میں تعظیم پیش کی اور تاجان کے سامنے آن کھڑی ہوئیں۔ سکندر نے کہا۔

”یہ حسن کی انتہا نہیں ابتدا ہے۔ ہم اپنے جاں نثاروں کو بھی مایوس نہیں کرتے“ جب تک تم امتیاز نہیں ہو یہ حسینائیں تمہارے ساتھ رہیں گی۔“

تاجان نے دل میں سوچا۔ ”اے شاہ مقدونیہ! تو نے میرے محبوب کا چہرہ نہیں دیکھا ورنہ اپنے بخشے ہوئے انعام پر اتنا نازاں نہ ہوتا۔“ اس کا دل نہیں چاہا کہ وہ لڑکیوں کو دیکھے بھی مگر عتاب شہابی کے خوف سے وہ نگاہیں اٹھائے رکھنے پر مجبور تھا۔ سکندر نے ایک چھوٹی سی روشنی تھیلی تاجان کی طرف اچھالی جسے تاجان نے ہوا میں ہی دبوچ لیا۔ تھیلی کے اندر موتیوں کی سرسراہٹ محسوس کر کے تاجان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

اچانک دروازہ کھلا اور نیزہ بردار چوہدار اندر آگیا۔ تعظیبات کے بعد اس نے کہا۔ ”شاہ مقدونیہ! استاد محترم ارسلو تشریف لارہے ہیں۔“

تاجان نے دیکھا سکندر کے چہرے پر رنگ سا آکر گزر گیا ہے۔ اس نے تاجان کو حکم دیا کہ وہ دو شیرازوں کے ساتھ بظنی دروازے سے باہر نکل جائے۔ تاجان نے فوراً عمل کیا۔ جب وہ بظنی دروازے سے باہر نکل رہا تھا اس نے دیکھا سکندر کا ایک خادم جلدی جلدی دیوار پر آویزاں نقشے کو لپیٹ رہا ہے۔ جوئی تاجان دروازے سے نکلا دو خوش پوش سپاہیوں نے اسے اپنے ہمراہ لے لیا۔ یہ وہی سپاہی تھے جو اسے ہتھکڑی لگا کر یہاں تک لائے تھے۔ اب ان دونوں کے انداز میں پہلے سے کہیں زیادہ ادب و احترام نظر آ رہا تھا۔ تاجان اپنی اس ”مکاپلیٹ“ پر حیران ہو رہا تھا کہیں ایک قاتل نفرت غلام ہو کر نکل گیا معمولی سپاہیوں کی ٹھوکروں میں تھا اور کہاں بادشاہ وقت کا نوازا ہوا مہتمد جس کے آگے آگے ایوان خاص کا مہذب چوہدار چل رہا تھا۔ وہ محل کے دروازے سے باہر نکلا تو ایک آرام دہ گھوڑا گاڑی اس کی سواری کے لیے تیار کھڑی تھی۔ وہ دونوں دو شیرازوں کے ساتھ گاڑی میں سوار ہو گیا۔ گاڑی بان نے گھوڑے بڑھائے اور وہ ایک بل کھاتی ہوئی ہموار سڑک پر آگے بڑھنے لگے۔ رات اب گہری ہو چکی تھی۔ برباد شدہ امتیاز کی کسی سلامتی عمارت میں مقدونی سپاہیوں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ ان کی جلائی ہوئی مشعلوں کی روشنی اس قبرستان کی ویرانی کو قدرے کم کرتی تھی۔ دونوں دو شیرازیں تاجان کے پہلو میں بیٹھی تھیں۔ تاجان نے دیکھا کہ ان میں سے ایک کچھ ہراساں اور پریشان

ہے۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا اور پیشانی پر پسینے کی ننھی بوٹندیں گاڑی کی اندرونی روشنی میں چمک رہی تھیں۔ تاجان اس کی کیفیت دیکھ کر حیران ہوا۔ وہ کیوں خوفزدہ تھی؟ شہر کی تباہی کے مناظر نے اسے ہراساں کیا تھا یا پھر وہ ایک انجینی مرز کے سپرد کئے جانے سے پریشان تھی۔ کیا ہوا تھا اسے؟ ابھی تھوڑی دیر پہلے تو وہ بالکل ہشاش بشاش تھی۔ دفعتاً تاجان نے محسوس کیا کہ گھوڑا گاڑی کے دائیں پہلو پر دو تاریک سائے ان کے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ یہ دو گھڑ سواروں کے سائے تھے۔ حالانکہ وہ کافی فاصلے پر تھے لیکن ان کا انداز مشکوک تھا۔ تاجان کو یہ سمجھنے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ ترک دو شیرہ کے خوف کی وجہ یہی گھڑ سوار ہیں۔

☆-----☆

گاڑی اپنے راستے پر چلتی رہی گھڑ سواروں نے بھی تعاقب جاری رکھا۔ چند نیم تاریک راستوں سے گزرنے کے بعد وہ لوگ ایک حویلی نما خوبصورت عمارت کے سامنے رکے۔ سپاہیوں نے نیچے اتر کر تاجان کے لئے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ وہ اپنی ہمراہی دو شیرازوں کے ساتھ نیچے اتر آیا۔ سپاہی انہیں لے کر حویلی کے اندر پہنچے۔ حویلی کے بلند وبلا صدر دروازے میں داخل ہونے سے پہلے تاجان نے ارد گرد نگاہ دوڑائی۔ تعاقب میں آنے والے گھڑ سوار اسے کہیں دکھائی نہیں دیئے۔ غالباً وہ گھوڑا گاڑی کو رکتے دیکھ کر آگے نکل گئے تھے۔ تاجان حویلی میں داخل ہوا۔ سپاہیوں نے اسے بتایا کہ اب وہ یہیں رہے گا۔ حویلی خوب جی ستوری تھی۔ نوکر چاکر اور آرام و آسائش کی تمام چیزیں موجود تھیں۔ تاجان ایک ایک شے غور سے دیکھ رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ اب اس کا ہے۔ نہ جانے کیوں اس کا دل چاہا کہ وہ نرم و گداز مسروں پر اچھلے کودے۔ دبیز قالین پر لوٹیں لگائے اور چیخ چیخ کر نوکروں کو احکامات جاری کرے۔ کسی سے کہے میرے پاؤں دباؤ کسی کو حکم دے میرے سر پر مالش کر۔ بہت سی خواہشیں اس کے ذہن میں سر اٹھا رہی تھیں لیکن پھر اس نے خود پر قابو پایا۔ وہ خود کو سمجھانے لگا۔ مجھے اپنی اوقات نہیں بھولنی چاہیے۔ کچھ بھی ہے میں اب بھی ایک غلام ہوں۔ میرے آقا نے خوش ہو کر مجھ پر عنایتیں کی ہیں۔ ناراض ہو کر وہ یہ عنایتیں چھین بھی سکتا ہے۔ کیا معلوم میرا کون سا فعل اسے ناگوار گزر جائے۔

طعام گاہ میں پہنچ کر اس نے دونوں دو شیرازوں کے ساتھ ایک پر خلکف کھانا کھلیا۔ ابھی کھانے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ ایک خادم نے دست بستہ ہو کر اطلاع دی کہ دو مسلمان

دے ماری۔ نہ صرف بڑی ترش مٹی بلکہ گل کا گوشت بھی احرار گیا۔ میں اسے موقع پر ہی قتل کر دیتا چاہتا تھا، لیکن پھر میرا دل نہیں مانتا کہ اتنے خوبصورت چہرے کو ایک غلطی کی ایسی کڑی سزا دی جائے۔ میں نے اسے معاف کر دیا۔ سوچا کہ اسے سکندر سے مانگ لوں گا..... کل میں اسی سلسلے میں محترم سکندر سے ملنے والا تھا مگر..... خیر چلو ہو جاتا تھا وہ ہو گیا.....

تایان اور اس کے دونوں مہمانوں میں کافی دیر گفتگو ہوتی رہی۔ گہری بھوری آنکھوں والے شلال کی باتوں سے تایان نے اندازہ لگایا کہ وہ کورا نامی اس دو شیرازہ کو حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن سکندر سے بھی ڈر رہا ہے کیونکہ سکندر نے دو شیرازہ تایان کے حوالے کر دی ہے۔ اب وہ چاہتا ہے کہ تایان اپنی مرضی اور خوشی سے لڑکی اس کے سپرد کر دے۔ وہ اپنی خواہش کا اظہار کھلے لفظوں میں نہیں کر رہا تھا مگر گفتگو کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ تایان یہاں کسی شخص سے کس طرح کی دشمنی پیدا کرنا نہیں چاہتا اور شلال تو پھر ایک اہم سردار تھا۔ اگر وہ لڑکی شلال کو پسند تھی اور تایان اس سے دستبردار ہو کر ایک اہم سردار سے اچھے تعلقات پیدا کر سکتا تھا۔ تو اسے یہ کام کرنا چاہئے تھا کچھ دیر مہمانوں کے پاس بیٹھ کر تایان نے ان سے چند لمحوں کی اجازت طلب کی اور حویلی کے زنان خانہ میں آگیا۔ وہ سیدھا دونوں شیرازوں کے پاس پہنچا۔ ترک دو شیرازہ تایان کو دیکھتے ہی اپنے آپ میں سمٹ گئی۔ تایان نے پوچھا۔

”تمہارا نام ہی کورا ہے؟“ اس نے سر اوپر نیچے ہلا کر ہاں میں جواب دیا تایان نے پوچھا ”تم بھوری آنکھوں والے اس سردار کو جانتی ہو یا ابھی مجھ سے ملنے آیا ہے؟“

ترک دو شیرازہ نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بس سر گھٹنوں پر رکھ کر رسیکوں سے روٹنے لگی۔ اس کی آواز میں گریہ زاری تھی اور رحم کی التجائیں تھیں۔ تایان کو اس کے روٹنے نے متاثر کیا۔ وہ دو شیرازہ کے پاس بیٹھ گیا اور دلاس دینے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بولنے کے قابل ہوئی تو پتلیوں کے درمیان کہنے لگی۔ ”مالک! میرا گلا گھونٹ دو مگر اس درندے کے حوالے نہ کرو۔ وہ مجھ سے بہت بری طرح پیش آئے گا۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ مجھے اپنے پاس ہی رکھو۔“

تایان نے پوچھا۔ ”آخر ایسی کیا بات ہے جو تم اس سے اتنی خوفزدہ ہو؟“ وہ بولی۔ ”مالک! میرے ہاتھوں اس کے چہرے پر زخم لگایا تھا اس نے مجھے بہت بری طرح چپا خوفناک دھمکیاں دیں اور گھینتا ہوا گھوڑا گاڑی میں لے آیا۔ اس نے میرا

اس سے ملنا چاہتے ہیں۔ تایان نے شان بے نیازی سے کہا۔ ”انہیں اندر بلایا جائے۔“ خادم سر جھکا کر واپس لوٹ گیا۔ زرا دیر بعد دو درواز قامت خوش پوش اشخاص اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے یونانی طرز کے فرائز پہن رکھے تھے۔ جاکلیں گھٹنوں سے اوپر تک عریاں تھیں۔ دونوں کے کمر بند کلاہ تھے اور کونوں سے بیش قیمت دستوں والی گواریں لٹک رہی تھیں۔ تایان نے اٹھ کر انہیں خوش آمدید کہا۔ اچانک اسے محسوس ہوا کہ پسوا میں بیٹھی ہوئی ترک دو شیرازہ ایک بار پھر سخت خوفزدہ ہو گئی ہے۔ اس کا خوبصورت چہرہ بالکل سفید پڑ گیا تھا۔ تایان کو یہ سمجھنے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ یہی وہ گھڑسوار ہیں جو سکندر کی اقامت گاہ سے اس کا پیچھا کرتے ہوئے آئے تھے۔ اس نے ایک بار پھر دونوں کو غور سے دیکھا۔ ان دونوں کی آنکھوں میں تایان کے لئے حقارت چھپی ہوئی تھی۔ ایک شخص جو نسبتاً زیادہ طویل اور تومند تھا خاص طور پر تایان کو گھور رہا تھا۔ اس کی ٹھوڑی پر چند دن پرانا ایک زخم بھی تھا۔ ترک دو شیرازہ کو خوفزدہ دیکھ کر تایان نے کہا۔

”آئیے جناب ہم نشست گاہ میں بیٹھتے ہیں۔“

وہ تینوں نشست گاہ میں پہنچ گئے۔ دونوں افراد نے اپنا تعارف کرایا۔ تومند شخص نے کہا۔ ”میرا نام شلال ہے اور یہ داراب ہے ہم دونوں سکندر کی فوج میں ایک ہزاری سالار ہیں اور تمہیں تو ہر شخص جانتا ہے سکندر کے تین اہم سرداروں کو یہ قتل کر کے تم نے زبردست شہرت پائی ہے۔“

اظہار وہ دونوں تایان کی تعریف کر رہے تھے لیکن ان کے لبوں میں نفرت پوشیدہ تھی۔ تایان نے خوشدلی سے ان کا شکریہ ادا کیا اور ان کی آمد کا مقصد پوچھا۔ شلال نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”مقصد کوئی خاص نہیں۔ بس ہم تمہیں مبارکباد دینے آئے تھے۔ شاہ مقدونیہ سکندر تم پر بہت مہربان ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اتنی اچھی رہائش گاہ اور ایسی خوش بھلا لڑکیاں تمہارے حصے میں آئی ہیں لیکن ایک برادرانہ مشورہ دینا چاہتا ہوں۔“

”جی فرمائیے۔ میں سن رہا ہوں۔“ تایان نے پوری طرح متوجہ ہو کر کہا۔ شلال بولا۔ ”وہ ترک لڑکی جس کا نام کورا ہے بڑی خطرناک ہے اس کی طرف سے ہوشیار رہنا۔ لڑائی کے موقع پر میں نے ہی اسے ایک امیر کی حویلی سے گرفتار کیا تھا۔ یہ میری ٹھوڑی پر بدنام زخم دیکھ رہے ہو؟ اسی بدبخت کا دیا ہوا ہے۔ میں نے اسے کھینچ کر گھوڑا گاڑی میں بٹھا چاہا تو اس نے ایک طاق ہوئی لکڑی پورے زور سے میرے منہ پر

لباس پہنا کر مجھے غراں کر دیا میری قسمت اچھی تھی کہ اس وقت مقدونی فوج کے چند اہم سردار وہاں آگئے ان کی وجہ سے میری جان بچ گئی۔ بعد میں مجھے شہابی محل میں منتقل کر دیا گیا۔ یہ شخص میرے تعاقب میں وہاں بھی پہنچ گیا۔ اس کی خواہش تھی کہ شاہ مقدونیہ سکندر سے مجھے مانگ لے لیکن اسی دوران..... مجھے آپ کے حوالے کر دیا گیا۔

کورا نامی اس دوشیزہ کی پوری روئیداد سننے کے بعد تہاں نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ اسے سردار کے حوالے نہیں کرے گا۔ اس نے کورا سے پوچھا "لڑائی سے پہلے تم کس امیر کے پاس تھیں؟" دوشیزہ نے کچھ دیر جھنجھکنے کے بعد کہا۔ "میں آقا عارس زونب کی کنیز تھی میرا شمار شہزادی مارشا کی خاص خادماؤں میں ہوتا تھا۔"

تہاں کی سماعت میں دھماکا سا ہوا۔ شہزادی مارشا کے نام کی گونج اس کے پورے جسم میں پھیل گئی۔ دوشیزہ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میں ان تین خادماؤں میں سے تھی جو لباس بدلنے اور بناؤ نگہار کرنے میں شہزادی مارشا کی مدد کرتی تھیں۔ میرا پورا نام کورال ویر ہے شہزادی مجھے محبت سے کورا کہا کرتی تھیں۔" تہاں آنکھیں پھاڑے کورا کو دیکھ رہا تھا کہ یہ دوشیزہ جو اس کے سامنے بیٹھی ہے شہزادی مارشا کی خاص خادمہ رہ چکی ہے۔ اس کا بی چاہا ان آنکھوں کو دیکھتا چلا جائے جو نہ جانے کتنے عرصے تک مارشا کو دیکھتی رہی تھیں ان ہاتھوں کو چوم لے جو مارشا کے بال سنوارتے رہے تھے اور اس کے جسم سے چھوتے رہے تھے۔ اکیدم ہی کورا نامی یہ لڑکی تہاں کے لئے نہایت اہم اور معزز ہو گئی..... اس نے پوچھا۔

کیا آپ سچ سچ شہزادی کی خادمہ ہیں؟

کورا نے کہا۔ "ہاں مالک! میں بیچھلے تین برس سے شہزادی کی خدمت پر مامور تھی مقدونیوں کے ہاتھوں گرفتاری کے وقت بھی میں عارس زونب کے محل میں تھی۔" ایکایک تہاں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اس دوشیزہ کو ہرگز ہرگز سردار شلال کے حوالے نہیں کرے گا۔ اس کا عیار ذہن تیزی سے کوئی تدبیر سوچنے لگا..... کوئی ایسی تدبیر کہ سردار شلال ناراض نہ ہو اور کورا ابھی اس کے پاس رہے۔ جلد ہی یہ تدبیر اس کے ذہن میں آگئی۔ اس نے کورا سے کہا کہ وہ سردار شلال کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو جائے کورا کا رنگ ایک بار پھر زرد ہو گیا تہاں نے کہا۔ "گھبراہٹیں نہیں۔ میں آپ کو اس کے

ساتھ نہیں بھیجوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔"

کورا ابھین سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اسے تیار ہونے کا کہہ کر تہاں واپس نشست گاہ میں آیا اور سردار شلال سے کہا کہ وہ کورا کو اس کے سپرد کرنا چاہتا ہے۔ تہاں نے شلال کے دل کی بات کہی تھی۔ ان کی آنکھیں جبک انھیں۔ رسمی انکار کرنے کے بعد اس نے تہاں کی یہ پیشکش قبول کر لیا۔ تہاں اندر گیا اور ڈری سہمی ہوئی کورا کو لے کر واپس آگیا۔ کورا کو دیکھ کر شلال کی آنکھوں میں نفرت و حقارت کی آگ جل اٹھی۔ ایسی ہی آگ اس کی آنکھوں میں تہاں کے لئے بھی موجود تھی لیکن اس آگ کی روشنی اس نے تہاں پر ظاہر نہیں ہونے دی تھی۔ کچھ دیر بعد جب شلال اور داراب کورا کو لے کر رخصت ہونے لگے تو تہاں نے شلال کو ایک طرف بلایا اور آہستگی سے کہا۔ "جناب! اگلے ہفتے دوپہر سے غورزی دیر قبل آپ اسے چند پہرے کے لئے میرے پاس چھوڑ جائیے گا۔"

"وہ کیوں؟" شلال نے حیران ہو کر پوچھا۔

تہاں نے کہا "فتح کی شکر گزرائی کے لئے بادشاہ نے ہفتے کی شام کو شہابی محل میں خاص عبادت کا اہتمام کیا ہے۔ کورا کو بھی وہاں جانا ہے۔" شلال نے کہا۔ "میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔"

تہاں دھیسے لمبے میں بولا۔ "دراصل یہ لڑکی بڑی لمبی منجلیت جانتی ہے بادشاہ سلامت کو بھی پتہ ہے۔ انہوں نے قریباً تھا کہ ہفتے کی شام جب میں عبادت کے لئے آؤں تو اسے بھی ساتھ ضرور لاؤں۔ یہ زیور لڑکی مورقی کے سامنے منجلیت کرے گی۔" شلال کا چہرہ اتر گیا۔ وہ مایوسی سے بولا۔ "یہ تو بڑا مسئلہ ہو گیا۔"

تہاں نے ہوشیاری سے کہا۔ "مسئلہ کیا ہو گیا محل سے واپسی پر میں اسے پھر آپ کے حوالے کر دوں گا۔"

شلال نے کہا۔ "لیکن اگر اس نے بادشاہ کے سامنے کچھ بک دیا تو میں اور تم دونوں مصیبت میں پڑ جائیں گے۔"

تہاں بولا۔ "کیسے بکے گی؟ ہم اس بارے میں سختی سے منع کر دیتے ہیں۔" شلال نے کہا۔ "ہمارے منع کرنے سے کچھ نہیں ہو گا۔ تم اس عورت ذات کو نہیں جانتے۔ اس نے وہاں ذرا بھی چوچ بادی تو ہم دونوں کی گردنیں پھری کے نیچے آجائیں گی۔"

اپنی آنکھوں کے سامنے آقا غارس اور مالکن نورا کو کاری زخم کھا کر گرتے دیکھا۔ میں شہزادی مارشا کی طرف واپس بھاگی لیکن راستے ہی میں مجھے اس دراز قد سردار نے دبوچ لیا۔۔۔۔۔۔

اس ہولناک دن کی کہانی سن کر تابان کا غم بھی تازہ ہو گیا اس کے تصور میں وہ لمبے اباگر ہوئے جب اخروٹ کے جنگل میں شہزادی مارشا اس سے جدا ہوئی تھی۔ اس کی فریادی آنکھیں تابان کی سوچوں کو بھلسانے لگیں۔ اس کا دل چاہا وہ آذر کر مارشا کے پاس پہنچ جائے لیکن پھر سکندر کا جلاوہ جلال اس کے سامنے آگیا۔ سکندر کی مرضی کے بغیر وہ شہزادی تک کیسے پہنچ سکتا تھا۔ نہ جانے سکندر نے اسے کہا رکھا ہوا تھا۔ وہ کن لوگوں کی تحویل میں تھی۔ خوش تھی یا غمگین، زخمی تھی یا صحیح سلامت، مطمئن تھی یا بے قرار؟ اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔۔۔۔۔۔ ایک شام جب تابان کھانا کھا کر اپنی نویلی میں لیٹا ہوا تھا ملازم نے بتایا کہ بندی خانے کا داروغہ اس سے ملنا چاہتا ہے۔ تابان اس غومند داروغہ کو پہلے سے جانتا تھا۔ چند روز پہلے تابان کی موجودگی میں سکندر نے اسے طلب کیا تھا۔ داروغہ نے تابان سے کہا کہ اسے بندی خانے جا کر کچھ مجرموں کی شناخت کرنی ہے۔

تابان نے پوچھا۔ ”کیسے مجرم؟“

داروغہ نے کہا کہ فی الحال وہ اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔

تابان خاموشی سے داروغہ کے ساتھ چل دیا۔ داروغہ جس راز داری سے آیا تھا اسی راز داری سے تابان کے ساتھ واپس رواں ہو گیا۔ بندی خانے تک تقریباً دو میل کا فاصلہ انہوں نے گھوڑا گاڑی کے ذریعہ طے کیا تھا۔ تابان بندی خانے کی عمارت کو اچھی طرح جانتا تھا، یہاں اس نے نہایت اذیت کے شب و روز گزارے تھے۔ بندی خانے کے اندر ایک کشادہ کمرے میں چند مقدونی سردار موجود تھے اور ایک طرف دو درجن کے قریب مجرم قطار باندھے کھڑے تھے۔ شکل و صورت اور محلے سے یہ سب مقدونی فوج کے سپاہی نظر آتے تھے۔ تابان سے پوچھا گیا کہ وہ ان افراد میں سے کسی کو جانتا ہے۔ تابان نے غور سے ایک ایک کا چہرہ دیکھا لیکن کسی کو شناخت نہ کر سکا۔ اس موقع پر اس نے ایک بار پھر داروغہ سے پوچھا کہ ان لوگوں کو کیوں شناخت کرایا جا رہا ہے۔ داروغہ نے حسب سابق اسے ٹال دیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ ایک بار پھر گھوڑا گاڑی پر سوار تھے اور واپس عوفی جا رہے تھے۔ راستے میں بھی تابان نے داروغہ سے اس کارروائی کے متعلق پوچھنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ داروغہ نے صرف اتنا بتایا کہ حکام ہلاک کی طرف سے

تابان نے پُرسوج انداز میں کہا۔ ”ایک طریقہ اور ہے۔۔۔۔۔۔ ہتھ کے روز میں اکیلا چلا جاؤں اور بادشاہ پوچھتے تو کہہ دوں کہ وہ بیمار تھی۔“

شمال کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لئے چمک نمودار ہو کر غائب ہو گئی۔ وہ سرد آہ بھر کر بولا۔ ”نہیں اس میں بھی اندیشہ ہے۔۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔۔ تم ایسا کرو کہ فی الحال اسے اپنے پاس ہی رکھو۔ یہ عبادت والا مرحلہ گزر جائے تو پھر سوچ لیں گے۔“ تابان کے چہرے سے افسردگی ٹپکنے لگی۔ جیسے وہ بھی شمال کی بد قسمتی میں برابر کا شریک ہو۔ شمال کورا کو دزدیدہ نظروں سے دیکھتا ہوا حویلی سے واپس چلا گیا۔

☆-----☆-----☆

شاہ مقدونیہ کی عنایت کردہ حویلی میں تابان نے پانچ چوبیس یوم خوب آرام میں گزارے۔ اس نے زندگی میں کبھی ایسی راتوں کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اس کے سینے کا زخم بھی اب پہلے سے بہتر تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک ایسی ہستی اس کے سامنے تھی جو ایک عرصے تک غلوٹ اور جلاوت میں مارشا کی ساتھی رہی تھی یعنی کورا۔ تابان کورا کو سامنے بٹھا کر سپروں دیکھتا رہتا۔ اسے کورا سے عجیب طرح کا انس ہو گیا تھا اور اس انس کی وجہ صرف یہ تھی کہ کورا کا تعلق شہزادی مارشا سے تھا۔ تابان کا دل چاہتا تھا وہ ان ہونٹوں، ان آنکھوں اور رخساروں پر ہزار جان سے فدا ہو جائے جن کے حسن پر مارشا کے حسن کا سایہ پڑتا رہا ہے۔ وہ کورا سے شہزادی مارشا کی باتیں کرتا۔ شہزادی کے روز و شب کا تذکرہ سنتا اور اس کی عادات اور روز مرہ مصروفیات کے بارے میں جانتا۔ جب کورا یہ سب کچھ بتا رہی ہوتی وہ اتنا محو ہو جاتا کہ اسے اپنے آپ کی خبر نہ رہتی۔ ایک روز اس نے کورا سے ان آخری لمحوں کا حال پوچھا جب مارشا اس سے جدا ہوئی تھی۔ کورا نے بتایا اس روز شہزادی صبح سے ہی پریشان تھیں۔ وہ خطرے کو پہلے سے بھانپ لینے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔ انہوں نے اس روز صبح سویرے فساد کو لباس تبدیل کیا اور کہا کہ آج وہ خیرات کرنا چاہتی ہیں وہ محل سے باہر آئیں اور سہ پہر تک مسلسل اپنے ہاتھوں سے خیرات بانٹتی رہیں۔ انہوں نے دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا۔ سہ پہر کے وقت وہ خواب گاہ میں آرام کرنے کے لئے چلی گئیں۔ اس دوران خبر پہنچی کہ سکندر کی فوج نے فیصلیہ توڑ دی ہے۔ شہزادی مارشا نے مجھے آقا غارس زلوب کی طرف دوڑایا۔ وہ ان کی زبانی اس خبر کی تصدیق چاہتی تھیں۔ میں آقا کو ڈھونڈتی ہوئی محل کے مزارعے حصے میں پہنچی تو مقدونی فوج کا ایک دستہ محل پر حملہ آور ہو چکا تھا۔ اس کے بعد قیامت کی گھڑیاں آئیں۔ میں نے

عالم ملا تھا جو انہوں نے پورا کیا ہے۔
 تابان یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ کہیں اس کارروائی کا تعلق شہزادی مارشا سے تو نہیں..... لیکن شہزادی تو سکندر کی حفاظت میں تھی..... نہ جانے کیوں تابان کو شہزادی کے معاملے میں کچھ الجھن محسوس ہونے لگی تھی۔ چند روز پہلے بھی مقدونی فوج کا ایک سردار اس کے پاس آیا تھا اور عجیب و غریب سوالات کرتا رہا تھا۔ ان سوالوں سے تابان کو اندازہ ہوا تھا کہ یہ شخص شہزادی مارشا کے عزیز و اقرباء کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ جو باتیں وہ تابان سے پوچھ رہا تھا وہ ساری باتیں مارشا سے بھی پوچھی جاسکتی تھیں بلکہ بہتر تھا کہ اسی سے پوچھی جاتیں۔ اسی ادھیڑ میں میں گرفتار تابان واپس حویلی میں پہنچا۔ شاید وہ رات بھر اس معاملے پر سوچتا رہتا لیکن وہاں ایک دوسرے واقعے کی وجہ سے اس کی توجہ ہٹ گئی۔ حویلی میں سردار شلال آیا بیٹھا تھا۔ آج سردار داراب اس کے ساتھ نہیں تھا۔ تابان نے دیکھا شلال کے چہرے پر برہمی کے آثار ہیں۔
 بظاہر وہ تابان کے ساتھ اخلاق ہی سے پیش آیا۔

کئے لگا۔ ”تابان! تم نے کہا تھا کہ کورا ہفتے کو شہابی محل میں دعا پڑھے گی لیکن میرے علم میں یہ بات نہیں آئی۔ مذہبی رسوم میں نکل چار لڑکیاں شرکت کریں گی اور ان میں کورا کا نام نہیں ہے۔“

تابان نے اطمینان سے کہا۔ ”کورا کی شرکت کے بارے میں بادشاہ نے مجھ سے زبانی کہا تھا..... اور ہفتے کون سا دور ہے پرسوں آپ خود دیکھ لیجئے گا شاید آپ شک کر رہے ہیں۔“

شلال نے جلدی سے کہا۔ ”نہیں شک کی کوئی بات نہیں لیکن اس سے پہلے بھی ایسا ہوا نہیں شاید.....“

تابان نے کہا۔ ”آپ بے فکر رہیں میں جو کہہ چکا ہوں وہی ہو گا ہفتے کی شب کورا آپ کے پاس ہوگی۔“

شلال کچھ دیر تابان کے پاس رکنے کے بعد واپس چلا گیا۔ وہ کوئی بچہ نہیں تھا۔ مقدونی فوج کا ایک اہم سردار تھا۔ تابان صاف محسوس کر رہا تھا کہ وہ شک میں پڑ گیا ہے۔ اب تابان کو کورا کی فکر لاحق ہوئی۔ وہ جلد از جلد اس منظر سے بٹا دینا چاہتا تھا۔ اس کام کے لئے وہ منصوبہ تو پہلے ہی تیار کر چکا تھا۔ اب صرف بہتر موقع کی تلاش تھی۔
 اگلی شب تابان نے کورا کو تیار ہونے کی ہدایت کی۔ اس نے ریشم کا زوق برق

لباس پہنا اور ہٹاؤ سنگھار کر کے آئی۔ تابان نے رتھ بان کو حکم دیا کہ وہ رتھ حویلی کے صدر دروازے پر لے آئے۔ حویلی کے دروازے سے تابان کو دراکے ساتھ رتھ پر سوار ہوا اور سیر کے لئے نکل گیا۔ یہ پورے چاند کی رات تھی۔ زرد چاندنی بال کھولے، اجتناب کے برپا شدہ در و دیوار پر رو رہی تھی۔ دراکھ کے ڈھیر، سنگ مرمر کے ٹکڑے اور بدلو۔ یہ تھی اس شہر کی کل متاع۔ رتھ شہر سے نکل کر مضائقہ علاقے میں آیا۔ یہاں فضا قدرے صاف اور زندگی معمول پر تھی۔ قابض مقدونی فوج کے کئی افسر اور سردار ہوا خوری کے لئے نکلے ہوئے تھے۔ ان کی گھوڑا گزیاں اور رتھ ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ تابان کے حکم پر تابان کا رتھ بان ایک عجیب و غریب کا بجا بھانے لگا۔ گھوڑوں کی ٹانگیں اس باجے سے ہم آہنگ ہو گئیں۔ یوں لگا جیسے چاند بھی اس دھن سے متاثر ہوا ہے اور موسیقی کی کشش اسے ساتھ ساتھ لئے آ رہی ہے۔ تابان نے نشہ آور مٹراب کے کئی گھونٹ بھرے اور باجے کے نغے کو پاؤں کی تھاپ دینے لگا۔ شہر سے چند کون دور جب رتھ ندی کے ساتھ ساتھ چلا ایک سنسان سڑک پر مڑ رہا تھا اور رتھ بان مت ہو کر پورے جوش سے بجا بجا رہا تھا۔ تابان بہ آہستگی اٹھا اور اپنی تلوار کا دست پورے زور سے رتھ بان کے کھوپڑے پر دے مارا۔ وہ باجے سمیت لڑھک کر رتھ سے نیچے جا گرا۔ تابان نے چابک دستی سے رتھ سنبھال لیا۔

رتھ رکتے ہی تابان نے اپنے لہارے کے اندر سے ایک میٹلی سی چادر نکال کر کورا کے سر پر ڈال دی۔ پھر اسے رتھ سے نیچے اتارا اور کھیتوں کے درمیان سے گزار کر ایک راستے پر لاکھڑا کیا۔ اس نے کورا سے کہا کہ وہ اس راستے پر سیدھی چلی جائے تو تھوڑی ہی دیر میں ایک گاؤں تک پہنچ جائے گی۔ یہ گاؤں مقدونی فوجیوں سے بالکل محفوظ ہے اور وہاں اسے با آسانی پناہ مل سکے گی۔ کورا نے اٹک بار نظروں سے تابان کی طرف دیکھا۔ چاندنی میں نمائے ہوئے وہ دونوں تھوڑی دیر گم صم کھڑے رہے پھر کورا نے گھوگر آواز میں کہا۔

”مالک! میں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔ آپ انسان نہیں دیوتا ہیں۔“
 تابان بے دھتکے پن سے مسکرایا۔ ”یہ صرف آپ کا خیال ہے ورنہ میں آقاؤں کی فحشوں میں رہنے والا ایک بھگوڑا غلام ہوں۔ مجھ جیسا کتر شخص یونان میں شاید ہی آپ کو کوئی ملے گا۔“

کورا نے سسکی لے کر کہا۔ ”مالک! آپ شہزادی حضور کو تلاش کریں نہ جانے

تہذیب پر پیش کرنے کے بعد وہ پانچوں کمرے سے نکل آئے۔ اس ملاقات کے دوران سکندر نے تہاں سے کورا کا ذکر بائبل نہیں کیا تھا۔ نہ ہی اس کی پیشانی پر بندھی پٹی کے بارے میں پوچھا تھا۔ آثار سے لگتا تھا کہ اسے سب کچھ معلوم ہے تاہم شلال مسلسل تہاں کو گھورتا رہا تھا۔ کمرے سے باہر آنے کے بعد اس کی آنکھوں میں غضب کی کیفیت اور شدت پکڑ گئی۔ تہاں نے اسے مخاطب کر کے کہا۔

”سردار! آپ کا کمنا درست تھا۔ وہ لڑکی واقعی خطرناک نکلی۔ قسمت اچھی تھی جو جان بچ گئی ورنہ اس بد بخت نے کوئی کسراٹھائیں رکھی تھی۔“

شلال نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”جب کسی کو اس کی اوقات سے بڑھ کر نواز دیا جائے تو ایسا ہی ہوتا ہے بادشاہ کو سوچنا چاہئے تھا کہ تم اس لڑکی کو سنبھال بھی سکتے ہو یا نہیں۔“

ایک دوسرے سردار نے مسکرا کر کہا۔ ”جس نے ساری عمر غلامی میں گزاری ہو اسے آقا کی کالیقہ اتنی جلدی کیسے آسکتا ہے۔“

دوسرے سرداروں کی موجودگی میں شلال کھل کر بات نہیں کر رہا تھا ورنہ اس کی چمکدار بھوری آنکھوں سے صاف ظاہر تھا کہ وہ تہاں پر شک کر رہا ہے، اسے خدشہ ہے کہ لڑکی بھاگی نہیں بھوگائی گئی ہے۔ کچھ دیر تہاں سے طنزیہ گفتگو کرنے کے بعد سردار شلال اور دوسرے سردار گھوڑا گاڑی میں بیٹھ کر چلے گئے۔ تہاں بھی ایک دوسری گھوڑا گاڑی کے ذریعے اپنی رہائش گاہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆-----☆-----☆

ٹھیک دو روز بعد تہاں اپنے چاروں ساتھیوں کے ساتھ ایشیائی ساحل کی مم پر روانہ ہو رہا تھا۔ وہ ایتھنز سے ممی گھروں کے روپ میں روانہ ہوئے۔ میلے کپیلے لباس، ناتراشیدہ داڑھیاں ایک بڑی کشتی میں ان کے جال اور دیگر ساز و سامان رکھا تھا۔ روانگی سے پہلے سردار شلال نے زیوس دیوتا کی مورتی کے سامنے شراب کے جام پائے اور عبادت کی۔ زیوس دیوتا کو مسافروں کا محافظ سمجھا جاتا تھا اور سفر سے پیشتر اس کی خوشنودی حاصل کی جاتی تھی۔ تہاں یہ ساری کارروائی خاموشی سے دیکھتا رہا۔ دل ہی دل میں وہ اپنے ہمراہیوں پر ہنس رہا تھا۔ اسے دیوی دیوتاؤں کے سامنے ادا کی جانے والی مذہبی رسومات سے ہمیشہ چڑ رہی تھی۔ ایسے موقعوں پر نہ جانے کیوں اس کا بھی کسی مزیدار گستاخی کو چاہئے لگتا تھا۔

آخر رسومات ختم ہوئیں اور ان کی بادیانی کشتی دھیرے دھیرے یونانی ساحل سے دور ہونے لگی۔ تہاں کی نگاہیں خود بخود کشتی کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ دور ایتھنز کے درودیوار کو دیکھنے لگا۔ وہ درودیوار جو بد نصیبی کی تاریک چادریں میں چھپے ہوئے تھے۔ ایتھنز سے دور جاتے ہوئے نامعلوم کیوں تہاں کا دل بو جھل ہو گیا۔ اسے اس شہر سے عجیب وابستگی پیدا ہو گئی تھی یہ حسن و جمال کی مہیاں دیوی مارشا کا شہر تھا..... کاش وہ رخصت ہونے سے پہلے ایک بار مارشا کو دیکھ سکتا۔ وہ مارشا کو انجانے فطروں میں چھوڑ کر جا رہا تھا۔ اسے رو کر احساس ہو رہا تھا کہ مارشا کے معاملے میں کوئی الجھن موجود ہے۔ کوئی بات جو اس سے چھپائی گئی ہے اور یہ بات چھپانے والا خود سکندر ہے۔ تہاں نے اس سے درخواست کی تھی کہ وہ مارشا کو ایک بار دیکھنا چاہتا ہے۔ جواب میں سکندر نے اسے بری طرح جھڑک دیا تھا اور وعدہ کیا تھا کہ وہ سفر سے واپسی پر مارشا کو تہاں کے حوالے کر دے گا۔ یہ ایک بادشاہ کا وعدہ تھا تہاں کے لئے اس وعدے پر اعتبار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا، لیکن وہ دلی طور پر مطمئن نہیں تھا۔

شمال مشرق کی طرف چلنے والی مدھم ہوا سے بادیان پھڑپھڑا رہے تھے۔ یہ بجز نما کشتی دھیمی رفتار سے تاریک سمندر میں موج سفر تھی۔ لیکام تہاں کو اپنے خیالوں سے چونکنا پڑا۔ کشتی کے اندرونی حصے سے تہاں کا ایک ہمراہی اسے آوازوں دے رہا تھا۔ تہاں اندر پہنچا چاروں سردار دبیز ایرانی قاتلین پر بیٹھے خوش گلیوں میں مصروف تھے۔ سردار شلال نے تہاں سے کہا کہ قہوہ پینے کو طبیعت چاہ رہی ہے۔ وہ کشتی کے مطبخ میں جا کر قہوہ بنالائے لیکن اس سے پہلے ایک دفعہ بادیانوں کو اچھی طرح دیکھ لے۔ تہاں نے سر جھکا کر سردار کی اطاعت کا اظہار کیا۔ باہر جا کر بادیانوں کے رے وغیرہ درست کئے پھر کشتی کے عقب میں واقع ایک چوٹی کو ٹھری میں جا کر قہوہ تیار کرنے لگا۔ قہوہ بنا کر وہ واپس کمرے میں پہنچا اور یہاں میز پر سجادیں۔ چاروں سرداروں نے میز کے گرد نشستیں سنبھال لیں لیکن تہاں کی پہلی زمین پر رکھ دی گئی۔ اس حرکت کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا کہ تہاں کو نیچے بیٹھ کر قہوہ پینا ہوگا۔ وہ کچھ دیر گم صم کھڑا رہا۔ پھر پانی اٹھائی اور سر جھکا کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ اس پر پوری طرح واضح ہو گیا تھا کہ وہ اس مم میں ایک ساتھی سے زیادہ ایک غلام کی حیثیت سے شامل ہے۔ سردار شلال اور دوسرے مقدونی سردار اسے وہ درجہ دینے پر ہرگز تیار نہیں تھے جو اسے سکندر نے دیا تھا۔ تہاں کو اس انکشاف پر کچھ زیادہ حیرت نہیں ہوئی وہ اپنی اوقات اچھی طرح جانتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ

کشتی غلہ رخ پر نہ نکل جائے مگر اس صورت حال میں باہر جانے کی ہمت کون کرتا۔ ظاہر تھا یہ کام تہاں ہی کو کرنا تھا۔ سردار شمال کا اشارہ پا کر وہ اٹھا اور بادبان گرانے میں مصروف ہو گیا۔ اس دوران بارش اور تیز ہو گئی۔ سرد ہوا تہاں کے جسم کو چھیدنے لگی۔ جس وقت وہ بادبان گرا کر فارغ ہوا کشتی میں بارش کا پانی جمع ہونا شروع ہو گیا تھا۔ پانی باہر نکالنے کی ضرورت تھی۔ قیمتی بات تھی کہ یہ فرض بھی تہاں ہی کو انجام دینا تھا، لہذا سردار شمال کے حکم سے پہلے ہی اس نے پانی کھینچنے والا برتن اٹھایا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ جتنا پانی وہ نکال رہا تھا اس سے کچھ زیادہ ہی جمع ہو رہا تھا۔ تہاں کا خیال تھا کہ ان میں سے کوئی نہ کوئی اس کا ہاتھ بٹانے ضرور آئے گا لیکن یہ خیال بھی خام ہی ثابت ہوا۔

بارش برستی رہی اور تہاں اپنے کام میں لگا رہا۔ کسی وقت جب بارش ہلکی ہو جاتی وہ چند گھنٹا بیٹھ کر سانس لے لیتا۔ رات تیسرے پھر بارش کا زور ٹوٹ گیا اور اس کے ساتھ تہاں کی مشقت بھی کم ہو گئی۔ دفعتاً اسے کشتی کے تہ خانے سے مدھم آوازیں سنائی دیں جیسے کوئی زور زور سے لکڑی کے تختے پر ہاتھ مار رہا ہو۔ یہ آوازیں پچھلے چار روز میں تہاں نے کئی مرتبہ سنی تھیں۔ پہلے پہل تو وہ اسے پانی ٹکرانے کی صدا سمجھا تھا لیکن اب اس کا خیال بدلتا جا رہا تھا۔ خیال بدلنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ تہ خانے میں اترنے والا دروازہ ہر وقت بند رہتا تھا۔ صرف سردار شمال دو تین دفعہ تہ خانے میں اترتا تھا اور وہ بھی بڑی احتیاط کے ساتھ جیسے کوئی چوری کر رہا ہو۔ تہ خانے کے دروازے پر ایک موٹا قفل لگا ہوا تھا اور اس کی چابی سردار شمال کے پاس تھی۔

قفل کھولنا تہاں کے لئے کوئی مشکل کام نہیں تھا لیکن وہ اس شش و پنج میں تھا کہ ایسا کرنا ٹھیک رہے گا یا نہیں۔ مقدونی سرداروں کا رویہ تو پہلے ہی ٹھیک نہیں تھا کوئی اور بد مزگی ہو جاتی تو پورا سفر ہی خطرے میں پڑ جاتا۔ وہ انہی سوچوں میں گم تھا کہ لکڑی پر ضربوں کی صدا پھر آنے لگی۔ رات کے سناٹے میں یہ صدا اٹھنا واضح تھی۔ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ تہ خانے میں کوئی جاندار موجود ہے۔ تہاں نے دبے پاؤں جا کر کشتی کے اندرونی حصے میں جھانکا۔ اس کے ہمراہی سو رہے تھے۔ وہ خاموشی سے واپس آیا تھی میں سے تھوڑا سا پانی کھینچا پھر لمبی کی چال چلتا تہ خانے کے دروازے کی طرف آیا۔ یہ دروازہ ایک تختے کی صورت میں تھا جس نے تہ خانے میں اترنے والے خلا کو ڈھانپ رکھا تھا۔ دروازہ بند ہو کر فرش کا حصہ بن جاتا تھا۔ تہاں نے گھٹنوں کے بل جبک کر

ایک غلام ہے اور مقدونی سرداروں کی نظر میں غلام ہی رہے گا۔

اگلے تین چار روز میں اس کے اندازے بالکل درست ثابت ہوئے۔ سردار شمال اور دوسرے مقدونی سرداروں کا تعاقب آمیز رویہ کھل کر سامنے آ گیا۔ وہ سارا دن اس سے گدھے کی طرح کام لیتے۔ پچا کھچا کھانا دیتے اور ان کی زہریلی نگاہیں ہر گھڑی اس کا تعاقب کرتیں۔ تہاں نے بڑی سرعت کے ساتھ ان حالات سے بھجھوتہ کر لیا تھا۔ وہ بڑی خوشدلی کے ساتھ مقدونی سرداروں کی خدمت میں مصروف رہتا۔ ان کے لئے کھانا پکاتا، ان کے بستر درست کرتا، ان کے لئے مچھلیاں پکڑتا اور بادبانوں سے دست و گربان ہو کر کشتی کا رخ درست رکھتا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ جوں جوں امتحان کے ساحل سے دور آرہے ہیں مقدونی سرداروں کا رویہ سخت ہوتا جا رہا ہے۔ ان میں سے صرف ایک ریخا نامی سردار کبھی کبھی اسے ہر دم کی نظروں سے دیکھ لیتا تھا لیکن دلجوئی کی بات کبھی اس نے بھی نہیں کی تھی۔

یوں تو امتحان کے سرائے تک کا سفر زیادہ طویل نہیں تھا لیکن وہ راستے کے چھوٹے چھوٹے جزیروں پر رکتے ہوئے جا رہے تھے۔ یہ تمام جزیرے نہایت خوش نما اور آباد تھے۔ ان میں زیادہ تر یونانی آباد تھے لیکن یہ یونانی آزادانہ طور پر رہ رہے تھے۔ انہیں یونان اور ایران کی چپقلش سے کوئی واسطہ نہیں تھا وہ صرف اپنی خوشحالی پر رقرار رکھنے کی فکر میں رہتے تھے۔ سکندر اور اس کے مصاحبین کا خیال تھا ان میں سے بعض جزیروں کے حکمرانوں کی ہمدردیاں ایرانیوں کے ساتھ ہیں۔ سردار شمال اور اس کے ساتھی چونکہ مابی گہروں کے روپ میں تھے اس لئے پچھلے تین روز میں انہوں نے کھلے سمندر سے جو مچھلیاں پکڑی تھیں وہ انہی جزیروں میں فروخت کر دی تھیں اس سے نہ صرف انہیں جزیروں کے لوگوں کو ایک نظر دیکھنے کا موقع ملا تھا بلکہ مچھلیوں کے عوض ضرورت کی اشیاء بھی حاصل ہوئی تھیں۔ ابھی تک اپنے سفر میں کہیں بھی انہیں ایرانی بحری بیڑے کے جہاز نظر نہیں آئے تھے۔

یہ سفر کے چوتھے روز کا واقعہ ہے۔ ان کی کشتی جزیروں سے دور کھلے سمنان سمندر میں رواں تھی۔ شام سے تھوڑی ہی دیر بعد مطلع ابر آلود ہونے لگا۔ سمندر کے پُر سکون پانی میں ہلکی ہلکی موجیں اٹھ رہی تھیں۔ وہ پانچوں کھانا وغیرہ کھا کر لیٹ گئے۔ رات کسی پہرے کے بعد دیکھے ان کی آنکھ کھلی۔ موسم شدت اختیار کر چکا تھا۔ سمندر میں تلاطم تھا اور بارش ہو رہی تھی۔ بادبان گرانے کی ضرورت تھی تاکہ ہوا کی شدت سے

دروازے کی درز سے کان لگا دیے۔ کچھ دیر سن گئی رہا کوئی آواز نہیں آئی۔ اس نے اپنی قفل کی مدھم ضربوں سے دروازے پر دستک دی یکایک اندر سے وہی کھٹ پٹ کی صدا آئے لگی۔ صدا کے آہنگ سے ظاہر تھا کہ اندر جو کوئی بھی ہے انسان ہے، لیکن اگر انسان ہے تو پھر چیختا چلاتا کیوں نہیں.....؟ شاید اس کا منہ بند کر دیا گیا تھا۔

تھوڑی دیر اندر کی آوازیں سننے کے بعد تباہان دو زانو بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے ہتھکے پاؤں میں سے ایک اپنی چوٹی نکالی یہ چوٹی دیکھی تھی جیسی غار سے زونب نے اس سے چھینی تھی۔ ابھی وہ چوٹی کو قفل کی طرف بڑھائی رہا تھا کہ عقب سے کھٹ پٹ کی صدا آئی۔ اس نے جلدی سے چوٹی لباس میں رکھ لی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ مڑ کر دیکھا تو سردار شلال سامنے کھڑا تھا اس کی جلتی نگاہیں تباہان کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

”میل کیا کر رہے تھے؟“ اس نے درشت آواز میں پوچھا۔

تباہان نے اطمینان سے کہا۔ ”جناب! نیچے سے آوازیں آرہی تھیں۔ جیسے کوئی لکڑی کے تختے پر ضربیں لگا رہا ہو۔“

”ہوں..... بہت ہو شیار ہو تم‘ لومڑی کی طرح عیار ہو۔“

تباہان نے سر جھکالیا جیسے جو کچھ سردار نے کہا ہے اسے صدق دل سے تسلیم کر رہا ہو۔ اس کے انداز سے سردار کو اور تاؤ آیا۔ پھر کھار کر کہنے لگا۔ ”بڑا شوق ہے تمہیں تہ خانے میں دیکھنے کا؟ دکھا دیں گے ذرا ایک دو دن ٹھہر جاؤ۔“

جیسے آپ کی مرضی۔“ تباہان نے ہاتھ باندھ کر کہا۔

”اب جاؤ جو کام تمہارے ذمے تھا وہ کرو۔“

تباہان خاموشی سے گھوم کر باہر اٹھیا اور پانی کھینچنے والے برتن کے ذریعے پانی کھینچنے

لگا۔

تباہان ایک سخت جان شخص تھا لیکن گوشت پوست کا تھا۔ تمام رات سردی میں بیٹھنے کی وجہ سے اگلے روز اسے تیز بخار ہو گیا۔ بخار ہی کی حالت میں وہ سارا دن کام میں جتا رہا۔ شام کو اس کی حالت زیادہ خراب ہو گئی۔ اس کا تھمبایا ہوا چہرہ اور سرخ انگارہ آنکھیں دیکھ کر برضا کو اس پر ترس آ گیا۔ اس نے سردار شلال سے اسے آرام کرنے کی اجازت لے دی۔ فراغت پاتے ہی تباہان مڈھال ہو کر بستر پر گر گیا۔ اس کا سارا جسم درد سے پھٹ رہا تھا اور سینے میں آگ سی روشن تھی۔ بخار کی وجہ سے اس پر غنودگی طاری ہو گئی اور وہ عجیب بے سرو پا خواب دیکھنے لگا۔ کبھی وہ خود کو گھوڑوں اور خونخوار کتوں کے

آگے بھاگتے ہوئے پاتا۔ کبھی خود کو آہنی شکنوں میں جکڑا ہوا دیکھتا اور یونانی آقاؤں کے کوڑے تاج توڑ اس کے جسم پر برستے۔ وہ چیخا لیکن اس کے حلق سے اپنی آواز کی بجائے کسی نامعلوم جانور کی آواز نکلتی۔ پھر اس نے شراوی مارشا کو دیکھا وہ شراب سے بھرے ہوئے ایک بہت بڑے بلوری جام میں تیر رہی تھی۔ اس کا سانس پھول چکا تھا۔ وہ ڈوب رہی تھی اور تباہان کو مدد کے لئے پکار رہی تھی۔ یہ جام ایک بہت بڑے ہاتھ میں تھا۔ تباہان سوچنے لگا، پاؤں سے بھرا ہوا یہ مضبوط ہاتھ کس کا ہے..... شاید کسی مقدونی سردار کا..... شاید خود شاہ مقدونیہ کا۔

اس کا دل غم سے پھٹنے لگا۔ وہ پاگلوں کی طرح اس جام کے گرد پھرانے لگا۔ یکایک ایک خوشنما آواز نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ وہ اس آواز کی طرف کھینچا چلا گیا۔ کھیتوں سے گھرے ہوئے ایک طویل راستے سے گذر کر وہ ایک گاؤں میں پہنچ گیا۔ یہاں اس نے کورا کو دیکھا وہ ایک محفوظ چار دیواری میں بند دو لوگوں کے درمیان موجود تھی۔ اسے دیکھ کر تباہان تھوڑی دیر کے لئے مارشا کا بے پناہ غم بھول گیا۔ باتیں کرتے کرتے اچانک کورا کے گلے سے سردار شلال کی آواز نکلنے لگی..... تباہان پریشان ہو گیا اور اس وقت اسے اندازہ ہوا کہ وہ خواب سے بیدار ہو چکا ہے اور کشتی میں اپنے بستر پر لیٹا ہوا ہے۔ اس سے کچھ فاصلے پر سردار شلال اپنے ساتھیوں سے باتیں کر رہا تھا۔ کشتی کھلے سمندر میں تھوڑی سی سفر تھی۔ غالباً رات کا دوسرا پہر ختم ہونے والا تھا۔ سردار شلال دوسرے پہر کے آغاز پر شراب نوشی شروع کر رہا تھا اور پہر ختم ہونے تک مدہوش ہو جاتا تھا۔ اس وقت وہ مدہوش ہو رہا تھا۔ تینوں مقدونی سرداروں کی آوازیں بھی لڑکھرائی تھیں۔ وہ ابھی تک تباہان کو جو خواب سمجھ رہے تھے اس لئے کھل کر باتیں کر رہے تھے۔

سردار شلال کہہ رہا تھا۔ ”میرا تو خیال ہے کل ٹھیک رہے گا کل ہم بالکل محفوظ علاقے میں ہوں گے۔“

ایک سردار نے اختلاف کیا۔ ”یہ کون سا غیر محفوظ علاقہ ہے۔ ایٹھنر سے ہم دور نکل آئے ہیں کھلا سمندر ہے۔ کوئی جزیرہ بھی قریب نہیں میری رائے میں تو آج تماشا ہو جانا چاہئے۔“

سردار شلال نے کہا۔ ”بادشاہ کے ہاتھ بہت لمبے ہوتے ہیں اور اس کی نگاہیں بہت فاصلے تک دیکھ سکتی ہیں۔ ہم ایٹھنر سے دور ہیں لیکن اتنے بھی دور نہیں۔ جہاں اتنے دن انتظار کیا ہے ایک دن اور کرلو۔“

پاؤں بندھ گئے تو ایک سردار نے بے دردی سے اس کی پیلیوں میں ٹھوکر ماری۔ وہ کراہ کراٹھ بیٹھا۔ سردار شلال نے جھپٹ کر اس کے دونوں بازو پشت کی طرف موڑ دیئے اور ریخا جلدی جلدی کھائیوں کو رسی سے جکڑنے لگا۔ تباہان حیرت سے اپنے ہمراہیوں کو دیکھ رہا تھا۔

”جناب! یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟“ اس نے سردار شلال سے پوچھا۔
 ”جو کچھ ہو رہا ہے وہ تمہارے علم میں آجائے گا۔“ زہریلے لہجے میں جواب ملا۔
 ”لیکن جناب میرا قصور؟“
 ”قصور تمہارا نہیں تمہارے گندے خون کا ہے جس میں اپنے آقاؤں سے بے وفائی اور دغا بازی رچ بس چکی ہے۔“
 ”میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا مالک۔“

”ہم ابھی پوری وضاحت سے سمجھا دیتے ہیں۔“ شلال نے زہر خند لہجے میں کہا۔
 تمہ خاٹے کا دروازہ کھلا تھا اور اندر سے اکھاڑ بچھاڑ کر آوازیں آرہی تھیں۔ تباہان کی نگاہیں تمہ خاٹے کے خلا پر مرکوز ہو گئیں۔ چند لمحوں اور بیت گئے..... اور پھر تباہان کی آنکھوں نے ایک ناقابل یقین منظر دیکھا۔ اسے لگا جیسے سینے میں دل کی حرکت ختم ہو گئی ہے۔ تمہ خاٹے کے خلا سے کورا برآمد ہو رہی تھی۔ وہ نیچے سرخس۔ تباہان کی طرح اس کے ہاتھ بھی پشت پر بندھے تھے۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اوپر سے پنی باندھ دی گئی تھی۔ وہ اسی لباس میں تھی جس میں تباہان نے ایک ہفتہ پہلے اسے ایجنٹر کے نواتی گاؤں میں چھوڑا تھا۔ کورا کے پیچھے ہی پیچھے ایک مقدونی سردار برآمد ہوا اس کے ہاتھ میں عریان تلوار تھی جس کی نوک وہ بار بار کورا کے جسم سے لگا دیتا تھا۔ سردار شلال نے تباہان سے مخاطب ہو کر کہا۔

”کیا خیال ہے اب تو تمہارا قصور بتانے کی ضرورت نہیں؟“

تباہان خشک لبوں پر زبان پھیر کر رہ گیا کٹنے سننے کو اب کچھ باقی نہیں رہا تھا۔ معلوم نہیں سردار شلال نے کورا کا کھوج کیسے لگایا تھا اور کیونکر اسے یہاں تک لانے میں کامیاب ہوا تھا۔ ہر حال اب وہ اس کے سامنے تھی۔ کورا کی بد نصیبی کا سوچ کر تباہان کا دل غم سے لبریز ہو گیا۔ اس نے اپنے ہاتھ پاؤں کو حرکت دینا چاہی لیکن اب اپنے جسم پر اس کا اختیار بہت کم رہ گیا تھا۔ اس نے سوچا کاش چند گھنٹا پہلے اسے اس قیامت کا علم ہو جاتا۔ اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایسا کچھ ہو سکتا ہے۔ اب وہ حیرت سے

تیسرے سردار نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے کل تک ہم ٹرائے کے نزدیک پہنچ جائیں۔ منزل قریب آجائے تو سفر کا مزا ختم ہو جاتا ہے اس کھلے سمندر میں تفریح کا جو لطف ہے ایشیائی ساحل کے قریب نہیں ہو گا۔“

سردار شلال تذبذب میں دکھائی دے رہا تھا..... کچھ دیر یہ گفتگو مزید جاری رہی۔ آخر سردار شلال ساتھیوں کا ہم خیال نظر آنے لگا۔ اس نے مقدونی سرداروں سے کہا۔ ”لیکن یہ نہ ہو کہ ہم اپنے حال میں مگن ہو کر ارد گرد کو بھول جائیں۔ ہوا کافی تیز ہے بہتر ہے کہ ہم میں سے ایک باہر رہے اور کشتی کو درست سمت میں چلاتا رہے..... اور ہاں اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دو۔ ہمیں اس کے بارے میں کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہئے۔“

ایکایک تباہان کے جسم میں برق سی دوڑ گئی۔ اس کے لئے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ ہاتھ پاؤں باندھنے کی جو بات کی جا رہی ہے وہ خود اسی کے بارے میں ہے۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی یہ کیا معاملہ ہے۔ یہ کس تفریح کی بات ہو رہی ہے اور اس تفریح کے لئے تباہان کے ہاتھ پاؤں باندھنا کیوں ضروری ہے؟ وہ وہ کر اس کا دھیان تمہ خاٹے کی طرف جا رہا تھا اور اس کی چھٹی جس گواہی دے رہی تھی کہ اس ساری گفتگو کا تعلق تمہ خاٹے کے اسرار سے ہے۔

ایک دوسرے سردار کی آواز آئی وہ سردار شلال سے مخاطب ہو کر کہہ رہا تھا۔
 ”جناب ہاتھ پاؤں باندھنے کی کیا ضرورت ہے۔ بس غیر مسلح کر دیتے ہیں۔“
 سردار شلال نے غصیلی سرگوشی میں کہا۔ ”تم زیادہ ہر کوئیس بننے کی کوشش نہ کرو۔ جو میں کہہ رہا ہوں وہ کرو۔“

چند لمحوں بعد تباہان کو اپنے بالکل قریب قدموں کی چاپ سنائی دی۔ کوئی بالکل پاس کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر ایک ہاتھ حرکت میں آیا اور پیش قبض تباہان کی کمر سے جدا ہو گئی۔ تباہان آنکھیں بند کئے بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اس کے ذہن میں زبردست کشش شروع ہو چکی تھی۔ ظاہر تھا اب اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے جائیں گے۔ سوال یہ تھا کہ کیا وہ خاموشی سے ہاتھ پاؤں بندھوا لے۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کشتی میں کچھ دیر بعد کیا ہونے والا تھا۔ ممکن تھا کہ وہ کوئی بہت اہم واقعہ ہو اور ممکن تھا کہ ایسا نہ ہو۔ تباہان اسی اوجیز بن میں تھا کہ ایک سردار نے اس کے پاؤں باندھنے شروع کر دیئے۔ اب سوچنے کا وقت نہیں رہا تھا تباہان نے فیصلہ کر لیا کہ وہ فی الحال مزاحمت نہیں کرے گا۔

آنکھیں پھاڑے کورا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ بے بسی کی تصویر بنی اس کے سامنے تھی اور بے رحم شکاری سفاک نظروں سے اس کا نشانہ لے رہے تھے۔
تہا بن نے بھرائے ہوئے لمبے میں کہا۔ ”سردار شلال“ جو کچھ تم کرو گے یہ ٹھیک نہیں ہوگا۔“

سردار شلال نے بدست قہقہہ لگایا۔ ”اور جو کچھ تم نے کیا وہ ٹھیک تھا؟ پہلے مجھے دھوکے میں رکھا کہ یہ لڑکی شادی محل میں ہونے والی عبادت میں حصہ لے گی اور جب عبادت کا دن نزدیک آیا تو اسے رتھ میں بٹھا کر شہر سے باہر لے گئے۔ رتھ بان کو بے ہوش کیا اور لڑکی کو بھگا کر خود کو بھی زخم لگایا۔ لگتا ہے امتیاز کے کسی حصار میں اداکاری کرتے رہے ہو تم۔ مگر حقیقت اور اداکاری میں بہت فرق ہوتا ہے۔ حقیقی زندگی میں ہم جو بننے والے کو کبھی کبھی کتے کی موت بھی مرنا پڑتا ہے۔“

سردار شلال کی باتوں سے ظاہر تھا کہ وہ لوگ ڈرا دھمکا کر کورا سے سب کچھ پوچھ چکے ہیں۔ کورا کے ہاتھوں کی رسی اب تلوار سے کاٹ دی گئی تھی اور اس کے منہ سے کپڑا بھی نکل گیا تھا۔ آزادی ملنے کے باوجود وہ قطعی بے بس تھی۔ چار بٹے کئے افراد کے زرخے میں وہ کیا کر سکتی تھی۔ ایک مقدونی سردار کی عیاں تلوار نے اس کے سر پر سایہ کر رکھا تھا۔ وہ لرز رہی تھی۔ بے چارگی کے عالم میں کبھی تہا بن اور کبھی مقدونی سرداروں کی طرف دیکھتی تھی۔

تہا بن نے خود کو لاچار پا کر کہا۔ ”سردار شلال! میں تم سے رحم کی درخواست کرتا ہوں۔“

سردار ڈھٹائی سے مسکرایا۔ ”کس کے لئے۔ لڑکی کے لئے یا تم دونوں کے لئے؟“
تہا بن نے کہا۔ ”کیا مطلب؟ کیا میرے خون سے ہاتھ رکنے کا فیصلہ بھی ہو چکا ہے؟“

”بالکل!“ سردار شلال نے اطمینان سے کہا۔ ”یہ فیصلہ اسی روز کر لیا گیا تھا جب تم نے اس کشتی پر پہلا قدم رکھا تھا۔“

تہا بن کی ذہن نگاہیں اپنے ہمراہیوں کے چہرے منول رہی تھیں۔ ان چہروں پر اسے اپنے اور کورا کے خون کے چھینٹوں کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ تھوک نکل کر بولا۔
”مجھے مار دو گے تو شاہ مقدونیہ کو کیا جواب دو گے؟“

شلال نے شراب کا نیا جام بھرتے ہوئے کہا۔ ”یہ تم نے قطعی غیر اہم سولل کیا

ہے۔ ایسی خطرناک مہم میں کام آجائے والے کے لئے سکندر ہم سے کیوں پوچھ گچھ کرے گا۔ ہر حال ہم اس کی نگاہوں میں تمہارا مقام بلند نہیں ہونے دیں گے۔ کوئی ایسی کمائی سنائیں گے جس سے ظاہر ہو کہ تم اپنی جلد بازی اور بے وقوفی سے موت کے منہ میں گئے تھے۔“

تہا بن نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”اگر میں کموں کہہ دوں تو جاکر شاہ مقدونیہ سے کورا کے بارے میں کچھ نہیں کموں گا اور باقی سفر میں ہر طرح تمہارا اعانت گزار رہوں گا تو.....؟“

سردار شلال نے ایک نظر تہا بن کے چہرے پر ڈالی پھر زور زور سے ہنسنے لگا۔ اس کے قہقہے سمندر کی بیکراں وسعت میں دور تک تیرتے چلے گئے۔ اس کے ہاتھوں نے بھی حتی المقدور اس کا ساتھ دیا۔ بعد مشکل اپنے قہقہوں پر قابو پاتے ہوئے اس نے تہا بن کی طرف انگلی اٹھائی اور ساتھیوں سے مخاطب ہو کر بولا۔

”دیکھ رہے ہو..... دیکھ رہے ہو۔ یہ فرق ہوتا ہے اعلیٰ اور ادنیٰ خون میں۔ موت کو سامنے دیکھا ہے تو ساری جوانمردی بھول گئی ہے۔ کتابتے لڑکی کے ساتھ جو کچھ بھی کرو“ مجھے چھوڑ دو۔ ہا ہا..... دیکھی ہے یہ ہواں مروی۔“ اس نے آگے بڑھ کر ایک زوردار ٹھوکر تہا بن کے سر میں ماری۔ غصے سے چیخ کر بولا۔

”بد بخت تیرا انجام اس لڑکی سے زیادہ برا ہوگا۔ ہم تجھے تھوڑا تھوڑا کاٹ کے سمندر میں پھینکیں گے۔ تیرا جسم تیری آنکھوں کے سامنے گوشت کی آخری بوٹی سے محروم ہوگا۔ یہ ہمارا وعدہ ہے۔ تم نے قتل کا ایسا فن کارانہ طریقہ زندگی میں کبھی نہیں دیکھا ہوگا..... تم نے کیا سمجھا تھا۔ سردار شلال کو دھوکا دے لو گے؟ شیر کے منہ سے نوالہ چھین لو گے؟ سیلاب کے تند ریلے سے ایک حقیر شے کو پچالو گے؟ اپنی طرز کے بے مثال بیوقوف ہو تم۔ تمہاری سزا بھی نوعیت میں بے مثل ہوگی۔“

سردار شلال کی خوفناک باتیں سن کر کورا رونے لگی۔ اس کی خوبصورت آنکھوں میں خوف کا سمندر موجزن تھا۔ ”خاموش ہو جا۔“ سردار شلال نے آتے ہی آتے ہرج ہرج کرکے وہ دونوں ہاتھوں سے ہونٹ ڈھانپ کر اپنی سسکیاں روکنے کی کوشش کرنے لگی۔
تہا بن کو کچھ بھائی نہیں دے رہا تھا وہ کیا کرے۔ درحقیقت وہ دونوں لوہے کے جال میں پھنس چکے تھے۔ اس ہار یک آسمان کے نیچے اور بیکراں سمندر کے اوپر وہ چار وحشیوں کے رحم و کرم پر تھے کوئی اس کشتی میں ان کی مدد کو آنے والا نہیں تھا۔ تہا بن کو اپنی جان کی

پرواہ نہیں تھی۔ ایسی پرواہ اس نے کبھی کی ہی نہیں تھی لیکن کورا کی مصیبت کا سوچ کر اس کا دل خون ہو رہا تھا وہ کسی بھی قیمت پر کورا کو بچا لینا چاہتا تھا۔ کورا جو شہزادی مارشا کی خادمہ خاص تھی اور جس کے چہرے پر تابان کو شہزادی کے حسن کا سایہ نظر آتا تھا۔ تابان نے بے پناہ قوت کے ساتھ اپنے ہاتھوں کو جنبش دیتا چاہی۔ بان کی مضبوط رسی اس کے گوشت میں ڈھنسنے لگی۔ باندھنے والوں نے اسے بڑی احتیاط سے باندھا تھا۔ وہ اپنی پاؤں کی مدد کرنے سے بالکل معذور تھا۔ یکایک اس کے کانوں میں سازوں کی آواز گونجنے لگی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا دو مقدونی سردار کانسی کے بتے ہوئے لمبے لمبے باجے بجا رہے تھے۔ سردار ریخا مطبخ سے ایک غلی دیکھ کر اٹھا لیا اور ڈھولک کی تھاپ دینے لگا۔ سردار شلال لکڑی کے فرش کو پاؤں سے بجا بجا کر بے ڈھنگے پن سے ٹاپتے لگا۔ اس کی آنکھیں نٹے سے سرخ ہو رہی تھیں۔ ٹاپتے ٹاپتے اس نے کورا کو تھام لیا اور اپنے ساتھ رقص پر مجبور کرنے لگا۔ کورا رو رہی تھی اور فریادی نظروں سے تابان کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے بعد تابان کی نگاہوں کو دیکھنے کی تاب نہ رہی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ کشتی میں کورا کی چیخیں گونجنے لگیں۔ سردار شلال اسے نوچ کھسوت رہا تھا۔ تابان نے سانس روک کر اپنے جسم کی پوری قوت صرف کی اور اس کی کلاسیوں پر لمپنی ہوئی رسیوں میں سے ایک رسی تراخ سے ٹوٹ گئی۔ رسی ٹوٹنے کی آواز خطرناک ثابت ہو سکتی تھی لیکن بے ہنگم موسیقی کے شور نے اس آواز کو دبایا۔ اب تھوڑی سی مزید کوشش کر کے تابان اپنے ہاتھ آزاد کر سکا تھا۔ مگر اس کے بعد کیا ہوگا؟ اس سوال کا جواب ابھی بھی اندھیرے میں تھا۔ تابان کے پاؤں بدستور بندھے ہوئے تھے اور وہ ہتھیار سے بھی محروم تھا۔ بے بسی نے اپنے پنجے اس طرح گاڑ رکھے تھے کہ رہائی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی..... ایک ایک ایک ٹائوس شور نے ان سب کو ٹھک دیا۔ باجے خاموش ہو گئے، رقص ختم کیا اور کورا کی چیخیں مزید بلند ہو گئیں۔

تاجان نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ سردار شمال اور اس کا ایک ساتھی بھاگتے ہوئے کشتی کے اگلے حصے کی طرف جا رہے تھے تاجان نے لینے لینے سرٹا کر دیکھا اور اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ کشتی سے بیس تیس گز کی دوری پر دو کشتیاں تیزی سے ان کی طرف آ رہی تھیں۔ ان پر موجود ملان چچ چچ کر کچھ کہہ رہے تھے۔ تاجان نے الفاظ پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ وہ ان کو رکنے کے لئے کہہ رہے ہیں۔ اس ہدایت پر عمل کرنے کی بجائے رفعت نے سردار شمال کی ہدایت پر کشتی کا تیسرا بابڈان بھی کھول دیا تھا اور کشتی کی

رفار ایک دم تیز ہو گئی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے دونوں کشتیوں نے بھی اپنی رفتار تیز کر دی اور بائیں پلو سے ان کی کشتی کے ساتھ آ گئیں۔ تباہ حیران ہو رہا تھا کہ یہ دونوں کشتیاں اندھیرے میں سے اچانک کیسے نمودار ہو گئی ہیں۔ ان کشتیوں پر قریباً آٹھ افراد سوار تھے۔ ان سب کے لباس ایک جیسے تھے جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ کسی جزیرے کے سپاہی ہیں۔ ان سپاہیوں نے کوڈ کوڈ کر تباہ کی کشتی پر آنا شروع کیا تو سردار شلال اور اس کے ساتھیوں نے تھوڑی دیر سوچ لی اور حملہ آوروں سے بچ گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کشتی پر گھمسان کی لڑائی ہونے لگی۔ کورا چلائی ہوئی بھاگی اور تباہ کے قریب آ کر مٹ گئی۔ وہ تباہ کے ہاتھ کھولنے میں مصروف تھی جب دو آتشیں تیر سناتے ہوئے تباہ کے سر پر سے گزرے اور کشتی کے بادیوں میں جا گئے۔ چند ساعتوں میں بادیوں نے آگ پکڑ لی۔ اسی دوران چند چلتی ہوئی مشینیں کشتی کے عقبی حصے پر بھی گریں اور شعلے بھڑک اٹھے۔ سردار شلال اور اس کے ساتھی بے جگری سے مقابلہ کر رہے تھے اور انہوں نے حملہ آوروں میں سے چند کو ہلاک بھی کر دیا تھا لیکن ان کا اپنا جانی نقصان بھی ہوا تھا۔ لڑائی کی شدت کے سبب کشتی بری طرح ڈول رہی تھی اور کسی وقت گٹا تھا کہ لٹ ہی جائے گی۔

دفعۃً تابان کی نگاہ اپنے عقب میں اٹھ گئی وہ سنائے میں رہ گیا کم از کم تین کشتیاں اور ان کی سمت بڑھ رہی تھیں۔ ان پر کئی درجن مسلح افراد موجود تھے۔ درحقیقت ان سب کشتیوں نے اپنی روشنیوں گل کر رکھیں تھیں۔ اب قریب آکر انہوں نے روشنیوں جلائی تھیں اور یوں لگا تھا جیسے سمندر میں سے اچانک نمودار ہو گئی ہیں۔ چند ہی لمحوں میں یہ کشتیاں بھی قریب پہنچ گئیں اور ان کے سوار کود کود کر اپنے ساتھیوں کی مدد کو آگئے۔ سردار شلال کے دو ساتھی ہلاک ہو چکے تھے جب کہ وہ خود بھی زخمی ہوا تھا۔ پلک جھپکنے میں انہیں گھیر کر گرفتار کر لیا گیا۔ گرفتار ہونے والوں میں کورا اور تابان بھی شامل تھے۔ کئی اب سازو سامان سمیت دھڑا دھڑ جل رہی تھی۔ اس میں رکنا خطرناک تھا۔ وہ بڑی سرعت کے ساتھ دوسری کشتیوں میں منتقل ہو گئے۔ سردار شلال گرفتار ہونے کے باوجود مزاحمت کر رہا تھا اور جیج رہا تھا۔ دو سپاہیوں نے اسے اونڈھا کر اگر اس کی منگیلیں کس دیں اور منہ میں کپڑا ٹھونس دیا..... تھوڑی دیر پہلے سردار شلال نے جو حالت کورا کی کر رکھی تھی اب خود اس کی ہو گئی تھی۔ ایک ایک جلتی ہوئی کشتی بجیرہ ایجیمن کے سرد پانی میں ڈوبنا شروع ہو گئی۔ گاڑھا سفید دھواں فضا میں بلند ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے پانی کی سطح پر

سوائے بلبلوں کے اور کچھ نہ رہ گیا۔ وہ کشتی جس پر تھوڑی دیر پہلے شیطان نے جشن ہرا کر رکھا تھا سردار برغاور سردار نارنگ سمیت تاریک پانیوں میں اتر چکی تھی۔

☆-----☆-----☆

سردار شلال اور اس کے ساتھی کو تابان اور کورا کے ساتھ ہی جزیرے پر لایا گیا۔ ان چاروں کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ جزیرہ گھنے درختوں میں گھرا ہوا تھا جگہ جگہ آبادی کی روشنیاں نظر آتی تھیں۔ آمارے لگتا تھا کہ یہ خاصا بڑا جزیرہ ہے۔ جوں جوں وہ ساحل سے ہٹتے گئے سو کیس کشادہ اور آبادی گنجان ہوتی گئی۔ انیس دھکیل دھکیل کر ایک گھوڑا گاڑی میں سوار کر دیا گیا۔ گاڑی میں صاف ستھرے لباس والے سپاہی موجود تھے۔ انیس تابان وغیرہ کے غلیظ جسموں سے بو آ رہی تھی اور وہ بری طرح ناک بھون چڑھا رہے تھے۔ راستے میں تابان نے اندازہ لگایا کہ کورا سپاہیوں کو اپنے بارے میں کچھ بتانا چاہتی ہے۔ تابان نے آنکھوں کے اشارے سے اسے منع کر دیا کہ فی الحال وہ اپنے ارادے سے باز رہے۔ جس وقت کشتی پر قبضہ ہوا تابان اور کورا کی حالت سردار شلال کے قیدیوں کی سی تھی..... لیکن جزیرے کے سپاہی ان سب کو ایک ہی لاشی سے بانگ رہے تھے جہاں انہوں نے سردار شلال کو مارا پینا تھا وہیں تابان اور کورا کو بھی سخت روکے کا نشانہ بنایا تھا۔

گھوڑا گاڑی جزیرے کے مختلف راستوں سے گزرنے کے بعد ایک بہت بڑی عمارت کے سامنے رکی۔ یہ عمارت ساحل سے زیادہ دور نہیں تھی اور سرسبز درختوں سے ڈھکی ہوئی تھی یہاں تابان کو بے شمار چمکنے کھڑے نظر آئے۔ ان پتھروں کے آگے لمبی ایال والے پھوٹے قد کے گھوڑے بٹتے ہوئے تھے۔ عمارت کے اندر سے عجیب طرح کی بدبو پھوٹ رہی تھی اور اس بو نے ارد گرد کی فضا کو متعفن کر رکھا تھا۔ یہ پتھلیوں کی بو تھی۔ تابان نے اندازہ لگایا کہ یہ ایک کارخانہ ہے جہاں مچھلی کی چربی سے تیل وغیرہ بنایا جاتا ہے۔ عمارت کے اوپر ایک بہت بڑی پون پکی نظر آ رہی تھی۔ اس پکی سے غالباً تیل نکالنے والے کسی آلے کو حرکت دی جاتی تھی۔ سردار شلال 'تابان' کورا اور ان کے ساتھی سردار گونسل کو اس عمارت کے ایک وسیع وعریض کمرے میں دھکیل دیا گیا۔ آہنی سلاخوں والے اس کمرے کے فرش پر غلیظ لباس والے بے شمار قیدی پھیلے ہوئے تھے وہ سو رہے تھے۔ کمرے میں جٹے والی مشعلوں کی روشنی میں ان کے چہرے مدقوق اور زرد نظر آتے تھے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی مسلح سپاہیوں نے ان چاروں کے ہاتھ کھول دیے

اور انیس ایک کونے میں دھکیل دیا۔

تابان کا یہ اندازہ درست تھا کہ عمارت تیل نکالنے کا کارخانہ ہے۔ اگلی صبح اس نے بے شمار مزدوروں کو اس کام پر بٹتے ہوئے دیکھا۔ جدھر جگہ انھیں تھی لکڑی کے کلو نما آلے اور بڑی بڑی بھینساں نظر آتی تھیں جن پر جنازی کڑا چڑھے ہوئے تھے بدبو سے دماغ پینا جا رہا تھا۔ مزدوروں کی نگرانی کرنے والے نہایت سخت چہرہ لوگ تھے۔ وہ ہاتھوں میں کوڑے لہراتے ادھر سے ادھر دھناتے پھرتے تھے۔ ایسے ہی ایک نگران نے سردار 'تابان' اور کورا وغیرہ کو بھی کام پر لگا دیا۔ وہ بدبو دار چربی کے بڑے بڑے لوتھڑے قصاب خانے سے اٹھا کر ہتھ گاڑیوں پر لاوے لگے۔ یہ ہتھ گاڑیاں ان لوتھڑوں کو بھینسوں کی جانب لے جاتی تھیں۔

تابان کو زیادہ فکر کورا کی تھی۔ وہ اس غلیظ ماحول میں خیم میں نہائے ہوئے پھول کی طرح تھی۔ یہاں کسی بھی وقت کوئی بے رحم ہاتھ اس کی نو شلفت پتیاں بکیر سکتا تھا۔ ہر کوئی اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ قیدیوں کی آنکھوں میں نگرانوں سے براہ کرم ہوس تھی اور نگران تو پھر نگران تھے۔ وہ کورا کو اپنے لئے نقد تر سمجھ رہے تھے۔ تابان سوچنے پر مجبور ہو رہا تھا کہ اس چار دیواری میں کوئی قانون قاعدہ بھی ہو گا یا نہیں۔ وہ کورا کی طرف سے پوری طرح باخبر تھا اور ہر لکڑی اسے نگاہ میں رکھ رہا تھا وہ پتھاری ایک تو رات کے خونی واقعات سے سہمی ہوئی تھی اوپر سے اس قید خانے کی مشقت لگے پڑ گئی تھی۔ اس کارنگ زرد تھا اور پاؤں ڈمگا رہے تھے۔ چربی کے لوتھڑے اٹھاتے ہوئے اسے بار بار ابکائی آ رہی تھی اور تابان دیکھ رہا تھا کہ اس نے خود پر بڑی مشکل سے قابو پا رکھا ہے۔ سردار شلال چونکہ رات کی لڑائی میں زخمی ہو گیا تھا لہذا اسے کام پر نہیں لگایا گیا تھا۔ وہ اپنا زخمی بازو گردن میں لٹکائے ایک کونے میں بیٹھا تھا اور تابان کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا، جیسے یہ سارا کیا دھرا اسی کا ہو۔

دوپہر تک تابان وغیرہ کام پر لگے رہے۔ اس دوران تابان نے یہاں کے ماحول کا خوب اچھی طرح جائزہ لیا تھا۔ اس عمارت میں زیادہ تر قیدی مرد تھے، تاہم چند فیصد عورتیں بھی دکھائی دیتی تھیں۔ سب قیدی ہڈیوں کے ڈھانچے ہو رہے تھے ان کے جسموں پر مارہیت کی نشانیں بھی کثرت سے نظر آتی تھیں۔ ہر قیدی کی گردن میں ایک آہنی کڑا تھا جس پر اس کے کوائف کندہ کئے گئے تھے، تاہم تابان اور اس کے ساتھیوں کی گردنیں ابھی ان آہنی کڑوں سے آزاد تھیں..... دوپہر کے وقت جب سب قیدیوں نے کھانا

کے آئے گا وہ جنگی نقطہ نگاہ سے نہایت گراں قدر ہوں گی۔ اس کے علاوہ ان معلومات سے تجارتی فوائد بھی حاصل ہوں گے۔ زرناب کی مسم کو زیادہ سے زیادہ سچہ نام میں مکمل ہو جانا تھا لیکن ایک سال گزرنے کے باوجود وہ واپس نہیں آیا۔ ای دور ان شاہ فیقوس نے وفات پائی اور سکندر نے تاج شاہی اپنے سر پر سجایا۔ شاہ سکندر کو شروع ہی سے مشرق اور مشرقی زمینوں سے والہانہ دلچسپی تھی۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ ایک جاسوس پچھلے ایک برس سے مشرقی سواحل کی طرف گیا ہوا ہے اور ابھی تک اس کی واپسی نہیں ہوئی تو وہ بہت غم مند ہوئے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ زرناب ٹائی اس نوجوان کا کمون لگایا جائے یہ پچھلے برس موسم سرما کی بات ہے، شاہ سکندر نے مجھے طلب کیا اور بتایا کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ سکندر کو معلوم تھا کہ میں اس سے پہلے بھی اسی طرح کی ایک مسم کاہلی سے سر کر چکا ہوں اور ایشیائی علاقے کے متعلق مجھے کافی معلومات حاصل ہیں، لہذا وہ چاہتے تھے کہ میں کسی طرح زرناب کا سراغ لگاؤں اور اگر وہ کسی مصیبت میں گرفتار ہے تو اس کی مدد کروں۔ سکندر کے حکم پر میں اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ زرناب کی تلاش میں روانہ ہوا۔ وہ موسم بڑا سخت تھا۔ سمندر میں سفر کے حالات اتنے اچھے نہیں تھے۔ نہایت دشواری کے ساتھ ہم ایشیائی ساحل پر نرائے کے قریب اڑے اور ساحل کے ساتھ ساتھ تلاش کا آغاز کیا۔ خوش قسمتی سے ہمیں زیادہ دیر نہیں بھٹکا پڑا۔ قدرت ہم پر مہربان تھی ہمیں کچھ نہایت اہم اطلاعات مل گئیں اور ان کے ذریعہ ہم دو ہی ہفتے میں ایران کے اس ساحلی جزیرے پر جا پہنچے جہاں زرناب دنیا و مافیہا سے بے خبر حسن و عشق کی رنگینیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ یہ جزیرہ جس کا نام سامو تھریس ہے بالکل الگ تھلک اور پرسکون ہے۔ زمین زرخیز ہے اور اس زرخیزی سے فائدہ اٹھانے والے بھی زیادہ نہیں ہیں۔ پھولوں اور باغات کی بہتات ہے۔ یہاں زرناب نے سفید چوٹے کا ایک خوبصورت مکان بنا رکھا ہے۔ چند غلام رکھے ہوئے ہیں جو اس کے موسیقیوں کی کچھ بھال کرتے ہیں اور وہ خود حسین چہروں میں گھرا رہتا ہے۔ میں جس مشکل سے اس تک پہنچا تھا میں ہی جانتا ہوں۔ میرا خیال تھا کہ وہ میری زبانی سکندر کا پیغام سنے گا تو فوراً ساتھ چلنے پر آمادہ ہو جائے گا لیکن صورت حال اس کے برعکس نکلی۔ زرناب نے اپنے میٹھ و آرام کی دنیا چھوڑنے سے بالکل انکار کر دیا، بلکہ اس نے مجھے بھی وطن اور یادداشت سے بے وفائی کی ترغیب دی۔ اس نے کہا، 'یونان میں کیا رکھا ہے، یہ جزیرہ جنت ارضی ہے، یہاں رہو اور چار روزہ زندگی سے سرمتیں کشید کرو۔ بہر حال جب اس نے محسوس کیا کہ میں اس کے

سے ایک قیدی کو لگا اور بہرہ تھا۔ اس کا نام کسی کو معلوم نہیں تھا۔ دوسرا قیدی ایجنٹر سے تعلق رکھتا تھا، اس نے تہاں کو اپنا نام نورین بتایا۔ نورین کی عمر چالیس برس کے لگ بھگ تھی۔ اسے اس قید خانے میں ایک برس ہونے کو آیا تھا۔ اس تاریک تہ خانے میں اسے نہ جانے کون سا مرض لاحق ہو گیا تھا، گاہے گاہے اسے ہیٹ میں شدید قسم کا درد اٹھتا تھا اور وہ نیم جان ہو جاتا تھا اس نے بتایا کہ اس جزیرے کا نام سکوپے لاس ہے۔ ایک روز علی الصبح نورین نے اچانک اٹھ کر سردار شلال کی قدم پوسی کی اور یہ حیرت انگیز انکشاف کیا کہ وہ سردار شلال کو اچھی طرح جانتا ہے تہاں اور شلال وغیرہ حیران رہ گئے۔ نورین نے انہیں یہ بتا کر مزید حیران کر دیا کہ اس سے پہلے اس نے اپنے بارے میں جو کچھ کہا وہ غلط تھا، حقیقت یہ ہے کہ وہ دس برس تک سکندر کی فوج میں دست سلا رہا ہے اور اس حیثیت میں وہ ایک موقع پر سردار شلال کی کمان میں لڑ بھی چکا ہے۔

اس نے سردار شلال سے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ "جناب میں آپ کی پہلی جھٹک دیکھنے کے ساتھ ہی پہچان گیا تھا لیکن آپ کے دونوں ساتھی میرے لئے اجنبی تھے، اس کے علاوہ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ آپ کس حیثیت سے اور کیوں یہاں آئے ہیں۔ آپ پر اپنا آپ ظاہر کرنے سے پہلے میں پورا اطمینان کر لینا چاہتا تھا۔ امید ہے اس گستاخی کے لئے آپ تینوں مجھے معاف فرمائیں گے۔"

سردار شلال نے کہا۔ "تم نے نہایت کا ثبوت دیا ہے اس موقع پر تمہیں ایسی ہی احتیاط کرنی چاہئے تھی۔"

اس روز نورین اور وہ تینوں بہت دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ نورین نے سردار شلال کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا اس نے انہیں یہ اطلاع دے کر ٹھٹھے میں ڈال دیا کہ ایک برس پہلے وہ بھی اسی مقصد کے تحت بحیرہ ابکیئن کے سفر پر روانہ ہوا تھا جس مقصد سے وہ تینوں آئے ہیں۔

سردار شلال نے کہا۔ "میں تمہاری بات سمجھا نہیں۔"

نورین نے تہ خانے کے اکوڑے روزن میں سے آتی ہوئی دھوپ کی لکیر پر نظرس جمائیں اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "جناب! یہ کہانی آج سے دو برس پہلے شروع ہوئی تھی۔ سکندر کے والد شاہ مقدونیہ فیقوس نے ایک جری نوجوان زرناب کو جاسوسی کی غرض سے ایشیائی ساحل کی طرف روانہ کیا تھا۔ زرناب ایک بڑا ہوشیار اور بیدار مغز شخص تھا۔ شاہ فیقوس کو امید تھی کہ وہ ایشیائی ساحل کے بارے میں جو معلومات حاصل

برکادوں میں نہیں آؤں گا تو اس نے آنکھیں بدل لیں۔ ایک رات ہم تینوں پر بے خبری میں حملہ کیا گیا۔ میرے دونوں ساتھی اس لڑائی میں کام آئے اور میں گرفتار ہوا۔ زرناب نے مجھے اپنے ایک خاص آدمی کے حوالے کر دیا۔ یہ سفاک شخص میری مشکلیں کس کے اور آنکھوں پر پٹی باندھ کر اس جزیرے میں لے آیا۔ اس کے بعد مجھے نہیں معلوم میں کس طرح اور کیونکر اس منحوس قید خانے میں پہنچ گیا۔ اب پچھلے ایک برس سے یہ منحوس تہ خانہ میرا مسکن ہے اور آثار سے یہی لگتا ہے کہ زندگی بھر کھلا آسمان دیکھنا نصیب نہیں ہو گا۔

نورین کی کمائی متاثر کن تھی۔ سردار شلال، گونسٹ اور تباہان نے نورین کی باتوں میں گہری دلچسپی لی۔ سردار شلال، نورین سے کرید کرید کر سوال پوچھتا رہا۔ اس کے چہرے پر شدید برہمی تھی۔ ظاہر تھا یہ برہمی اسی شخص کے لئے تھی جس نے سکندر اور سکندر کے باپ سے دھوکا کیا تھا اور بعد میں جو افراد اس کی مدد کے لئے بھیجے گئے تھے انہیں بھی اذیت ناک انجام سے دوچار کر دیا تھا۔ تباہان بھی قیدی نورین سے بدردی محسوس کر رہا تھا یہ ایک زبردست اتفاق تھا کہ وہ نورین کے پاس اس تہ خانے میں پہنچ گئے تھے ورنہ بادشاہ سے غداری اور وطن سے بے وفائی کی یہ کمائی بیش پردہ راز میں رہتی۔ نہ کسی کو یہ پتہ چلا کہ زرناب نامی وہ شخص کہاں ہے اور نہ یہ خبر ہو پائی کہ اس کی مدد کو جانے والے کیا ہوئے؟

تہ خانے میں چند دن گزار کر تباہان کو یہاں کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو گیا۔ یہ معلومات زیادہ تر نورین ہی کے ذریعے حاصل ہوئی تھیں۔ اس نے تباہان کو تسلی دی کہ کورا قید خانے کے اس حصے میں بالکل محفوظ رہے گی۔ اس نے کہا کہ یہاں قیدی عورتوں کے لئے علیحدہ حصہ ہے اور وہاں کی نگران بھی عورتیں ہی ہیں تاہم یہاں سے نکلنا کورا کے لئے ممکن ہے اور نہ ان کے لئے۔ قید خانے کے اس حصے میں بے شمار تہ خانے تھے اور ان تہ خانوں میں صرف ان قیدیوں کو رکھا جاتا تھا جن کی انتہائی نگہداشت مقصود ہوتی تھی۔ نورین نے بتایا کہ پچھلے ایک برس کے عرصے میں صرف تین قیدیوں نے ان تہ خانوں سے فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔ ان میں سے ایک عورت تھی اور دوسرے وہ تینوں عبرت ناک انجام سے دوچار ہوئے۔ انہیں پکڑ لیا گیا اور دوسرے قیدیوں کے سامنے شدید اذیتیں دے دے کر مار دیا گیا۔ تباہان گاہے گاہے زرناب کے بارے بھی معلومات حاصل کرتا رہتا تھا۔ اس نے سامو تھریس جزیرے کا محل وقوع پوچھا تھا اور یہ معلوم کیا تھا

کہ زرناب جزیرے کے کس حصے میں مقیم ہے۔ وہ راستے کی دشواریوں کے بارے میں سوالات کرتا رہا تھا۔ اس کی باتوں سے سردار شلال اور گونسٹ اندازہ لگا رہے تھے کہ شاید وہ زرناب تک پہنچنے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ تباہان کی اس سوچ پر وہ بے دلی سے مسکراتے کے سوا اور کیا کر سکتے تھے۔ وہ جس پنجرے میں آچھنے تھے یہاں سے عیاد کی مرضی کے بغیر نکلنا دینے کا خواب تھا اور ان میں سے کوئی ایسا خواب دیکھنا نہیں چاہتا تھا درحقیقت وہ اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر چھوڑ چکے تھے انہیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ ان کا مستقبل کیا ہے۔ انہیں قید کرنے والوں نے ان کے متعلق کیا فیصلہ کیا ہے اور اس فیصلے کے اسباب کیا ہیں لیکن تباہان کا حال مختلف تھا۔ اس نے خود کو حالات کے دھارے پر نہیں چھوڑا تھا۔ وہ ایسا کبھی نہیں سکتا تھا۔ اس کے اندر ایک بے چین و بے قرار روح کا بغیرا تھا وہ روح جو آہنی سلاخوں سے الجھتی تھی، تاریک جنگلوں میں بھاگتی تھی، گردابوں سے لڑتی تھی اور طوفانوں سے بغلیں ہوتی تھی..... قدرت نے اسے آزاد پیدا کیا تھا اور وہ ہر دم آزاد رہنا چاہتا تھا۔ اس کا ایمان تھا کہ جب تک اس کے سینے میں آزادی کی شمع روشن ہے کوئی دیوار اسے روک نہیں سکتی، لہذا اس نے حالات کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے تھے۔ وہ اس قید خانے کے در و دیوار کو سونگھ رہا تھا اور یہاں سے نکلنے کی تدبیریں سوچ رہا تھا۔

ایک رات جب نورین درد کے شدید دورے کے بعد تڑپ تڑپ کر سو چکا تھا اور سردار شلال اور گونسٹ دو کونوں میں گم سم بیٹھے تھے، تباہان اٹھ کر ان کے پاس آگیا۔ اداسیوں اور مایوسیوں سے بھری اس رات میں تباہان کا چہرہ ہشاش بشاش تھا اور اس کی آنکھوں میں مسرت آمیز چمک تھی۔ وہ سردار شلال سے مخاطب ہو کر بولا۔

”سردار، تم نے میرے ساتھ جو سلوک کیا وہ کسی طور تمہارے شایان شان نہ تھا۔ بہر حال اب ہم تینوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ یہ تاریک قید خانہ ہمارا مقدر بنا دیا گیا ہے۔ ہمیں اس مقدر کو مٹانا ہو گا یا سبک سبک کر دم توڑ دینا ہو گا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم دونوں مجھ سے ایک وعدہ کرو۔“

”کیسا وعدہ؟“ شلال نے اپنی بو جھل پلکیں اٹھائیں۔

یہ وعدہ کہ اگر ہم اس جزیرے کی قید سے آزاد ہو گئے تو تم کورا کی اس خطا کو بھول جاؤ گے جس کے بدلے تم اس کی زندگی اور عزت سے کیلئے جا رہے تھے۔ میری مراد تمہارے چہرے کے زخم سے ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم یہ معاملہ ہمیشہ کے لئے ختم

برآمدے کے پہلو میں بھی آہنی دروازوں کی ایک قطار دکھائی دے رہی تھی۔ یہ وہ تہہ خانے تھے جہاں خواتین قیدیوں کو رکھا جاتا تھا کورا بھی انہی میں سے کسی تہہ خانے میں بند تھی۔ وہ کورا سے کتنا قریب ہو کر بھی کتنا دور تھا کورا کا خوبصورت معصوم چہرہ اس کی نگاہوں میں گھومنے لگا۔ ایک ایک تابان کو اپنی بائیں جانب آہٹ محسوس ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک بھاری زنانہ آواز اس کے کانوں سے نکلا۔ ”کون ہے؟“

تابان تڑپ کر ایک ستون کی اوٹ میں ہو گیا۔ چند ساعت بعد اسے ایک عظیم جہیم سیاہ فام عورت دکھائی دی۔ اس کے ایک ہاتھ میں مشعل اور دوسرے میں عیاں تلوار تھی۔ مشعل کی روشنی تابان پر پڑی۔ اس سے پہلے کہ سیاہ فام عورت رخ پھیر کر اس کی طرف دیکھتی وہ اپنی جگہ سے ہلا اور بلائے ناگمانی کی طرح اس سے لپٹ گیا۔ اس کا ایک ہاتھ عورت کے بھدے ہوئوں پر آیا اور دوسرے نے اس کا تلوار والا بازو پکڑ لیا۔ یہ حملہ اتنا اچانک اور شدید تھا کہ عورت کے منہ سے ہلکی سی آواز بھی نہ نکل سکی۔ تابان اسے گھسیٹتا ہوا ایک تاریک کونے میں لے گیا چند لمحوں میں اپنی سانسیں درست کرنے کے بعد اس نے عورت کو دوبارہ گھسیٹا اور برآمدے طے کر کے ایک باغیچہ نما جگہ پر آگیا۔ عورت کے جسم میں مست ہاتھی کی سی قوت تھی۔ اس کے منہ سے شراب کی بو آ رہی تھی اور وہ مسلسل مزاحمت کر رہی تھی۔ اس کی شکل اچھی طرح دیکھے بغیر ہی تابان سمجھ سکتا تھا کہ وہ ایک خوفناک عورت رہی ہوگی۔ باغیچے میں پہنچ کر تابان نے عورت کے ہاتھ سے تلوار چھینی اور نہایت سفاکی سے اس کی گردن پر رکھ دی۔

”آواز نکال تو سر ہدا کر دوں گا۔“ اس نے نہایت سنگین لہجے میں دھمکی دی اور پھر بڑے اعتماد کے ساتھ عورت کے منہ سے ہاتھ اٹھالیا۔ تابان کے لہجے میں نہ جانے کیا بات تھی کہ عورت نے واقعی کسی کو مدد کے لئے نہیں پکارا۔ اس کی بڑی بڑی دہشت زدہ آنکھیں تابان کے چہرے پر بھی تھیں۔ تابان اسے کھینٹ کر درختوں میں کچھ اور آگے لے گیا۔

کوئی ایک گھڑی بعد تابان عورت کو قتل کرنے کے بعد درختوں کے اس جھنڈ سے باہر نکل رہا تھا۔ عورت کو قید زندگی سے چمکاؤہ دلائے سے پہلے اس نے اس سے بہت کچھ پوچھ لیا تھا۔ تابان سوچ رہا تھا کہ وہ اس عورت تک نہ پہنچتا تو اس قید خانے سے نکلتا کس قدر دشوار ہوتا۔ اب نہ صرف وہ اس عمارت کے ایک چور راستے سے واقف ہو چکا تھا بلکہ سپردار عورت کی تلوار بھی اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ پودوں کی آڑ لیتا ہوا دوبارہ

تہہ خانوں کی طرف نکل گیا۔ یہ وہی تہہ خانے تھے جہاں خواتین قیدیوں کو رکھا جاتا تھا۔ ان میں سے زیادہ تر تہہ خانے اس وقت خالی پڑے تھے۔ ان خالی تہہ خانوں کے سامنے پہرہ بھی نہیں تھا۔ تابان نے اپنی بائیں جانب والی قطار میں چار تہہ خانے چھوڑے اور پانچویں کے دروازے پر آگیا۔ دروازہ کھلا تھا۔ وہ بڑے اعتماد سے اندر گھس گیا۔ اس تہہ خانے کی ایک دیوار سے وہ خفیہ راستہ نکلتا تھا جو تابان کو بیرونی احاطے تک پہنچا سکتا تھا۔ معمولی کوشش سے وہ یہ راستہ ڈھونڈنے میں کامیاب رہا۔ یہ ایک تاریک سرنگ تھی جس میں دراز زدہ تابان کو جھک کر چلنا پڑا۔ پچاس ساٹھ گز کے فاصلے سفر کے بعد اس نے خود کو اس احاطے میں پایا، جہاں دو ہفتے پہلے انہیں گرفتار کر کے لایا گیا تھا۔ اس احاطے میں وہ اور کورا چرنی کے بڑے بڑے لوٹھڑے ڈھوٹے رہے تھے۔ احاطے میں ہر طرف کمرہ بو پھیلی ہوئی تھی۔ قید خانے کی بلند دیواروں پر چکی گھر گھر کی آواز سے بے مقصد چل رہی تھی۔ ایک طرف بحیرہ انجین سے پکڑی جانے والی چند دیو پیکل مچھلیاں پڑی تھیں۔ تاریکی میں ان مچھلیوں کے ہولے بڑے خوفناک لگ رہے تھے تابان ان ہولوں کی آڑ لیتا ہوا اس جانب آگیا جہاں بہت سے چھکڑے قطار اندر قطار کھڑے تھے۔ انہی چھکڑوں میں چرنی اور مچھلیاں قید خانے میں لائی جاتی تھیں اور بعد ازاں تیل اور خشک کیا ہوا گوشت باہر لے جایا جاتا تھا۔ اس وقت تمام قیدی کو ٹھڑوں میں بند تھے لہذا سپردار بھی اطمینان سے کونوں کھدروں میں دیکھتے ہوئے تھے۔ تابان کے لئے یہ اچھا موقع تھا کہ وہ کسی چھکڑے میں گھس کر بیٹھ جائے۔ سپرداروں کی نگاہوں سے بچنے کے لئے تابان زمین پر اونٹنہ حالت گیا اور رینگتا ہوا چھکڑوں کی طرف بڑھا میں تیس گز کا یہ فاصلہ بہت خطرناک تھا۔ سپردار چونکہ بلندی پر تھے وہ کسی بھی وقت اسے دیکھ سکتے تھے۔ سانپ کی طرح بل کھاتا وہ چھکڑوں سے دس گز کی دوری پر پہنچ چکا تھا جب اچانک اسے ٹھک کر رک جانا پڑا۔ دو سپردار ایک چھکڑے کی اوٹ سے نکلے اور گشت کرنے والے انداز میں اس کی طرف بڑھنے لگے۔ اپنی جگہ پڑے پڑے تابان نے سانس روک کی۔ تلوار اس کے داہنے ہاتھ میں تھی۔ وہ ایک ہی جست میں دونوں سپرداروں کی گردنیں ناپنے کے لئے بالکل تیار تھا۔ سپردار دنگناتے ہوئے آئے اور اس سے صرف چند قدم کے فاصلے سے گزر گئے۔ تاریکی کے سبب وہ اسے دیکھ نہیں پائے تھے۔ تابان نے اطمینان کا سانس لیا اور آخری دس گز کا فاصلہ تیزی سے طے کر کے ایک چھکڑے میں گھس گیا۔ تاہم چھکڑے میں پہنچ کر ایک ایک اس کا اطمینان رخصت ہو گیا۔ چھکڑا بان اندر ہی سو رہا تھا۔ تاریکی میں تابان کو

اپنے اوپر پا کر وہ بڑبڑا کر اٹھ بیٹا اور پھر جی کر اس سے لپٹ گیا۔ تاہاں نے اس کی چیخ مسمیٰ ہونے سے پہلے اس کا منہ ڈھانپا اور تلوار گردن پر رکھ دی۔

☆-----☆-----☆

چنگیز کی طویل قطار میں تاہاں سب سے پیچھے تھا۔ وہ لوگ قید خانے سے قریباً ایک میل دور آچکے تھے۔ تاہاں چنگیزا بن کے لباس میں تھا اور چنگیزا بن انہری لباس پہنے لاش کی صورت میں چنگیز کے اندر پڑا تھا۔ تاہاں کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ جزیرہ سکوپے لاس کے اس منوس قید خانے سے نکلنے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ رات کی ساری باتیں اسے خواب لگ رہی تھیں۔ اب سپید و سحر نمودار ہونے والا تھا۔ دور مغربی افق پر اندھیرا چھٹنا جا رہا تھا اور ساحل کی نم ہوائے رخ بدلنا شروع کر رہا تھا۔ تاہاں نے جان بوجھ کر چنگیز کو پیچھے رکھا تھا۔ وہ موقع ملتا ہی چنگیز سے کوہ جانا چاہتا تھا۔ جوں جوں روشنی پہیلی جاتی تھی اس کے پیچھے جانے کے امکانات بڑھ رہے تھے۔ آخر تاہاں کو دور سمندر کا پانی ہلکورے لیتا دکھائی دینے لگا۔ اب اس کارواں کے ساتھ رہنا خطرناک تھا۔ ہونسی چنگیز کی قطار ایک موڑ سے مڑی تاہاں نے گھوڑے کی رفتار دھیمی کی اور کود گیا۔ گھوڑا قطار کے پیچھے بھاگتا چلا گیا اور تاہاں تیزی سے گھٹے درختوں میں روپوش ہو گیا

علاقے کے دوسرے جزائر کی طرح یہ جزیرہ بھی خوبصورت تھا۔ جگہ جگہ سرسبز دھلوانیں نظر آتی تھیں جن پر آؤ بخارے کے وسیع باغات تھے۔ کئی مقامات پر اونچے برجن والے سرخ معبد تھے ان معبدوں کے گرد خوبصورت آبادیاں پائی جاتی تھیں۔ تاہاں کو خوبصورت چرواہے اور چرواہیاں نظر آئیں اور ان کے جلو میں بکریوں کے صحت مند ریوڑ دکھائی دیے۔ چنگیزی دھوپ نے جزیرے کے خدوخال کو کسی حسینے کے منور چہرے کا روپ دے رکھا تھا۔ وہ سہ پہر تک جزیرے کے نشیب و فراز میں گھومتا رہا۔ کئی جگہ لوگوں سے اس کی مدد بھیجی ہوئی لیکن کسی نے اس پر توجہ نہیں دی۔ سہ پہر کے وقت اسے جزیرے کی اصل آبادی دکھائی دی۔ یہ عقیم الشان بستی ایک پہاڑی کے دامن میں دور تک پہیلی ہوئی تھی دیکھنے سے ہی اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں مقبول اور خوشحال لوگ رہتے ہیں۔ راستے صاف ستھرے اور عمارتیں خوشنما تھیں۔ تاہاں کسی محفوظ پناہ گاہ کی تلاش میں تھا اسے معلوم تھا کہ اس وقت جزیرے کی کھاڑی پر جانا خطرناک ہے۔ یقینی بات تھی کہ چنگیزا بن کے علاوہ سپردار عورت کی لاش بھی پر آمد ہو

تہاں اسے نہ پہچانا۔ غارس زنوب کے محل میں وہ کئی ماہ اکٹھے کام کرتے رہے تھے اور ہوشمند سے تہاں کی گاڑھی چھنٹی تھی۔ تہاں نے ہوشمند کو آخری بار سکندر کے محل کے وقت شہر کی فسیل پر پتھر ڈھوتے دیکھا تھا اور اس بات کو اب تین چار ماہ ہونے کو آئے تھے۔ وہ دونوں چند لمحے یک تک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ ہوشمند نے ہرے جوش سے تہاں کا بازو دایا اور آنکھوں آنکھوں میں اسے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ دونوں بھیڑ میں رستہ بناتے ایک طرف چل دیے۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ مجمع سے باہر تھے ہوشمند لنگڑاتا ہوا ایک گھوڑا گاڑی کی طرف بڑھا۔ گاڑی بان سے کرایہ لے گیا اور تہاں کو لے کر اندر آ بیٹھا۔ تھائی ملتے ہی دونوں ایک دوسرے سے بغلگیر ہو گئے۔ ہوشمند نے دھیسے لہجے میں کہا۔ ”میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ تم ہی وہ قیدی ہو جو آج صبح ہاؤن کے قید خانے سے بھاگا ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”نہیں۔ تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن..... تم یہاں کیسے؟“

ہوشمند نے تیزی سے کہا۔ ”یہ سب تمہیں بعد میں بتاؤں گا ابھی صرف اپنے بارے میں بتاؤ۔ کوئی تمہارے تعاقب میں تو نہیں تھا؟“

”دو آدمی تھے لیکن میں انہیں چمک دے کر جلسہ گاہ میں گھس گیا تھا۔“

”قید خانے سے بھاگتے ہوئے تم نے ایک مرد اور عورت کو بھی قتل کیا ہے؟“

”ہاں، کیا ہے مگر تمہیں یہ سب کچھ کیسے معلوم ہے؟“

”غضب کی بات کرتے ہو تم..... غضب کے یہ قوف ہو۔“

تہاں کو یاد آیا کہ ”غضب کا“ ہوشمند کا نکیہ کلام ہے۔ وہ کان کھچا کر بولا۔ ”میں تمہاری بات سمجھتا ہوں۔“

ہوشمند نے کہا۔ ”قریباً ہر شخص کو تمہارا کارنامہ معلوم ہو چکا ہے یہ جزیرہ بہت بڑا نہیں ہے یہاں ایسی خبریں غضب کی جلدی سے پھیل جاتی ہیں۔ تمہاری قسمت غضب کی ہے کہ کسی نے تمہاری طرف توجہ نہیں دی ورنہ شہر میں کئی جگہ مٹادی ہوئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ہاؤن کے قید خانے سے فلاں رنگ کے لباس اور طے والا ایک قیدی فرار ہوا ہے۔ میں نے بھی یہ مٹادی سنی تھی اس وقت میرے تصور میں بھی نہیں تھا کہ یہ تمہارا ذکر خیر ہو رہا ہے۔“

اسی طرح کی باتیں کرتے وہ لوگ ایک بھرے پرے بازار سے گزرے اور ایک رہائشی عمارت کے سامنے جا کر رک گئے۔ ہوشمند نے گاڑی عین دروازے کے سامنے

رکوائی تھی۔ گاڑی سے اترتے ہی وہ تہاں کو لے کر گھر میں گھس گیا یہ ایک کافی کشادہ مکان تھا۔ یہاں گھستے ہی تہاں کو لگا جیسے وہ کسی پھلدار باغ میں چلا آیا ہے انواع و اقسام کے پھلوں کی خوشبوئیں پورے گھر میں بھری ہوئی تھیں۔ کئی جگہ لکڑی کی بڑی بڑی ادھ کھلی بیٹیاں نظر آئیں ان میں کشتش، بی، سنگنے، مانے، کیلے اور انگور بند تھے۔ ہوشمند تہاں کو لے کر مکان کی نشست گاہ میں پہنچا۔ گھر میں چند ملازم بھی موجود تھے تاہم ہوشمند اس احتیاط سے نشست گاہ تک پہنچا کہ کسی ملازم کی نگاہ تہاں پر نہیں پڑ سکی۔ نشست گاہ کا دروازہ بند کر کے اس نے ایک طویل سانس لے۔ پیسے بڑا بوجھ سر سے اتر گیا ہو۔ بولا۔

”تمہارے لئے سب سے بڑا خطرہ تمہارے لمبے بال ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ بال تراشو۔ داڑھی وغیرہ بھی صاف کرو۔ اس کے بعد اس شخص لباس سے چمکارہ حاصل کرو اور تروتازہ ہو کر میرے پاس آ جاؤ۔“ پھر اس نے ایک طرف اشارہ کیا اور بولا۔ ”تمام اس طرف ہے۔“

ہوشمند کے اس مکان میں ضرورت کی ہر شے موجود تھی۔ حمام صاف ستھرا اور ہر سہولت سے مزین تھا۔ ہوشمند کی ہدایت کے مطابق تہاں نے اپنے بال تراشے، سر کے بال صاف کئے اور نما کر لباس بدل لیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ اور ہوشمند کھانے سے فارغ ہو چکے تھے اور موی شمعوں کی روشنی میں بیٹھے گفتگو کر رہے تھے۔ ہوشمند نے تہاں کو بتایا کہ اسے کم از کم ایک ہفتے تک اس مکان سے باہر نہیں نکلنا چاہئے کیونکہ جزیرے میں ہر جگہ اس کی تلاش ہو رہی ہے۔ اس کے بعد اس نے تہاں کو اپنی طویل اور دلچسپ کہانی سنائی۔ اس کہانی کا خلاصہ یہ تھا کہ لڑائی کے روز ہی ہوشمند انتہی سے فرار ہو گیا تھا۔ فرار ہوتے وقت اس نے ایک دوست بولائی گھرانے کی مدد کی اور انہیں بھی اپنے ساتھ لے لیا۔ وہ لوگ کسی نہ کسی طرح سہال تک پہنچے اور ایک لاوارث کشتی کے ذریعے مشرقی رخ پر نکل گئے۔ ہوشمند دو روز تک کشتی کھیتا رہا اور آخر بولائی گھرانے کو جزیرہ ”ایوبو“ کے ساحل تک پہنچانے میں کامیاب ہو گیا۔ ان لوگوں نے اس خدمت کے عوض ہوشمند کو ایک چھوٹا سا سینی بار دے کر مال کر دیا۔ ہوشمند اپنی کشتی کھیتا ہوا جزیرہ سکوپے لاس پہنچ گیا۔ یہاں اس نے وہ بار فروخت کر کے رہائش کے لئے مکان خریدا اور باقی رقم سے کاروبار شروع کر دیا۔ پہلے اس نے زیتون کے تیل کا کام شروع کیا مگر پھر ارادہ بدل کر پھلوں کی فروخت کرنے لگا۔ اس کاروبار میں اسے خاصی کامیابی ہو رہی تھی وہ مختلف جزیروں سے تازہ پھل لاکر اپنی دکان پر فروخت کرتا تھا۔ یہ دکان شہر کے ایک

معروف بازار میں تھی اور تیزی سے ترقی کے مراحل طے کر رہی تھی۔

جواب میں تابان نے بھی ہوشمند کو اپنی پیشتر کہانی سنا دی۔ تین اہم سرداروں کے قتل سے لے کر اپنے گرفتار ہونے تک اور شاہی محل میں طلبی سے لے کر اپنی مہم کی شروعات تک اس نے سب کچھ ہوشمند کے گوش گزار کر دیا۔ اس روایت میں اس نے شہزادی مارشا کا ذکر بھی کیا اور بتایا کہ سکندر سے شہزادی مارشا کے بارے میں اس کی کیا گفتگو ہوئی تھی۔ ہوشمند کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ وہ اس بات پر حیران نظر آنے لگا کہ تابان براہ راست سکندر سے ملاقات کر چکا ہے۔ اس کے علاوہ شہزادی مارشا کے ذکر نے بھی اسے متاثر کیا تھا۔ وہ تابان کو ٹھٹھے والی نظروں سے دیکھ کر بولا۔

”شہزادی مارشا کے بارے میں کوئی پتہ نظر آ رہا ہے۔ کہیں دیوتا کیونہ کا محبت بھرا تیر تو نہیں کھایا میرے شہزادے نے!“

تابان نے کہا۔ ”نہیں ہوشمند! وہ چہرہ تو پوچھنے کے لائق ہے تم نے اس کے لئے ”محبت“ کا لفظ استعمال کیا ہے تو لگتا ہے اس کی توہین کی ہے۔“

ہوشمند بولا۔ ”محسوس ہوتا ہے تم نہیں بول رہے تمہارے دل کے زخم بول رہے ہیں۔ میں نے تو پہلے ہی کہا تھا یہ آسمانوں پر رہنے والی چیزیں ہیں، ہم جیسے خاک نشینوں کو حق نہیں پہنچتا کہ ان کا تصور بھی کریں۔“

تابان نے کہا۔ ”کاش تم نے وہ چہرہ دیکھا ہوتا پھر میں پوچھتا اس کا تصور کرنا تمہارے اختیار میں ہے یا نہیں۔“

”بہت خوب۔“ ہوشمند نے اپنا گھڑے جیسا سر ہلایا۔ ”خالبانی سر سے گذر چکا ہے۔ ویسے جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے شہزادی ”غضب“ کے پردے میں رہتی تھی۔ تم نے وہ رخ روشن کیونکر دیکھ لیا۔“

تابان وہ واقعہ سناتے لگا جب ایک شب ایک حسن اتفاق نے اسے آفتاب نیم روز کے روبرو کر دیا تھا اور اس کی بصارت جاتی رہی تھی۔ کافی دیر اس موضوع پر گفتگو ہوتی رہی پھر تابان کی کوشش سے بات چیت کا رخ جزیرے کے حالات کی طرف مڑ گیا۔ تابان کی نگاہوں میں وہ رہ کر وہ خالی کرسی گھوم رہی تھی جو اس نے جلسہ گاہ کے چبوترے پر حکم دیا تھا اور جس پر زرد گلاب کا پھول رکھا ہوا تھا۔ اس نے اس بارے میں ہوشمند سے پوچھا تو وہ بولا۔

”زرد پھول اس جزیرے میں انتظار کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ شاہی نشست پر زرد

پھول رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ جزیرے کا حکمران جزیرے پر موجود نہیں اور رعایا کو اس کا انتظار ہے۔“

”میں سمجھا نہیں۔“ تابان نے وضاحت چاہی۔

ہوشمند نے کہا۔ ”اس جزیرے کی حکمران ایک خوبرو ملکہ زونیا ہے وہ شاہی سے پہلے ہی یہ وہ ہو گئی تھی۔ یہ ایک غضب کی کہانی ہے پھر کسی وقت تمہیں سناؤں گا۔ کچھ عرصہ پہلے زونیا نے ایک شخص سے محبت کی شادی کی اور جزیرہ چھوڑ کر چلی گئی جزیرے کے لوگ زونیا سے غضب کی محبت رکھتے تھے۔ اور اب بھی کرتے ہیں۔ ان میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ ملکہ کی نشست پر کسی اور کو برا بھلا کریں۔ وہ شاہی نشست پر زرد پھول رکھتے ہیں اور اس امید میں ہیں کہ وہ کسی دن لوٹ آئے گی۔ وہ شخص جسے تم نے چبوترے پر تقریر کرتے دیکھا تھا جزیرے کی فوج کا سپہ سالار ہے۔ ملکہ کے بعد وہ عارضی طور پر سربراہ حکومت کے فرائض انجام دے رہا ہے۔“

تابان نے اس جزیرے کے بارے میں ہوشمند سے اور بھی بہت سی معلومات حاصل کیں۔ وہ جانتا چاہتا تھا کہ جزیرے کے لوگ مقدونیہ اور شاہ مقدونیہ کے بارے میں کیا خیالات رکھتے ہیں۔ یہ سب کچھ جانتا تابان اور اس کے ساتھیوں کی مہم کا حصہ تھا۔

ہوشمند نے کہا۔ ”تاہو! میں نے تمہاری باتوں سے اندازہ لگایا ہے کہ تمہاری مہم کا مقصد اس راستے کے بارے میں معلومات کا حصول ہے جس پر سکندر کو پیش قدمی کرنی ہے۔“

”تمہارا اندازہ درست ہے۔“ تابان نے کہا۔

ہوشمند بولا۔ ”ایک ناچیز رائے پیش کرنا چاہتا ہوں اگر تمہیں ناگوار نہ گزرے تو۔“ تابان سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ہوشمند نے کہا۔ ”تم نے ابھی زرناب نامی شخص کا ذکر کیا ہے جو دو برس پہلے شاہ مقدونیہ کی ہدایت پر بحیرہ اسٹیکس میں آیا تھا اور واپس نہیں گیا۔“ یقینی بات ہے کہ اس شخص کے پاس غضب کی معلومات ہوں گی جو اس کی حکم عدولی کے سبب بے کار چلی گئی ہیں۔ بجائے اس کے کہ تم خود در بدر بھٹک کر یہ معلومات اکٹھی کرو اگر تم کسی طرح اس شخص کو واپس لے جانے میں کامیاب ہو جاؤ تو یہ زیادہ بہتر اور سہل کام ہو گا۔“

تابان نے مسکرا کر کہا۔ ”ہوشمند! تم نے میرے منہ کی بات سمجھنی ہے۔ میں خود اسی انداز میں سوچ رہا ہوں۔ قبرخانے میں میں نے نورین نامی اس قیدی سے زرناب کا

لگے گی۔

تہاں نے کہا۔ ”لیکن یہ تو صرف ایک اندازہ ہے ہو سکتا ہے اتنی بڑی فوج کی تیاری میں تاخیر ہو جائے۔۔۔۔۔ اور اس ہم کی مینے یا ایک دو سال لگ جائیں۔ اتنی دیر میں تو وہ تاریک تہ خانے نہ جانے کو راجھی کتنی لڑکیوں کو نگل جائیں گے۔“

ہوشمند نے کہا۔ ”اگر تاخیر کی صورت ہوئی تو تم سکندر سے مشورہ کر کے کوئی حل نکال سکتے ہو۔ یہ صرف کورا کا معاملہ نہیں سردار شلال اور گونسل جیسے اہم سرداروں کا مسئلہ بھی ہے۔ سکندر تمہاری تشویش کو نظر انداز نہیں کر سکتے گا۔“

ہوشمند کی باتوں میں خاصا وزن تھا ہاں تو اس کی شخصیت مضحکہ خیز تھی مگر جب وہ سوچ میں ڈوب کر بات کرتا تھا تو بہت دور لڑی کوڑی لاتا تھا۔ تہاں خود بھی سوچ رہا تھا کہ اسے کوئی جلد بازی نہیں کرنی چاہئے۔ طویل گت و شنید کے بعد وہ دونوں اس نتیجے پر پہنچے کہ قیدیوں کی رہائی کا مسئلہ فی الحال مؤخر کر دیا جائے اور اس شخص کو ڈھونڈا جائے جو پچھلے دو برس سے شاہ مقدونیہ کے لئے معمر بنا ہوا ہے۔

☆-----☆-----☆

ایک ہفتے تک تہاں نے ہوشمند کے گھر میں مکمل آرام کیا۔ ہوشمند کو کھانے پینے سے شغف تھا شاید اس لئے اس نے زیتون کا کام چھوڑ کر پھلوں کی تجارت شروع کی تھی۔ وہ ہر وقت کھانا پیتا رہتا اور تہاں کو بھی اس طرف راغب کرتا۔ ”دیکھو تہاں! کیا غضب کا آلو بخارا ہے۔ ایسا آلو بخارا پورے یونان میں نہیں ملے گا۔ اور یہ سنگترہ دیکھو۔ کیسی غضب کی رنگت پائی ہے۔ جزیرہ ریزہ اس کا ہے۔ اس جزیرے کے انگور تو بس غضب ہی ڈھکا دیتے ہیں لیکن افسوس اس دقت میرے ذخیرے میں نہیں۔ خیر! تم یہ کشمش چکھو یہ بھی انہی انگوروں کی بنی ہوئی ہے۔“ وہ سارا دن تہاں کو مصروف طعام رکھتا اور دنیا جہان کی باتیں کرتا۔ اس کے علاوہ وہ گاہے گاہے کھاڑی کی خبر بھی لے لیتا تھا۔

ایک روز وہ شام کو گھر آیا تو کہنے لگا۔ ”تاہو! کل یہاں سے نکلنے کا بہت اچھا موقع ہے۔ ایک قریبی جزیرے سے کچھ شاہی مہمان آرہے ہیں۔ کل ان کے اعزاز میں ایک بڑی ضیافت دی جائے گی۔ اس ضیافت کے لئے پھولوں کا ایک بہت بڑا فرش تیار کیا جا رہا ہے۔ یہ کام جزیرے کے سپاہی کر رہے ہیں۔ میں نے آج دیکھا ہے کھاڑی پر برائے نام محافظ تھے میرا خیال ہے کل علی الصبح یہاں سے نکل چلیں۔“

پتہ دریافت کیا ہے اور اگر وہ شخص اپنی قیام گاہ چھوڑ نہیں گیا تو مجھے وہاں پہنچنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوگی۔“

ہوشمند جوش سے بولا۔ ”اس کا مطلب ہے تم وہاں جانا چاہتے ہو۔“

”بالکل!“ تہاں نے جواب دیا۔

”تم نے اس جزیرے کا نام سامو تھریس ہی بتایا ہے؟“ تہاں نے اثبات میں جواب دیا۔ ہوشمند خوش ہو کر بولا۔ ”یہ بہت آسان کام ہے۔ میں پھلوں کے لئے تھاموس کے جزیرے پر جانا رہتا ہوں۔ سامو تھریس کا جزیرہ وہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ ہوا موافق ہو تو مشکل سے دو گھنٹی کا سفر ہے۔ شاید تمہیں معلوم نہیں میرے پاس اپنی کشتی ہے بالکل نئی اور اس کے باہان بھی غضب کے ہیں۔“

تہاں نے کہا۔ ”یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔۔۔۔۔ تمہارا کیا خیال ہے ہم کب تک سامو تھریس کی طرف روانہ ہو سکتے ہیں؟“

ہوشمند کا ہمتیا ہوا چہرہ ذرا پیکا پڑ گیا بولا۔ ”نوں تو تم اپنا حلیہ کافی حد تک بدل چکے ہو پھر بھی میرے خیال میں ابھی پانچ چھ روز تک تمہیں کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہئے۔ میں کھاڑی پر نگاہ رکھتا ہوں جو نئی حالات درست ہوئے ہم نکل چلیں گے۔“

تہاں نے کہا۔ ”ہوشمند! یہ کام اتنا سہل نہیں جتنا تم سمجھ رہے ہو۔ میں یہ جزیرہ چھوڑنے سے پہلے اپنے ساتھیوں کو بھی رہا کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے یہ گوارا نہیں کہ انہیں انتظار میں رکھ کر میں کسی دوسرے معاملے میں الجھ جاؤں۔“

ہوشمند نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”تہاں! میں اس جزیرے پر چار مہینے سے ہوں جتنا میں جانتا ہوں تم نہیں جان سکتے۔ اگر تمہارا خیال ہے کہ اپنی کوشش سے سردار شلال وغیرہ کو رہا کر لو گے تو یہ سراسر خام خیالی ہے۔ انہوں نے صرف ایک بار ہوتی ہے اور وہ ہو چکی ہے۔ تم ہاون کا قید خانہ توڑ چکے ہو۔ اب کوئی ایسا خیال دل میں مت لاؤ۔“

تہاں نے کہا۔ ”تو پھر ان کا مستقبل کیا ہو گا؟“

ہوشمند بولا۔ ”تمہاری مہم کامیاب ہو گئی تو ان کا مستقبل خود بخود سنور جائے گا۔ تم زرناب کو لے کر واپس مقدونیہ پہنچ گئے اور سکندر اپنا لشکر لے کر روانہ ہوا تو راستے کے یہ سارے جزیرے خود بخود اس کے مطیع ہو جائیں گے۔ پھر ہاون کا قید خانہ بھی تمہارا آگے کے ایک اشارے سے کھل جائے گا اور یہ کوئی بہت دور کی بات نہیں ہے۔ حالات تم بتا رہے ہوں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ سکندر کی لشکر کشی میں اب زیادہ دیر نہیں

تہاں تو پہلے ہی تیار بیٹھا تھا۔ ایک بے چینی سی ہر وقت اس کے دل کو گھیرے رکھتی تھی۔ وہ چاہتا تھا سکندر کی شرط جلد از جلد پوری ہو اور وہ شہزادی مارشا کی صورت دیکھ سکے۔ کسی وقت اس کے دل میں عجیب وسوسے جاگ اٹھتے۔ وہ سوچتا کیا سکندر اپنا وعدہ پورا کرے گا۔ کہیں وہ اس سے فریب تو نہیں کر جائے گا۔ تہاں کو معلوم تھا خوبصورتی اپنی دشمن آہی ہوتی ہے اور مارشا خوبصورتی کی انتہا کا نام ہے۔ کیا نوجوان بادشاہ اس حسن مجسم کو دیکھ کر اپنے دل پر قابو رکھ سکے گا۔ وہ ایک بادشاہ تھا اور بادشاہ کی دراز دستی ہر شک و شبہ سے بالاتر تھی۔ اسے اپنی مملکت کی ہر چیز پر تصرف حاصل تھا وہ چاہتا تو تہاں کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر باہر پھینک سکتا تھا۔ تہاں کو بادشاہ وقت سے عجیب طرح کی رقابت محسوس ہونے لگتی۔ اس کا یہ گمان تصور خوبرو بادشاہ کے سامنے مارشا کو لاکھڑا کرتا۔ مارشا جس کے نوخیز بدن میں قیامتیں کھلی تھیں، ریلے ہونوں سے شدہ فیکتا تھا اور آنکھوں میں دنیا کے خوبصورت ترین موتی کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ تہاں کا سینہ دھک اٹھتا۔ اسے لگتا کہ اس کے دل کے معبد میں زلزلہ برپا ہو گیا ہے اور وہاں بھی ہوئی ایک خوبصورت مورتی میں دراڑیں پڑ رہی تھیں۔ اس کا دل چاہتا یہ مہم فوراً پایہ تکمیل کو پہنچے اور وہ اڑ کر واپس ایتھنز چلا جائے۔ اس وقت بھی ہوشمند کی بات سن کر اس کا جی خوش ہو گیا وہ بولا۔

”پیارے ہوشمند کیوں نہ صبح کی بجائے آج رات ہی نکل جائیں۔“

ہوشمند نے کہا۔ ”اب اتنی جلدی بھی اچھی نہیں۔ اس سے پہلے میں کبھی رات کے وقت کشتی لے کر نہیں نکلا اس لئے کسی کو شبہ ہو سکتا ہے۔“

وہ رات تہاں نے جیسے تیسرے کانٹے۔ اگلے روز علی الصبح وہ دونوں جزیرے کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ اپنے طے اور لباس سے وہ دونوں ہی پھل فروش نظر آتے تھے۔ کشتی میں ہوشمند نے آلو بخارے کے بست سے نوکرے لا کر رکھے تھے آلو بخارا جزیرہ سکوپے لاس کی خاص پیداوار تھا اور یہاں کا پھل دور دور تک جاتا تھا ہوشمند کو یہ پھل جزیرہ تھامسوس کی کھاڑی پر پہنچانا تھا اور وہاں سے کوئی دوسرا پھل کشتی پر بار کرنا تھا۔

کھاڑی سے نکلنے میں انہیں کسی خاص دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ہوشمند کھاڑی پر ایک بنا پچھتاہٹھن تھا۔ لہذا تہاں پر بھی کسی نے خصوصی توجہ نہیں دی۔ ہوشمند ملاخوں اور مانی گیروں سے نوک جھونک کر تہاں کو کشتی تک لے آیا۔ کھاڑی میں کھڑی ہوئی کئی کشتیوں پر تہاں نے ایک تصویر لگی دیکھی۔ شوخ رنگوں سے بنی ہوئی،

یہ تصویر ایک خوبصورت عورت کی تھی۔ اس کے سر پر تاج نظر آ رہا تھا۔ ایسی ہی تصویر تہاں نے کھاڑی کے راستے میں بھی کئی دکانوں پر آویزاں دیکھی تھی۔ مختلف تصویروں میں خدوخال مختلف نظر آتے تھے لیکن سب بات تھی کہ مصور نے ایک ہی عورت کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ عورت وہی ملکہ تھی جو اپنے محبوب عوام کو چھوڑ کر اپنے محبوب کے سنگ جزیرے سے رخصت ہو چکی تھی۔ ایک ملکہ کا سارا حسن وقار اور غرور ایک عاشق کے قدموں میں بکھر گیا تھا اور وہ کچے دھماگے سے بندھ کر ان لوگوں سے دور چلی گئی تھی جو اب بھی اسے یاد کر کے آئیدہ ہو جاتے تھے۔ کھاڑی پر موجود ایک سرکاری محافظ نے تہاں کے بارے ہوشمند سے چند سوال کئے جن کے ہوشمند نے مناسب جواب دیے اور یوں وہ کھاڑی سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ کھلے سمندر میں بیٹھتے ہی ہوشمند نے کشتی کی رفتار تیز کر دی 'ہوا موافق تھی۔ وہ دوپہر تک تھامسوس پہنچ گئے وہاں کچھ وقت پھل کے اتارنے چڑھانے میں صرف ہوا۔ اس دوران تہاں اور ہوشمند بھی کھائی کر تازہ دم ہو چکے تھے۔ اب انہوں نے اپنی کشتی کا رخ جزیرہ سامو تھریس کی طرف کر دیا۔

وہ شام سے کچھ دیر قبل سامو تھریس پہنچے۔ یہ جزیرہ دور تک کتے جنگلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ آسمان گہرا نیلا تھا اور ڈوبتے سورج کی روشنی میں خوش رنگ آبی پردے مجھ پر داز نظر آتے تھے۔ انہوں نے کشتی کھاڑی میں ہی ایک پیریدار کی نگرانی میں چھوڑ دی اور جزیرے پر آ گئے۔ تہاں نے قید خانے میں نورین سے جو معلومات حاصل کی تھی ان کے مطابق جزیرے کے انتہائی جنوب میں جزیرے کی سب سے بڑی عبادت گاہ تھی۔ اس عبادت گاہ سے کچھ فاصلے پر ایک سرسبز ٹیلا تھا جہاں سفید چوٹے سے بنا ہوا ایک دیدہ زیب مکان زرتاب کی قیام گاہ تھا۔ ہوشمند اور تہاں ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس عبادت گاہ اور پھر اس مکان تک جا پہنچے لیکن یہ جان کر ان کے جذبوں پر اوس پڑ گئی کہ مکان میں زرتاب کی جگہ ”نرائے“ کا کوئی سوداگر مقیم ہے۔ یہ سوداگر زرتاب کے بارے کچھ زیادہ نہیں جانتا تھا تاہم سوداگر کی باتوں سے معلوم ہوا کہ یہ مکان اور ٹیلا اس نے زرتاب سے چند ماہ قبل ایک ہزار ٹیلنٹ میں خریدا تھا۔

تہاں کے اندازے درست نکلے تھے۔ وہ مکار شخص اپنی ممکنہ گرفتاری سے بچنے کے لئے ٹھکانہ بدل چکا تھا۔ اب وہ نہ جانے کہاں گیا تھا؟ کس شناخت سے کہاں ٹھہرا ہوا تھا؟ تہاں اور ہوشمند تو اس کی صورت تک نہیں پہچانتے تھے۔ وہ ان کے سامنے سے

ضرورت تھیں۔ وہ اسی جزیرے میں ہے ہم اس کا پتہ جانتے ہیں۔" اس کے بعد جاگل نے انہیں تفصیل سے زرناب کا حدود اربعہ سمجھایا۔ ان باتوں سے پتہ چلا کہ زرناب نے اپنے تمام ریوڑ سچ ڈالے ہیں۔ اس نے جزیرے کے شمالی ساحل پر گنجان آبادی میں ایک مکان خرید رکھا ہے اور وہاں بڑے ٹھاٹ سے رہتا ہے۔ اس کا میل جول عیاش لوگوں سے ہے اور وہ خود بھی بڑے رنگین شب و روز گزارتا ہے۔ حال ہی میں اس نے اپنی حفاظت کے لئے چند خطرناک غنڈے پالے ہیں۔ یہ غنڈے لوگوں کے ہاتھ پاؤں توڑنے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔

جاگل نے انہیں مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ "اگر تم زرناب سے اپنا حق خدمت وصول کرنا چاہتے ہو تو اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ جزیرے کی عدالت سے رجوع کرو منصف بہت انصاف پسند شخص ہے وہ زرناب جیسے سرکشوں کو ناگوں پتے چھوڑ دیتا ہے۔" تاہم نے کہا۔ "محترم! آپ ہمیں کدو نہ سمجھیں ہم اپنا حق برزور بازو بھی حاصل کر لیں گے۔ زرناب نے ابھی تک ہمارا جھکا ہوا سر دیکھا ہے۔ ہمارے اٹھے ہوئے ہاتھ نہیں دیکھے۔ ہماری رگوں میں اصل ایرانی خون ہے۔ ہم اسے بتا دیں گے کہ مزدور کی اجرت کیسے غصب کی جاتی ہے آپ بالکل بے فکر رہیں۔"

ہوشمند نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ "یہ ہمارا معاملہ ہے جناب! آپ ہم پر بھروسہ دیں آپ کی بے حد عنایت کہ آپ نے ہمیں اس کا ٹھکانہ بتا دیا۔ بس اتنا ہی کافی ہے۔" چرواہے کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ دونوں جو کہہ رہے ہیں اس پر عمل بھی کر پائیں گے۔ تاہم کے ذیل ڈول اور دراز قامت نے انہیں متاثر ضرور کیا تھا لیکن وہ ان کی نگاہ میں ایک گھریلو خدمتگار ہی تھا۔ ایک گھریلو خدمتگار زرناب کے خونخوار فنڈوں سے کہاں تک نبرد آزما ہو سکتا تھا۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ اس گھریلو خدمتگار کے قبضے میں وہ خوفناک جنگجو چھپا ہوا ہے جس نے ایک ہی جھنجھپ میں سکندر کے تین چونی کے سردار ہلاک کئے تھے اور جس کا نام مقدونیہ و یونان کے ہر سپاہی کو معلوم ہو چکا ہے۔ وہ کافی دیر تاہم کو یہ سمجھانے کی کوشش کرتے رہے کہ وہ جو کچھ کرنا چاہتا ہے زرناب کے خونخوار سپردار سے بچ کر کرے۔

رات کسی وقت مطلع ابر آلود ہوا اگلے روز صبح موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ ان جزیروں پر ہونے والی بارش عموماً طوفانی ہوتی تھی اور تھوڑی دیر جاری رہتی تھی، لیکن اس روز جو بارش شروع ہوئی وہ مختلف قسم کی تھی۔ جزیرے کا نیلا آسمان

گہرے سیاہ بادلوں سے ڈھک گیا۔ طوفانی بجزوں کے ساتھ زور دار ہوجھاڑیں پڑنے لگیں اور یہ سلسلہ سارا دن جاری رہا۔ تاہم اور ہوشمند بستی میں محصور ہو کر رہ گئے۔ جاگل اور اس کے ساتھیوں نے مہمانوں کی طرح ان کی خاطر مدارت جاری رکھی۔ وہ شراب کے رسیا تھے۔ انہوں نے تاہم اور ہوشمند کو بھی بے تحاشا پلائی۔ یہ ایک نہایت لطیف تجربہ تھا۔ چڑے کے خیمے پر متواتر پانی برس رہا تھا۔ بستی کے چرواہے دیوار کے اوڑھے کے گرد بیٹھے برباد اور بانسریاں بجا رہے تھے۔ ایک معصوم چہرہ دو شیرازہ رقص کر رہی تھی اور کوئی قدیم گیت گارہی تھی۔ اس گیت میں ان ذہنوں کی مسافروں کا ذکر تھا جنہیں مشرق سے چلنے والی ہوا جزیرے کے ساحل پر لاتی تھی۔ وہ سمندر پار کے سنہری دیس کی کہانیاں سن کر کنواری چرواہیوں کا دل موہ لیتے تھے اور پھر لوٹ جاتے تھے، کبھی واپس نہ آنے کے لئے۔ انہوں نے گھریلو شراب کے جام لگاتار پیتے ہوئے چرواہے بڑی عویت سے یہ گیت سن رہے تھے۔ یہ محفل شام کے بعد دو بج گیا تھا۔ تاہم اور ہوشمند اوڑھے کے قریب ہی بڑکھڑکے رہے۔ رات کسی وقت تاہم کی آنکھ کھلی۔ بچنے ہوئے گوشت اور شراب کی کھینچنے نے پیاس بھڑکا رکھی تھی۔ اس نے پانی کی تلاش میں ادھر ادھر گھومے دوڑائیں اور اس وقت اسے معلوم ہوا کہ ہوشمند خیمے میں موجود نہیں ہے۔ ایک طرف جاگل پڑا ہے خیر سو رہا تھا۔ شراب کا پیالہ اس کے نزدیک ہی لٹکا ہوا تھا۔ قریب ہی ایک ریشمی اوڑھنی پڑی تھی۔ معلوم نہیں یہ کس کی اوڑھنی تھی۔ سردار کی دو بیویاں تھیں۔ پھر اس لڑکی کے سر پر بھی تو ایسی ہی اوڑھنی تھی جو شروع رات میں گیت گارہی تھی۔ یہ اوڑھنی یوں ہی تو یہاں نہیں پڑی تھی۔ یقیناً ہل کسی کے حسین جسم سے کھینچا گیا تھا۔ تاہم نے اس منظر کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی۔ ان لوگوں کے اپنے ہی رسم و رواج تھے اور جب انہوں کی بیٹی بھی درمیان میں آجائے تو وہ وہ کم ہوتا ہے۔ تاہم دے پاؤں خیمے سے باہر نکلا۔ بارش ختم ہو چکی تھی۔ تیسرے ٹپے کا چاند بادلوں کے درمیان بھانکنا دکھائی دیتا تھا۔ خیمہ بستی کے ایک پہلو پر رکھواں کے کتے زور شور سے بھونک رہے تھے۔ تاہم کو کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ ہوشمند کہاں چلا گیا ہے۔ چاند کے رخ سے اندازہ ہوتا تھا کہ شب کا دوسرا پر ختم ہونے والا ہے۔ اس وقت ہوشمند کا پڑاؤ سے باہر ہونا کیا معنی رکھتا تھا۔ تاہم کے دل میں کئی وسوسے سر اٹھائے گئے۔ دقتاً اسے اپنے پہلو کی طرف سے آہٹ سنائی دی اس نے نیام سے تلواری کھینچی اور چونکا ہو گیا۔ "کون ہے؟" اس نے سرسراتی آواز میں پوچھا۔ کوئی جواب نہیں آیا۔ تاہم دے قدموں آواز کی سمت بڑھلا۔

اسے یوں چلتے دیکھ کر کسی شکاری جانور کو گمان ہوتا تھا۔ جوئی وہ ایک خیمے کی اونٹ میں پچکا تاریکی سے سہمی ہوئی آواز آئی۔

”کابو! یہ میں ہوں۔“ آواز یقیناً ہوشمند کی تھی۔

تہاں نے غور سے دیکھا وہ ایک چادر میں لپٹا خیمے کے سائے میں کھڑا تھا۔ ”تم کہاں سے آرہے ہو؟“ تہاں نے حیران ہو کر پوچھا۔

”اندازہ تو چلو۔“ ہوشمند نے جواب دیا۔ ہوشمند خیمے کی طرف بڑھا تو تہاں نے اندازہ لگایا کہ وہ بیشب سے زیادہ لنگڑا رہا ہے شاید کوئی چوٹ وغیرہ آگئی تھی۔ وہ دونوں خیمے میں پہنچے۔ جاگال کے خراسے زور شور سے گونج رہے تھے۔ تہاں نے ایک شمع جلائی۔ روشنی میں اس نے دیکھا ہوشمند زخمی تھا۔ اس کی ایک آنکھ سوچ رہی تھی اور ناک سے خون کی تپکی سی لکیر بہہ رہی تھی۔ ”یہ کیا ہوا؟“ تہاں نے گھبرا کر پوچھا۔ ہوشمند نے کانپتے لبے میں کہا۔ ”دو ٹماؤں کا شکر ادا کرو بیچ کر آیا ہوں ورنہ میری لاش بھی نہ ملتی۔ بڑے ظالم لوگ ہیں وہ۔“

”کون لوگ؟“

”وہی اس بدبخت کے بدذات محافظ راہ پتوں کو پکڑ کر بیٹھا شروع کر دیتے ہیں۔“ تہاں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”کیسے تم..... زرناب کی طرف تو نہیں چلے گئے تھے؟“

”ہاں یہی غلطی ہوئی ہے مجھ سے“ میں نے سوچا تمہاری طبیعت میں گرمی ذرا زیادہ ہے۔ خواخواہ خون ریزی ہو جائے گی، کیوں نہ میں پہلے جا کر حالات کا جائزہ لے لوں۔ مجھے کیا پتہ تھا وہ بلاوجہ گلے پڑ جائیں گے۔“

”تم نے اس کے گھر میں گھسنے کی کوشش کی ہوگی؟“

”دو ٹماؤں کی قسم نہیں میں تو صرف آس پاس گھوم کر جائزہ لے رہا تھا۔ وہ کوئی ایسی سنسان جگہ نہیں ہے بازار ہے اکا دکا اور لوگ بھی موجود تھے۔ میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ مجھ پر شبہ کیا جائے گا۔ اتنے میں ایک لمبا ترنگ شخص آیا۔ اس کے ہاتھ میں مشعل تھی۔ مجھ سے پوچھنے لگا یہاں کیا کر رہے ہو۔ میں نے کہہ دیا یہاں کھڑے ہونا منع ہے۔ بس اسی بات پر وہ ملعون شخصے کی طرح بھڑک اٹھا۔ تاک کر ایسا غضب کا کہہ میری ناک پر مارا کہ میں پکڑا کر رہ گیا۔ اس کے بعد کیا ہوا کچھ نہ پوچھو۔ اس کے دو ساتھی بھی بھاگتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے بیچ بازار کے مجھے وہ غضب کی مار ماری

کہ انجر بنجر مل گیا۔ پھر مجھے کھینچتے ہوئے ایک چھت کے نیچے لے گئے۔ یہاں تین چار مشعلیں روشن تھیں اور گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ غالباً وہ زرناب کی حویلی کا اصطبل تھا۔ مجھے مارنے والے ظاہر ہے زرناب کے پانچوٹے تھے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھ گچھ شروع کر دی کہ میں کون ہوں اور یہاں کیوں گھوم رہا تھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں یہاں بالکل اجنبی ہوں۔ اپنے ساتھی کے ساتھ پھل فروخت کرنے کے لئے جزیروے پر آیا تھا۔ ساتھی گم ہو گیا ہے اور اسے ڈھونڈتا پھر رہا ہوں لیکن وہ میری بات پر کسی صورت یقین کرنے کو تیار نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ میں کسی بری نیت سے ان کے آقا کی رہائش گاہ میں گھسنا چاہتا تھا وہ بار بار کسی ریچھ کا ذکر بھی کر رہے تھے۔ سخت پوچھ تاچھ اور چھان بین کے بعد وہ مجھے چھوڑنے پر آمادہ ہوئے لیکن اس سے پہلے انہوں نے مجھ سے دست بستہ معافی منگوائی اور حکم دیا کہ میں منہ سے لمبی کی طرح میاؤں میاؤں کی آواز نکال کر تسلیم کروں کہ مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔ تم تو جانتے ہی ہو کابو! میں لڑنے پر آجاتا تو غضب ہو جاتا تھا۔ مرنے سے پہلے میں تین چار کی موت تو غضب ناک کر ہی دیتا لیکن میں معاملہ بگاڑنا نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ اس میں ہمارا ہی نقصان تھا لہذا شرافت سے میاؤں کی آواز نکال کر اپنی جان چھڑائی اور گرتا پڑتا یہاں پہنچا ہوں۔“

ہوشمند کی حالت زار دیکھ کر تہاں کے سینے میں آگ سی روشن ہو گئی اس کا دل چاہا ابھی پڑاؤ سے نکلے اور زرناب کی گردن تاپنے کے لئے اس کی حویلی میں پہنچ جائے۔ شاید رات اتنی زیادہ نہ بیتی ہوتی تو وہ نکل بھی پڑتا لیکن اب ممکن نہیں تھا اور پھر ہوشمند بھی اس کے سامنے موجود تھا۔ وہ کسی طور پر اسے تنہا خطرے میں کودنے کی اجازت نہ دیتا۔ تہاں نے اپنے دلی جذبات کو چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا اور خشک لبے میں بولا۔

”تمہیں اس طرح بغیر مشورے کے وہاں نہیں جانا چاہئے تھا۔ معاملہ بگڑ جاتا تو کئے کرائے پر پانی پھر جانا تھا۔“

ہوشمند نے برا سامنہ بنا کر غصے سے کہا۔ ”تو تم چاہتے ہو اب میں تمہارے سامنے بھی میاؤں میاؤں کی آواز نکالوں!“

تہاں بولا۔ ”میرا مطلب یہ ہے کہ ہمیں اب جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہئے ہم کامیابی کے بالکل قریب پہنچ چکے ہیں۔ بہتر ہے کہ ایک دو روز اچھی طرح سوچ بچار کرنے کے بعد کوئی قدم اٹھائیں۔“

”کیسا قدم؟“ ہوشمند نے منہ پھلائے پھلائے پوچھا۔

آگے بڑھتا چلا گیا اور طویل چکر کاٹ کر عتب کی ایک اندری گلی میں پہنچ گیا۔ اس طرف روشنی تھی اور نہ پہرہ۔ وجہ یقیناً یہی تھی کہ اس طرف سے مکان کے اندر داخل ہوتا ناممکن تھا۔ ایک سیدھی سیٹ دیوار بالائی منزل کی چھت تک چلی گئی تھی۔

اس تاریک گلی میں پہنچ کر تہاں نے گھوڑا ایک طرف باندھ دیا۔ پہلے جوتے اتار کر خرچین میں رکھے پھر فراک بھی اتار دیا۔ اب اس کے جسم پر ایک لنگوٹی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ خنجر لنگوٹی میں اڑس کر اس نے خود ساختہ کندھائی اور عمل کے لئے تیار ہو گیا۔ پندرہ ہی بعد وہ مکان کی چھت پر پہنچ چکا تھا اور نیچے جانے والے زینوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کی حرکات و سکنات میں بلا کی بھرتی تھی۔ مکان کے کینوں سے اس کی پہلی ملاقات زینوں کے درمیان ہوئی۔ یہ ایک نومند خادم تھا جو غالباً چھت پر ہونے والی آہٹ سن کر اوپر آ رہا تھا۔ یکایک تہاں اندھیرے سے نکلا اور موت بن کر اس سے لپٹ گیا۔ اس کا ایک ہاتھ بد مقابل کے منہ پر آیا اور دوسرے نے اتنی عقلی سے اس کی شہ رگ کاٹ ڈالی کہ دیر تک مقتول کو بھی اس سانچے کی خبر نہیں ہوئی ہوگی۔ گرم خون ایک دھار کی طرح تہاں کے ننگے پاؤں پر گرا، مرنے والے کے جسم نے چند جھٹکے کھائے اور تہاں کے آہنی بازوؤں میں جھول گیا۔ تہاں نے اسے گھٹیت کر زینوں کے تاریک ترین کونے میں سمیٹ دیا اور خون آلود خنجر کو صاف کرتا ہوا بالائی منزل پر اٹھ گیا۔ ایک شخص سے خبردار ہونے کے بعد اس کے جسم میں جیسے پارہ بھر گیا تھا۔ وہ کسی آسیب کی طرح چند ہی لمحوں میں پوری منزل پر گھوم گیا۔ اس چھت کے نیچے اب کل دو خادم تھے ایک مرد اور ایک عورت۔ عورت جو باورچین تھی مطبخ کے اندری ایک بوسیدہ قالین بچا کر لیٹی ہوئی تھی۔ وہ یا تو جاگ رہی تھی یا بہت کچھ نیند میں تھی۔ جو سنی تہاں نے مطبخ میں قدم رکھا وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اس کی آنکھیں چند ساعت کے لئے تہاں پر مرکوز رہیں پھر وہشت سے پھیلتی چلی گئیں۔ آنکھوں کے ساتھ ساتھ اس کا منہ بھی کھلنا شروع ہوا۔ یقیناً وہ ایک لرزہ خیز جج بلند کرنے کے لئے پھینچوں میں سانس بھر رہی تھی۔ یہ سب کچھ تہاں نے ساعت کے ایک مختصر حصے میں دیکھ لیا۔ پھر وہ بجلی کی طرح تڑپ کر عورت پر آیا۔ اس کے ایک ہاتھ نے عورت کا منہ ڈھانپا، دوسرے ہاتھ نے غم دار خنجر اس کی گردن پر رکھ دیا۔ وہ دیوانہ وار مزاحمت کر رہی تھی۔ چند لمحوں کے لئے تہاں کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ اس عورت کا کیا کرے۔ پھر اس نے جھنڈا کراپنے یا زکوہ حرکت دی اور عورت باسر پوری شدت کے ساتھ فرش سے ٹکرا دیا۔ یہ ایک غیر معمولی ضرب تھی۔ عورت کا

”یہی کہ زرناب کو یہاں سے کس طرح لے جانا ہے۔ یہ بات تو ثابت ہو چکی ہے کہ وہ اپنی خوشی سے ہمارے ساتھ روانہ نہیں ہوگا۔ اس کے ساتھ زبردستی کرنا پڑے گی۔ دوسرے لفظوں میں ہم اسے گرفتار کر کے یہاں سے لے جائیں گے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟“

ہوشمند خوب غور سے تہاں کی بات سن رہا تھا۔ یکایک اسے احساس ہوا کہ تہاں باتوں میں لگا کر اس کی عقلی دور کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ ایک بار پھر ہتھ سے اٹھ گیا۔ بیڑی سے ہوا۔ ”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔۔ ٹھیک ہے جو تمہاری سمجھ میں آئے کرو۔ دنیا جہان کی عقل تمہارے ہی دماغ میں تو تھمتھی ہوئی ہے۔“ اس کے بعد اس نے روشنی ہوئی بیوی کی طرح منہ پھیرا اور ادھ بیٹھی انگلیشی کے پاس بیٹھ کر اپنی غضب کی سوئی ہوئی آنکھ پر غور کرنے لگا۔

☆-----☆-----☆

رات تاریک اور خشک تھی جب فیصے میں جاگل اور ہوشمند کے خرانے کو بچنے لگے تو تہاں پہ آہستگی اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ آج وہ وہی کام کرنے جا رہا تھا جو کل رات ہوشمند نے کیا تھا۔ کل ہوشمند کی مم ہوئی سے تہاں بے خبر تھا۔ آج رات تہاں کے منصوبے کی ہوشمند کو خبر نہیں تھی۔ تہاں نے سردار جاگل کا خم دار خنجر اپنی کمرے ازسا اور دپے پاؤں اس حاطے میں پہنچ کیا جہاں چرواہوں کے گھوڑے بندھے رہتے تھے۔ اس اصطبل نما جگہ سے اس نے کچھ راسیں سمیٹ کر کند کی شکل میں جوڑ لیں۔ پھر ایک تندرست گھوڑا لیا اور اس کے ساتھ پیدل چلتا ہوا پڑاؤ سے نکل آیا۔ دکھائی کے کتب سے کافی فاصلے پر جا کر اس نے گھوڑے کی ٹیڈہ سنبھالی اور جزیرے کے شمالی ساحل کی طرف روانہ ہو گیا۔

تاریک راستوں پر قریب دو کوس کا فاصلہ طے کر کے وہ جزیرے کے انتہائی شمال میں پہنچ گیا۔ اس جگہ جزیرے کی آبادی بہت گنجان تھی۔ جگہ جگہ مخروطی میناروں والی عبادت گاہیں اور پون پکیاں نظر آ رہی تھیں۔ راستے سیدھے تھے اور ایک دوسرے کو زاویہ قائمہ پر قطع کرتے تھے۔ ان راستوں کی دونوں اطراف خوبصورت مکانات اور بازار تھے۔ رات کئی ہو چکی تھی۔ مشعل بردار پیریداروں کے علاوہ اکا دکا افراد ہی نظر آ رہے تھے۔ ہوشمند کی فراہم کردہ معلومات کے ذریعے تہاں اس شاندار مکان کے سامنے پہنچ گیا جو دور دراز جزیرے میں زرناب مقدونی کا مسکن تھا۔ تہاں مکان کے سامنے رکنے کی بجائے

سر پھٹ گیا اور اس کے ناک منہ سے خون کے فوارے جاری ہو گئے وہ تھوڑی دیر اٹھتی رہی پھر یکبارگی تڑپ کر اس کا جسم ساکت ہو گیا۔ فرش سے سر ٹکرانے کی صدا تباہان کے تیسرے شکار کو بھی مطبخ میں کھینچ لائی۔ قدموں کی آہٹ سن کر تباہان ایک تاریک گوشے میں سمٹ گیا۔ اب کی بار تباہان کے سامنے آنے والا ایک چوڑا چکلا ٹھنص تھا لباس اور طے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ زربتاب کے مشہور و معروف پالتوں غنڈوں میں سے ہے۔ مطبخ میں داخل ہونے سے پیشتر ہی وہ اپنی آب و ہوا تلوار ہاتھ میں لے چکا تھا۔ جس وقت وہ مطبخ میں داخل ہوا اس کی حیرت زدہ نگاہیں فرش پر جمی تھیں جہاں تباہان کے خون آلود نقش پا دکھائی دے رہے تھے۔ تب اس کی نگاہ باورچہن کی خونچکا لاش پر پڑی۔ وہ بے انتہا پھرتی سے بائیں جانب گھوما لیکن وہاں اس سے کہیں زیادہ پھر تپتا ٹھنص موجود تھا پیریدار کو خبری نہیں ہوئی کہ کب تلوار اس کے ہاتھ سے نکلے اور کب ایک فولادی بازو نے اس کی گردن کو جکڑ لیا۔ تباہان کی گرفت اتنی سخت تھی کہ منہ کھلا ہونے کے باوجود پیریدار چیخ نہیں سکتا تھا۔ اس کا پورا جسم جیسے کسی ٹکٹے میں کسایا تھا اس کے حلق سے زور زور کی بو آواز نکل رہی تھی وہ اتنی دھیمی تھی کہ تباہان کو اس سے کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا تھا۔ پیرے دار نے کن اکھیوں سے تباہان کا چہرہ دیکھا۔ وہاں اسے کوئی ایسی بات نظر آئی کہ پلک جھپکنے میں اس نے اپنا جسم ڈھیلا پھینک دیا۔ اب اس کی آنکھوں میں فریاد کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ موت کو رو برو پا کر یہ پہلو نما ٹھنص دفعتاً سر کیا التجا بن گیا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ ایک ایسے شخص کی گرفت میں ہے جس نے رحم کرنا سیکھا ہی نہیں۔ زندگی بھر نہ اس پر کسی نے ترس کھلیا ہے اور نہ وہ کسی پر ترس کھاتا ہے۔ وہ موت کے آگے بھاگ رہا ہے اور خود بھی موت ہے۔ ایک ایسی تباہان کا دوسرا ہاتھ حرکت میں آیا اور گرانڈیل پیریدار کا پیت سینے سے ٹاف تک چاک ہو گیا۔

تینوں خونچکا لاشوں کو محفوظ کونوں میں سمیٹنے کے بعد تباہان عمارت کے اندرونی کمروں کی طرف بڑھلا۔ یہاں کسی دروازے کے پیچھے سے جترنگ کی مدہم صدا آ رہی تھی۔ وہ راستے میں آنے والے دروازوں کو بے آواز دھکیلتا ہوا ایک چھوٹی سی راہداری میں پہنچا اور وہاں سے ایک کھڑکی کے سامنے آگیا۔ کھڑکی میں روشنی ہو رہی تھی۔ سرخ روشنی پردہ تھوڑا سا سرکا ہوا تھا اور اس جھری سے کمرے کا کچھ حصہ صاف نظر آ رہا تھا۔ یہ ایک شاندار خوابگاہ تھی۔ شاندار اور وسیع و عریض۔ در و دیوار سے شان و شوکت جیتی تھی۔ دبیز قالین قیمتی فانوس 'زرد تار پردے اور عالیچے جن پر ساغر و مینا اور پھول چوں کی

تصویر کشی کی گئی تھی۔ خواب گاہ کے فانوس میں خوشبودار شمعیں جل رہی تھیں ان کی روشنی میں ایک دبیر مرد آرام دہ مسہری پر پھیلا ہوا تھا۔ اس کے گھونگھریالے ہاتھوں کی ایک لٹ پیشانی پر تھی۔ گریبان کھلا تھا اور کرتے کے اندر سے سینے کے سیاہ بال جھانک رہے تھے۔ مرد کے پاؤں کی طرف ایک خوبصورت عورت قالین پر بیٹھی جترنگ بجاری تھی۔ اس کی نازک انگلیاں تیزی سے ساز پر حرکت کر رہی تھیں اور خوابگاہ کی فضا مدھر موسیقی سے معمور ہو رہی تھی۔

ان لوگوں کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ خوابگاہ سے باہر کیا ہو چکا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔ وہ اپنے حال میں مست تھے۔ عورت کی جھکی جھکی نظرس ساز پر تھیں اور مرد فضلی نظروں سے اس کا چہرہ تک رہا تھا۔ عورت کے بیٹھنے کا انداز ایسا دلربا تھا کہ جسم تصویر بن گیا تھا اور لگتا تھا کہ ایک خوبصورت تصویر سے نفہ پھوٹ رہا ہے۔ تباہان کے لئے یہ سمجھنا ہرگز مشکل نہیں تھا کہ مسہری پر پھیلا ہوا ٹھنص ہی زربتاب ہے۔ زربتاب کو دیکھ کر اس کی جیس شکاری جانور کی مانند بیدار ہو گئیں۔ اس نے خنجر ہاتھ میں تولی اور پوری طرح چوکس ہو کر بیٹھ گیا۔ دفعتاً ایک بچے کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ یہ بچہ کمرے کے اس حصے میں رو رہا تھا جو تباہان کی نظروں سے اوچھل تھا۔ ساز بجاتی عورت نے جلدی سے اپنے ہاتھ روکے اور بائیں طرف لپکی۔ ذرا دیر بعد وہ ایک بچے کو لے کر دوبارہ مسہری کے پاس آئی۔ بچہ قریباً ایک سال کا تھا۔ غالباً وہ سوتے میں ڈر گیا تھا۔ خوبصورت عورت نے اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا اور ہلکے دے دے کر چپ کرانے کی کوشش کرنے لگی۔ مرد بھی مسہری پر اٹھ بیٹھا اور بچے کو پکارتے لگے۔ ان دونوں کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بچے کے ماں باپ ہیں۔ بات کچھ تباہان کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اس کا ہاتھ خنجر پر تھا اور آنکھیں اندر کا منظر دیکھ رہی تھیں۔ عورت قوتلی زبان میں بچے سے کہہ رہی تھی۔

"کیا ہوا ہمارے لاڈلے کو کیوں رو رہا ہے؟ کوئی پینا دیکھا ہے؟ چپ کر میری جان یہ دیکھ تیرے بابا کے پاس جاؤ گے؟ میرا منا اپنے بابا کے پاس جانے گا بابا سے لوری سنے گا؟ چندا کی کمائی سے گے؟"

معموم بچہ روتے روتے مسکرانے لگا۔ جیسے پادلوں کی اوٹ سے چمکتا سورج نکل آئے۔ اس نے اپنے ننھے سنے ہاتھ زربتاب کی طرف بڑھا دیے۔ زربتاب نے اسے گود میں اٹھالیا اس کی پیشانی اور رخساروں پر بوسے دینے لگا۔ اسے اپنے ہاتھوں سے گد گد آنے

لگا۔ بچہ تڑپ کر بستر پر جاگرا اور قاتکاریاں مارنے لگا۔ وہ دونوں اسے گدگداتے گئے۔ وہ نبی سے لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ تھوڑی دیر یہ شغل جاری رہا۔ پھر بچہ تھک گیا اور وہ دونوں بھی تھک گئے۔ زرناب بچے کو اپنے ساتھ لے کر لیٹ گیا اس نے بچے کا سر اپنے سینے میں پھیپھا اور بیٹھ تھپکتے لگا۔ عورت نے پانسنی کی طرف سے اپنی ریشمی چادر اٹھائی اور باپ بیٹے کے اوپر بھینچ دی۔ اس کے بعد وہ بال کھولتی ہوئی کمرے کے دوسرے حصے کی طرف چلی گئی۔ تباہان کو ابھنسی محسوس ہونے لگی۔ نہ جانے کیوں اس کے سنے ہوئے رگ ہنپے ڈھیلے پڑ گئے تھے لیکن ایسا تھوڑی دیر کے لئے ہوا چند ہی لمحے بعد وہ جڑے بھینچ کر اپنی جگہ سے اٹھا اور دروازے کے راستے دھناتا ہوا کمرے میں داخل ہو گیا۔ سب سے پہلے اسے عورت نے دیکھا وہ ایک قد آدم آئینے کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کی آنکھیں دہشت سے پھٹ گئیں اور وہ کہنے کی کیفیت میں اسے دیکھتی چلی گئی۔ اس سے پیشتر کہ وہ اس کیفیت سے نکلتی تباہان اس کی شد رگ تک پہنچ چکا تھا اس کا خون آلود خنجر عورت کی نازک گردن پر آیا اور دوسرے ہاتھ نے اس کے ریشمی بال مٹھی میں جکڑ لئے۔

”زرناب!“ عورت کی چیخ کمرے میں گونجی

زرناب یوں اچھلا جیسے بیسیوں سانپوں نے اسے ایک وقت کاٹ کھایا ہو۔ پہلے اس نے تباہان کو دیکھا پھر تباہان کے شعلے میں کسی ہوئی عورت کو تب اس کی نگاہ دیوار کی طرف گئی۔ جنم ایک خوبصورت نیام میں تلوار لٹک رہی تھی وہ تلوار کی طرف لپکا۔ ”خبردار!“ تباہان کی سفاک آواز بند کمرے میں گونجی ایک قدم بھی بڑھایا تو اس عورت کا سرتق پر نہیں رہے گا۔

تباہان کے خوفناک لہجے نے زرناب کو چند لمحوں کے لئے مہموت کر دیا۔ مگر پھر اس نے ہمت کی اور آگے بڑھ کر تلوار اٹار لی۔ تباہان نے خنجر کی دھار عورت کے سینے زرخرے پر رکھ دی اور پُر غضب لہجے میں پھر اپنی دھمکی دہرائی۔ صاف ظاہر تھا کہ ایک بار پھر زرناب نے دھیری دکھانے کی کوشش کی تو کمرے میں عورت کی لاش گر جانے لگی۔

زرناب نے بڑی تیزی کے ساتھ خود کو سنبھالا اور خسرے ہوئے لہجے میں بولا

”کیا چاہتے ہو؟“

”ابھی بتا دیتا ہوں۔ پہلے اس سامنے والے پردے سے ڈوری کھینچ کر لاؤ تاکہ تم

تمہاری اس عزیزہ کی مشکلیں کس لوں۔“

زرناب آگ بگولہ ہو کر بولا۔ ”جانتے ہو تم کس کے گھر میں کھڑے ہو۔ میری ایک آواز پر محافظہ تمہاری تکہ بوٹی کر ڈالیں گے۔“

تباہان نے کلمہ۔ ”جن محافظوں پر تم کو ناز تھا ان کی لاشیں اس خوابگاہ سے باہر بکھری پڑی ہیں۔ اس خنجر پر جو خون چسک رہا ہے وہ تمہارے ہی پالتو کتوں کا ہے۔“

یکایک زرناب کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ تباہان کی بات اس کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ عورت کی زبردست چیخ سن کر بھی اگر کوئی خوابگاہ تک نہیں پہنچا تو اس کا یہی مطلب تھا کہ تباہان ٹھیک کہہ رہا ہے۔

وہ ابھی بوٹی آواز میں بولا۔ ”کس مقصد سے گھسے ہو میرے گھر میں؟“

تباہان نے کلمہ۔ ”میں نے تم سے وعدہ کیا ہے کہ سب کچھ تمہیں بتاؤں گا پہلے تم وہ ڈوری لے کر آؤ تاکہ میں اس عورت کے ہاتھ باندھ سکوں۔“

”عورت پر ہاتھ اٹھانا مردانگی نہیں ہے۔ میری بیوی سے علیحدہ ہو جاؤ۔“

”مجھے اس کے نزدیک رہنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ تم وہ ڈوری لاؤ تاکہ میں اس کے ہاتھ باندھ سکوں۔ اس کے بعد تمہیں مردانگی آزمانے کا شوق ہے تو وہ بھی پورا کر لیتا۔“

خون آلود خنجر بدستور عورت کی شد رگ پر تھا۔ تباہان کی شعلہ فشاں آنکھوں میں ایک بار جھانکنے کے بعد زرناب نے اس کی ہدایت پر عمل کرنا ہی بستر سمجھا۔ وہ ڈوری لینے کے لئے کھڑکی کی طرف بڑھا مگر اس سے پہلے ہی عورت ڈوری کی ضرورت سے بے نیاز ہو گئی۔ اوپر تلے شدید صدموں نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس نے ایک طویل آہ بھینچی اور سبے ہوش ہو کر تباہان کی ہانپوں میں جھل گئی۔ بیوی کو یوں گرتے دیکھ کر زرناب بھوکے شیر کی طرح تباہان پر جھپٹا۔ اس کی تلوار کا دار انتہائی شدید اور اچانک تھا۔ تباہان نکلا اور موت اس کے سر کے بالوں کو چھوتی ہوئی گذر گئی۔ عورت کو مسسری پر پیٹنگ کر اس نے زرناب کا دوسرا دار پچھلایا اور خنجر سے اس کے ہاتھیں پیلو پر حملہ کیا۔ زرناب پھرتی سے ایک طرف ہٹا اور خنجر اس کی ریشمی قدیض پھاڑتا ہوا نکل گیا۔ اسی دوران تباہان نے ہاتھ بڑھا کر دیوار سے تانبے کی منقش ڈھال اٹار لی۔ اب اسے زرناب کی تلوار سے فوری طور پر کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اس نے زرناب کے چند شدید وار ڈھال پر روکے اور موقع ملے ہی اس کے سینے پر ایسی ٹانگ بھائی کہ وہ قاتلین پر سر پہ سجود ہو گیا۔ تباہان کی

دوسری شدید ٹھوکر نے اس کے کئی دانت توڑ دیئے۔ اس کے بعد تابان نے اسے منہ سے نکالنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ کموار زرناب کے ہاتھ سے نکل چکی تھی۔ تابان نے وحشت کے عالم میں اسے روٹی کی طرح دھتک کر رکھ دیا۔ وہ شخص جو تھوڑی دیر پہلے بڑی شان سے مسمری پر دراز موسیقی سے لطف اندوز ہو رہا تھا، قلبی رحم حالت میں قلابن پر پڑا سسک رہا تھا۔ اس کا لباس تار تار تھا اور صورت پچھانا مشکل ہو رہی تھی۔ کچھ عینی حالت خواباگہ کی بھی تھی۔ اکثر آرائشی چیزیں نوٹ چکی تھیں اور بے داغ دیواروں پر زرناب کے نو کے چھینے تھے۔

خواباگہ میں ہونے والی لڑائی کے بعد بچہ بیدار ہو چکا تھا۔ اب وہ مسمری پر بیٹھا پورے جوش و خروش سے رو رہا تھا۔ تابان نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے نیچے جھک کر زرناب کا بازو پکڑا اور پھر اس کے منہ میں جسم کو بے دردی سے کھینچ کر کدھے پر لاد دیا۔ جب وہ قاتحانہ انداز میں خواباگہ کے دروازے کی جانب بڑھ رہا تھا یکایک کوئی چیز اس کے پاؤں سے لپٹ گئی۔ اس نے جھک کر دیکھا۔ یہ وہی عورت تھی جسے زرناب نے بیوی کہا تھا۔ اس کے لیے بال تابان کے خون آلود پیروں پر بکھرے ہوئے تھے اور ہاتھوں نے مضبوطی سے اس کی پنڈلیاں تھام رکھی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں اور فریادوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

”نہیں نہیں۔“ وہ بلک کر بولی۔ ”دیوتاؤں کے لئے ایسا نہ کرو ہمیں یوں برا کر کے نہ جاؤ۔“

تابان نے پاؤں جھٹک کر آگے بڑھنا چاہا لیکن وہ پوری جان کے ساتھ اس کی عریاں پنڈلیوں سے لپٹ گئی۔ ”نہیں“ ہم پر رحم کرو۔ اس معصوم بچے پر رحم کرو۔ انہیں چھوڑ دو۔“

تابان نے گھوم کر روتے بچے اور سستی عورت کو دیکھا۔ ایکایک اس کے سناگاہ سینے میں کوئی ننھا سا دھارا بہہ نکلا۔ ایک دھندلا سا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے آیا۔ یہ منظر اکثر اس کے تصور میں آتا تھا۔ ایک روتی ہوئی عورت، چند ہلکتے ہوئے بچے، کئی مضبوط ہاتھ جو بچوں کو کھینچ کھینچ کر عورت سے دور کرتے تھے اور بچے جو بھاگ بھاگ کر عورت کے آگلیں میں چھپنا چاہتے تھے۔ اس منظر نے یکایک تابان کے قہر و غضب پر پھرے بخا دیئے۔ اسے اپنے جسم میں ایک ناؤانی سی ارتقی محسوس ہوئی۔ وہ کچھ دیر عورت اور بچے کی طرف دیکھتا رہا پھر اس کے چہرے پر ابھرنے لگی۔

رات جو کسی قدیم داستان کی طرح طویل تھی، پل پل آگے سرک رہی تھی۔ زرناب کی خواب گاہ سے باہر دور نینکوں تاریکی میں کہیں کسی گھڑیاں نے اعلان کیا کہ رات کا تیسرا پہر ختم ہو چکا ہے۔ خوبرو عورت نے اپنے بچے کو سینے سے لگائے لگائے سر اٹھا کر تابان کی طرف دیکھا اور دوبارہ آنکھیں موند کر لیٹ گئی۔ نہ جانے اس عورت کو دیکھ کر کیوں تابان کو احساس ہوا تھا کہ وہ اسے پہلے سے جانتا ہے۔ یہ چہرہ اس کا دیکھا ہوا ہے۔

زرناب اپنی مسمری پر نیم دراز تھا۔ چوٹوں کی وجہ سے اس کا چہرہ متورم اور ہونٹ خون آلود تھے۔ تاہم وہ بول سکتا تھا تابان کے کچھ بتانے سے پہلے ہی وہ جان چکا تھا کہ وہ کوئی چور لٹیرا نہیں جو رات کی تماشائی میں اس کے گھر آدھکا کچھ بلکہ شاہ مقدونیہ سکندر کا بیٹھا ہوا وہ ابلا کر ہے جو اسے یہاں سے لے جانے آیا ہے۔ لہذا اس سے کچھ بھی چھپانا فضول تھا۔ زرناب نے اعتراف کر لیا کہ وہی وہ جاسوس ہے جسے سکندر کے والد عزت ماب شاہ فیلقوس نے دو برس پہلے ایشیاء کی مہم پر بھیجا تھا اور اس کے ذمے کچھ اہم کام لگائے تھے۔ وہ یہ بھی مان گیا کہ ایک برس پہلے مقدونی ملار نورین اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ اسے واپس لے جانے آیا تھا۔ جس کے نتیجے میں وہ ہاون کے تاریک تہ خانوں میں پہنچ گیا ہے۔

تابان نے زرناب سے پوچھا۔ ”تم نے یہ سب کیوں کیا۔ آخر کیا وجہ تھی کہ تم بادشاہ سے غداری کر کے اس دور دراز جزیرے میں آئیے اور تھیں واپس لانے کے لئے جو آدمی بھیجے گئے انہیں بھی المناک انجام سے دوچار کیا؟“

زرناب نے کراہ کر کہا۔ ”میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ معلوم نہیں نورین نے تمہیں کیا بتایا ہے۔ حقیقت صرف اتنی ہے کہ وہ مجھے زبردستی یہاں سے لے جانا چاہتا تھا۔ ایک روز اس نے مجھے دھوکے سے زہریلی شراب پلا دی۔ وہ مجھے بے ہوشی کی حالت میں جزیرے سے نکال لینا چاہتا تھا لیکن میرے ملازمین کو پتہ چل گیا۔ نورین کے ساتھ ان کی جھڑپ ہو گئی۔ اس جھڑپ میں نورین کے دونوں ساتھی ہلاک ہوئے اور وہ خود پکڑا گیا۔ میں چاہتا تو اسے قتل کر سکتا تھا۔ کوئی میرا ہاتھ روکنے والا نہیں تھا، لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں نے اسے اپنے ایک شہساز جہاز ران کے سپرد کر دیا اور کہا کہ وہ اسے کسی ایسی جگہ لے جائے جہاں سے وہ دوبارہ یونان نہ پہنچ سکے۔ اگر وہ ہاون کے تہ خانوں میں پناہ

کیا ہے تو مجھے اس سلسلے میں کچھ علم نہیں۔

تباہ نے کہا۔ ”اگر تمہاری بات مان بھی لی جائے تو میرا اصل سوال اپنی جگہ رہتا ہے تم نے واپس جانے سے انکار کیوں کیا؟ کیوں شاہ مقدونیہ سے غداری کی کیوں اس جزیرے میں آچھے اور خوشنور محافظ رکھ کر یہ سمجھ بیٹھے کہ وہ تمہیں بادشاہ کی پکڑ سے بچالیں گے؟“

زرناب نے کہا۔ ”تباہ تم ان محافظوں کی بات کر رہے ہو جو میرے مکان پر پردہ دیتے ہیں!“ تباہ نے اثبات میں جواب دیا۔ ”تم بالکل غلط رخ پر سوچ رہے ہو۔ اس دور وراز جزیرے میں مجھے شاہ مقدونیہ کی طرف سے ایسا کیا خطرہ ہو سکتا تھا اور اگر خطرہ پیدا ہو ہی جاتا تو پھر یہ محافظ مجھے کہاں تک بچا سکتے تھے کیا آج یہ محافظ مجھے بچا سکے ہیں؟“

تباہ نے پوچھا۔ ”تو پھر کیوں پال رکھا تھا انہیں؟“

”یہ سرخ رینچھ کے لئے تھے۔ شاید تمہارے لئے یہ نام انہی ہو۔ سرخ رینچھ اس علاقے کا بہت بڑا فائدہ ہے۔“

تباہ کے ذہن میں جھمکا سا ہوا۔ کل ہوشمند کی باتوں سے بھی پتہ چلا تھا کہ زرناب کے محافظ کسی رینچھ کی بات کر رہے تھے۔ زرناب نے اسے سوچ میں گم پا کر کہا۔ ”نورین نے تمہیں بتایا ہی ہوگا‘ میں پہلے جزیرے کے جنوبی ساحل پر مقیم تھا۔ وہاں میں نے ایک چراگاہ خرید رکھی تھی اور بھیڑ بکریاں پال رکھی تھیں۔ وہاں کچھ چرواہوں سے میرا تازہ چل لگا۔ وہ چرواہے زبردستی میری چراگاہ میں گھس آتے تھے۔ میں نے اپنے قطعہ اراضی کے گرد حصار بندی کر دی۔ انہوں نے یہ حصار بندی توڑنی شروع کر دی۔ بات بڑھتی گئی۔ کئی بار جھگڑا ہوا جس میں دونوں طرف کے کئی آدمی ہلاک و زخمی ہوئے۔ زندگی اجیرن ہو کر رہ گئی تھی۔ لہذا میں نے مکان سمیت وہ چراگاہ بیچ ڈالی اور اس آبادی میں گیا۔ یہاں میں نے جو محافظ رکھے ہیں وہ اسی دشمنی کی وجہ سے ہیں۔ ان چرواہوں کا سرفراز ایک کیم خیم خطرناک شخص ہے، بالکل رینچھ کی مانند چھوٹی چھوٹی آنکھوں والا۔ لوگ اسے بلا تکلف سرخ رینچھ کہتے ہیں۔“

تباہ کے ذہن میں کوئی نئی بات آئی وہ چونک کر بولا۔ ”کیا اسے جاگال بھی کہا جاتا ہے؟“

زرناب نے حیرت سے کہا۔ ”تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“ پھر خود ہی بولا۔ ”اس کا

مطلب ہے تم اس سے بھی مل چکے ہو۔“

تباہ نے ”ہاں“ میں جواب دیا اور بتایا کہ اسی کی مدد سے وہاں تک پہنچا ہے۔ زرناب کے زخمی ہونٹوں پر چٹکی مسکراہٹ کھیل گئی۔ بولا۔ ”اتفاق ہے کہ تم اب تک جن دو افراد سے ملے ہو وہ دونوں ہی میرے شدید مخالف ہیں۔ میرا مطلب نورین اور جاگال سے ہے۔ شاید اسی لئے تم مجھے یار بار عیاش اور ظالم گردان رہے ہو۔ حقیقت اس سے بہت مختلف ہے دوست۔ میں ظالم ہوں اور نہ بدکار۔ گناہ گار ضرور ہوں مگر سرکش نہیں ہوں اور گناہ بھی یہ ہے کہ میں نے محبت کی ہے۔ کسی کو چاہا ہے اور اس کا ساتھ نبھانے کی کوشش کی ہے۔“

”تم کس کی بات کر رہے ہو؟“

”اپنی بیوی کی۔ اس کا نام زنوبیا ہے۔“

ایک تباہ کے ذہن میں پھل جھنپیاں سی ہموٹ گئیں۔ وہ تصویر جو بڑی دیر سے اس کے تصور میں مکمل نہیں ہو پا رہی تھی۔ اچانک مکمل ہو گئیں۔ زنوبیا سکوپے لاس کی ملکہ کا نام تھا۔ وہی ملکہ جو پیار میں سب کچھ ہمارا اپنے محبوب کے ساتھ چلی گئی تھی۔ تباہ اس کی تصویریں دیکھ چکا تھا۔ وہی ملکہ زرناب کی بیوی تھی۔ تباہ نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ وسیع خوابگاہ کے ایک گوشے میں ملکہ اپنے تخت جگر کو بیٹے سے لگائے دم سادھے لیٹی تھی۔ ایکایک تباہ کو احساس ہوا کہ وہ ایک سخت امتحان سے دوچار ہونے والا ہے۔ اسے ہر صورت زرناب کو واپس لے کر جانا تھا اور زرناب واپس چلا جاتا تو محبت کی ایک یادگار کہانی دردناک انجام کا شکار ہو جاتی۔

☆-----☆-----☆

تباہ کی حیرت زدہ نگاہیں عورت پر جمی تھیں۔ وہ سہمی نظروں سے تباہ کو دیکھ رہی تھی ننھے بچے کا ننھا ہاتھ خوراک کی تلاش میں مل کے جسم پر گردش کر رہا تھا۔ تباہ کے ہونٹوں سے سرسراتی آواز نکلی۔

”کیا یہ سکوپے لاس کی ملکہ ہے؟“

زرناب نے اپنے درم زدہ ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔ ”ہاں۔ تمہاری معلومات درست ہیں۔“

تباہ نے پوچھا۔ ”تم دونوں نے ایسا کیوں کیا؟ کیا تم کسی سسل طریقے سے ایک دوسرے کو حاصل نہ کر سکتے تھے۔“

مقدونیہ چلو میں وعدہ کرتا ہوں کہ شاہ سکندر سے تمہاری جان بخشی کروادوں گا۔
 زرناب بے دلی سے مسکرایا۔ ”دوست! محسوس ہوتا ہے تمہیں شاہی صحبت میں
 زیادہ وقت نہیں گزرا بادشاہوں کے فیصلے بیشہ ناقابلِ گمان ہوتے ہیں۔ کوئی کچھ نہیں کہہ
 سکتا کہ کیا حکم صادر ہو جائے۔ میں گناہ گار ہوں، میری توبت ہی چھوڑو۔ میرا نو مولود بچہ
 بھی دربارِ شاہی سے سزا کا مستحق قرار پا سکتا ہے۔“

تباہان نے کہا۔ ”دوست! تم اپنے جرائم کو سنگین تر کرتے چلے جا رہے ہو۔ میرا
 خیال ہے کہ واپس چلنے کے لئے اب بھی وقت موجود ہے۔“
 زرناب بولا۔ ”میں تمہارے خیال سے اتفاق نہیں کر سکتا۔“

تباہان نے کہا۔ ”پھر میں بھی مجبور ہوں۔ مجھے ہر مل میں تمہیں مقدونیہ لے جانے
 کا حکم ہے۔“

عورت کی سسکیاں بلند ہو گئیں۔ وہ ہنسی ہوئی فریادیں تباہان کی طرف
 دیکھنے لگی۔ تباہان نے نظر چرائی۔ وہ ان آنکھوں میں دیکھنے کی تاب نہیں رکھتا تھا۔ وہ دل
 ہی دل میں فیصلہ کر چکا تھا کہ اس ہنسنے بڑے گھراتے کو اڑانے نہیں دے گا۔ زرناب کو
 واپس لے جانے کی باتیں وہ صرف اس لئے کر رہا تھا کہ زرناب کچھ لو کچھ دو کے اصول پر
 عمل کرے یعنی وہ معلومات اور راستوں کے نقش جات جو زرناب کے پاس موجود تھے اور
 جن کی موجودگی کا وہ اعتراف بھی کر چکا تھا، تباہان کی ضرورت تھی جبکہ ”اپنی آزادی“
 زرناب کی ضرورت تھی۔ ان کی گفتگو کچھ دیر مزید جاری رہی آخر زرناب نے وہ سب
 کچھ کہہ دیا جس کی تباہان خواہش کر رہا تھا، زرناب نے پیشکش کی کہ وہ اپنی مہم سے
 حاصل ہونے والی تمام معلومات تباہان کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس کے بدلے وہ اسے اس
 کے حال پر چھوڑ کر چلا جائے۔

تباہان نے کہا۔ ”لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ وہ معلومات مکمل ہوں گی اور
 تم کچھ چھپا کر نہیں رکھو گے۔ تمہاری شادی جزیرہ سکوپے لاس کی ملکہ سے ہوئی ہے اور
 سکوپے لاس کبھی یونان کا جہنما خیال نہیں کیا گیا۔ یہ سارے جزیرے ہم سے زیادہ
 ایرانیوں کے قریب ہیں۔ یمن ممکن ہے کہ تم اس ناطے سے اہم باتیں چھپاؤ۔“

ملکہ زونبیا نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے ہڈیاں لہجے میں کہا۔ ”میں اپنے
 بچے کی قسم کھا سکتی ہوں کہ میرا شوہر ایسا نہیں کرے گا۔“

زرناب بولا۔ ”دوست! میری بیوی اب سکوپے لاس کی ملکہ نہیں ہے اور نہ اسے

زرناب بولا۔ ”ایسا ہو سکتا تو ہم اپنے اپنے وطن کو خیر یاد کہہ کر اس جزیرے کو
 ممکن کیوں بناتے۔ ہمارے لئے یہ ناممکن تھا کہ ایک دوسرے کو پائیں۔ سکوپے لاس کے
 رواج کے مطابق ملکہ شاہی خاندان سے باہر شادی نہیں کر سکتی تھی۔ دوسری طرف میں
 بھی اس شادی کے بعد شاہ مقدونیہ کا معتبہ ٹھہرتا۔ ہم دونوں کے پاس اس کے سوا اور
 کوئی چارہ نہ رہ گیا تھا کہ ایک دوسرے کو اپنا کر اس جزیرے میں روپوش ہو جائیں۔“

تباہان نے کہا۔ ”تم نے یہ بھی نہ سوچا کہ شاہ مقدونیہ تمہاری مہم کے لئے شاہی خزانے سے رقوم خرچ کی
 تھیں اور تم سے ان گنت امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔“

زرناب کی نگاہیں جھک گئیں۔ ”ہاں دوست! مجھے اپنی اس بھول کا اعتراف ہے۔
 لیکن تم یہ بات تسلیم کرو گے کہ کبھی کبھی حالات انسان کو جکڑ کر بے بس کر دیتے ہیں۔
 جب مجھ سے ایک قدم غلط اٹھ گیا تو پھر میرے لئے واپس لوٹنا مشکل ہو گیا۔ گذرنے
 والے ہر دن کے ساتھ اپنی فرض ناشائی اور شاد کے خوف کا احساس مجھ پر غالب آتا تھا
 اور میں مدد سے سے بھاگے ہوئے بچے کی طرح اپنے آپ میں چھپتا چلا گیا۔“

زرناب کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے گویا آواز میں بات جاری رکھی۔
 ”آج میں اعتراف کرتا ہوں دوست کہ میں گناہ گار ہوں۔ میں شاہ کا بھرم ہوں میں
 نے شاہی خزانے پر بوجھ ڈال کر خشکی اور تری کے طویل سفر کئے۔ شاہ کے اثر و رسوخ کو
 استعمال کر کے اہم معلومات تک رسائی حاصل کی اور جب میرے پاس اپنے ہموطنوں کے
 لئے گراں قدر معلومات جمع ہو گئیں اور میں اس قابل ہو گیا کہ مشرقی سواحل کی جانب
 ہر شہر کے مقدونیہ منصوبے میں نئی روح پھونک سکوں تو میں سب کچھ بھول بھال کر
 اپنی نئی زندگی میں گم ہو گیا اور دن بدن سب کچھ بھولتا چلا گیا۔ پھر میرے پاؤں میں بیوی
 اور بچے کی بیڑیاں پڑ گئیں۔ میں جانتا تھا اور اب بھی جانتا ہوں کہ واپس لوٹنا تو شاہی عتاب
 میری جان لے لے گا اور میں اپنی جان کھو کر اپنے بیوی بچے کو دنیا میں بے سارا کرنا
 نہیں چاہتا اس سنگدل دنیا میں کہاں بڑھنے کی انہیں؟ کہاں جائیں گے وہ؟“

تباہان بہت دیر زرناب کی روئیداد سنتا رہا۔ اس کی باتوں سے سچائی کی خوشبو آتی
 تھی۔ وہ اپنی غلطیوں کا برملا اعتراف کر رہا تھا اور یہ بھی بتا رہا تھا کہ وہ زندہ رہنا چاہتا ہے۔
 تباہان نے کہا۔

”تم نے مجھے دوست کہا ہے تو دل سے بھی دوست سمجھو۔ تم میرے ساتھ

ایران و یونان کے سیاسی معاملات سے سروکار ہے۔ ہم نے تو جس اپنی انگ پھونی سی دنیا رکھی ہے جسے آباد رکھنا ہماری پہلی اور آخری آرزو ہے۔ میرا وعدہ ہے کہ میں تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔"

~~~~~

ٹھیک دو یوم بعد تباہان شام کے وقت زرناب کے خوبصورت مکان سے رخصت ہو رہا تھا۔

ان دو یوم میں وہ زرناب اور زونیا کے علاوہ کسی کے سامنے نہیں آیا تھا۔ نہ ہی کسی کو معلوم ہوا تھا کہ گھر میں نقل و غارت کرنے والا شخص بطور مسمان گھر کے اندر ہی موجود ہے۔ تباہان کو رخصت کرتے وقت زرناب کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک تھی۔ زونیا بھی بچے کو سینے سے لگائے رو رہی تھی۔ تباہان کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا چرمی تھیلا تھا۔ اس تھیلے میں وہ تمام دستاویزات موجود تھیں جن کی تمنا شاہ فیقتوس نے کی تھی اور اب جن کی سکندر کو اشد ضرورت تھی۔ یہ دستاویزات مقدونی سپاہ کے لئے ایک قیمتی اثاثے سے کم نہیں تھیں ان میں راستوں کے نقشے تھے۔ ایران کے سرحدی علاقوں کی تفصیلات تھیں اور اہم قلعہ جات کے حالات درج تھے۔

زرناب نے الوداعی انداز میں کہا۔ "تباہان! میری بات یاد ہے نا؟"

تباہان بولا۔ "بے فکر رہو دوست! خدا تمہیں ہزاروں برس سلامت رکھے لیکن شاہ سکندر کی نگاہ میں اب تم فرود قرار پاؤ گے۔ اب کبھی کوئی تلاشی دستہ تمہاری تلاش میں نہیں نکلے گا ورنہ شہنشاہ ایوانوں میں تمہاری روپوشی کا ذکر ہو گا۔"

زرناب احسان مندی کی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ تباہان نے ایک نظر ملکہ زونیا پر ڈالی اور مسکرا کر بولا۔ "میں آپ کو ایک اور فکر سے بھی آزاد کر کے جا رہا ہوں۔ امید ہے اب آپ کی شاہیں اور بھیجیں مزید خوبصورت ہو جائیں گی۔"

"میں سمجھا نہیں۔" زرناب نے پوچھا۔

"کل تک سمجھ جائیں گے۔" تباہان نے جواب دیا۔

میاں بیوی کے چہرے پر ابھمن نظر آ رہی تھی۔ تباہان نے ان کی کیفیت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے الوداعی کلمات کہے اور خادم کے ساتھ باہر نکل آیا۔ مکان کی دُور دُور کے سامنے ایک محترمہ گھوڑا کھڑا تھا۔ یہ وہی گھوڑا تھا جو دو روز پہلے تباہان نے چرواہوں کے اے مصل سے لیا تھا اور مکان میں داخل ہونے سے پیشتر آزاد چھوڑ دیا تھا۔ زرناب کے

~~~~~

ملازمین نے یہ گھوڑا پکڑ لیا تھا اور اب ایک بار پھر تباہان کی خدمت میں پیش کر دیا گیا تھا۔ تباہان نے گھوڑا سمیٹا اور چرمی تھیلے کے ساتھ واپس چرواہوں کی بستی روانہ ہو گیا۔

تباہان واپس بستی پہنچا تو ہوشمند کو سخت پریشان پایا۔ بات تھیں بھی پریشانی کی۔ تباہان پورے دو روز بستی سے غائب رہا تھا۔ ہوشمند پہلے تو اسے قرب وجوار میں تلاش کرتا رہا تھا پھر وہ اور جاگال اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ کہاں کسی کو پتا لے بغیر زرناب کی طرف چلا گیا ہے اور زرناب کے درندہ صفت محافظوں کے ہتھے پڑھ گیا ہے۔ اس خدشے کی تصدیق کے لئے جاگال نے اپنا ایک خاص مخبر زرناب کی رہائش گاہ کی طرف بھیجا تھا۔ اس مخبر نے کھوج لگایا کہ کل رات زرناب کے محافظوں نے ایک خالی گھوڑا پکڑا ہے۔ خیال ہے کہ یہ گھوڑا تباہان ہی وہاں لے کر گیا تھا۔ اس کے علاوہ مکان کے اندر کچھ ڈاڑھرا سرگرمیاں جاری ہیں۔ لگتا ہے کچھ لوگ ہلاک یا زخمی ہو گئے ہیں۔ مخبر کی اس اطلاع کے بعد ہوشمند کی بے قراری فقط عروج پر پہنچ گئی تھی۔ اپنے جینیے دوست کی جان بچانے کے لئے وہ سب کچھ کرنے پر تیار ہو گیا۔ وہ اسی وقت واپس اپنے جزیرے پہنچا۔ یہاں ایک ایسا سپاہ فام شخص اس کا واقف تھا جو معاوضہ لے کر بڑے سے بڑا جرم کر گذرنا تھا۔ اقوامِ آبروریزی، قتل۔ یہ سب اس کے بایں ہاتھ کا گیل تھا۔ لوگوں میں یہ بات مشہور تھی کہ اگر کوئی چاہے تو معاوضہ دے کر اس سے ہادشہ کو بھی قتل کرا سکتا ہے لیکن اس کا طلب کردہ معاوضہ دینا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں تھا۔ وہ بیسیوں نہیں سینکڑوں فیلسٹ میں بات کرتا تھا۔ حاسن نام کے اس دہشت گرد سے ہوشمند کا رابطہ ہو چکا تو ہوشمند نے اپنا مکان بمعہ دکان فروخت کر دیا۔ گاہک پہلے سے موجود تھا۔ ہوشمند کو زیادہ تردد نہیں کرنا پڑا۔ ایک دن کے اندر اندر نقد رقم اس کے ہاتھ میں آ گئی۔ اس نے حاسن کو دو تہائی معاوضہ پیشگی دیا اور ایک تہائی بعد میں دینے کا وعدہ کیا۔ کام یہ تھا کہ حاسن کو زرناب کا سر لانا تھا اور تباہان کو اس کی قید سے رہائی دلائی تھی۔ سب معاملات طے ہو چکے تھے۔ حاسن اپنی خونی مہم پر روانہ ہونے کے لئے تیار تھا کہ کہاں واپس آ گیا۔ تباہان کو زندہ سلامت اپنے سامنے پا کر ہوشمند کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ وہ چند لمحے مبہوت رہا پھر ہناگ کر تباہان سے پٹ گیا۔

"تباہان! کہاں چلے گئے تھے تم۔ بہت غصہ کیا تم نے اس طرح باکرہ معلوم ہے کتنا پریشان رہے ہیں ہم۔"

نیم چرواہا جاگال اور اس کے ساتھی بھی تباہان کے قریب آ گئے۔ جیٹی حاسن

سمیت سب سوائے نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ تاہاں نے کہا۔ ”دوستو! ذرا سانس تو لینے دو، پھر بتاتا ہوں سب کچھ۔“

ہوشمند تاہاں کو لے کر ٹیلنڈ خیمے میں آگیا۔ خیمے میں پہنچ کر تاہاں نے ہوشمند سے پہلا سوال ٹامسن کے متعلق ہی کیا۔ پوچھنے لگا۔

”وہ خونخوار حبشی کون ہے؟“

ہوشمند نے کہا۔ ”وہ خونخوار تو ہے مگر اس کے لئے جو اس کے نشانے پر ہو۔“

”کیا کتنا چاہتے ہو؟“

”میں اس شخص کو تمہاری تلاش میں بھیج رہا تھا۔ زرناب کی طرف۔“

”تو تمہیں معلوم تھا کہ میں وہاں ہوں۔“

”غضب کے بیوقوف ہو۔“ ہوشمند نے کہا۔ ”یہ تو سامنے کی بات تھی۔ یہاں ہماری آمد کا مقصد زرناب کے علاوہ اور کیا تھا۔“

تاہاں نے گہری سانس لی اور گود میں رکھے چری تھیلے کو گھور کر بولا۔ ”یہ مقدمہ پورا ہو چکا پیارے۔ اب واپس چلنے کی تیاری کرو۔“

ہوشمند نے حیرت سے تھیلے کو دیکھا۔ ”تو کیا زرناب کو اس میں بند کر کے لائے ہو؟“

”ایسا ہی سمجھو۔“ تاہاں نے جواب دیا۔ ”جیسے حکیم اور طبیب جڑی بوٹیوں سے کشتہ نکال لیتے ہیں، سمجھو یہ زرناب کا کشتہ ہے۔“

ہوشمند کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔ اس حیرت کو کم کرنے کے لئے تاہاں نے مختصر الفاظ میں اپنی روئیداد بیان کی اور زرناب کے محل نماکان میں پیش آنے والے واقعات بتائے زرناب کے کردار کا یہ مثبت پہلو ہوشمند کے لئے بھی انکشاف انگیز تھا۔ اب تک وہ زرناب کو ایک بے اصول اور ظالم شخص سمجھ رہے تھے جو اپنے فرائض کو پس پشت ڈال کر اس دور دراز جزیرے میں داؤد پیش دینے میں مصروف تھا۔ مگر اب اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ محبت کا مارا ایک مجبور و محصور شخص ہے۔ وہ اپنی چھوٹی سی دنیا بچانے کے لئے اس جزیرے میں چھپتا پھرتا ہے اور اپنی کوتاہیوں پر قرار واقعی نام ہے۔ ہوشمند کی نگاہیں چری تھیلے پر مرکوز تھیں۔ اب اسے اس معمولی تھیلے کی اہمیت کا احساس ہو رہا تھا۔ اس تھیلے کی موجودگی کا مطلب تھا کہ تاہاں وہ سب کچھ حاصل کر چکا ہے جو اسے اپنی طویل مہم سے بھی شاید ہی حاصل ہو گا۔ ان دستاویزات کا حصول کوئی معمولی کامیابی نہیں تھی۔

اچانک خیمے کے دروازے پر جاگل کی صورت دکھائی دی۔ اس کے ایک ہاتھ میں ریور ہانگے والی طویل لاشی تھی۔ اس لاشی کے ایک سرے پر تیز کھماڑی کا پھل چبک رہا تھا۔ وہ اکھڑے اکھڑے لمبے میں بولا۔

”کیا ہمارا اندازہ درست تھا؟“

”کون سا اندازہ؟“ ہوشمند نے پوچھا۔

”یہی کہ تمہارا سامنی زرناب کی فہم میں ہے۔“

”ہاں۔ میں اسی کے پاس تھا۔“ ہوشمند کی بجائے تاہاں نے جواب دیا۔

”پھر رہائی کیسے لی؟“

”رہائی ملتی نہیں حاصل کی جاتی ہے سردار۔ سزا کاٹ کر یا سلاخیں کاٹ کر۔ سمجھو میں بھی سلاخیں کاٹ کر آیا ہوں۔“

”یعنی نکل بھاگے ہو؟“

”ہاں ان کے چار محافظ مارنے کے بعد۔“ تاہاں بڑی روانی سے جھوٹ بول رہا تھا۔

”بہت خوب۔ تم نے جو انہمدی کا ثبوت دیا ہے۔ ویسے میں تم دونوں سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔“

”مخلے دل سے کہو۔“ ہوشمند نے پوری طرح متوجہ ہو کر کہا۔

جاگل بولا۔ ”یہ جو حبشی تم سکو پے لاس سے لے کر آئے ہو۔ کیا نام ہے اس کا؟“

”ٹامسن۔“ ہوشمند نے لقمہ دیا۔

”ہاں۔ یہ بڑا پیچھا ہوا شخص لگتا ہے۔ شاید کسی معرکے میں اسے دیکھا بھی ہوا ہے میں نے۔ اسے کرائے پر لائے ہو یا دوست ہے تمہارا؟“

ہوشمند نے ہوشیاری سے کہا۔ ”ٹامسن پر کہاں سے لاتے۔ مزدور پیشہ ہیں، سوداگر نہیں ہیں۔“

”یعنی دوست ہے تمہارا؟“

ہوشمند نے ”ہاں“ میں جواب دیا۔ جاگل بولا۔ ”تو اس دوست کو کام میں لاؤ اور زرناب کا قصہ پاک کر دو اس سے۔“

ہوشمند بولا۔ ”مگر تاہاں تو اب واپس آیا ہے۔“

”تاہاں واپس آگیا تو کیا ہوا۔ تمہاری رخصتی تو زرناب سے پختہ ہو گئی ہے۔ تم نے

زرتاب کے چار محافظ مارے ہیں۔ وہ تمہارے چالیس آدمی مار کر بھی آرام سے نہ بیٹھے۔
گاہ اس سے پہلے کہ وہ سرپا انتقام بن کر تمہارا پیچھا کرے، تم اسے فکے گھاٹ اتار دو۔
میرادل گواہ دیتا ہے کہ تمہارا یہ وحشی دوست یہ کام انجام دے سکتا ہے۔"
ہوشمند کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن تباہ نے آنکھ کے اشارے سے اسے خاموش کر دیا۔
دوستانہ انداز میں سر کو جنبش دے کر بولا۔ "سردار، تمہارا مشورہ غور طلب ہے۔ واقعی
ہمیں زرتاب کو کوئی ڈھیل نہیں دینی چاہئے۔ داناؤں کا قول ہے سانپ کو سر اٹھانے سے
پہلے کھل دینا بہتر ہے۔"

سردار جاگال کافی دیر تباہ اور ہوشمند سے مصروف گفتگو رہا، اس کا سارا زور
بیان اس بات پر صرف ہو رہا تھا کہ وہ دونوں اپنے سیاہ فام ساتھی کو حرکت میں لائیں اور
زرتاب کی زندگی کا چراغ گل کر دیں۔ موقع ملے تو اس کی حسین و جمیل بیوی کو اٹھا لیا
جائے اور گھر کا ساز و سامان لوٹ لیا جائے۔ جاگال کا سینہ زرتاب کے خلاف کدورت سے
بھرا پڑا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی کے ہاتھوں ہو لیکن زرتاب کا گھر تاراج ہو جائے۔

رات گئے تک یہ محفل پیا رہی۔ خیمے کی نیم گرم فضا میں سے کا دور چل رہا اور
خیمے سے باہر چرواہے الاؤ کے گرد بیٹھے بے سرے راگ الاپتے رہے۔ وہ نقش شعر بھی
بڑی روانی سے پڑھ جاتے تھے۔ ان کی آوازوں میں کرتختی تھی جیسے وہ گانہ رہے ہوں
اپنے ناپیدہ دشمنوں سے ٹکرا کر رہے ہوں۔ دوسرے پر جاگال اور اس کے ساتھی خیمے
سے اٹھ کر چلے گئے۔ تباہ اور ہوشمند نے شمالی پانی تو اپنے تھکے پر سر رکھ کر لیٹ گئے۔
چری تھیلا تباہ کے سینے پر تھا۔ اس کی انگلیاں بے خیالی میں تھیلے پر سرسرا رہی تھیں۔
جیسے بے جان چمڑا نہ ہو کسی کی نرم ریشی جلد ہو۔ اس گل بدن کی جلد جو اس کی وحشی
دھڑکنوں میں سما کر اس کے حواس خمد کا حصہ بن چکی تھی۔ اس کی آنکھیں کہیں بہت
دور دیکھ رہی تھیں۔ شاید ایتھنز کے در و دیوار اس کی نگاہوں میں تھیں۔ وہ ایتھنز جہاں
ایک شب اس کی آوارہ آنکھوں نے ایک سپنا دیکھا تھا ایک دوشیزہ دیکھی تھی اور اس
نتیجے پر پہنچا تھا کہ وہ لڑوے زمین پر موجود نقش ترین چہرہ دیکھنے کا اعزاز حاصل کر چکا ہے۔

"ہاؤ!" ہوشمند کی آواز نے اسے خیالوں سے چو لکا دیا۔

"کیا بات ہے؟" تباہ نے تھیلا تھکے کے نیچے سرکاتے ہوئے کہا۔

"اب کیا ارادے ہیں؟"

"کل کسی وقت یہاں سے نکل چلیں گے اور ہوا موافق ہوگی تو کل کی رات ہمیں

سکوپے لاس میں آئے گی۔"

"اور یہ جاگال جو سمجھے بیٹھا ہے کہ ہم زرتاب سے نیرو آزما ہونے کی تیاری کر رہے
ہیں۔"

"وہ جو جی چاہے سمجھتا رہے ہم اس کی سوچ پر پرے تو نہیں بٹھا سکتے۔"

"ویسے دوست، ایک مسئلہ ہے۔" ہوشمند نے متفکر لہجے میں کہا۔

"کیا مسئلہ؟"

"ہامسن نے زرتاب کے سر کی قیمت دو ہزار ٹیلنٹ لگائی تھی۔ میں نے ساری جمع
پونجی اس کے مطالبے کی نذر کر دی۔ اب ہمیں ہامسن سے کام تو لینا نہیں مگر اس سے
معافہ واپس لینا سانپ کے منہ سے نوالہ چھیننے کے مترادف ہے۔ اس کم بخت کا یہ
اصول ہے کہ معافہ واپس نہیں کرتا۔"

"تو نہ لو معافہ واپس۔" تباہ نے لاپرواہی سے کہا۔

"دوست، تمہیں کوئی ہمدردی نہیں میرے ساتھ؟ میں غریب آدمی بے وجہ مارا گیا
ہوں۔"

"اچھا، تمہارے مارے جانے کی کوئی وجہ پدا کر لیں گے۔ اب تو خوش ہو؟"

"کیا مطلب؟"

"مطلب تمہیں کل بتاؤں گا۔ جب جزیرے سے روانہ ہوں گے۔" تباہ نے
مسکرا کر کہا۔ ہوشمند منہ لٹکا کر رو گیا۔ وہ اب کسی حد تک تباہ کا مزاج سمجھنے لگا تھا۔
اسے معلوم تھا کہ کتنا بھی سر پٹے تباہ اب کچھ نہ بولے گا۔

☆-----☆

جزیرہ سامو تھریس کے نیگیوں آسمان پر سبز بادلوں کی ٹکڑیاں تیر رہی تھیں۔ دوپہر
کا وقت تھا۔ دھوپ چمکیلی مگر نرم تھی۔ تباہ اور ہوشمند جزیرے کی سرسبز کھائیوں
بارونق گلیوں اور لدے پھندے باغوں سے ہوتے ہوئے کھاڑی پر پہنچ چکے تھے۔ یہاں
ہوشمند کی کشتی موجود تھی۔ ہوشمند کشتی پر سوار ہونے کے لئے بے قرار نظر آتا تھا۔ وہ
چرواہوں کی بہتی سے چوری چھپے نکلے تھے اور جتنی جلدی وہ اس جزیرے کو انوداع کہہ
دیتے اتنی ہی بہتر تھا۔ تاہم تباہ کھاڑی پر کھڑا دستور مشرق کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اسے
کسی کا انتظار تھا۔ ہوشمند کا پتا نہ مہر لہرز ہونے لگا مگر اس سے پہلے کہ وہ تباہ سے تاخیر
کی وجہ دریافت کرتا دور سے ایک گھڑ سوار آدھ کھائی دیا۔ یہ ایک تو مند شخص تھا۔ اس

ہو گئے۔

چھپے پھر کے طویل اور کھنکھنے لڑکے بعد وہ واپس سکوپے لاس پہنچے۔ اس وقت صبح ہو رہی تھی جزیرے کی سرسبز اعلیٰ اداں اور آلو بخارے کے خوبصورت باغات پر سورن کی رو پہلی کر تیں دمک رہی تھیں۔ کھانسی کے ارد گرد مانی گیروں، ملاحوں اور تاجروں کا شور و غل تھا۔ اس ہنگامہ محشر میں کسی محافظ نے تابان اور ہوشمند پر خصوصی توجہ نہیں دی۔ ساحل پر اتر کر وہ جزیرے میں داخل ہو گئے۔ یہ وہی جزیرہ تھا جہاں دو ہفتے پہلے تابان نے ایک مرد اور ایک عورت کو ہلاک کرنے کے بعد بان کے منحوس قید خانے سے رہائی حاصل کی تھی اور پھر دوبارہ گرفتاری سے بچنے کے لئے گلی کوچوں میں بھاگتا پھرتا تھا۔ اب اس کا حلیہ کافی حد تک بدل چکا تھا وہ ہر طرح سے پھل فروش ہوشمند کا ساتھی نظر آ رہا تھا۔

دکان اور مکان تو ہوشمند دروازے پہلے ہی فروخت کر چکا تھا اور نئے مالکان ان جگہوں پر قابض بھی ہو چکے تھے۔ اب اس جزیرے میں کوئی ایسی پیمت نہیں تھی جس کے نیچے لیٹ کر وہ دونوں سفر کی تھکان ادا کر سکتے۔ "اب کہاں کا ارادہ ہے؟" ہوشمند نے تابان سے پوچھا۔

"بتانا ہوں۔" تابان نے چلتے پھرتے مختصر جواب دیا۔

"کسی مسافر سرائے میں جانا ہے؟"

"ذرا زبان منہ میں رکھو ابھی پزل جاتا ہے۔"

تھوڑی ہی دیر بعد وہ کھاڑی سے کچھ فاصلے پر واقع ایک شاہی عمارت کے سامنے پہنچ گئے۔ جب تابان نے عمارت کے مدور دروازے کی طرف قدم بڑھائے تو ہوشمند نے بوکھلا کر اسے بازو سے تھام لیا۔

"ہاں؟ کیا کرتے ہو؟" مرنے کا ارادہ ہے کیا؟"

"مرنے کا نہیں رات بسر کرنے کا ارادہ ہے۔" تابان نے جواب دیا۔

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔ یو قوف تم مفروضہ قاتل ہو سرکاری محافظ تمہیں دیکھتے ہی پھانسی چڑھا دیں گے۔"

"میرا خیال تم سے مختلف ہے۔" تابان نے کہا اور ہوشمند کا بازو تھام کر صدر دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ ہوشمند کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ تابان کی گرفت مضبوط تھی ورنہ شاید وہ بازو چھڑا کر بھاگ جاتا۔ مدور دروازے پر چوکس محافظ گہری نظروں سے ان

نے اپنا نصف چہرہ ایک رومال نما کپڑے میں چھپا رکھا تھا۔ وہ قریب پہنچا تو ہوشمند نے اسے پہچان لیا۔ وہ حبشی ٹامن تھا۔ حبشی تابان کے سامنے رکھا اور گھوڑے کی ایک خرچین اتار کر تابان کی طرف بڑھادی۔ خرچین (تھیلی) میں کوئی گول منول تربوز نما شے تھی۔

"یہ کیا ہے؟" ہوشمند نے حیران ہو کر تابان سے پوچھا۔

"جاگال کا سرا۔" تابان نے سادگی سے جواب دیا۔

"کیا؟" ہوشمند قریباً چیخ پڑا۔

"ہاں تمہاری صرف کی ہوئی رقم بیکار نہیں گئی۔ اس کے عوض ہم نے ٹامن سے جاگال کا سر کٹوا لیا ہے۔" سرخ رینچہ اب ایک بے سر کے جسم کے سوا اور کچھ نہیں۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟" ہوشمند کو اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔

"پیارے ہوشمند! سیدھی سادی بات ہے۔ تم نے ٹامن کو سر کا معاوضہ دیا تھا اور

ٹامن سر لے آیا ہے۔ اب جلدی سے باقی رقم اس کے حوالے کرو۔" ہوشمند کے جواب دینے سے پہلے ہی تابان نے اس کی جیب میں ہاتھ ڈال کر رقم والی تھیلی نکال لی۔ پھر ایک نظر خرچین کے اندر ڈالی اور مطمئن ہو کر تھیلی حبشی ٹامن کی طرف اچھال دی۔ حبشی نے تھیلی کو ہوا میں دوچا اور اپنے لباس میں رکھ لیا۔ ہوشمند ہکا بکا کھڑا تھا۔ تابان نے اپنی جیب سے چمڑے کا ایک باریک ٹکڑا نکالا اور اس پر اپنے ہاتھ سے تحریر لکھنا شروع کی۔

"پیارے و محترم دوست زرتاب! میں نے کہا تھا تھاں کہ جانے سے پہلے تمہیں ایک بڑی فکر سے آزاد کر جاؤں گا۔ تمہارے بدخواہ جاگال کا سر پیش خدمت ہے۔ میں ایک بار پھر معذرت چاہتا ہوں کہ میرے ہاتھوں تمہارے چند قیمتی محافظ ہلاک ہوئے۔ میری طرف سے اپنے بچے کی پیشانی پر بوسہ دینا۔ قدرت تم سب کو اپنی حفاظت میں رکھے۔"

یہ تحریر اس نے خرچین میں ڈالی اور خرچین دوبارہ ٹامن کے حوالے کر دی۔ "یہ دونوں چیزیں زرتاب تک پہنچا دو۔" تابان نے کہا۔ حبشی نے اقرار میں سر ہلایا اور گھوڑا موڑ کر واپس روانہ ہو گیا۔ ہوشمند اب بات کی تہہ تک پہنچ چکا تھا۔ ہونٹ سکڑ کر بولا۔ "غضب کے چکر باز ہو تم۔"

"یہ چکر بازی نہیں۔ ہاں تم عقلمندی کہہ سکتے ہو۔ ہماری رقم ڈوبنے سے بچ گئی۔"

"ہماری یا میری؟" ہوشمند نے اعتراض کیا۔

"چلو تمہاری سہمی۔ کوئی نیکی تو تمہارے حساب میں جمع ہوئی۔" وہ دونوں کشتی میں آن بیٹھے۔ پاسان کو خدمت کا معاوضہ دیا اور بادبان کھول کر جزیرہ سکوپے لاس روانہ

کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"تاہو یہ کیا کر رہے ہو؟ اپنے ساتھ مجھے بھی مرواؤ گے! میں کہتا ہوں رک جاؤ۔" ہوشمند مسلسل ڈری ہوئی سرگوشیاں کر رہا تھا۔ وہ دونوں صدر دروازے پر پہنچ گئے۔ نیزہ بردار محافظوں نے انہیں روکا۔ تہاں نے اپنے چرمی تھیلے میں سے ایک تحریر لکھ کر محافظوں کو دکھائی وہ ایک ایسی مودب نظر آنے لگے۔ انہیں مودب دیکھ کر ہوشمند کی جان میں جان آئی۔ ایک محافظ نے پوچھا۔ "تو آپ سپہ سالار سے ملنا چاہتے ہیں۔"

تہاں نے اثبات میں ہوا بے باور دی محافظ انہیں ساتھ لے کر اس محل نما عمارت کے اندر چلے آئے۔ یہاں ایک سبزہ زار میں فوارے پھوٹ رہے تھے اور پھولوں کے رنگ دار تختوں پر جا بجا تتلیاں منڈلا رہی تھیں۔ ان تتلیوں کے علاوہ بھی یہاں کچھ تتلیاں موجود تھیں۔ یہ محل کی خوش اندام و خوب رو خادماں تھیں۔ وہ ایک دوسرے کو پھول مار رہی تھیں اور آگے پیچھے دوڑ رہی تھیں۔ ہوشمند اور تہاں کو دیکھ کر وہ چند لمحوں کے لئے ٹھکیں۔ ان کی نگاہیں خود بخود تہاں کے سراپا پر مرکوز ہو گئیں۔ چوڑے شانوں والا دروازہ تہاں صنف خفاف کے لئے بے پناہ کشش رکھتا تھا اور وہ اپنی اس خوبی سے آگاہ بھی تھا۔ بے شمار موقعوں پر وہ اپنی اسی مروانہ کشش کے سبب اپنے آقاؤں کی قید سے بھاگنے میں کامیاب ہوا تھا۔ اہل خانہ میں سے کوئی خاتون یا کنیز اس پر مرضی تھی اور وہ اس کی مدد سے اپنے آقا کو بچہ دے گیا تھا۔ لڑکیوں کو دیکھ کر ہوشمند نے بھی تن کر کھڑا ہونے کی کوشش کی مگر اس میں اسے خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی۔ خوشنما تتلیاں شوخی سے مسکرائیں اور ایک بار پھر اپنے کھیل میں مصروف ہو گئیں۔ محافظ نے تہاں اور ہوشمند کو ایک تخت کے قریب آرام دہ نشستوں پر بٹھادیا۔ سبک مرمر کے اس تخت پر دبیز گولے بچے تھے اور گولے تکیہ رکھا تھا۔ تہاں اور ہوشمند کو بیٹھے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ کھیتی کو دتی دو شیراز میں ٹھنک کر رک گئیں۔ باغیچے کے دروازے کی جانب سے "بادب ملنا" کی بھاری بھر کم صدا آئی۔ پھر ایک بار عجب شخص برآمد ہوا۔ اس نے بیٹھے پر شانزات نگاہ ڈالی۔ دو شیرازوں اور خادماؤں کو ترتیب سے کھڑا کیا۔ چند ہی لمحوں بعد ایک اوجیز عمر شخص اندر داخل ہوا۔ اس نے منٹوں تک لمبا زرد چنچ پن رکھا تھا۔ آگے اور پیچھے مسلح محافظ تھے۔ تہاں نے اسے پہچان لیا۔ یہ وہی شخص تھا جس کے بارے میں ہوشمند نے بتایا تھا کہ یہ جریرے کی فوج کا سپہ سالار ہے اور ملک کے بعد عارضی حکمران کے طور پر کام کر رہا ہے۔ وہ بیٹھے پہلے تہاں نے اس شخص کو بل گاہ میں تقریر کرتے

دیکھا تھا۔ جلسہ گاہ کی طرح زرد پھول یہاں بھی سپہ سالار کے ساتھ تھا۔ ایک خادمہ زرد پھول والا طلائی گلدان اٹھائے سپہ سالار کے آگے آگے چلی آ رہی تھی۔ گلدان کو مرمرس تخت پر گولا تکیے کے سامنے سجا دیا اور سپہ سالار خود ایک عام نشست پر بیٹھ گیا۔ وہ سب سے پہلے تہاں اور ہوشمند کی جانب ہی متوجہ ہوا۔ وہ دونوں اپنی نشستوں پر بادب کھڑے تھے۔ محافظ نے جبکہ کر سرگوشی کے انداز میں سپہ سالار سے کوئی بات کہی۔ غالباً ان دونوں کا تعارف کرایا گیا تھا۔ سپہ سالار کی آنکھوں میں حیرت آمیز دلچسپی نظر آنے لگی۔ اس نے سوائے نظروں سے تہاں کی طرف دیکھا تو تہاں نے لباس کے اندر سے ایک سرسبز تحریر نکال کر سپہ سالار کے حوالے کر دی۔

سپہ سالار پوری توجہ سے اس تحریر کو دیکھنے لگا۔ بعد ازاں اس نے اپنے ذاتی محافظ کو ہدایت کی کہ وہ ان دونوں کو پارے احترام کے ساتھ مہمان خانے میں لے جائے۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ دونوں شاہی مہمان خانے کے شاندار حماموں میں غسل کرنے کے بعد فارغ ہو چکے تھے اور کہیں قریب ہی اشتہا انگیز کھانوں کی خوشبو سونگھ رہے تھے۔ اس خوشبو نے ہوشمند کو بے قرار کر دیا تھا۔ باوجودیکہ اس کے ذہن میں سینکڑوں سوال بھرا رہے تھے اس نے دسترخوان پچھنے اور پھر برتن اٹھنے تک کوئی بات نہیں کی۔ پیٹ بھر گیا تو اس کے خدشے پھر سر اٹھانے لگے۔ یعنی عقل دوبارہ کام کرنے لگی تھی۔ ایک طویل تر ڈکار لے کر بولا۔ "تاہو! مجھے وہ بکرے یاد آ رہے ہیں جنہیں ذبح کرنے سے پہلے خوب کھلایا پایا جاتا ہے۔"

تہاں نے اطمینان سے کلمہ "یہاں ایسے کچھ نہیں ہوگا۔ تم دیکھنا سپہ سالار ہمیں ایک دو روز خوب کھائے پائے گا اور پھر ایک اچھی کشتی دے کر بڑے احترام سے رخصت کر دے گا۔"

"اگلے جہان۔" ہوشمند نے لقمہ دیا۔

"نہیں۔ واپس مقدمہ۔"

"آخر ایسی کیا کرامات آگئی ہے تمہارے ہاتھ؟ ہاں یاد آیا وہ تحریر کس کی تھی؟"

"تھی ایک خیر خواہ کی۔"

"خوش قسمی ہے تمہیں۔ اگر وہ خیر خواہ ہوتا تو تمہیں اس جال میں نہ پھنساتا۔ تاہو

یارے! میری مانو اب بھی وقت ہے نکل چلو۔"

"نکل چلیں گے دوست مگر تم ایک بات، بھول رہے ہو میرے کچھ رفیق یہاں ہوں

کے قید خانے میں ہیں انہیں رہا کرانے بغیر کیسے جاسکتا ہوں۔
ہوشمند کی آنکھیں حلقوں سے مائل پڑیں۔ ”تو کیا اب تم انہیں رہا کرو گے؟“
”ہاں اور یہ کام ابھی تھوڑی دیر میں ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے دوپہر کا کھانا وہ لوگ
ہمارے ساتھ کھائیں۔“

ہوشمند نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ ”تمہارے ساتھ رہ کر تو میں پاگل
ہو جاؤں گا۔ کوئی بات تمہاری میری سمجھ میں نہیں آتی۔“

تباہان اب ہوشمند کی جھنجھلاہٹ سے کافی لطف اندوز ہو چکا تھا۔ اس نے تباہان کو
حقیقت حال بتاتے ہوئے کہا۔ ”پیارے! یہ سب ملکہ زونبیا کی مہربانی ہے۔ اس نے مجھے
اپنے سپہ سالار کے نام تحریر دی تھی۔ اس تحریر میں سپہ سالار سے درخواست کی گئی ہے
کہ اگر قیدیوں پر کوئی بہت سنگین مقدمہ نہیں تو انہیں رہا کر دیا جائے۔ یہ لوگ زونبیا کو
اب بھی اپنی ملکہ ہی سمجھتے ہیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ وہ اس کی درخواست رد کریں۔ وہ تو
انہیں حکم بھی دے سکتی ہے۔“

ہوشمند نے حیران ہو کر پوچھا۔ ”تو کیا شاہی خاندان کو معلوم ہے کہ ملکہ جزیرہ
سامو تھریس میں ہے۔“

”نہیں“ صرف سپہ سالار اور اس کے چند قریبی ساتھیوں کو معلوم ہے۔
تباہان کی باتیں سننے کے بعد ہوشمند کے چہرے پر اطمینان کی بارش ہونے لگی۔ وہ
اپنے کھائے ہوئے کھانے سے اب پوری طرح لطف اندوز ہو رہا تھا اور بار بار پیٹ پر ہاتھ
پھیر رہا تھا۔ جیسے ذاتیوں اور خوشبوؤں کو بھر سے یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اسی
دوران ایک نقیب نے اندر آکر تعظیم پیش کی اور تباہان کو اطلاع دی کہ ان کے ساتھی
رہائی پانے کے بعد ہاون کے قید خانے سے روانہ ہو چکے ہیں اور تھوڑی دیر میں یہاں پہنچنے
والے ہیں۔ تباہان کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ وہ چاہتا تو ہوشمند کے ساتھ براہ
راست مقدونیہ روانہ ہو سکتا تھا اور سکندر کو اپنی کارکردگی سے آگاہ کر کے اس کی
نوازشات اور توجہ کا مستحق ٹھہر سکتا تھا لیکن اس کی حیات اور مردانگی نے گوارا نہ کیا کہ
اپنے ہمراہیوں کو قید میں چھوڑ کر خود واپسی کا سفر اختیار کرے۔ بلاشبہ سردار شلال نے
اس سے چانوڑوں سا سلوک کیا تھا، مگر وہ خود کو انسان ثابت کرنا چاہتا تھا۔ زرناب اور
زونبیا کو اوداع کہنے سے پہلے اس نے زونبیا سے درخواست کی تھی کہ وہ اس کے
ساتھیوں کی رہائی کا پروانہ لکھ دے۔ زونبیا رضامند ہو گئی تھی لیکن زرناب نے شرط رکھی

تھی کہ نورین دوسرے قیدیوں کے ساتھ رہا نہیں ہوگا۔ زرناب کی یہ شرط قابل فہم تھی۔
نورین، زرناب کا دشمن تھا اور یقینی بات تھی کہ وہ واپس مقدونیہ پہنچ کر سکندر کو زرناب
کے بارے بتائے گا اور زرناب کے لئے مشکلات پیدا کر دے گا تاہم تباہان نے یہ ابھین
بھی اپنی خداداد فراست سے حل کر لی تھی اور اپنی طرف سے زرناب کو یہ ضمانت فراہم
کردی تھی کہ رہا ہونے کے بعد نورین اپنی زبان بند رکھے گا اور کبھی کسی کے سامنے
زرناب و زونبیا کا تذکرہ نہیں کرے گا لہذا اب نورین بھی دوسرے قیدیوں کے ساتھ رہا
ہو رہا تھا۔

حسب اطلاع تھوڑی دیر بعد قیدی سپہ سالار کے محل میں پہنچ گئے۔ تباہان اور
ہوشمند ان کے استقبال کے لئے محل کے صدر دروازے پر موجود تھے۔ انہیں شاہی
مہمبل کی ایک بند گھوڑا گاڑی میں یہاں تک لایا گیا تھا۔ ایک ایک کر کے وہ نیچے اترے۔
وہ سب ابھی تک قیدیوں کے لباس میں تھے۔ گورا سب سے آخر میں نظر آئی۔ اپنے
ساتھیوں کی طرح وہ بھی قدرے حیران نظر آتی تھی۔ لگتا تھا انہیں ابھی تک بھروسہ نہیں
کہ وہ واقعی آزاد کئے جا رہے ہیں۔ سردار شلال، گونسل اور نورین نے عجب سے تباہان
کی طرف دیکھا۔ تباہان تیزی سے آگے بڑھا اور بڑی گرجبوشی سے ایک ایک کو گلے لگایا پھر
وہ گورا کی جانب متوجہ ہو گیا۔ وہ سادہ لباس میں حزن و ملال کی تصویر نظر آتی تھی اور اس
کیفیت نے اسے کچھ اور جاذب نظر بنا دیا تھا۔ وہ بے ساختہ بھاگ کر تباہان سے چمٹ گئی
اور رونے لگی۔ ان آنسوؤں میں ہاون کے اس بدبودار قید خانے کے دکھ پڑے ہوئے
تھے اور تفکر کا وہ جذبہ بھی تھا جس کے اظہار کے لئے گورا سمیت کسی کے پاس الفاظ
موجود نہیں تھے۔

☆-----☆-----☆

رات دھیرے دھیرے سرک رہی تھی۔ کانوڑی شمعوں کی روشنی میں تباہان اور
ہوشمند مصروف گفتگو تھے۔ یہ سپہ سالار کے محل ہی کا ایک کمرہ تھا۔ ایک ایسے ہی کمرے
میں سردار شلال، گونسل اور نورین سوئے ہوئے تھے۔ تباہان اور ہوشمند کے درمیان
جاری گفتگو کا موضوع سردار شلال تھا۔ وہ دونوں اس بات پر سوچ بچار کر رہے تھے کہ
سردار شلال کو چری تحیلے کے بارے بتایا جائے یا نہیں۔ شلال اس مہم کا سردار تھا۔ اسے
ان تمام مقاصد کا علم تھا جو سکندر اس مہم سے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ چری تحیلے کی
دستویزات کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتا تھا اور فیصلہ کر سکتا تھا کہ یہ معلومات کافی ہیں یا

نہیں۔ بحیثیت سردار بھی اس کا حق تھا کہ اسے حالات سے باخبر رکھا جائے لیکن دوسری طرف سردار شلال کا سابقہ کردار ان کے سامنے تھا۔ یقین سے نہیں کہا جاسکتا تھا کہ شلال احسان فراموشی نہیں کرے گا اور اس کی نیت فتور سے پاک رہے گی۔ یوں تو تابان قید خانے میں سردار شلال سے عمدے لے چکا تھا۔ اگر وہ انہیں رہائی دلانے میں کامیاب ہوا تو وہ اتنے دوستوں کی طرح ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے اور سردار شلال اب کسی حد تک ”دوست“ نظر بھی آ رہا تھا۔ تاہم اس مرحلے میں حتیٰ رائے قائم نہیں کی جاسکتی تھی۔

ہوشمند کو گفتگو کے ساتھ اب بتائیاں بھی آ رہی تھیں۔ لہذا تابان نے اس معاملے پر غور و فکر صبح تک ملتوی کر دیا۔ شد نے دودھ کا ایک ایک پیالہ نوش کر کے وہ بستر پر دراز ہونے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اچانک دروازے پر آہٹ ہوئی اور کورا اندر آ گئی۔ وہ شب خوابی کے لباس میں تھی۔ آنکھوں میں خوف سمٹا ہوا تھا۔ وہ کسی وحشت زدہ ہرئی کی مانند دکھائی دیتی تھی۔

”کیا بات ہے کورا؟“ تابان نے نرمی سے پوچھا۔

اس نے خشک لبوں پر زبان بچھری۔ ”کچھ نہیں کچھ بھی نہیں۔ بس مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“

تابان نے اسے نونے والی نگاہوں سے دیکھا۔ ”سردار شلال سے خوفزدہ ہو؟“ اس نے اقرار میں سر ہچکایا پھر چہرہ ہاتھوں میں ڈھانپ کر روئے گئی۔ ”وہ انسان نہیں درندہ ہے میں اس کے قریب بھی رہنا نہیں چاہتی۔ ایسی آزادی سے تو ہاؤن کا تہ خانہ اچھا تھا۔ وہاں ایسے حیوان کا خوف تو نہیں تھا۔“

تابان نے محبت سے اس کا شانہ سہلایا۔ ”کورا تم بے وجہ گھبرا رہی ہو شلال اب تم سے اتنی ہی دور ہے جتنا مشرق سے مغرب اور ویسے بھی اب وہ بہت بدل چکا ہے۔ تم نے محسوس نہیں کیا اس کے لہجے میں تمہارے لئے پہلے جیسی سختی نہیں تھی۔ میں اس سے وعدہ لے چکا ہوں کہ وہ جہتیں کوئی گزند نہیں پہنچائے گا اور تم سے عداوت رکھے گا۔“

ہوشمند نے تابان کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”میں سردار شلال کو عرصے سے جانتا ہوں مجھے وہ بہت بدلا ہوا نظر آ رہا ہے۔ لگتا ہے ہاؤن کے قید خانے میں اس کے دل کی سیاحت کافی حد تک دھل گئی ہے پھر بھی اگر آپ کوئی خدشہ محسوس کر رہی ہیں تو اس

کمرے میں سو جائیے میں آپ کے کمرے میں لیٹ جاؤں گا۔“

معمولی تذبذب کے بعد کورانے یہ تجویز مان لی۔ ہوشمند ”شب بخیر“ کہہ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ تابان دروازے کے قریب قائلین پر دراز ہو گیا اور کورا مسہری پر لیٹ گئی۔ کمرے میں اب صرف ”دو“ مسمیٰ مسمیٰ جل رہی تھیں۔ ان کی خوابیدہ روشنی میں کمرے کے فانوس دور افتادہ کھنکھوں کی طرح دک رہے تھے۔ اس کمرے میں کورا کی موجودگی ایک گندگدگی کی طرح تابان کے حواس کو چھو رہی تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ کتنا بدل گیا ہے وہ بھی۔ کس قدر بے لگاؤ اور اجنب تھا وہ۔ وہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ ایک خوبصورت جسم اس کے اس قدر نزدیک موجود ہوگا اور وہ لا تعلیق پڑا رہے گا۔ وہ تو آنکھوں سے کابل اور زلفوں سے خوشبو لے اڑتا تھا۔ اس میں منصف مخالف کے لئے کشش تھی اور اس کشش کو اس نے کبھی رائیگاں نہیں جانے دیا۔ جہاں اور جب موقع ملا اس نے عورت کو ہتھیار بنا کر اپنے آنکھوں پر کاری وار کیا۔ مگر اب اس کے اندر ایک اور نئی طرح کی ترتیب جاگ چکی تھی۔ شاید وہ محبت کرنے لگا تھا اور محبت اسے حیوانیت سے دور لے آتی تھی معلوم نہیں سوچے سوچتے کب تابان کو اوجھ آ گئی۔ نیند اور بیداری کی درمیانی حالت میں وہ محسوس کرتا ہا کہ اس کے حلق میں کائنات سے چھبے ہوئے ہیں اور وہ پیاس کی شدت سے ہانپ رہا ہے۔ دفعتاً اس کی آنکھ کھل گئی۔ دروازے پر ایک ٹانوس شور سے گونج رہے تھے۔ وہ بڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ مسہری پر کورا بھی جاگ چکی تھی۔ ایک ملازم ہانپتا کانپا ہوا اندر داخل ہوا اور اس نے یہ روح فرسا اطلاع دی کہ کسی نے ہوشمند کو خنجر گھونپ دیا ہے۔ تابان خادم کے پیچھے بھاگتا ہوا اس کمرے میں داخل ہوا جو آج کی رات ہوشمند کا مسکن تھا۔ اس کی آنکھوں نے ایک دلدوز منظر دیکھا۔ ایک خنجر کا نصف سے زائد پھل ہوشمند کے سینے میں اتر رہا تھا۔ ہوشمند کا جسم بے حس و حرکت تھا اور خون نے چادر پر رنگین کر رکھی تھی۔ تابان کے ہونٹوں سے کراہ نکلی۔ وہ لپک کر ہوشمند کے قریب آیا۔ پھر اسے سردار شلال کا خیال آیا۔ اس نے قریبی کمرے میں جھانکا وہ خالی تھا۔ ”سردار شلال کہاں ہے؟“ اس نے گرج کر خادموں سے پوچھا۔

”وہ تو اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ چلے گئے۔“

”کہاں گئے ہیں؟“

”معلوم نہیں ابھی توڑی رہے پہلے نکلے تھے۔“ خادم مزید تفصیل بھی بتا رہا تھا لیکن تابان کو کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کے کانوں میں ساعت شکن دھماکے گونج

رہے تھے۔ پلک جھپکنے میں وہ بات کی تہ تک پہنچ گیا تھا۔ کورا کے خدشات درست نکلتے تھے۔ تارکی اور تہائی سے فائدہ اٹھا کر سردار شلال کورا کے کمرے میں گھسا تھا۔ وہاں اس کی مذہمیز نے دست و پا کورا کی بجائے ہوشمند سے ہو گئی تھی۔ غالباً ہوشمند نے مزاحمت کی تھی اور شلال نے اس کے سینے میں خنجر گھونپ دیا تھا۔ چونکہ تہاں کی طرف سے کسی محافظ کو ایسی کوئی ہدایت نہیں کی گئی تھی کہ سردار شلال یا دیگر مہمان کیسے آتا جانا چاہیں تو انہیں روکا جائے۔ سردار شلال ہوشمند کو خنجر گھونپ کر با آسانی محل سے نکل گیا تھا۔ گونسل اور نورین بھی اس کے ساتھ تھے۔ دفعتاً تہاں کا دھیان اپنے چری تھیلے کی طرف چلا گیا تھا۔ یہ تھیلا حفاظت کے پیش نظر اس نے کل کورا کے کمرے میں رکھ دیا تھا۔ وہ بھاگا ہوا دوبارہ کورا کے کمرے میں آیا۔ شاندار مسمری کے پاس ایک منقش آہوئی الماری تھی۔ الماری کا قفل ٹوٹا ہوا تھا۔ تہاں کے دل پر دوسرا شدید گھونہ لگا۔ اس نے جلدی سے پت کھول کر اندرونی خانے میں جھانکا۔ تہاں کا تن بدن جل اٹھا۔ ایسے میں وہ وحیت لا پرواہ اور بے رعب تہاں کہیں دور جا چھپا جسے سب جانتے تھے۔ اس کی جگہ ایک ضدی، خود سر اور خطرناک شخص نے لے لی۔ ایک عجیب سی آگ تہاں کی آنکھوں میں روشن ہوئی۔ وہ بھاگتا ہوا محل سے نکلا اور اصطبل کی طرف لپکا۔ چند لمحوں بعد وہ ایک مٹھی گھوڑے پر سوار تیزی سے جزیرے کی بندرگاہ کی طرف جا رہا تھا۔ نہ جانے کیوں اس کا گلا بالکل خشک ہو رہا تھا اور سانس بوجھل ہوتی چلی جا رہی تھی۔ سوکے لاس خاصا بڑا جزیرہ تھا لیکن ایسا وسیع و عریض بھی نہیں تھا کہ سردار شلال اور اس کے ساتھی یہاں تادیر چھپ سکتے۔ چینی بات تھی کہ وہ اس چری تھیلے کے ساتھ جلد از جلد یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں گے۔ یہی وجہ تھی کہ تہاں کا رخ ساحل کی جانب تھا۔ کھاڑی زیادہ دور نہیں تھی وہ تھوڑی دیر میں وہاں پہنچ گیا۔ رات کا آخری پہر تھا۔ کھاڑی پر زیادہ جھیز نہیں تھی۔ چند ایک پھیرے اپنی کشتیوں کے بادبان درست کر رہے تھے۔ بہت سویرے کام پر نکلنے والے سبزی فروش اور شیر فروش بھی کہیں کہیں دکھائی دے رہے تھے۔ تہاں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ سردار شلال وغیرہ کا کہیں سراغ نہیں ملا۔ یہ بھی بعید از قیاس تھا کہ وہ اس مختصر وقت میں کشتی دھونڈ کر یہاں سے نکل گئے ہوں۔ دوسرا امکان یہ تھا کہ وہ ابھی تک جزیرے میں ہی کہیں چھپے ہوئے ہوں۔ تہاں کو پریشان پا کر ایک بربری ملاح اس کے نزدیک آیا۔ تہاں نے اس سے سردار وغیرہ کے بارے پوچھا ملاح کا جواب غور طلب تھا۔ اس نے کہا۔

”ابھی تھوڑی دیر پہلے تین گھڑ سوار یہاں پہنچے تھے۔ ان میں سے ایک نجیم خیم تھا۔ اس کے چہرے پر بد نما زخم تھا۔ وہ تین بہت جلدی میں لگتے تھے۔ انہیں فوری طور پر ایک بڑی کشتی درکار تھی۔ مگر کوئی کشتی اس وقت تیار نہیں تھی۔ لہذا اس ہو کر پرانی کھاڑی کی طرف چلے گئے۔“

پرانی کھاڑی وہاں سے کم از کم پانچ کوس کے فاصلے پر تھی۔ رات بھی ویران اور ان دیکھا تھا لیکن تہاں مزید تاخیر کا تحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے اپنے سوکے ہونٹوں پر زبان پھیری گھوڑے کو ایڑ لگائی اور حتی الامکان رفتار سے پرانی کھاڑی کی طرف روانہ ہو گیا۔ معلوم نہیں کیوں کچھ بہ لمحہ اس کی طبیعت گزرتی جا رہی تھی۔ محل سوکھ گیا تھا اور بیت میں درد کی لہری اٹھ رہی تھی۔ جیسے کوئی جانور تیز نوکیلے پنچوں سے اس کی آنتیں کھود رہا ہو۔ بے حد سخت جان تھا تہاں ورنہ درد جس تیزی سے بڑھ رہا تھا وہ اب تک گھوڑے سے لڑھک کر زمین پر آگیا ہوتا۔ اپنی بے پناہ قوت مدافعت کو بروئے کار لاتے ہوئے اس نے سفر جاری رکھا۔ دونوں اطراف اونچی نیچی گھاسیاں تھیں۔ جھاڑ جھکاڑ تھا اور مہیب خاموشی تھی۔ اس خاموشی میں صرف گھوڑے کی ٹانگیں گونج رہی تھیں یا کبھی کبھار سمندر کی جانب سے لہروں کا مدھم مدھم شور سنائی دے رہا جاتا تھا۔ تہاں نے قریباً ایک کوس فاصلہ طے کیا تھا کہ اس کی حالت غیر ہونے لگی۔ دفعتاً اسے زور دار آہلی آئی۔ اس کے ساتھ ہی گرد پیش اس کی نگاہوں میں پھراتے چلے گئے۔

”یہ کیا ماجرا ہے؟..... یہ کیا ماجرا ہے؟“ یہ سوال بار بار اس کے ذہن میں گونہ رہا تھا۔ ”کہیں..... کہیں اسے کچھ دے تو نہیں دیا گیا؟“ اسے وہ دودھ یاد آیا جو اس نے سونے سے تھوڑی دیر قبل پیا تھا۔ کیا اس دودھ میں کچھ ملا دیا گیا تھا؟ یہ سوچتے ہوئے تہاں کو احساس ہوا کہ وہ تو ازان کھو کر گھوڑے سے گر رہا ہے۔ اس نے بے پرواہداشت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک بار پھر خود کو مہنبلا دیا۔ اب ایک جہنم اس کے پیٹ میں دھک رہا تھا اس کے ذہن نے فیصلہ دیا کہ اسے واپس لوٹ جانا چاہیے۔ وہ گھوڑے کا رخ بدلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب اچانک سب کچھ اس کے بس سے باہر ہو گیا۔ اوپر سے اس نے کئی بار قے کی اور وہ اس کھو کر گھوڑے کی پشت سے زمین پر آگرا۔ میں اس وقت ایک عجری مرغابی بھی اس کے پاس گری اور بری طرح تر پڑنے لگی۔

~~~~~

وہ ایک اونچی چھت کا کمرہ تھا۔ چھت پر نقش و نگار کندہ تھے اور دیدہ زیب

”یہ حکیم رستاب کون ہے؟“

”سکوپے لاس کا سب سے قاتل حسین۔ شہابی خاندان کے افراد اور تمام بڑے بڑے امرا و رؤسا اسی کے دستِ شفا کے قدر دان ہیں۔ تمہاری زندگی قحی جو تمہیں آقا گویش جیسے مددگار اور حکیم رستاب جیسے مددگار ملا۔“

تباہی نے ایک بار پھر اٹھنے کی کوشش کی اور عورت کے خوبصورت ہاتھوں نے اسے دوبارہ روک لیا۔ "نہیں۔" اس نے تنبیہ کی۔ "تمہیں ابھی مکمل آرام کی ضرورت ہے۔ آقا کا حکم ہے کہ تمہیں سترے اٹھنے نہ دیا جائے۔"

"لیکن میرا جانا ضروری ہے میں سپہ سالار کا مہمان ہوں اور کچھ لوگ سپہ سالار کے محل میں ایک شخص کو قتل کر کے فرار ہو رہے ہیں۔ انہوں نے کچھ قیمتی دستاویزات بھی چرائی ہیں۔"

”تم کب کی بات کر رہے ہو؟“ عورت نے پوچھا۔

”یہ کل رات ہی کی بات ہے۔“ تمایان نے جواب دیا۔

عورت نے ایک چادر تابان کے سنے تک کھینچی اور اطمینان سے بولی۔ "شاید  
 تمہیں معلوم نہیں کہ پچھلے تین روز سے تم ان بستر پر موجود ہو اور ہم تمہاری ہمدردی  
 کر رہے ہیں۔"

عورت کے لیے میں چائی بھٹک رہی تھی۔ تہاں سنائے میں رہ گیا۔ تین روز گزر جانے کا مطلب تھا شمال سرودے دستاویزات کے ساتھ اتھنفر کے قرب دوار میں پہنچ چکا ہوگا۔ ہوشمند کی آخری رسوم ادا ہوئے دریم بیت چکے ہوں گے اور گورا..... نہ جانے کہاں کہاں بھٹکتی پھرتی ہوگی۔ اس دفعہ عورت کے روکنے کے باوجود وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ انداز باغیانہ ہی تھا۔ عورت نے آواز دے کر دو سیاہ فام غلاموں کو اندر بلا دیا۔ انہوں نے نرمی سے مکر فیصلہ کن انداز میں تہاں کو دوبارہ بستر پر بٹھا دیا۔ تہاں نے کراہ کر کہا۔ ”میں تمہارے آقا سے ملنا چاہتا ہوں۔“

عورت بولی۔ ”بس وہ تشریف لاتے ہی ہوں گے۔ تمہیں زیادہ انقلاب نہیں کرنا پڑے گا۔“

عورت نے دوست کہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد دروازے کی جانب سے ہماری قدموں کی صدا آئی اور دلچسپ کھڑا مسلح غلام ٹوٹ ہو گیا۔ یہ اس امر کی طرف اشارہ تھا کہ آنے والا اس گھر کا آقا ہے۔ اب تک کے حالات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک مہربان

فانوس لنگ رہے تھے۔ دیواروں پر عیاں چلے گئے اور مختلف جنگلی جانوروں کے حوط شدہ سر فرس پر دبیز قاتلین بچھا ہوا تھا۔ تابان نے منہوس کیا کہ وہ کسی آرام دہ مہسری پر دروازہ ہے۔ اس کے نزدیک ہی کہیں بدوادر کسلی دوا میں رکھی تھیں۔ تابان کو ایک بار پھر منہلی ہونے لگی۔ اسے لگا جیسے وہ ایک زمانے سے اس بستری پر دراز ہے اور ان منہوس دواؤں کی بیزار کن بو سونگھ رہا ہے۔ ایسا کیسی جیتے ہوئے لمحات قطار اندر قطار سمیٹ گھوڑوں کی طرح بھاگتے ہوئے آئے اور اس کے تصور میں دندانے لگے۔ اسے یاد آیا کہ وہ ہوشمند کا خونچکیں جسم اور خالی الماری دیکھنے کے بعد نیم دیوانہ ہو گیا تھا اور اندھا دھند سردار شہناں کے نقاب میں روانہ ہوا تھا۔ اسے اس کی طبیعت گزرتی چلی گئی تھی اور وہ کھانسی سے قریب ایک کوس دور ایک گھائی میں اوندھے منہ گھوڑے سے گرا تھا۔ یہ سب کچھ یاد آتے ہی اس نے جڑوا کر اٹھنے کی کوشش کی لیکن دو نسوانی ہاتھ اس کے ہر ہڈ سینے پر آئے اور اسے سر اٹھانے سے روک دیا۔ اس نے گردن گھما کر دیکھا۔ ایک نقاب پوش عورت اس کے سر ہائے بیضی تھی۔ نقاب میں سے صرف اس کی آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں لیکن تابان ان آنکھوں سے ہی عورت کے متعلق بہت سے اندازے لگانے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ چہنچس چہنچس برس کی جوان سال عورت تھی۔ قبول صورت تھی ایرانی تھی اور اس گھر کی ملازمہ یا کنیرہ تھی۔

"میں کہاں ہوں؟" تاپن نے کراہ کر پوچھا۔

”تم جزیرے کے ایک معمول زمیندار کی امان میں ہو۔ تمہارے آقا کا نام گویش ہے۔“

گویش کا نام تابان کو کچھ جانا پہچانا لگا۔ اس نے ذہن پر زور دیا لیکن بنار جسم کے ساتھ ذہن بھی ماؤف ہو رہا تھا۔ اسے فوراً کوئی بات یاد نہیں آئی۔ جوں سال عورت نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "آقا علی الصبح اپنے چند مہمانوں کے ساتھ مرغابی کے کنارے نکلے ہوئے تھے ایک گھٹائی میں انہوں نے تمہیں بے ہوش پڑا دیا۔ یہ دیوانوں کا کام ہے کہ تمہاری زندگی بچ گئی ورنہ تمہاری حالت ایسی نہیں تھی۔"

”نک ..... کیا ہوا تھا ..... مجھے؟“

”یہ تو تم ہی بہتر جانتے ہو۔ تمہاری حالت سے ظاہر تھا کہ تم نے زہر کھایا ہے یا کسی نے تمہیں دیا ہے۔ حکیم رسطاب کا کہنا ہے کہ اگر چند لمحوں کی تاخیر مزید ہو جاتی تو تمہارا بیٹا نامکمل تھا۔“





کی گئی تھی اور خوشحال طبقے کا ایک فرد ایک لوارٹ جان بلب مریض پر اتنا مہیاں کیوں ہو گیا تھا؟ کرم کے اس پردے میں ستم کے خوفناک عزائم چھپے ہوئے تھے۔ گویش کو دیکھ کر تابان نے اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کی اور پہلی بار اسے اندازہ ہوا کہ اس کا باپ اس کے پاؤں ایک زنجیر میں جکڑا ہوا ہے۔ اس کے پاؤں سے زنجیر کا رشتہ مست پرانا تھا اور یہ رشتہ ایک بار پھر استوار ہو چکا تھا۔

-----ہم-----ہم-----ہم-----

سکوپے لاس کی وہ رات جس زندہ اور تاریک تھی ان جزائر میں ایسی راتیں طوفان کا پیش خیمہ ہوتی ہیں۔ تابان بستر پر نیم دراز تھا اور گویش ایک نشست پر پاؤں رکھے بڑی رعونت سے تابان کے سر ہانک رہا تھا۔ اس کے گلے میں سبک بلب کا پیش قیمت ہار فانوس کی روشنی میں دمک رہا تھا۔ وہ عجیب جذباتی لہجے میں گویا ہوا۔

"ان دو برسوں میں میں تیری صورت چند لمحوں کے لئے بھی نہیں بھولا اور نئے یاد رکھا جائے وہ زبیت کے کسی نہ کسی موڑ پر ملتا ضرور ہے۔ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے ناں! گویش کے بظاہر نرم لہجے میں زہر کا دیا بدم رہا تھا۔

تابان نے کہا۔ "سردار گویش! تم شب و روز دیوتاؤں کی پرستش کرتے ہو۔ میں انہی دیوتاؤں کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میرا ارادہ تمہارے گھر سے بھاگنے کا ہرگز نہیں تھا۔ میں تو تمہارے پاس ہر طرح خوش تھا۔ پھر بھاگنے کا خیال دل میں کیوں لایا؟"

تم جھوٹ بول رہے ہو تبو..... تمہیں پتہ چل گیا تھا کہ میں تمہیں جہازوں پاشا کے ہاتھ فروخت کر رہا ہوں۔ لہذا تم فرار ہو گئے۔

"میں فرار نہیں ہوا۔ مجھے فرار ہونے پر مجبور کیا گیا تھا۔"

"کس نے کیا تھا ایسا؟"

تابان نے چند لمبے توقف کیا۔ "میں..... اس کا نام نہیں بتا سکتا۔"

گویش نے آگے بڑھ کر ایک زور دار تحییر تابان کے منہ پر مارا۔ چنانچہ کی آواز سے کمر اگوچ اٹھا۔ گویش غریبا۔ "تم نہ بتاؤ..... لیکن میں جانتا ہوں۔ اس کا نام مارسیلہ تھا۔ یہ تم دونوں کی ملی بھگت تھی۔ تم دونوں میرے گھر میں 'میری آنکھوں میں دھول جھونک کر عشق و محبت کا کھیل کھیتے رہے۔ میری عزت مار مار کرنے کے منصوبے بناتے رہے اور جب موقع ملا تو بھاگ نکلے۔ یہ تو دیوتاؤں کا کرم تھا کہ تم اپنے ناپاک ارادے پورے نہ کر سکے اور مارسیلہ میرے محافظوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئی۔"

تابان نے کہا۔ "سردار! آپ کو اپنی پاکدامنی بیٹی پر ایسے بستان باندھتے شرم آتی چاہیے۔"

گویش کا دوسرا تحییر تابان کے منہ پر پڑا۔ اس دفعہ اس کا ہونٹ پھٹ گیا اور خون رخسار پر بسنے لگا۔ پاؤں میں وزنی زنجیر تھی اور وہ گویش کے سامنے قطعی بے بس تھا۔ وہ دانت پیس کر بولا۔ "تم اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتے ہو کہ فرار کی شب تمہیں کو بھری میں ملنے والی مارسیلہ نہیں تھی۔"

تابان نے اعتراف کیا۔ "وہ مارسیلہ تھی لیکن یہ غلط ہے کہ اس کا میرے ساتھ کوئی تائید تھا یا وہ میرے ساتھ فرار ہو رہی تھی۔ غالباً آپ نے اسے صفائی پیش کرنے کی مصلحت ہی نہیں دی۔ ورنہ اس کی باؤں میں آپ کو سچائی جھلکتی نظر آتی اور آپ جان جاتے کہ وہ کتنی گناہ گار ہے۔"

"تو تم چاہتے ہو کہ میں اسے صفائی کی دلیلیں پیش کرنے کا موقع دوں؟"

"بالکل آپ کو ایسا کرنا چاہئے تھا۔"

گویش بولا۔ "زیوس دیوتا کا شر ہے کہ اس نے مجھے اس شرمندگی سے محفوظ رکھا ہے۔ مارسیلہ اب اس دنیا میں نہیں۔ وہ اسی روز اپنے انجام کو پہنچ گئی تھی جس روز گرفتار ہوئی تھی۔"

چند لمحوں کے لئے تابان سنانے میں رہ گیا۔ "تو..... تم..... تم..... تم..... نے اسے قتل کر دیا تھا؟"

"نہیں اس میں ابھی غیرت کی رقی باقی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھوں خود کو ہلاک کر لیا تھا..... مجھے صورت دکھانے سے پہلے ہی وہ اپنی جان دے چکی تھی۔"

یہ اطلاع تابان کے لئے غم انگیز تھی۔ وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر گری سانس لے کر بولا۔ "سردار اگر واقعی وہ خودکشی کر چکی ہے تو یہ مت سمجھنا کہ وہ گناہ گار تھی۔ وہ جہنم کے قہقروں کی مانند صاف و شفاف تھی۔ ممکن ہے اس کے دل میں میرے لئے جاہت ہو لیکن اس کا ذکر کبھی اس کی زبان پر نہیں آیا اور جہاں تک میری بات ہے میں نے کبھی اسے اس نظر سے دیکھا ہی نہ تھا۔"

گویش کیمٹی سے مسکرایا اور فطرتاً لہجے میں بولا۔ "تمہارا کیا خیال ہے میں تمہارے جھوٹ پر یقین کر لوں گا۔ ہرگز نہیں..... ہرگز نہیں۔ تم نے کسی معمولی آدمی کی عزت پر ہاتھ نہیں ڈالا۔ تم نے گویش کی بیٹی کو اس سے جدا کیا ہے۔ میں تمہیں بڑی





دیکھتی رہی، پھر اس نے گردن لمبی کی اور روزن میں سے تہاں پر تھوک دیا۔ تھوک تہاں کے چہرے پر پڑا اور وہ دانت خیش کر رہ گیا۔ کینز آگے چلی گئی تو ایک دوسرا چہرہ نظر آیا یہ بھی ایک نوجوان خادمہ تھی۔ اس نے مسکرا کر تہاں کو دیکھا اور تھوک کر آگے بڑھ گئی۔ اب ایک اور خوبصورت نسوانی چہرہ دکھائی دیا۔ تہاں پر انکشاف ہوا کہ روزن سے باہر عورتوں و لڑکیوں کی قطار لگی ہے اور ان میں سے ہر ایک اس روزن میں سے تہاں پر تھوکنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس کی نگاہوں میں سردار گویش کا غصیلہ چہرہ گھومتے لگا۔ وہ کینز پرور شخص انتقام کی شدت میں نیم پاگل ہو رہا تھا۔ یہ اونچی حرکت اسی پاگل پن کی غماز تھی۔

☆-----☆-----☆

تہاں اسی تہ خانے میں بے بسی کی تصویر بن کر رہ گیا۔ قید کرنے والوں نے اس کا خوب انتظام کیا تھا۔ گلے میں پڑا ہوا طوق نما کڑا ناقابل شکست تھا۔ اس قسم کے کڑے تہاں نے صرف ایک دفعہ آقا خاں زونب کے محل میں دیکھے تھے۔ وہاں یہ کڑے سزائے موت پانے والے قیدیوں کو پسانے جاتے تھے۔ قیدی کی گردن کے گرد ایک دفعہ یہ کڑا بند ہو جاتا تو پھر اسے کھونا ناممکن تھا۔ اسے صرف کھانا جاسکتا تھا۔ بغرض محل وہ کسی طرح اس طوق نما کڑے سے بچنا نہ سکتا تھا۔ اسے کھانا پانے میں کامیاب ہو جاتا تو کئی ہاتھ اونچے دروازے تک پہنچتا اور اسے کھولنے کی کوشش کرنا ناممکن تھا۔ دروازے میں سے اس کے لئے باقاعدگی سے کھانا پینے کا جاتا تھا اور اسی باقاعدگی سے تھوک بھی۔ ہر روز ایک مقررہ وقت پر تہ خانے کی چھت پر عورتوں کی ایک طویل قطار لگ جاتی وہ پاری بار روزن نما دروازے کے سامنے سے گزرتیں اور تہاں پر تھوکتیں۔ ان عورتوں میں اب خادماؤں اور کنیزوں کے علاوہ گھر کی خواتین بھی شامل ہونے لگیں تھیں۔ سردار گویش کی دو بیویاں اور ایک بہن بڑی باقاعدگی سے اس "نیک کام" میں حصہ لیتی تھیں۔ غالباً انہیں بھیجا جاتا تھا۔ ظاہر ہے بھیجنے والا سردار گویش ہی رہا ہوگا۔ یہ سب کچھ اسی کی ایما پر ہو رہا تھا۔ تہاں کو گویش کی اس عجیب و غریب حرکت پر کچھ زیادہ حیرت نہیں ہوئی تھی۔ گویش ایک غصیلہ شخص تھا اور بیش اوقات اس کا غیظ و غضب جنون کی حد تک پہنچ جاتا تھا۔ اس حالت غضب میں اس نے ایک دفعہ ایک سفید ریش کے سر پر اس زور سے مکا مارا تھا کہ وہ پلک بپسکتے میں جان بحق ہو گیا۔ اس واقعہ کا المناک ترین پہلو یہ تھا کہ مرنے والا گویش کا بچا باپ تھا۔ ایک عرصہ گزرنے کے باوجود یہ واقعہ ابھی تک تہاں کو بھولا نہیں تھا اور یہ کوئی ایک

واقعہ نہیں تھا۔ ایسے بے شمار واقعات تہاں کے ذہن میں محفوظ تھے۔

ایک روز جب بہت سے حسین چہرے تہاں پر تھوک کر جا چکے تھے اور وہ ہوشمند و کورا کی یاد میں گم صم پڑا تھا، روزن میں گویش کی صورت نظر آئی۔ گویش کی آواز سن کر تہاں نے گھٹنوں سے سر اٹھایا۔ گویش اس کی آنکھوں میں جھانک کر حقارت سے مسکرائے لگا۔ اس کی بھاری بھر کم آواز تہ خانے میں گونجی۔

"ایک روز میں تجھ پر تھوکنے کے لئے اتنی عورتیں جمع کروں گا کہ تو غرق ہو جائے گا۔ میری اس بات کو مذاق نہ سمجھنا۔ جو میں نے کہا ہے ویسا ہی ہوگا۔"

"میرا کیا قصور ہے؟" تہاں نے پوچھا۔

گویش بولا۔ "قصور تیری اس صورت کا ہے جس کے قریب سے تو نے میری بیٹی کو درغلا یا تھا اور اب تک نہ جانے کتنی لڑکوں کو درغلا چکا ہے۔ میں اس صورت کو دیکھنے والوں کے لئے عبرت ناک بنا دوں گا۔"

"سردار" میں تمہیں بتا چکا ہوں، میں نے تمہاری بیٹی کو نہیں درغلا یا مجھے اس کی موت کا افسوس ہے لیکن اس موت میں میرا کوئی ہاتھ نہیں۔"

جواب میں گویش نے تہاں کو ایک گلی گلا دی اور نفرت سے اس پر تھوک دیا۔ ایک جوابی گلی تہاں کے ہونٹوں پر بھی چلی لیکن اس نے ہونٹوں کو بھیجنے لیا۔ آداب غلامی سے واقف ہونے کے بعد اسے اپنا رنج و غم پھپھانا آ گیا تھا۔ وہ اس وقت صورت حال مزید کشیدہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ تہ خانہ واقعی ابے کا جال تھا۔ اسے کائے کے لئے تہاں کو وقت درکار تھا اور بے پناہ کوشش کی ضرورت تھی۔ جبکہ وہ جلد از جلد یہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔ جلد نکلنے کی ایک ہی صورت تھی۔ وہ گویش سے کسی طرح کی مناسبت کر لے ان کے مابین کوئی ایسا معاہدہ ہو جائے جس کی زور سے گویش اسے رہا کر دے۔ تہاں نے اپنے لمبے جو نرم رکھتے ہوئے کہا۔ "سردار! میں تمہاری قید میں ہوں تم جو چاہو سلوک مجھ سے کر سکتے ہو، لیکن جس جرم میں تم مجھے قید کرنا چاہتے ہو وہ میں نے نہیں کیا۔ اگر تم آنکھیں بند کر کے بیٹی پر الزام نہ لگاؤ اور قورنی سی تحقیق گوارا کرو تو تمہیں ضرور پتہ چل جائے گا کہ مار سیلہ میرے ساتھ فرار نہیں ہو رہی تھی اور نہ اس نے کبھی اس انداز میں سوچا تھا۔"

گویش غریبا۔ "مجھے کسی تحقیق کی ضرورت نہیں۔ میں تمہاری شیطانیات کے ہر رخ سے آگاہ ہوں۔"





یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ فیلانہ ہے۔ پچھلے تین برس میں وہ لڑکپن کی منزل پیچھے چھوڑ آئی تھی اور شباب اس پر ٹوٹ کر برس پڑا تھا۔

”فیلانہ، تم چھپ کیوں رہی ہو؟“ تابان نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

”چھپ تو نہیں رہی ہوں تمہارے نہ خانے کی بدبو مجھے پیچھے دھکیل رہی ہے؟“

”اتنی بدبو سے تو کیوں آتی ہو یہاں؟“

”تمہیں دیکھنے کے لئے..... تم نے کیا کیا تھا جس کی یہ سزا تمہیں ملی ہے۔“

”میرا جرم تمہارے ابا جان ہی بتا سکتے ہیں۔“

”بڑے بیوقوف ہو تم..... ابا جان بتا دیتے تو تم سے پوچھنے کیوں آتی۔“

”تمہارا کیا قیاس ہے میں نے کیا جرم کیا ہو گا؟“

”جہاں تک میرا اندازہ ہے تم پر یہی بڑی بہن کو بدنام کرنے کا الزام ہے۔ اسی بدنامی کے سبب انہوں نے موت کو گلے دگایا تھا۔“

تابان نے کہا۔ ”یہ تم سنی سنائی بات کہہ رہی ہو۔ تمہارا اپنا کیا خیال ہے کیا مجھ پر لگایا جانے والا یہ الزام درست ہے؟“

روزن سے باہر چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر ایک فیصلہ کن آواز سنائی دی۔  
”نہیں..... میں ایسا نہیں سمجھتی۔“

یہ مختصر جواب بے حد حوصلہ افزاء تھا۔ تابان نے پوچھا۔ ”پھر تم کیا سمجھتے ہو؟“

”میں سمجھتی ہوں تم بھلے آدمی ہو۔ تم پر ظلم ہو رہا ہے۔“

دفعاً فیلانہ بولتے بولتے رک گئی۔ اس کے ساتھ ہی بھاری قدموں کی جاپ سنائی دی ایک پیریدار کی آواز آئی۔

”چھوٹی ماکن! آقا ہمیں قتل کر دیں گے۔ آپ ادھر نہ آیا کریں۔“

ایک دوسرا پیریدار بولا۔ ”چھوٹی ماکن! میں افسوس سے کہتا ہوں کہ آپ پھر

آئیں تو ہمیں شکایت کرنا پڑے گی۔“

اس کے ساتھ ہی تمام آوازیں معدوم ہو گئیں۔

☆-----☆-----☆

تابان نے سمجھ لیا کہ اب فیلانہ ادھر مارخ نہیں کرے گی۔ مگر چند ہی روز بعد وہ پھر کسی طرح ترہ خانے کے روزن تک پہنچ گئی۔ یہ دو منزلہ ترہ خانہ تھلا بلائی منزل پر ہمہ وقت کوئی نہ کوئی پیریدار موجود رہتا تھا اس کی نگاہوں سے بچ کر ترہ خانے تک پہنچنا

سمجھا کہ شاید گویش کا کوئی پیریدار ہے۔ مگر پھر اسے یہ خیال بدلنا پڑا۔ یہ سایہ مرد کا نہیں عورت کا تھا۔ کبھی تابان کو پاگل کی مدھم چھٹکار سنائی دے جاتی اور کسی وقت فراک کا آواز ہوا ر تلین کو نہ اس کی نگاہ میں پھٹکتا۔ گویش کے گھر کا ماحول بے حد مذہبی تھا۔ جگہ جگہ دیوی دیوتاؤں کی تصاویر آویزاں تھیں اور صبح وشام عبادت کی گھنٹیاں گونجتی تھیں۔ گویش گھرانے کی عورتیں سخت پردے میں رہتی تھیں اور گویش کی موجودگی میں کسی کو یہ جرات نہ ہوتی تھی کہ اونچی آواز میں بات بھی کر سکتے۔ پھر یہ کون ایسی کینز یا خاتون خانہ تھی جو چھپ چھپ کر اسے دیکھتی تھی۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ روز آتی ہو لیکن ہفتے میں دو تین بار اس کی موجودگی کا احساس ضرور ہوتا تھا۔ خاص طور پر ہر ہفتے کی شام جب عمارت کے کسی ایوان میں زور شور سے گھنٹیاں بجتی تھیں اور آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ خاص عبادت کا اہتمام کیا گیا ہے۔ ایک ایسی ہی شام کو تابان نے اس پردہ نشین کو دیکھ لیا۔ روزن کے قریب جلنے والی مشعل میں اس کے نقوش نمایاں تھے وہ دیکھ کر مبسوت رہ گیا۔ وہ ایک نوعمر خوبصورت لڑکی تھی۔ بشکل پندرہ سولہ کا سن رہا ہو گا۔ تاہم وہ اپنی عمر سے بڑی نظر آتی تھی۔ وہ روزن پر جھکی ہوئی تابان کو دیکھ رہی تھی جو بنی تابان کی نگاہ اس سے ملی وہ تیزی سے پیچھے ہٹ گئی۔ ”سنو!“ تابان نے فریادی لہجے میں کہا لیکن وہ دوبارہ نمودار نہیں ہوئی۔ تابان کو اگلے ہفتے تک اس کی جھک کا انتظار کرنا پڑا۔ اس مرتبہ بھی وہ صورت دکھا کر اوجھل ہونے لگی تھی مگر تابان کی آواز پر رک گئی۔

”کیا بات ہے؟“ اس نے سامنے آئے بغیر پوچھا۔ آواز میں دلنشین لہجہ تھا۔

”نت..... تمہارا نام فیلانہ تو نہیں؟“

”ہاں!“ مختصر جواب ملا۔

تابان دنگ رہ گیا۔ فیلانہ، مارسلہ کی سب سے چھوٹی بہن تھی۔ تابان نے آخری مرتبہ اسے تین سال پہلے دیکھا تھا۔ اس وقت وہ ایک چھوٹی پٹی نظر آتی تھی۔ جو گھر کے خادین پر خواہ مخواہ چلتی تھی اور زر خرید غلاموں و لونڈیوں کو زچ کرنے میں مصروف رہتی تھی، گھو گھریالے بالوں سے فیلانہ کو بہت چڑ تھی۔ گھو گھریالے بال دیکھتے ہی وہ ان پر جھپکتی تھی۔ ایک مرتبہ ایک کینز کے خوبصورت گھو گھریالے بالوں سے زور آزمائی کرتے ہوئے ننھی فیلانہ کی کلائی اتر گئی تھی۔ اس ناکردہ گناہ کی پاداش میں گھر کی ماکن نے گھو گھریالے بالوں والے تمام غلاموں اور کینزوں کے سراستے سے منڈوا دیے تھے۔ تابان بھی ان میں شامل تھا..... آج وہی فیلانہ تابان کے قریب موجود تھی اور اسے



آسان کام نہیں تھا۔ تابان یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ وہ گھٹنے موڑ کر بڑے اطمینان سے روزن کے کنارے بیٹھ گئی ہے۔ اس نے پنڈلیوں تک اونچا فراک پہن رکھا تھا۔ فراک کے اوپر بغیر آستین کا ایک چست لباس تھا۔ گلے میں موتیوں کا ہار دمک رہا تھا اور سترے بال سینے سے نوزے کی صورت بندھے تھے۔ وہ خاصی بنی سنوری نظر آتی تھی، اس کے نقوش کی ملاحیت میں بڑی بہن کی جھلکیاں تھیں لیکن وہ مارسیلہ سے زیادہ تیز و طرار اور بے باک دکھائی دیتی تھی۔ وہ جس اطمینان سے یہاں آ بیٹھی تھی اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ پیریدار کسی وجہ سے آج یہاں موجود نہیں ہیں۔ وہ کچھ دیر گردن جھکا کر محویت سے تابان کی حالت دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں افسردگی اور ناہنیدگی تھی۔ آہستہ سے بولی۔

"مجھے افسوس ہے ابا جان کی وجہ سے تمہیں یہ ساری تکلیفیں سہنا پڑ رہی ہیں۔ کاش میرے بس میں ہو اور میں تمہیں یہاں سے نکال سکوں۔"

تابان نے گھبرا کر پوچھا۔ "پیریدار آج کہاں ہیں؟"

وہ بولی۔ "آج ان کی طرف سے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ شاید تم بے خبر ہو کہ آج پوسٹن کا تہوار ہے۔ زیادہ تر پیریدار رخصت پر ہیں۔ گھر میں بھی میری والدہ اور ایک کزن کے سوا کوئی موجود نہیں۔ سب لوگ ساحل پر کشتی رانی کے لئے گئے ہیں۔ میں..... تمہاری خاطر ہمانہ بنا کر یہاں رہ گئی ہوں۔"

"میری خاطر کیوں؟"

"بس یونہی۔" وہ آگے کو جھک کر بولی۔ اس کے جسمانی نشیب و فراز بے حد نمایاں تھے۔ "لیکن..... تم اس سے کوئی غلط مطلب نہ لینا..... میں اپنا اور تمہارا فرق اچھی طرح سمجھتی ہوں..... اور میرے دل میں کوئی ایسی بات بھی نہیں ہے۔ صرف ہمدردی کا جذبہ ہے جو مجھے تمہارے پاس لے آیا ہے۔"

تابان نے کہا۔ "اس ہمدردی کے لئے بہت شکریہ۔" اور خاموشی سے سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ روزن سے فیضان کچھ دیر گہری نظروں سے اسے دیکھتی رہی پھر ذرا شوخی سے بولی۔ "اداس ہو گئے ہو۔ یہ دیکھو میں تمہارے لئے کیا لائی ہوں۔"

تابان نے سر اٹھا کر دیکھا۔ فیضان کے ہاتھ میں ایک چالی نظر آ رہی تھی۔ یقیناً یہ اسی روزن کی تھی۔ تابان کے دیکھتے ہی دیکھتے فیضان نے چالی نفل میں گھمائی اور معمولی کوشش سے روزن کا آہنی جنگلہ اوپر اٹھا دیا۔ پچھلے تین ماہ میں پہلی دفعہ ایسا ہوا تھا کہ

صفائی کرنے والوں کے علاوہ کسی اور نے اس جنگلے کو ہٹایا تھا۔ اس کا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ "تو کیا یہ لڑکی اسے اس سنگلاخ قبر سے نکالنے آئی ہے؟" لیکن اگلے ہی لمحے یہ سوچ باؤسی کے اتحاد سمندر میں ڈوب گئی۔ اس کی گردن میں ایک ناقابل شکست طوق بھی تھا۔ بعید از قیاس تھا کہ فیضان کے پاس اس طوق سے چھکارہ پانے کی تدبیر ہوگی۔ روزن کا آہنی جنگلہ اوپر اٹھانے کے بعد فیضان نے رسی کی چھوٹی سی میڑھی اندر گرا دی۔ خاکروب وغیرہ اسی میڑھی سے نیچے اترتے تھے۔ فیضان میڑھی کے حلقوں میں پاؤں رکھتی اندر آگئی۔ اس کی حرکات میں جستی اور توانائی تھی۔ وہ بے حد دلیر بھی نظر آتی تھی۔ یوں بلا خوف اس تہہ خانے میں چلے آتا اس کی جرأت مندی کا کھلا ثبوت تھا۔ تابان اسے ایک تک دیکھتے جا رہا تھا۔ فیضان نے اپنے لباس کے اندر سے کانفد میں لپٹی ہوئی کوئی چیز نکالی۔ یہ مقدس شراب کی چھوٹی سی بلوری بوتل تھی۔ اس کے علاوہ خیر کئے ہوئے میدے کی میٹھی روٹی تھی۔ اس روٹی میں کشمش، بادام اور مرہ جلت کی آمیزش کی گئی تھی۔ روٹی کی خوشبو سے تہہ خانہ مک اٹھ۔ فیضان ادا سے بولی۔ "یہ پوسٹن کے تہوار کا خاص پکوان ہے تمہارے لئے لائی ہوں۔"

تابان اس قید میں ایسی تواضع کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ یہاں اسے جانوروں سے بدتر خوراک دی جاتی تھی۔ وہ نذیروں کی طرح روٹی کھانے میں مصروف ہو گیا۔ چند لمحے لینے کے بعد اس کے ذہن میں خدشات جاگ اٹھے۔ نہ جانے کیوں اس کے ذہن میں شد طے دودھ کا وہ گلاس آیا تھا جسے پینے کے بعد وہ موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہوا تھا۔ اس کرناک رات کا تصور ابھی تک اس کے لئے سوہان روح تھا۔ کہیں اس خوش ذائقہ پکوان میں بھی تو ویسی ہی جان لیوا اذیت نہیں گوندھ دی گئی تھی؟ اس نے ہاتھ روک لیا اور کھوٹی نگاہوں سے فیضان کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ باطمینان اس سے چند باتش کی دوری پر بیٹھی تھی۔ روٹی کی خوشبو میں اس کے جوان جسم کی ہنک یوں کھل مل گئی تھی کہ ایک تیسری اشتہا انگیز خوشبو تہہ خانے میں پھیل گئی تھی۔ تابان نے مضطرب انداز میں پوچھا۔

"کس لئے آئی ہو یہاں؟"

"بتاؤ تو ہے تمہاری خاطر۔"

"میری خاطر تم نے اتنا بڑا خطرہ کیوں مول لے لیا۔ اگر کوئی اس طرف نکل آیا تو کیا ہو گا؟"

"مجھے معلوم ہے کوئی نہیں آئے گا اور ابھی گیا تو میں کسی سے ڈرنے والی نہیں

ہوں۔

تہا بن اس کا خود سر لہجہ سن کر حیران رہ گیا۔ اسے احساس ہوا کہ فیلانہ کا یہ باغیانہ انداز اس بے پناہ گھمن اور ناروا جبر کا نتیجہ ہے جس کا ذمہ دار خود گوفیش ہے۔ اپنے اہل و عیال سمیت گھر کے ہر فرد پر اس کا بے پناہ دبدبہ تھا۔ کوئی اس کی مٹھائے کے بغیر پلک نہیں جھپک سکتا تھا۔ خاص طور پر اپنی پانچویں بیٹیوں کے لئے تو وہ بے حد سخت گیر تھا۔ اس سخت گیری کے کئی مظاہرے تہا بن نے دو برس پہلے دیکھے تھے۔ تہا بن کو یقین تھا کہ بڑی بیٹی مارسیلہ کی موت کا سبب بھی گوفیش ہی تھا۔ اگر گوفیش نے اسے اپنے ہاتھ سے قتل نہیں کیا تھا تو اپنے بے پناہ دبدبے کی جھینٹ ضرور چڑھایا تھا۔ گرفتاری کے بعد مارسیلہ نے اس خوف سے موت کو گلے لگالیا تھا کہ اسے جھکے سر کے ساتھ باپ کا سامنا کرنا پڑے گا۔

تہا بن نے بغور فیلانہ کا سراپا دیکھا۔ روزن سے آنے والی مدھم روشنی میں وہ اتھنتر کے قدیم معبد میں بھی ہوئی کوئی خوش رنگ مورتی دکھائی دیتی تھی اس کے چہرے اور جسم کا ایک رخ روشن تھا۔ جیسے کسی رومانی مصور نے دلکش نسوانی پیکر کو دھوپ سائے میں قید کر دیا ہو۔ تہا بن نے اس سے پوچھا۔ ”تمہ خانے کی چابی تمہیں کہاں سے ملی؟“

”داروغہ صفائی کی جیب سے۔ وہ تھوڑی خوشی میں ایک پوری صراحتی شراب کی چڑھانے کے بعد مدہوش پڑا ہے۔“

”تمہیں اس تمہ خانے میں اترتے ہوئے ڈر نہیں لگا؟“

”مجھے چھوٹی موٹی باتوں سے خوف نہیں آتا۔“

تہا بن نے کہا۔ ”میرے اس قدر قریب ہونا تمہارے لئے چھوٹی موٹی بات ہے؟“

”کیا مطلب؟“ اس نے اطمینان سے پوچھا۔

وہ بولا۔ ”تم مجھ سے محفوظ فاصلے پر نہیں ہو۔ میری زنجیر اتنی لمبی ضرور ہے کہ میں تمہیں دبوچ سکتا ہوں۔“ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور ایک قدم چل کر فیلانہ کے قریب پہنچ گیا۔ تہا بن کی گذارش پر پچھلے ماہ گوفیش نے اس کی زنجیر میں دو ہاتھ کا اضافہ کر دیا تھا۔ اب وہ اٹھ کر کھڑا ہو سکتا تھا اور ایک مختصر دائرے میں گھوم بھی سکتا تھا۔

تہا بن کی قربت کا فیلانہ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ اطمینان سے بولی۔ ”تم مجھے کیوں نقصان پہنچاؤ گے۔ میں تمہاری دشمن نہیں ہوں خیر خواہ ہوں۔ تمہیں تھوڑی مسرت میں شریک کرنے کے لئے یہاں آئی ہوں۔“

تہا بن نے مایوسی سے کہا۔ ”ایسی قبر میں کوئی کسی خوشی میں شریک کیسے ہو سکتا

ہے۔

”تو پھر کیا کروں میں تمہارے لئے؟“ وہ سادگی سے بولی۔

تہا بن نے گہری سانس لی۔ ”تم نے کہا تھا میں کہ مجھے یہاں سے آزاد کرانا چاہیے

ہو؟“

”ہاں میں نے کہا تھا لیکن..... لیکن یہ ناممکن ہے۔“

”کوئی کام ناممکن نہیں ہوتا فیلانہ..... اگر تم میری مدد کرو تو میں بھی تمہاری

طرح کھلا آسمان دیکھ سکتا ہوں اور آزاد فضا میں سانس لے سکتا ہوں۔“ فیلانہ پوری طرح

متوجہ ہو کر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ تہا بن نے کہا۔

”تمہیں معلوم ہو گا ملکہ زونیا جزیرے سے باہر ہے۔ قائم مقام فرمانروا کی ذمہ

داریاں سپہ سالار انجام دے رہا ہے۔ جس وقت تمہارے والد نے مجھے گرفتار کیا میں سپہ

سالار کا مہمان خاص تھا۔ سپہ سالار میری اچانک گمشدگی سے پریشان ہوں گے۔ اگر انہیں

میرے بارے میں اطلاع مل جائے تو وہ تمہارے والد کو معقول معاوضہ دے کر مجھے آزاد

کرا سکتے ہیں۔“

فیلانہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ”تو تم..... شہابی مہمان تھے.....

تم شہابی محل تک کیسے پہنچ گئے؟“

ایکایک تہا بن کو احساس ہوا کہ وہ ایک سنگین غلطی کر چکا ہے۔ فیلانہ کا رویہ اس

لئے ہمدردانہ تھا کہ وہ اسے ایک بے کس دلاچار غلام سمجھ رہی تھی۔ یہ جان کر کہ اس کا

تعلق جزیرے کے فرمانروا سے ہے وہ ایک دم اپنے خول میں سمٹ گئی تھی۔ تیرکمان سے

نکل چکا تھا۔ تہا بن نے بات بنانے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ فیلانہ ایک متعجب

لڑکی تھی۔ اس کی سوچ بہت دور چلی گئی تھی۔ اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہ تہا بن

کی رہائی کی کوشش کرے یا اس کا کوئی پیغام تمہ خانے سے باہر پہنچائے۔ اگر اس پیغام پر

شہابی ہرکارے یہاں پہنچ جاتے اور وہ اثر و رسوخ کے ذریعے یا معاوضہ دے کر تہا بن کو

چھڑانے کی کوشش کرتے تو صورت حال سنگین ہو سکتی تھی۔ عین ممکن تھا کہ فیلانہ کا باپ

تہا بن کو چھوڑنے سے انکار کر دیتا۔ تہا بن اس کا غلام تھا اور جزیرے کے قانون کی زد سے

وہ حق رکھتا تھا کہ زر خرید غلام یا لونڈی کو فروخت کرنے سے انکار کر دے چاہے خریدار

بادشاہ ہی کیوں نہ ہو۔ ایسی صورت میں گوفیش اور اس کے اہل خانہ پر مصیبت آسکتی

تھی۔ فیلانہ نے تہا بن سے دور ہٹتے ہوئے کہا۔



”مجھے افسوس ہے تبو“ میں اپنے اہل خانہ کے لئے کوئی مصیبت کھڑی کرنا نہیں چاہتی۔ بلکہ اب تو میں یہ دعا بھی نہیں کر سکتی کہ تم آزاد ہو جاؤ۔ کیا معلوم تمہاری آزادی ہمارے گھر کے لئے کتنی بڑی تباہی کا پیش خیمہ ہو۔“

تباہان نے غلوص دل سے کہہ۔ ”میں فیانہ“ ایسا نہیں ہو گا۔ مجھے سردار گویش کی ذہنی حالت کا اندازہ ہے مارسلہ کے صدمے نے انہیں مجھ سے متفر کر رکھا ہے۔ کوئی باپ بھی ہوتا ان حالات میں ایسا ہی سوچتا۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں مجھے رہائی نصیب ہو گئی تو تمہارے گھر آنے پر آج تک نہ آئے دوں گا۔“

فیانہ نے ان فقرات سے کوئی اثر قبول نہیں کیا۔ اب وہ جلد از جلد یہاں سے چلی جانا چاہتی تھی۔ دفعتاً تہ خانے سے باہر کوئی دروازہ دھماکے سے کھلا۔ فیانہ ٹھٹک کر رہ گئی۔ تباہان نے دیکھا ایک ہی لمحے میں اس کا رنگ اڑ گیا ہے وہ سر اٹھائے روزن سے باہر دیکھ رہی تھی۔ ہماری قدموں کی چاپ سنائی دی۔ یوں لگا جیسے کوئی لڑکھڑاہوا روزن کی جانب آ رہا ہے۔ ممکن تھا کہ داروغہ صفائی ہی ہو۔ چند لمحے بعد ایک کشت آواز سنائی دی۔ اس آواز نے تباہان اور فیانہ کو سمجھا دیا کہ آنے والا داروغہ ہی ہے۔ فیانہ گھبراہٹ میں اٹھتے قدموں چلتی تباہان کے بالکل پاس پہنچ چکی تھی۔ مجسم گداز خوشبو تباہان نے اس کے نوخیز بدن میں گوندتی برقی کو محسوس کیا اور ان محدود ترین لمحات میں بھی متوجہ ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ داروغہ تہ خانے کی پھٹ پر چکرا رہا تھا۔ ان کے بچنے کی واحد امید یہی تھی کہ داروغہ کی نگاہ کھلے ہوئے روزن پر نہ پڑتی لیکن ایسا ہونا قرن قیاس نہیں تھا۔ داروغہ ”ہائش“ ہائی خاکروب کو آوازیں دیتا تہ خانے کے روزن تک پہنچا اس نے جبکہ کھلا ہوا دیکھا اور اندر بھاگنے لگا۔ نیم تیرگی میں اس واضح طور پر دکھائی نہیں دیا۔ ویسے بھی وہ مقدس شراب کے نشے میں تھا۔ اندر بھاگنے کے بعد اس نے ”ہائش“ کو چند غلیظ گایاں دیں اور اسے ڈانٹ پلائی کہ وہ ابھی تک صفائی ختم نہیں کر سکا۔ داروغہ کی باتیں سن کر فیانہ اور تباہان کی جان میں جان آئی۔ داروغہ نے یہی گمان کیا تھا کہ اس کا ماتحت صفائی کے لئے نیچے اترتا ہوا ہے۔ وہ ڈنگا ہوا واپس چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد تباہان اور فیانہ نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ فیانہ سہتا کر رہ گئی۔ بے خبری میں وہ تباہان کے بے حد قریب آ چکی تھی۔ اس نے جلدی سے خود کو علیحدہ کیا اور ایک طرف ہٹنا چاہا مگر کسی شے نے اسے روک لیا۔ ”اف!“ وہ سسکاری لے کر رہ گئی۔ اس کا ایک آویزہ تباہان کے بوسیدہ کرتے کے نشے میں الجھ گیا تھا۔ آویزہ الجھنے سے کان برقی طرح کچ رہا تھا۔

اس نے پریشان نگاہوں سے تباہان کی طرف دیکھا۔ تباہان کے ہونٹوں پر مدھم مسکراہٹ ابھری۔ اس نے تسے میں سے آویزہ نکالنا چاہا مگر یہ چیخ دار آویزہ اس برقی طرح الجھا تھا کہ نکلنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ فیانہ مسلسل سسکاریاں لے رہی تھی۔ اس کا نازک چہرہ تکلیف کے سبب لال بھوکا ہو رہا تھا۔ وہ تباہان کے اس قدر نزدیک تھی کہ وہ اپنی قسمت پر ناز کر سکتا تھا اور اگر ایسا واقعہ کچھ عرصہ پہلے ہوا ہوتا تو یقیناً تباہان ناز کرتا بھی لیکن اب تو اس کا دل دماغ آٹھکھیں ’احساسات‘ سب کسی اور کی امانت ہو چکے تھے۔ حسن کی رعنائی اور اداؤں کی دلکشی اب بھی اس پر اثر تو کرتی تھی لیکن اب اس کیفیت میں وہ پہلے ہی شدت نہیں رہی تھی۔ نیک نیچی سے کوشش کرنے کے باوجود تباہان یہ آویزہ اپنے گریبان کے نشے سے جدا نہیں کر پایا۔ فیانہ کا گداز جسم بار بار تباہان سے چھو رہا تھا اور اس کے رگ و پے میں برق جگا رہا تھا۔ دفعتاً تہ خانے کی پھٹ پر پھر آئیں سنائی دینے لگیں۔ لگتا تھا داروغہ ابھی گیا نہیں وہیں منڈا رہا ہے۔ یہ صورت حال تشویشناک تھی۔ کسی بھی لمحے وہ پھر تہ خانے کی جانب آ سکتا تھا۔ فیانہ کا اب یہاں سے فوراً نکلتا ضروری تھا۔ تباہان نے حاضر دماغی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فیانہ کا آویزہ کان کی جانب سے اتار لیا۔ اب وہ ایک تحفے کی طرح تباہان کے سینے پر سجا ہوا تھا۔ فیانہ نے غور سے تباہان کی طرف دیکھا جیسے سوچ رہی ہو کہ شکل سے تو سکہ بند غلام لگتا ہے لیکن سمجھ بوجھ غلاموں والی نہیں۔ آویزے کی مصیبت سے چھوٹی ہی فیانہ نے شراب کی منہمی بولش دوبارہ اپنے لباس میں رکھی اور سیرمی چڑھ کر احتیاط سے باہر نکل گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ روزن کا آہنی دروازہ بند کر رہی تھی۔

☆-----☆

فیانہ کا قرب تباہان کے دل و دماغ میں پھیل چکا تھا۔ اس کے نوخیز بدن کی ممک اس کی شیریں گلائی، اس کا بے باک انداز، وہ لمحے تباہان کے حواس میں جلد ہو گئے تھے جب فیانہ کا سر اس کے سینے پر تھا اور تباہان کے کھردرے ہاتھ اس کے نازک کان سے الجھ رہے تھے۔ وہ کان..... سرخ پڑتا ہوا نازک ریشمی کان اس کا لمس تباہان کے دل و دماغ پر حاوی ہو رہا تھا۔ وہ جھگڑا آویزہ اب تباہان کی تحویل میں تھا جس نے اس تاریک سنگلاخ تہ خانے میں تباہان کے لئے کچھ دل گداز لمحات کی داغ بیل ڈالی تھی۔ حسن و محبت کے معاملات تباہان کے لئے نئے نہیں تھے۔ وہ ایسے بہت سے مرتبے سر کر چکا تھا۔ وہ جانتا تھا فیانہ کے دل میں اس کے لئے نرم گوشہ پیدا ہو چکا ہے، وہ پھر اس تہ خانے کی

طرف آئے گی۔ وہ انتظار کرتا رہا یہ انتظار طویل ثابت ہوا لیکن رائیگاں نہیں گیا۔ ایک روز پھر فیانہ کارنگین سراپا روزن کے قرب و جوار میں نظر آیا۔ یہ وہی دن تھا جب گل میں ہفت روزہ عبادت ہوتی تھی۔ اس موقع پر فیانہ کے لئے یہاں آنا آسان ہو جاتا تھا۔ وہ روزن کے پاس بیٹھ گئی۔

تہاں نے کہا۔ ”فیانہ میں تم سے چند باتیں کہنا چاہتا ہوں۔ کیا کسی روز پھر.....“

”نہیں تہاں! فیانہ نے اس کی بات کاٹی۔ ”اب میرے لئے نیچے اترنا ممکن نہیں۔ تمہارا فٹا میں جانتی ہوں۔ میں وہ نہیں کر سکتی۔“

تہاں بولا۔ ”فیانہ میں زیوس دیوتا کی قسم کھاتا ہوں میری رہائی سے تمہارے اہل خانہ پر کوئی آج نہیں آئے گی۔“

وہ بے دلی سے بولی۔ ”مجھے معلوم ہے تم دیوتاؤں پر کتنا یقین رکھتے ہو۔ جس چیز پر یقین ہی نہ ہو اس کی قسم کھانے سے فائدہ؟“

تہاں کافی دیر فیانہ کو قائل کرنے کی سعی کرتا رہا آخر جھنجھایا گیا۔ ”اگر تم کچھ سنا نہیں چاہتی تو کیا لینے آئی ہو۔ جاؤ یہاں سے۔“ وہ کروٹ بدل اور آنکھیں بند کر کے دراز ہو گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے بغیر سر ہلائے کن اکھیں سے روزن کی طرف دیکھا۔ فیانہ ابھی تک موجود تھی۔ وہ گم سم بیٹھی تھی جیسے سمجھ نہ پا رہی ہو کہ گفتگو کیسے جاری رکھے۔ کچھ دیر بعد وہ بوجھل دل کے ساتھ اٹھ کر چلی گئی۔

اس تہ خانے میں تہاں کے تاریک اور خاموش شب و روز گزرتے رہے۔ باہر کی دنیا سے اس کا رابطہ منقطع تھا۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا، جزیرے کے حالات کیا ہیں۔ بحیرہ اربعین میں ایران و یونان کی آویزش کہاں تک پہنچی ہے۔ مقدونیہ میں حالات کیا ہیں۔ سکندر کب مشرقی زمینوں کا رخ کر رہا ہے..... اس کی گل کائنات تہ خانے کی چار دیواریں نہیں اور وہ روزن تھا جہاں سے جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنے کے لئے اسے خوراک فراہم کی جاتی تھی۔ درحقیقت وہ ایک ایسے چوہے دان میں آن پھنسا تھا جو ہر طرح اس کے شایان شان تھا۔ اپنی تمام تر صلاحیتوں کے باوجود تہاں اس پنجرے کو توڑنے میں ناکام تھا..... فیانہ گاہے گاہے روزن پر دکھائی دے جاتی تھی لیکن تہاں اسے دیکھتے ہی رخ پھیر لیتا تھا یا آنکھیں بند کر کے لیٹا رہتا تھا۔ وہ کسی وقت آواز بھی دیتی تو تہاں کان بند رکھتا تھا۔ کبھی کبھی تو اسے بچ فیانہ پر غصہ آ جاتا تھا۔ عجب مزاج کی لڑکی تھی۔ صاف

سیدھی بات تھی، اگر وہ اس کی مدد نہیں کر سکتی تھی اس کا دکھ نہیں بانٹ سکتی تھی تو پھر روزن میں ٹنگے رہنے سے کیا فائدہ تھا۔ وہ ایک ایسے شغل میں مصروف تھی جو بے کار ہونے کے باوجود خطرناک تھا۔ تہاں کی واضح بے رخی کے باوجود فیانہ کی لگاتار میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی وہ ہفتے عشرے میں ایک بار روزن پر ضرور دکھائی دیتی۔ کوئی کشش جیسے اسے خود بخود تہاں کی طرف کھینچ لاتی تھی۔ تہاں انجان نہیں تھا کہ اس جذبے کو نہ سمجھتا۔ فیانہ اس سے محبت کرنے لگی تھی۔ وہ گرفتار بلا تھی۔ شاید قدرت کی طرف سے گوبیش کو اس کی من مانیوں کی سزا ملی تھی۔ اس نے تہاں کو پابند سلاسل کر کے اپنی بے پناہ نفرت کا نشانہ بنایا تھا۔ وہ خود اس پر تھوکتا تھا اور دوسروں کو ایسا کرنے کا حکم دیتا تھا۔ وہ اسے زلات کے عمیق ترین گڑھوں میں گرانا چاہتا تھا۔ تہاں کی منت سہابت کے باوجود وہ اپنے ارادوں سے باز نہیں آیا تھا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ اس کے گھر میں ایک اور ماریسلہ پیدا ہو گئی تھی۔ ایک اور لڑکی نے تہاں کو اپنے دل میں جگہ دے دی تھی۔ اس نے حقارت سے ٹھکرائے اور دھکرائے ہوئے تہاں کو اس کی تمام تر بے چارگی اور بے قدری کے باوجود سر آنکھوں پر بٹھالیا تھا اور اس مرتبہ جس لڑکی نے ایسا کیا تھا وہ ماریسلہ سے کہیں زیادہ دلیر اور بے باک تھی۔ وہ سینے میں حوصلہ رکھتی تھی اور منہ میں زبان بھی۔

دو تین ماہ اسی طرح گزر گئے۔ پھر ایک تاریک رات جب تہاں گہری نیند سو رہا تھا۔ اسے اپنے بالکل قریب آہٹ سنائی دی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ روزن سے آنے والی مدھم روشنی میں اس نے دیکھا کہ رسی کی سیڑھی تہ خانے میں جھول رہی ہے اور کوئی اس کے سارے اتر کر تہ خانے میں آچکا ہے۔ تہاں نے غور سے دیکھا اور اس کا سینہ منہ زور دھڑکنوں سے گونج اٹھا۔ آنے والی فیانہ تھی۔ معلوم نہیں رات کے اس آخری پہر وہ کیونکر اس تہ خانے میں آسکی تھی..... تہاں کو جو پسلا احساس ہوا، وہ فتح مندی کا تھا۔ آخر وہ فیانہ کو اپنے پاس بلانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ اس کے سوال کا جواب بن کر اس کے سامنے کھڑی تھی۔ سراپا حسن و رعنائی۔

”تمہیں کسی نے دیکھا تو نہیں؟“ تہاں نے پوچھا۔

”تمہیں اس سے کیا مطلب۔ تم تو مجھے یہاں دیکھنا چاہتے تھے..... میں آگئی ہوں۔“

”کیا آج پھر کوئی تہوار ہے؟“



”نہیں!“ فیانہ نے مختصر جواب دیا۔

تہاں نے ہاتھ تھام کر اسے پاس بٹھالیا۔ وہ جانتا تھا وقت بہت قیمتی ہے۔ لہذا فوراً اصل موضوع پر آگیا۔ موضوع وہی تھا جو اس سے پہلے کی بار زیر بحث آچکا تھا۔ تہاں چاہتا تھا کہ فیانہ اس کا پیغام تمہ خاتے سے باہر سپرہ سالار کے محل تک پہنچا دے۔ فیانہ یہ مطالبہ سن کر رونے لگی۔ تاریکی میں اس کی سسکیاں گونجتی رہیں پھر اشکوں میں بیٹھتی ہوئی آواز ابھری۔ ”تم جانتے ہو میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ اس وجہ سے اپنی بات پر اصرار کر رہے ہو؟“

تہاں نے پوچھا۔ ”تو کیا ایسا ہونا ممکن نہیں؟“

”نہیں!“ فیانہ نے بلا توقف کہا۔ ”میں نے اباحیان کا عندیہ لیا ہے۔ اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ وہ کسی قیمت پر تمہیں رہا نہیں کریں گے۔ ایسے میں تمہارا پیغام سپرہ سالار تک پہنچانا ہم سب کے لئے کتنا خطرناک ہو گا۔ یہ شاید تم نہیں سمجھ سکتے۔“

تہاں نے کہا۔ ”فیانہ تم وقت سے پہلے آخری رائے کیسے قائم کر سکتی ہو۔ بجائے کہ تمہارے والد مجھے آزاد کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے لیکن جو بات آج ناممکن ہے کل ممکن ہو سکتی ہے وہ زمانہ شناس ہیں۔ مجھے یقین ہے شاہی حکم سے زود گردانی نہیں کریں گے اور یہ معاملہ خوش اسلوبی سے طے ہو جائے گا۔“

فیانہ بولی۔ ”وہ میرے والد ہیں۔ میں انہیں تم سے زیادہ جانتی ہوں۔ غیض و غضب کے فراوانی انہیں ایک بالکل بدلا ہوا شخص بنا دیتی ہے۔ ایک ایسا شخص جو غلاموں و کنیزوں کو ذہن پر لٹا کر ذبح کر سکتا ہے۔ بیسیوں کو بے دریغ پیت سکتا ہے اور اپنے باپ کے سر پر مکہ مار کر اسے ہلاک کر سکتا ہے۔ ایسے شخص سے یہ بھی توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ شاہی فرمان ماننے سے انکار کر دے اور تمہارے بدلے بڑی سے بڑی رقم کی پیشکش ٹھکرا دے۔ میں نہیں چاہتی کہ میرے باپ کی ہٹ دھرمی کے سبب میرے پورے گھرانے پر قیامت ٹوٹے۔ میری بوڑھی ماں کو سر بازار گھیننا جائے یا میرے بہن بھائیوں کو شاہی عقوبت خانوں کی دیواریں چات جائیں۔ میں تمہاری مدد نہیں کر سکتی تاہم۔ صرف تمہارے لئے نیک خواہشات رکھ سکتی ہوں۔ یا یہ دعا کر سکتی ہوں کہ دیوتا تمہیں اس ذلت سے رہائی نصیب کریں۔“

تہاں نے نتیجی کنبے میں کہا۔ ”فیانہ! میری بات تو سنو ایک دفعہ سمجھنے کی کوشش کرو۔“ لیکن وہ نہ کی نہیں۔ تہاں نے اسے روکنا چاہا مگر اس کے گلے کا طوق بھینچنا انہما۔

اس کی زنجیر کی لمبائی اتنی نہیں تھی کہ وہ فیانہ کو روک سکتا۔ بے بسی کے احساس نے اسے پکنا پور کر دیا۔

فیانہ چلی گئی اور پھر دوبارہ تمہ خاتے میں نہیں اتری۔ نہ ہی پھر کبھی روزن میں دکھائی دی۔ تہاں اس کی طرف سے قطعی مایوس ہو گیا۔ جب وہ فیانہ سے مایوس ہو گیا تو اس کے ذہن نے فرار کے دوسرے طریقوں پر غور شروع کر دیا۔ تہاں کا ایمان تھا کہ موت سے پہلے انسان آزاد ہے اور قبر کے سوا کوئی ایسا قید خانہ نہیں جہاں سے قیدی فرار نہ ہو سکے۔ وہ شب و روز ایسی تدبیریں سوچنے میں مصروف ہو گیا جو اسے تمہ خاتے کی منجوس تیرگی سے نجات دلا سکیں۔ سردار شتال کو آزاد اور تہاں کو قید ہوئے اب قریباً دس ماہ ہو چکے تھے۔ تمہ خاتے کی شہم گرم فضا نے اندازہ ہوتا تھا کہ اس قفس سے باہر ایک بار پھر بہار ڈیرے ڈال رہی ہے۔ درختوں پر کونپلیں پھوٹ رہی ہیں۔ پہاڑی دھلوانوں پر سبزہ اُگ رہا ہے اور آسمان گہرا نیلا ہو چکا ہے۔ ایک روز تہاں سپرہ سالار کی آوازیں سن کر چونک اٹھا۔ وہ بڑی گھبراہٹ میں بول رہے تھے اور ان کی گفتگو میں بار بار مقدونیہ اور سکندر کا ذکر آ رہا تھا۔ تہاں ہمہ تن متوجہ ہو کر ان کی آوازیں سننے لگا۔ یکایک اس پر ایک حیرت انگیز انکشاف ہوا۔ اسے لگا کہ اس کا دل پسلیاں توڑ کر سینے سے باہر نکل آئے گا۔ سپرہ سالار ڈری ڈری آوازوں میں اس عظیم الشان لشکر کا ذکر کر رہے تھے جو سکندر کی قیادت میں مقدونیہ سے نکلا تھا اور قرب و جوار کی انسانی آبادیوں پر اپنی دھاک بٹھاتا نرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

تہاں کا دل چاہا وہ خوشی سے چلائے لگے۔ اچھے کودے اور ناچے۔ آخر وہ صبح طلوع ہو گئی تھی جس کا اسے انتظار تھا۔ آخر وہ قدم اٹھ گئے تھے جن کی چاپ کے لئے مدتوں سے اس کے کان ترس رہے تھے۔ آخر کار اس تاریخی مم کا آغاز ہو گیا تھا جس کی منصوبہ بندی عرصہ دراز سے کی جا رہی تھی۔ سالار اعظم اپنے محبوب گھوڑے یوزی فاس پر سوار نکل کھڑا ہوا تھا اور مستقبل کی منتوج زمینوں کی جانب اس کا سفر شروع ہو چکا تھا۔ اس شام تہاں نے محسوس کیا کہ گویش اور اس کے لیلی خانہ سراہیگی کے عالم میں یہ مکان چھوڑ رہے ہیں۔ تمہ خاتے سے دور مختلف کمروں اور دالانوں میں اسے سامان گھیننے جانے بھاگنے دوڑنے اور ایک دوسرے کو پکارنے کی آوازیں آئیں۔ اس کے بعد اچانک خاموشی چھا گئی۔ گہری اور مکمل خاموشی۔ تہاں سکوت کے سمندر میں ایک تنہا جزیرے کی مانند تھا۔ آج وہ مشعل بھی تاریک تھی جس کی مدد روشنی تہاں

کے تہ خانے میں بھانگا کرتی تھی۔ رات ذرا گہری ہوئی تو تارکی کے سبب عمارت کے حشرات الارض زور و شور سے پکارنے لگے۔ مگر یہ ایسا شور تھا جو خاموشی کو مزید گہرا کر رہا تھا۔ تہاں کو اندازہ ہوا کہ وہ اس وسیع و عریض عمارت میں بکسر تھا رہ گیا ہے۔ دو منبر تہ خانے کی زیریں منزل میں وہ قطعی بے بس اور لاچار تھا اس کی زندگی کا دار و مدار اب اس بات پر تھا کہ کوئی اس عمارت میں داخل ہو اور اسے تہ خانے ڈھونڈ نکالے۔ روشن امید تھی کہ کوئی یہاں آئے گا۔ کیوں نہ ہو کہ خوفزدہ ہو کر بھانگا ہی اس بات کی دلیل تھا کہ کوئی یہاں پہنچے گا۔ وہ کون ہوگا؟ یقیناً مقدونی فوج کے سپاہی ہوں گے۔ وہ عمارت میں گھسیں گے اور تہاں کی چیخ و پکار سننے کے بعد اسے نکال لیں گے لیکن..... لیکن اگر ایسا نہ ہوتا تو؟ اس سوال کے جواب میں ایک اندوہ ناک تاریکی منہ پھاڑے کھڑی تھی۔ اگر کسی وجہ سے ایسا نہ ہو سکا۔ اس عمارت میں کوئی داخل نہ ہوا یا زیریں تہ خانے تک نہ پہنچ سکا تو کیا ہوگا۔ تہاں ایزیاں رگڑ رگڑ کر مرجائے گا۔ وہ شخص جس نے مقدونی فوج کی پیش قدمی کا رستہ ہموار کیا، اپنی زندگی خطرے میں ڈال کر وہ معلومات فراہم کیں جو اس عظیم سفر کی بنیاد بنیں، ایک بدو دار تہ خانے میں بھوکا پیاسا دم توڑ دے گا اور باہر کھلے نیلگوں آسمان تلے پھولوں اور باغوں کے جزیرے میں مقدونی سپاہی جشن طرب مناتے رہیں گے۔

رات ہوئی اور پھر دن ہو گیا۔ اس کے بعد دوسری اور پھر تیسری رات سر پر آن کھڑی ہوئی۔ بھوک پیاس اور جس نے تہاں کو ہر سمت سے گھیر رکھا تھا۔ گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ اس کی زبان سوکھتی جا رہی تھی اور پیٹ میں بھر پوری آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ تہاں نے وہ رات جیسے تیسے کافی اور صبح ہوتے ہی کسی آنے والے کی چاپ پر کان لگا دیے۔ مگر وہ چاپ کہیں نہیں تھی جو اس کے شک لبوں کو تر کرتی۔ اس کی گردن سے یہ منحوس طوق اتارتی اور اسے کھلی فضاؤں کی نوید سناتی۔ جوں جوں دن چڑھ رہا تھا گرمی کی شدت میں اضافہ ہو رہا تھا اور یہ بے ہوا تہ خانہ جس سے معمور ہوتا جا رہا تھا۔ تہاں فرش پر لیٹ گیا اور اپنی ابھتی سانسوں کو ہموار رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ رہ کر سردار گویش کا سفاک چہرہ اس کی نگاہوں میں گھوم جاتا تھا۔ وہ اسے سبک سبک کر مرنے کے لئے چھوڑ گیا تھا اور تو اور فیلائے کے دل میں بھی اس کے لئے رحم نہ جاگتا تھا۔ اس کی محبت کا دم بھرنے والی اس سفاکی کے خلاف آواز بلند کئے بغیر یہاں سے روانہ ہو گئی تھی۔

تہاں کو زندہ درگور ہوئے وہ پانچواں روز تھا۔ زندگی اس کے سارے جسم سے کھچ کر اس کی سماعت میں جمع ہو گئی تھی۔ وہ کوئی آہٹ سننے کی امید پر سانس لے رہا تھا۔ اور وہ سانس بھی کیا تھی ایک دھکتا خنجر تھا جو سینے کے آر پار چل رہا تھا۔ اس بادیہ خنجر کے لگاتار وار سہہ کر بھی تہاں اگر زندہ تھا تو اس کی سخت جالی ہی تھی۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید ایک شب پہلے ہی پانی کے لئے تڑپ کر مر گیا ہوتا۔ تہاں کو موت کا غم نہیں تھا۔ موت تو بچپن سے اس کا کھلوٹا تھی۔ دکھ صرف دو باتوں کا تھا۔ ایک تو وہ بے بس قیدی کی موت مر رہا تھا اور دوسرے وہ اپنی زندگی کا سب سے بڑا قرض چکائے بغیر دم توڑ رہا تھا۔ یہ ان فریادی آنکھوں کا قرض تھا جنہوں نے وحشی سپاہیوں کے زرنے میں گھر کر تہاں کی طرف دیکھا تھا اسے مدد کے لئے پکارا تھا اور وہ مدد کرنے میں ناکام رہا تھا۔ احتجاج کے نواح میں شہزادی مارشا کی گرفتاری کا وہ منظر تہاں کو بھلائے نہیں بھولتا تھا۔ وہ ہمہ وقت خود کو ملامت کرتا کہ شہزادی کا محافظ ہونے کے باوجود وہ کیوں اسے نہ بچا سکا اور سوچتا رہتا تھا کہ اس "ناکامی" کا مداوا کیا ہے.....

تہاں اپنے خیالوں میں گم بے جس و حرکت فرش پر پڑا تھا۔ اس کی خشک ویران آنکھیں تہ خانے کے روزن پر تھیں۔ یہاں سے آنے والی مدھم روشنی سے اندازہ ہوتا تھا کہ شام ہونے والی ہے۔ یہ شام اس کی زندگی کی بھی شام تھی۔ وہ جان بلب تھا..... دفعتاً روزن کے بالکل پاس ایک آہٹ سنائی دی۔ پہلے تو تہاں نے اسے دم خیل کیا مگر جب بیرونی دروازے کا آہنی کھٹکا کھٹکا تو یکایک اس کی قوطیت کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ اس نے اپنی رہی سہی قوت سمیٹی اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی تقدیر نے ان گت مرتبہ موت کو مات دی تھی شاید ایک بار پھر ایسا ہو رہا تھا۔ اس کے پیڑی تے ہونٹوں پر ایک مدھم مسکراہٹ کھل گئی۔ کچھ لوگ بیرونی دروازہ کھولنے کے بعد بالائی تہ خانے کی پڑھیاں اتر رہے تھے۔ وہ تعداد میں پانچ یا چھ تھے۔ ان کے ہاتھوں میں مشعلیں تھیں۔ نیچے اتر کر انہوں نے تہ خانے میں بھانگا۔

"یہاں تو کوئی نہیں ہے۔" ایک آواز آئی۔

"ابھی آہٹ تو سنائی دی تھی۔" دوسری آواز نے کہا۔

تہاں نے پکار کر کہا۔ "میں یہاں ہوں۔"

اس کے خشک حلق سے نکلنے والی آواز عجیب و غریب تھی۔ بھاگتے قدم زیریں تہ خانے کے روزن تک پہنچے۔ تہاں نے دیکھا مشعلوں کی روشنی میں چاق و چوبند مقدونی





سلار کے عقب میں پڑی۔ یہاں ایک بلند دبلا محرابی دروازہ تھا دروازے پر خوبصورت ریشمی پردہ جھول رہا تھا۔ ہوا کے زور سے پردے نے ہلکورا لیا تو "پس پردہ" منظر عیاں ہو گیا۔ ایک لڑکی قیدیوں کے لباس میں معمولی کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس کے دائیں بائیں دو خاتون محافظ موجود تھیں۔ تابان لڑکی کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ فیلات تھی۔ تابان نے انگلی سے محرابی دروازے کی جانب اشارہ کیا اور پوچھا۔

"محترم سردار! یہ لڑکی کون ہے؟"

"قیدی ہے۔" سلار نے جواب دیا۔ "تم اسے جانتے ہو؟"

تابان کی سمجھ میں فوری طور پر نہیں آیا کہ اس سوال کا جواب ہاں میں دے یا ناں میں۔ آخر اس نے سچ بولنا ہی بہتر سمجھا۔ بولا۔ "سلار! میں انہی لوگوں کی قید میں تو رہا ہوں۔ اس لڑکی کا باپ جزیرے کا ایک خوشحال زمیندار اور بحری مرعابی کا معروف شکاری ہے۔ لیکن..... یہ لڑکی آپ کی قید میں کیسے آئی.....؟"

سلار نے اپنی چمکیلی چندیا سلاتے ہوئے کہا۔ "جزیرے کی بیشتر آبادی نے ہماری آمد کو خوشدلی سے قبول کیا ہے لیکن ایک ایران نواز طبقہ ایسا بھی تھا جو ہماری آمد کے خلاف تھا اور لوگوں کے مخالفانہ جذبات ابھار رہا تھا۔ بالآخر جب ہماری سپاہ جزیرے پر اتریں تو یہ لوگ بھاگ کھڑے ہوئے۔ ان میں سے کچھ کو گرفتار کر لیا گیا۔ یہ لڑکی بھی گرفتار ہونے والوں میں شامل تھی۔"

تابان نے پوچھا۔ "اور اس کے لواحقین؟"

سلار بولا۔ "ان میں سے کسی کا کھوج نہیں ملا۔"

ہوا نے بلند دبلا ریشمی پردے کو پھر ہلکورا دیا۔ تابان کی نگاہ فیلات پر پڑی اس کے جڑے بچھ گئے۔ اسے فیلات کی گرفتاری پر مطلق افسوس نہیں تھا۔ فیلات اور اس کا گھرانہ اسی لائق تھا..... لیکن فیلات یہاں کیا کر رہی تھی؟ تابان کے ذہن میں ابھرنے والے اس سوال کا جواب سلار نے دیا وہ بولا۔

"یہ لڑکی نہ ہوتی تو تم اس زمین دوڑ کو ٹھہری میں سسک سسک کر مر گئے ہوتے۔"

"تک..... کیا مطلب؟" تابان کے ذہن کو زبردست جھٹکا لگا۔

سلار بولا۔ "اسی لڑکی نے ہمیں اس تہ خانے کا سراغ دیا ہے۔ یہ دوسرے جگہ دوں کے ساتھ "ہاون" کے قید خانے میں تھی کل اس نے سپریدار عورتوں سے کہہ کر داروغہ سے ملاقات کی اور اسے بتایا کہ مقدونی فوج کا ایک اہم سلار ایک زمین دوڑ

کو ٹھہری میں بند ہے اور اگر اسے بچایا نہ گیا تو وہ ہمارے ہمارے گلہ داروغہ سے اس بات کا یقین نہیں کیا۔ لڑکی رو رو کر فریاد کرنے لگی اسی دوران میں بھی کسی کام سے وہاں پہنچ گیا۔ مجھے لڑکی کے بیان میں سچائی کی جھلک نظر آئی۔ میں نے اس کی نشاندہی پر اپنے ماتحتوں کو بھیجا اور وہ تھیں یہاں لے آئے۔"

تابان سکتے کی کیفیت میں بیٹھا رہ گیا۔ ان کا مطلب تھا مقدونی سپاہی اس تہ خانے میں اتفاقاً نہیں پہنچے تھے۔ انہیں خاص طور پر بھیجا گیا تھا اور بھیجنے والی فیلات ہی تھی۔ سلار نے خود کو ذہن ثابت کرنے کے لئے بڑے اثر سے تابان کی آنکھوں میں جھانکا اور بولا۔ "میں تمہیں دیکھتی ہی جان گیا تھا کہ تم کوئی اعلیٰ مہدیہار نہیں عام سپاہی ہو اور فیلات کے باپ پر رعب گانٹنے کے لئے تم نے خود کو فانی پہ سلار بنایا ہو گا۔ بہر حال وہ بے چاری اب بھی یہی سمجھتی ہے کہ تم سکندر کے کوئی ذمہ آدمی ہو۔"

تابان نے سلار کے احمقانہ تبصرے کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے دل و دماغ ریشمی پردے میں الجھے ہوئے تھے۔ وہ بولا۔ "محترم سلار! میں اس لڑکی سے ملنا چاہتا ہوں۔"

سلار نے ایک خوبصورت خادمہ کے ہاتھ سے شراب کا جام لیتے ہوئے قہقہہ لگایا۔ "تم ملنے کی بات کر رہے ہو میں اسے ویسے ہی تمہارے سپرد کر سکتا ہوں۔ اس کی حیثیت یہاں ایک معمولی قیدی کے سوا کچھ نہیں۔ کا خیال ہے تمہارا؟" تابان اس پیشکش پر خاموش رہا۔ سلار نے اس خاموشی کو رضامندی جان کر تابان کا کندھا تھپتھپایا اور معنی خیز لہجے میں بولا۔ "نہیک ہے رکھ لو اسے لیکن کسی کو خبر نہیں ہونی چاہئے سمجھے میری بات؟" پھر تابان کے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ ایک کتیز کو آواز دیں دینے لگا۔ چھوٹے قد کی ایک اویسز عمر کنیز تیزی سے آئی اور متوذب کھڑی ہوئی۔ سلار اسے فیلات کے متعلق ہدایات دیتے لگا۔

☆-----☆-----☆

جزیرے کی بحری پڑی آبادی سے تھوڑا ماہ گزرا کہ یہ ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ اس میں بیشتر ضروریات زندگی موجود تھیں۔ خدمت کے لئے ایک اویسز عمر نوکر تھا۔ سواری کے لئے ایک صحت مند گھوڑا تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ دل بھنگی کے لئے ایک سراپا سن موجود تھی۔ اپنی دانست میں سلار نے ان تمام صعوبتوں کا مداوا کر دیا تھا جو تابان نے چھ ماہ کی قید میں جھیلی تھیں۔ شام ہو چکی تھی مکان کے بالا خانے میں تابان



فیضان کے ساتھ موجود تھا۔ طاقتوروں میں موی شمعیں روشن تھیں اور بحرابی دروازوں پر خوبصورت پردے تھے۔ درپچوں سے باہر کچھ فاصلے پر جزیرے کی اصل آبادی نظر آتی تھی۔ بے شمار گنبد، کلس، مینار اور پون پکیاں، جہاں تک نگاہ جاتی تھی روشنیوں شماری تھیں۔ انہی روشنیوں میں کہیں اس عمارت کی روشنی بھی تھی جس کے منوں تہ خانے میں تباہان کی ماہ تک پراہ تھا۔ اس نے درپچے سے نگاہ بنا کر فیضان کی طرف دیکھا۔ وہ قید خانے کا پاس اتار چکی تھی۔ اب اس کے بدن پر ایک بھلانا تاریخی لبادہ تھا۔ وہ سنگھار کئے ہوئے تھی تباہان کے ذہن میں اس عمار کی یاد تازہ ہو گئی جب وہ ایسے ہی بناؤ سنگھار کئے تہ خانے میں آئی تھی اور کافی دیر اس کے پاس رہی تھی لیکن اس ملاقات اور آج کی ملاقات میں بہت فرق تھا۔ آج وہ دونوں آزاد تھے۔ تباہان نے کہا۔

”میں تمہارا شکر یہ ادا کرنا چاہتا ہوں اگر تم بھی مجھے فراموش کر دیتیں تو شاید اس وقت تہ خانے میں میری لاش پڑی ہوتی۔“

فیضان نے کہا۔ ”میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔ احسان تو تم کر رہے ہو جو ایک باندی سے ایسی مہمانی کا برتاؤ کر رہے ہو۔ مجھے ہمیشہ افسوس رہے گا کہ میں اپنے گھر میں تمہاری کوئی مدد نہ کر سکی۔ کاش میں اس وقت تمہاری رہائی کی صورت پیدا کر سکتی۔“

تباہان نے کہا۔ ”میں تمہاری مجبوریاں سمجھتا ہوں فیضان۔ تم نے وی کیا جو ایک سمجھدار لڑکی کو کرنا چاہئے تھا۔ اپنے والد سے اختلاف رکھنے کے باوجود تم نے کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا جس سے تمہارے گھرانے پر زد پڑتی۔ میں سمجھتا ہوں غلطی میری ہی تھی جو اپنی امیری سے گھبرا کر تم پر ناروا دباؤ ڈالتا رہا۔ میرے خیال میں مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔“

فیضان حیرت آمیز نظروں سے تباہان کو دیکھ رہی تھی۔ شاید اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ شکل سے یکسر بدھو نظر آنے والا معمولی غلام اس وقت ایسی طاقتور گفتگو کیسے کرنے لگا ہے۔ تباہان نے فیضان سے پوچھا کہ وہ گرفتار کیسے ہوئی اور اس کے اہل خانہ کہاں ہیں۔ اس سوال نے فیضان کو ایک دم اداس کر دیا۔ تباہان نے محسوس کیا کہ وہ اس سوال کا جواب دینے سے کھڑا رہی ہے۔ تباہان کے دوبارہ پوچھنے پر اس نے صرف اتنا بتایا کہ مقدونی فوج کی آمد کا سن کر اس کے والد نے فوراً جزیرہ چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اسی کو پتے کے دو اور گھرانے بھی جزیرہ چھوڑ رہے تھے۔ سب نے مل کر ایک بڑی کشتی کا انتظام کیا۔ شام کے وقت سب بڑی افراقی میں ساحل کی طرف روانہ ہوئے اس

افراقی میں وہ ساحل پر اہل خانہ سے بچھڑ گئی اور پانیوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئی۔ تباہان کو فیضان کے بیان پر یقین نہیں آیا۔ ”یقیناً کچھ پھپھاری تھی۔ تباہان کے بے حد اصرار پر فیضان نے اگلے روز اصل واقعے کا ذکر کیا۔ اس نے جو کچھ بتایا اور تباہان نے کرید کرید کر جو کچھ معلوم کیا اس کا خلاصہ یوں تھا۔

”فیضان پچھڑی نہیں تھی جان بوجھ کر جزیرے پر رو گئی تھی اور جزیرے پر رہنے سے اس کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا کہ تباہان کو تہ خانے کی اندھنیا موت سے بچانا چاہتی تھی۔ ساحل پر جب سب لوگ ہجاز نمائشی میں سوار ہوئے تو بہت افراقی کا عالم تھا مقدونی فوج کسی بھی وقت کھاڑی پر پناہ چاہتی تھی۔ فیضان جان بوجھ کر پیچھے رہ گئی۔ گھر والوں نے فیضان کو اس وقت دیکھا جب کشتی بادبان کھول کر روانہ ہو چکی تھی۔ فیضان کو ساحل پر کھڑا دیکھ کر وہ سب چیخ دیکھ کرنے لگے۔ رسی کی میڑھی ابھی تک کشتی سے لٹک رہی تھیں۔ فیضان چاہتی تو وہ اب بھی کوشش کر کے سوار ہو سکتی تھی، لیکن وہ سوار ہونے کے لئے تھوڑا سی رسی تھی۔ وہ ساحل پر کھڑی اٹھارہ نظروں سے اہل خانہ کو دیکھتی رہی۔ کشتی رانوں کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ پھر کشتی کو ساحل پر لاسکتے۔ تیز ہوا میں وہ کنارے سے دور ہوتی چلی گئی۔ اہل خانہ فیضان پر چیختے پاتے رہے۔ اسے کوسے رہے۔ سردار گویش نے غضبناک ہو کر فیضان پر چند تیر بھی چائے لیکن وہ رائیگس گئے۔ کشتی دور نکل گئی تو فیضان واپس مڑی۔ وہ واپس گھر جا رہی تھی تباہان کو تہ خانے سے نکالنے کے لئے۔ مگر اب اس کام کے لئے بہت دیر ہو چکی تھی۔ فیضان ابھی کھاڑی ہی میں تھی کہ مقدونی سپاہی وہاں پہنچ گئے اور انہوں نے بہت سے دوسرے مسافروں کے ساتھ فیضان کو بھی حراست میں لے لیا۔

فیضان کی روندہ او بے حد اثر انگیز تھی۔ تباہان دم بخود اس کی طرف دیکھتا چلا گیا۔ فیضان کی شفاف آنکھوں میں تباہان کے لئے محبت کے ہوا اور کچھ نہیں تھا۔ نہ جانے کیوں تباہان کو لگا جیسے ماریسلہ کی روح فیضان کے جسم میں اُٹی ہے اور فیضان کی آنکھوں سے اسے ماریسلہ دیکھ رہی ہے۔ صورت کے ساتھ ساتھ انہوں بہنوں کا انداز بھی بے حد ملتا جلتا تھا۔ فرق اتنا تھا کہ فیضان بے باک اور نوجیز تھی۔ انہی سپاہ میں ایسی دو شیز کی حیثیت درندوں سے بھرے ہوئے جنگل میں لاوارث بھیز کرئی۔ تباہان کو فیضان پر ترس آنے لگا اس نے پوچھا۔

”تمہیں کسی سے کوئی شکایت تو نہیں؟“

جس کے شور میں کچھ ساکھ ساکھ نہیں دیتا تھا اور جس کی روانی ناقابلِ مزاحمت تھی۔ محبت کی اس لہر نے دونوں کے درمیان کوئی فاصلہ باقی نہ رہنے دیا۔

اگلے چند روز میں فیانہ کی پرجوش محبت نے تابان کو اس طرح ڈھانچا کہ ارد گرد کی ہر شے اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ وہ کوئی ندی جیسی محبت تھی جس کی رفتار ہر لمحہ بڑھتی چلی جاتی ہے اور جو جلد سے جلد آگے سے آگے نکل جاتا جاتی ہے۔ فیانہ نے تابان کے شب و روز میں مکائے کہ وہ ششدر رہ گیا۔ وہ یہ سوچ کر حیران ہوتا تھا کہ اس لڑکی کے سراپے میں اتنا پیار نہ جائے کہاں چھپا ہوا تھا..... ہاں یہ بات تھی کہ کبھی کبھی قربت کے حسین لمحات میں بھی فیانہ یکدم ادا اس ہو جاتی تھی۔ چند لمحوں کے لیے وہ خود سے اور تابان سے کہیں دور بہت دور چلی جاتی تھی۔ شاید اسے اپنے پچھڑے اہل خانہ یاد آ جاتے تھے یا پھر کوئی اور بات تھی۔

وہ بڑی حسین رات تھی۔ دل چھو لینے والی ہوا چل رہی تھی۔ نشیب و فراز چاندنی میں دور تک روشن تھے۔ تابان اور فیانہ ایک جمرو کے میں ساتھ ساتھ بیٹھے تھے فیانہ دور نیلیوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی حنائی انگلیاں تابان کی گردن پر اس جگہ گردش کر رہی تھیں جہاں آہنی شوق نے جلد پر آن مٹ نشانات ڈال دیے تھے۔ وہ کھوئی ہوئی آواز میں بولی۔

”یہ چاند کہاں سے اٹھتا ہے تاہو؟“

”میں تو شہرِ مقدونیہ معلوم کرنے کے لئے نکلے ہیں۔ یہ سمندر کہاں سے شروع ہوتا ہے۔ دریا کہاں سے چہونے ہیں اور..... چاند کس سرزمین سے ابھرتا ہے۔“  
فیانہ رومانی لہجے میں بولی۔ ”تاہو مجھے تو لگتا ہے یہ چاند کسی نرہ لڑکی کا دل ہے۔ جو ہر رات اس کے سینے سے نکل کر ستاروں کے جھرمٹ میں اپنے محبوب کو ڈھونڈنے نکل کھڑا ہوتا۔ جب امید بندھتی ہے اس دل میں روشنی بھرتی جاتی ہے اور جب مایوسی بڑھتی ہے یہ نراغ اور بے نور ہوتا جاتا ہے.....“

تابان غیر جذباتی لہجے میں بولا۔ ”تم تو ہر بات کو اپنے انداز میں لیتی ہو۔“  
فیانہ چونک کر تابان کی طرف دیکھنے لگی پھر موضوع بدل کر بولی۔ ”آج چاند کی کون سی تاریخ ہے؟“

”شاید بارہویں۔“ تابان نے جواب دیا۔

”یہ سول پوری رات کا چاند ہوگا۔ شہر کے بڑے دروازے پر ”مظلوں کا میلہ“

فیانہ نے چونک کر تابان کی طرف دیکھا وہ اس سوال کی گہرائی سے آگاہ تھی۔ نفی میں سر ہلا کر بولی۔ ”میں گرفتار ہوتے ہی مجھے ہادن کے قید خانے میں پہنچا دیا گیا تھا وہاں پر عورتیں محافظہ خیم میں پچھلے چار پانچ روز وہیں رہی ہوں۔“

فیانہ کے تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ جو کہہ رہی ہے درست ہے۔ تاہم تابان کو حیرت ہو رہی تھی۔ وہ مقدونیوں سپاہ کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھے۔ ایک منظم فوج ہونے کے باوجود ان میں بربری خصائل موجود تھے۔ اگر چار روز ان کے دم و کرم پر رہنے کے باوجود وہ ”مصاب“ کا شکار نہیں ہوئی تھی تو یہ اس کی خوش قسمتی ہی تھی..... اچانک تابان کو اس چیز کا خیال آیا جو اس نے کئی ماہ سے فیانہ کی امانت سمجھ کر سنبھال رکھی تھی۔ وہ اٹھا اور اپنے پرانے لباس کے اندر سے جگمگا آویزہ نکال لیا۔

”یہ لو اپنا آویزہ۔“

آویزے کو دیکھ کر فیانہ کے پہرے پر سرفی پھیل گئی۔ شاید اسے وہ واقعہ یاد آیا تھا جب فیانہ کا آویزہ تابان کے لباس سے اٹھ گیا تھا اور کوشش کے باوجود جدا نہیں ہوا تھا۔ مجبوراً یہ آویزہ فیانہ کے کان سے جدا کرنا پڑا تھا۔ آویزہ دیکھ کر فیانہ جیسے گڑے دنوں کی یاد میں کھو گئی۔ شاید وہ شب و روز اسے یاد آگئے تھے جب وہ تہ خانے میں ہر روز ہی تابان سے ملتی تھی۔ اس وقت تابان کی حیثیت قیدی کی تھی اور فیانہ کی حیثیت آقا کی۔ اب سب کچھ الٹ ہو گیا تھا۔ تابان آقا تھا اور فیانہ کی حیثیت کنیز سے زیادہ کی نہیں تھی لیکن عجیب بات تھی ’فیانہ کو یہ حیثیت بھی بری نہیں لگی تھی۔ کوئی اس کے دل کی بات پوچھتا تو وہ برا کہہ دیتی کہ وہ ساری عمر اس گھر میں ادنی کنیز بن کر رہنا پسند کرے گی۔ وہ صرف تابان کا قرب چاہتی تھی چاہے اس کے لیے اسے کوئی حیثیت بھی اختیار کرنا پڑ جاتی۔

تابان محویت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ نہ جانے فیانہ کے دل میں کیا آئی کہ اس نے بے اختیار تابان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے رخسار سے لگا لیا۔ اس کی آنکھوں کے چشموں سے شفاف آنسو ابلے اور تابان کے ہاتھ کو بھگونے لگے۔ وہ سکیوں سے رو رہی تھی۔ تابان کا دل فیانہ کے لیے محبت اور احسان مندی کے جذبات سے بھر گیا۔ اس نے بے اختیار فیانہ کو اپنے کندھے سے لگا لیا۔ وہ تابان کے سینے میں سمٹ گئی۔ اس کا جسم بہ زبان خاموشی پکار پکار کر تابان سے کہہ رہا تھا کہ وہ اسے اپنی ہانوں میں لے لے۔ تابان تا دیر اس پکار سے اپنے کان بند نہ رکھ سکے۔ دونوں محبت کی ایک ایسی لہر میں بہنے لگے



ہو گا۔ ہم بھی چلیں گے نا؟

تباہان نے کہا۔ "اگر تم چاہتی ہو تو ضرور چلیں گے لیکن....." وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

"لیکن کیا؟" فیانہ نے اس کا کندھا جھنجھوڑا۔

"سنا ہے وہاں دیوتاؤں کے سامنے انسانی قربانی دی جاتی ہے۔ یہ سب دیکھ کر میرا خون کھولنے لگتا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے ایک بہت بڑا ہتھوڑا میرے ہاتھ میں ہو اور میں ان بتوں کو پاش پاش کر دوں۔"

فیانہ مسکرا دی۔ "تو تم نہ دیکھنا قربانی کا منظر۔ ہم صبح چلے جائیں گے۔ میلہ تو آٹھ پر رہے گا۔"

"لیکن بد نصیبوں کی لاشیں تو قربانی کے چبوترے پر پڑی رہتی ہیں۔"

لاشیں تمہیں کیسں گی نہیں کہ ہماری جانب دیکھو۔ تم ادھر ادھر دھیان مت دیتا..... بلکہ بہتر ہے میری ہی طرف دیکھتے رہنا اور.....

"اور کیا؟"

"اور میں میلہ دیکھتی رہوں گی۔" دونوں ہنس دیے۔

☆-----☆-----☆-----☆-----☆

درہنچے سے آنے والی خنک ہوا نے تباہان کے گھونگھریالے بالوں سے اٹھیلیاں کیں تو وہ جاگ گیا۔ رات کی آخری گھنٹاں تھیں۔ چودھویں شب کا چاند دور مغربی دھولانوں کے پیچھے غروب ہو رہا تھا۔ تباہان کی نگاہ جنوب کی سمت کھلنے والے درہنچے میں چلی گئی قریب دو فرلانگ کے فاصلے پر شر کی گنجائش آبادی شروع ہو جاتی تھی۔ دور تک گھروں، راستوں اور گرجوں کی عثمانی روشنیوں نظر آ رہی تھیں لیکن ایک مقام پر تو روشنی کا جھمکا سا لگتا تھا۔ یہ شر کا بڑا دروازہ تھا جہاں "مشعلوں کا میلہ" لگا ہوا تھا۔ ہوا کے دوش پر ترقی، دھول تاشوں کی مدھم آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور کبھی کبھی بہت سے لوگوں کا شور ایک دور افتادہ گونج کی طرح سماعت کو چھو جاتا تھا۔ کچھ روشنیوں خاصی بلندی پر نظر آ رہی تھیں۔ یہ وہ بازگیر تھے جو ہاتھوں میں مشعلیں تھامے تھے ہونے سے پہلے رہے تھے۔ کچھ روشنیوں ایک بہت بڑے دائرے کی شکل میں پھرا رہی تھیں۔ ایک مقام پر روشنیوں کی اچھل کود جاری تھی۔ یہ سب کھیل تھا شے تھے جو شر کے صدر دروازے پر ہو رہے تھے۔ تباہان کچھ دیر جو نظارہ دیکھا پھر ایک گہری سانس لے کر بہتر چت ہو گیا۔

فیانہ کمرے میں نہیں تھی صرف اس کی خوشبو تھی۔ وہ بہت سویرے اٹھنے کی عادی تھی۔ آج شاید زیادہ جلدی اٹھ لگی تھی۔ اسے میلے پر جانے کے لئے تیار بھی ہونا تھا۔ رات بھی وہ دیر تک میلے کی باتیں کرتی رہی تھی۔ اسی نے تباہان کو بتایا تھا کہ "مشعلوں کا میلہ" پروٹیسس دیوتا کی یاد میں منایا جاتا ہے جو "انسان دوست" دیوتا تھا اور جس نے سورج سے آگ چرا کر انسان کو دی تھی۔ وہ پروٹیسس سمیت ہر دیوتا کے متعلق بہت کچھ جانتی تھی اس کی معلومات بہت وسیع تھیں اور وہ شائستہ زبان میں ان کا اظہار بھی کر سکتی تھی۔ چھوٹی سی عمر میں یہ علیت اور دانائی متاثر کن تھی۔

فیانہ کے بارے سوچ کر تباہان دنگی ہونے لگا وہ کئی روز سے مسلسل سوچ رہا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ فیانہ کا مستقبل کیا ہو گا۔ اس کے والدین کا کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ کدھر گئے اور اگر پتہ لگ بھی جاتا تو فیانہ وہاں جانے کے لئے ہرگز تیار نہیں تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے اہل خانہ اور خاص طور پر اس کا باپ اسے کبھی معاف نہیں کرے گا۔ درحقیقت تباہان کی مدد کر کے وہ اس بھری پری دنیا میں تباہ ہو گئی تھی اور تباہان بھی اس کا ساتھ کہاں تک دے سکتا تھا۔ اس کی منزل تو بہت دور تھی۔ اسے شہزادی مارشا کو تلاش کرنا تھا۔ وہ مارشا جس کی یاد کا کانا تباہان کے دل میں ٹوٹ چکا تھا۔ وہ کسی پل اس کاٹنے کی جین سے نجات نہیں پاتا تھا۔ تھوڑی دیر کے لئے شدید تکلیف سے غافل ہو بھی جاتا تو ایک کک سی دل و دماغ میں موجو رہتی تھی۔ پیچھے ایک ہفتے میں اس نے سالار اعظم سکندر کے بارے میں تمام معلومات حاصل کر لی تھیں۔ سالار اعظم کا بڑا کمان ہے۔ وہ کب کوچ کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس کے ساتھ کون کون لوگ ہیں۔ یہ سب کچھ اسے معلوم ہو چکا تھا۔ خاص طور پر تباہان نے شمال اور نورین وغیرہ کے بارے میں معلومات حاصل کی تھیں کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہیں۔ یہ جان کر اسے ذہنی کرب کا احساس ہوا تھا کہ شمال اور نورین اپنی گراں قدر خدمات کے صلے میں سکندر سے بھرپور صلہ پا چکے ہیں۔ ایشیا کی مہم سے "بامراد" وہابی کے انعام میں شمال کو بیخ بڑی سردار بنادیا گیا تھا جبکہ گونسل اور نورین کو خاص شانی دستے میں شامل کر لیا گیا تھا۔ سکندر کے ایما پر جو اہم سردار جزیروں پر آیا ہوا تھا اور جزیروں کے فرمانروا سے گفت و شنید کر رہا تھا سردار شمال ہی تھا۔ ایک طرح سے یہ پورا جزیروں اس وقت سردار شمال کے زیر نگیں تھا۔ یہ صورت حال تباہان کے لئے بے حد تکلیف دہ تھی۔ وہ جانتا تھا کہ جزیروں سے پیچھے ہی سردار شمال نے سب سے پہلے کورا کو تلاش کر لیا ہو گا اور اگر اس کی قسمت بہت اچھی نہیں تھی تو وہ

اس وقت سردار شلال کے چنگل میں پھنسا ہوا رہی ہوگی۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ کورا تک پہنچنے کے باوجود سردار شلال نے اسے معاف کر دیا ہو۔ یہ بھی ممکن تھا کہ شلال کو تابان کے زندہ بچ رہنے کا شبہ ہو گیا ہو اور اس کے ہر کارے پر سے بڑے بڑے میں تابان کی ٹوہ لگاتے پھر رہے ہوں۔ یہی سبب تھا کہ تابان نے ابھی تک جزیرے سے نکل کر سکندر تک پہنچنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

تابان اپنے خیالوں میں گم تھا جب ہیردنی کمرے سے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ شاید فیلائہ آ رہی تھی 'خشم میں منائے پھول کی طرح تروتازہ' منگی اور سنوری ہوئی نینک آہٹ قریب آئی تو تابان کو اندازہ ہوا کہ یہ اس کا ادھیڑ عمر گھیلہ خادم ہے۔ خادم نے دوسرے کمرے سے آواز دے کر کہا۔ "مالک! فصل کے لیے تازہ پانی رکھ دیا ہے۔" تابان چونک گیا۔ اس سے پیشتر یہ فقرہ فیلائہ کی زبان سے ادا ہوا کرتا تھا۔ اس نے خادم کو اندر بلایا۔ خادم نے تعیل کی اور صبح بغیر کمرے خاموش و مودب کھڑا ہو گیا۔

"ما لکن کہاں ہے؟" تابان نے پوچھا۔

"وہ تو..... وہ رات ہی چلی گئی تھیں۔ آپ کے سونے کے بعد۔" خادم نے ہکا کر جواب دیا۔

"کہاں چلی گئی تھیں؟"

"میلے میں۔"

تابان حیرت زدہ ہو کر بستر پر بیٹھ گیا۔ فیلائہ اسے بتائے بغیر میلے میں چلی گئی تھی اور وہ بھی بالکل تھلا۔ وہ جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا اور منہ ہاتھ دھو کر لباس بدلنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ باغخانے کی میڑھیاں اتر رہا تھا۔ اب رات کی تیرگی سے دن کا اجالا بغلیں ہو رہا تھا۔ چاروں طرف پرندوں کی چکاریں گونج رہی تھیں۔ تابان کا گھوڑا گھر کے سامنے بندھا تھا۔ وہ جست لگا کر گھوڑے کی تنگی شینہ پر سوار ہوا اور تیزی سے آبادی کی سمت روانہ ہو گیا۔

☆-----☆

تابان میلے کے مقام پر پہنچا تو ہر طرف جھوم نظر آیا۔ صبح کا اجالا تیرگی پر حاوی ہو گیا تھا لہذا مشطیں گل ہو رہی تھیں۔ کھیل تماشہ دکھانے والے تھوڑی دیر سستانے کے لئے یہاں وہاں ٹولیوں میں بیٹھ گئے تھے۔ ایک طرف چولوں پر بڑے بڑے کڑاؤ رکھے تھے اور ان میں گوشت کے ٹکٹین پارے تے جارہے تھے۔ ہر طرف مسالوں کی تیز خوشبو پھیل

رہی تھی پاس ہی مشاق ناہائی اپنے کام میں مصروف تھے۔ یہاں شراب کے شگے قطار اندر قطار رکھے تھے اور منہ نوشوں کے لئے دعوت عام تھی۔ خوبصورت عورتیں رنگین لباس زیب تن کئے شگفتگی پھرتی تھیں اور دل پھینک مرد پروانوں کی طرح ان کے گرد گھوم رہے تھے۔ شہر کے صدر دروازے کے سامنے ایک بہت بڑے چوڑے پردیز قالین بچھائے جا رہے تھے۔ غالباً یہاں کچھ دیر بعد رقص و نغمہ کا مظاہرہ ہونا تھا..... غرض ہر طرف ایک ہنگامہ برپا تھا۔ تابان اس ہنگامے سے قطعی لاتعلقی بے قراری سے جھوم میں چکراتا پھر رہا تھا۔ اسے فیلائہ کی تلاش تھی۔ فیلائہ جو پچھلے چند دن شب و روز اس کی ساتھی رہی تھی اور اس کی دھڑکن میں سہا کر ہر سانس کی ضرورت بن گئی تھی۔ تابان کو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ فیلائہ کو نہیں اپنے ہی جسم کے کسی گوشہ جیسے کو ڈھونڈ رہا ہے۔ فیلائہ کو کھو جتنے ہوئے اسے یہ خدشہ بھی تھا کہ کوئی اسے پہچان نہ لے۔ وہ ہر قدم پھونک کر رکھ رہا تھا اور چاروں طرف سے باخبر تھا۔ اچانک ایک شخص نے تابان کو دیکھ لیا یہ مقدونوی فوج کا وہی ایک صدی سردار تھا جس نے پندرہ روز پیشتر اسے ترخانے سے نکلوا دیا تھا اور فیلائہ کا ہاتھ اسے سونپا تھا۔ اس وقت سردار کی بھل میں ایک "دشیرہ تھی اور وہ بڑی ترنگ میں دکھائی دیا تھا۔

"تھمرو!" اس نے تابان کو دیکھ کر ہانک لگائی۔ تابان اپنی جگہ ساکت ہو گیا۔ "کہاں پھر رہے ہو؟" اس نے قریب آ کر تابان سے پوچھا۔

تابان نے کہا۔ "سردار میں فیلائہ کو ڈھونڈ رہا ہوں۔"

یہ ایک سردار کی آنکھوں میں حیرت نظر آئی۔ اس نے "دشیرہ کے کندھے سے بازو ہٹایا اور غور سے تابان کو دیکھنے لگا۔ "کس فیلائہ کی بات کر رہے ہو؟" اس نے دریافت کیا۔

"وہی لڑکی جو آپ نے مجھے سونپی تھی۔" تابان نے جواب دیا۔ سردار نے اپنا گنجا سر سسلا دیا۔ "اس لڑکی نے تمہیں کچھ نہیں بتایا؟"

"کس بارے میں؟"

"اپنے بارے میں۔"

"میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھا۔"

سردار نے ایک گہری سانس لی۔ "میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ تم سب کچھ جانتے کے باوجود فیلائہ کو بچانے میں دلچسپی نہیں رکھتے۔"





دو پہرے ذرا قبل تابان شادی محل کے صدر دروازے پر کھڑا تھا۔ اس نے اپنا چہرہ اور جسم ایک چادر میں چھپا رکھا تھا۔ اس محلے میں وہ خاصا سرسراہٹا تھا۔ دروازے پر موجود محافظوں میں سے ایک بھاگ کر اس کے قریب آیا۔ "کون ہو تم؟ کیا بات ہے؟" تابان نے سناٹ سے کہا۔ "میں تمہارے کمندار سے بات کرنا چاہتا ہوں۔" اسے میں کمندار بھی نزدیک پہنچ گیا۔ وہ سر تپا لوہے میں غرق تھا۔ خود میں سے اس کی تیز چمکی آنکھیں جھانک رہی تھیں اور ایک ہاتھ تلوار کے دستے پر تھا۔ "کون ہو تم؟" اس نے رعونت سے پوچھا۔ "پھر وہ تابان کا چہرہ دیکھ کر چونک گیا اس کی آنکھوں میں حیرت اور سراسیمگی نظر آئی وہ تابان کی سمت اٹھ اٹھا کر بولا۔

"تمہارا نام تابان ہے؟" تابان نے ہاں میں جواب دیا۔ "تم شادی مہمان تھے؟" کمندار نے مزید تصدیق چاہی۔

"ہاں؟" تابان نے کہا۔ "آج سے دس ماہ پیشتر میں شادی مہمان ہی تھا۔" کمندار کے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے اس نے تابان کو پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور اسے لے کر محل کے اندرونی حصے میں پہنچ گیا۔ ایک کمرے میں آکر تابان نے چادر اتار بیٹھ گئی۔ کمندار نے بغور اسے دیکھا۔ اب اس کے چہرے پر دبا دبا ہوا جوش نظر آ رہا تھا۔ وہ لڑکاں آواز میں بولا۔

"تمہاری تلاش میں ہم کہاں کہاں نہیں بھٹکے کہاں چلے گئے تھے تم؟" "میری کمائی خاصی طویل ہے۔" تابان نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "ٹھہرو" میں سپہ سالار کو تمہاری آمد کی اطلاع دیتا ہوں۔" کمندار اندرونی دروازے کی طرف بڑھلا۔ "میری بات سنو۔" تابان نے اسے روک لیا۔ "میری آمد کی خبر عام نہیں ہونی چاہئے۔۔۔۔۔۔ اور ہاں۔۔۔۔۔۔ وہ لڑکی کہاں ہے جو میرے ساتھ یہاں آئی تھی؟"

کمندار نے کہا۔ "تم کورا کے بارے پوچھ رہے ہو؟" "ہاں۔"

"وہ خیریت سے ہے تم تھوڑی دیر میں اسے اپنے سامنے پاؤ گے۔" کمندار تیزی سے باہر نکل گیا۔ سپہ سالار یعنی جزیرے کا قائم مقام فرمانروا محل ہی میں تھا۔ چند لمبے بعد تابان کو طلب کر لیا گیا۔ تابان خواہ مخواہ میں پہنچا جہاں سپہ سالار قیلوہ کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔ تابان کی آمد نے سپہ سالار کو بھی حیران کر رکھا تھا۔ تابان نے آگے بڑھ کر سپہ سالار کو

تعظیم پیش کی اور اس کے اشارے پر ایک مسند پر بیٹھ گیا۔ خواہ مخواہ میں تحلیل ہوا تو سپہ سالار نے کہا۔

"آٹھار سے لگتا ہے کہ پچھلے دس ماہ میں تم نے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کی ہیں۔ کیا ہمارا اندازہ درست ہے؟"

تابان نے کہا۔ "حضور کی نگاہ تیز اور فراست پر شک و شبہ سے بالاتر ہے۔" سپہ سالار نے پوچھا۔ "کون بد بخت تھا وہ جس نے شادی مہمان پر ہاتھ ڈالنے کی جرات کی؟"

تابان نے کہا۔ "جہاں نہ وہ جزیرہ ابویا کا ایک سوداگر تھا مگر میں نہیں سمجھتا کہ اس کے کسی جرم کی سزا ملنا بھی باقی ہے۔"

سپہ سالار نے تفصیل چاہی تابان نے مختصر الفاظ میں شروع سے آخر تک تمام کمائی سپہ سالار کے گوش گزار کر دی۔ اس نے فیلانہ کے بارے میں بھی کوئی بات نہیں پوچھائی۔ سپہ سالار اس اثر انگیز روئیداد کو بڑے دھیان سے سنتا رہا۔ اس دوران ایک کثیر اندر داخل ہوئی اور اس نے بتایا کہ معزز مہمان کی ساتھی خاتون ان سے ملنا چاہتی ہیں۔

سپہ سالار نے حکم دیا کہ خاتون کو کہیں بلایا جائے۔ چند لمبے بعد کورا اندر داخل ہوئی۔ اس نے تابان کو دیکھا اور دم بخود کھینچی رہی۔ شاید وہ روتی ہوئی اس کے قدموں میں گر پڑتی مگر سپہ سالار کی موجودگی اسے جذبات چھپانے پر مجبور کر رہی تھی۔ اس نے سپہ سالار کو تعظیم پیش کی پھر تابان کو خوش آمدید کہا اس کی آنکھوں میں مسرت کے آنسو تھے۔ سپہ سالار گویا ہوا۔

"تم لوگوں نے بہت سی باتیں کرتا ہوں گی اور اس کے لئے تجھنے کی ضرورت ہے۔"

اس نے خدام کو اشارہ کیا کہ وہ دونوں مہمانوں کو احترام سے مہمان خانے میں پہنچا دیں۔ کچھ ہی دیر بعد کورا اور تابان مہمان خانے کے ایک خوبصورت کمرے میں بیٹھ گئے۔ تابان کے چہرے پر رنج و غم کی گہری پرچھائیاں تھیں۔ اس نے کورا سے پہلا سوال یہی کیا کہ ہوشند کہاں ہے۔ وہ جانتا تھا اس سوال کے جواب میں ایک اندوہناک خبر اس کی منتظر ہوگی۔ ایک ایسی خبر جسے سناتے ہوئے کورا کی ہچکی بندھ جائے گی اور جسے سننے ہوئے وہ خود بھی اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکے گا لیکن کورا کی آنکھوں میں مسرت کی ہلک دیکھ کر تابان پوچھ چکا وہ گیا۔ کورا نے کہا۔





تہاں اور کورا میں گفتگو جاری تھی کہ دو محافظ تیز قدموں سے گھبرائے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ ان کی گھبراہٹ اس بات سے عیاں تھی کہ اندر آنے سے پہلے انہوں نے اجازت تک طلب نہ کی۔ یہ دونوں قائم مقام فرمانروا کے خصوصی محافظ تھے اور یقینی طور پر شاہی حکم کی اطاعت میں یہاں پہنچے تھے۔ ایک محافظ بولا۔ ”آپ دونوں فوراً ہمارے ساتھ چلیے۔ یہاں سخت خطرہ ہے۔“ اس کی آواز میں لرزش تھی۔

”کیسا خطرہ؟“ تہاں نے دریافت کیا۔

”یہ شاہی فرمان ہے براہ کرم آپ سوال و جواب میں تاخیر نہ کیجئے۔“ ایک محافظ نے فرط اضطراب میں تہاں کو بازو سے تھام لیا۔ اسی دوران باہر کسی غلام گردش میں بھاگتے دوڑتے قدموں کی صدا اُٹھیں۔ پھر ایک بھاری بحرکم آواز گونئی۔ ”ممان خانہ اس طرف ہے۔“ اس کے ساتھ ہی کسی مقدونی نے کسی شاہی محافظ کو بری طرح ڈانٹا۔ ”تم خاموش رہو۔“ اس کی آواز بلند دھلا دھلاؤں میں دور تک گونئی۔ ان آوازوں کو سن کر کمرے میں موجود دونوں شاہی محافظوں کے چہرے مٹی ہو گئے۔ وہ شدید تعذیب میں تھے۔ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ اپنی جگہ کھڑے رہیں یا کھڑے بھاڑ دیں۔ اس دوران مقدونی سپاہی دندناتے ہوئے کمرے میں داخل ہو گئے۔ ان کی تعداد دس سے کم ہرگز نہیں تھی۔ وہ پوری طرح مسلح تھے۔ تہاں اور کورا کو دیکھتے ہی ان کی آنکھیں پٹک اٹھیں۔ اس مقدونی دستے کے سالار کو دیکھ کر تہاں بری طرح چونکا۔ وہ نورین تھا۔ وہی نورین جو اس جزیرے میں ہادن کے تہ خانے میں اپنی بیماری کے باجوں سسک سسک کر دم توڑ رہا تھا اور تہاں کی کوشش سے اسے ربانی نصیب ہوئی تھی۔ اب یہ احسان فراموش شخص آنکھوں میں خون کی سرخی لئے تہاں کو گھور رہا تھا۔ اس کے چہرے پر شرم یا تجک کا نشان تک نہیں تھا۔ ہاں وہ تہاں کی یہاں موجودگی پر تھوڑا سا حیران ضرور نظر آتا تھا۔

”گرفتار کرلو انہیں۔“ اس نے اپنے سپاہیوں کو گرج کر حکم دیا۔

مشغول سپاہی تہاں اور کورا کی طرف بچھے ”کورا چچ کر تہاں کے بازو سے چمٹ گئی سپاہوں نے یہ زور اسے جدا کیا اور تہاں کو عریاں تلوار کی نوک پر رکھ لیا۔ یہ سارا واقعہ چند سائنٹوں کے اندر وقوع پذیر ہو گیا۔

تہاں نے نورین کو مخاطب کر کے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”سکندر کے ذاتی دستے میں شہولیت مبارک ہو۔“ اس مبارک باد میں پنہاں طنز نورین کو تیر کی مانند لگا۔ وہ دانت پیسن

کر غرایا۔ ”اپنی زبان بند رکھ فارسی غلام ورتہ عمر بھر بولتے کوڑے لگے۔“

تہاں نے کہا۔ ”میں نے ایسی کیا غلط بات کہہ دی۔ تمہیں تمہاری خوش بختی پر مبارک باد دے رہا ہوں۔“

نورین بولا۔ ”اور میرا دل تمہاری بد بختی پر ماتم کرنے کو چاہتا ہے۔ بڑے بد نصیب ہو تم کہ اس وقت اس جگہ موجود پائے گئے ہو۔“ پھر وہ سپاہیوں سے مخاطب ہوا۔ ”ان دونوں کی مشکلیں کس دو اور چروں پر نقاب چڑھا کر باہر لے آؤ۔“

نورین کی زبان سے یہ لفظ ادا ہوتے ہی کئی تو متند سپاہیوں نے اسے دبوچ لیا اور ہاتھ پاؤں باندھنے لگے۔ تہاں کے ذہن میں آنہ حیاں سی چل رہی تھیں۔ اس کے لئے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ آخر کار سردار شلال کی تلاش کامیاب ہوئی ہے۔ وہ کسی طور اس بات کا کھوج لگانے میں کامیاب رہا ہے کہ کورا شاہی محل میں پناہ گزین ہے۔ یہ اتفاق تھا کہ شلال کے کارندے اس وقت یہاں پہنچے تھے جب تہاں بھی یہاں موجود تھا اور اب وہ بھی اس کے ساتھ ہی سردار شلال کے روبرو لے جایا جا رہا تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد نورین کے سپاہی تہاں اور کورا کو گھسیٹتے ہوئے شاہی محل کے وسیع و عریض دھان میں پہنچے یہاں ایک فوجی گھوڑا گاڑی موجود تھی۔ گھوڑا گاڑی کو دیکھتے ہی تہاں کو اندازہ ہو گیا کہ سردار شلال کی رہائش گاہ یہاں سے کچھ دوری پر ہے۔ سپاہیوں نے تہاں اور کورا کو بید روی سے گھوڑا گاڑی کے فرش پر بٹا دیا اور انہیں لے کر روانہ ہو گئے۔ جو نئی گھوڑا گاڑی شاہی محل سے نکلی ان دونوں کے چروں پر سیاہ نقاب منڈ دینے لگے۔ اب تہاں کے چاروں طرف تاریکی تھی۔ وہ صرف اتنا محسوس کر سکتا تھا کہ کورا اس کے پسلو میں بیٹھی ہے اور گاڑی جزیرے کی بھری بڑی سڑکوں پر سفر کرتی ہے شلال کی سمت بڑھ رہی ہے۔ معلوم نہیں یہ سفر مختصر تھا یا طویل، بہر حال اس سفر کے آخر میں ان دونوں کو انتہائی سنگین حالات کا سامنا تھا۔ یقینی بات تھی کہ وہ ایک دفعہ شلال کے قبضے میں چلے گئے تو ان کی لاشوں کا پتہ بھی نہیں چلے گا۔ ان دونوں کی سلامتی شلال کے لئے زبردست ”خطرہ“ تھی۔ اس کا نام مرتبہ ”عمدہ ملازمت“ زندگی سب کچھ ختم ہو سکتا تھا۔ تہاں کو یقین تھا کہ وہ ان دونوں کو تریا تریا کر مارنے میں بے حد سکون محسوس کرے گا۔ یہ سفر درحقیقت کریناک موت کی طرف سفر تھا۔ اگر تہاں کو اپنی اور کورا کی سلامتی مقصود تھی تو اسے یہ سفر ختم ہونے سے پہلے پہلے کچھ کرنا تھا۔ وہ سیاہ نقاب کی گہری تاریکی میں بے قرار ہو گیا۔ کورا کی طرح اس کے ہاتھ بھی پشت پر بندھے تھے اور چاروں طرف



عیاں تلوار میں تھیں۔ اچانک تہاں نے محسوس کیا کہ کسی کی نرم انگلیاں اس کی کلاسیوں پر رینگ رہی ہیں۔ بیک وقت اس کا سینہ بے قرار دھڑکنوں سے گونج اٹھا۔ یہ پہلو میں بیٹھی کورا کی انگلیاں تھیں۔ وہ اپنے بندھے ہاتھوں سے تہاں کے بندھے ہاتھ کھولنے کی کوشش کر رہی تھی۔

کورا کی یہ دلیرانہ کوشش کافی طویل اور صبر آزما ثابت ہوئی لیکن بالآخر تہاں کے ہاتھوں کی گرہ کھل گئی۔ یہ بڑے نازک لمحات تھے۔ سپاہیوں کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ منزل کے قریب پہنچ چکے ہیں اور اب گاڑی کسی بھی وقت اس قلعے کے حصار میں داخل ہونے والی ہے جہاں سردار شمال قیام پذیر ہے۔ اب سوچ بچار کا وقت نہیں تھا۔ جو خفی تہاں کے ہاتھ آزاد ہوئے اس نے ایک جھٹکے سے اپنا نقاب نوچا، اطراف کا جائزہ لیا اور ہر اندیشے سے بے نیاز ہو کر اپنے سامنے بیٹھے دو سپاہیوں پر جا پڑا۔ اس کا طوفانی گھوندر ایک سپاہی کے جڑے پر لگا اور دوسرے کو تہاں کے سر کی چان لیا ضرب برداشت کرنا پڑی۔ بائیں جانب بیٹھے نورین کی تلوار بجلی کی طرح چمکی اس نے بلا دروغی تہاں کے سر کو نشانہ بنایا تھا۔ تہاں نے جھک کر یہ مسلک وار ہتھیار اور پیچھے کھڑے ہوئے سپاہی کی کمر سے پیش قبض کیجھ لی۔ گھوڑا گاڑی کی مختصر سی جگہ میں پیچھے اچانک ہی زلزلہ اٹھیا تھا۔ پیش قبض ہاتھوں میں آتے ہی تہاں نے بے رحمی سے حملہ کیا اور ایک سپاہی کی آستین فرش پر ڈھیر ہو گئیں۔ ایک دوسرا سپاہی بھی مسلک طور پر گھائل ہو کر پیچھے ہٹا لیکن اس کے بعد تمام سپاہی یک بیک تہاں پر پل پڑے۔ گھوڑا گاڑی مسلسل دوڑ رہی تھی۔ سپاہیوں کے یکبارگی جھپٹنے سے گاڑی کا توازن خراب ہوا اور وہ ایک میب گزراہٹ کے ساتھ اسٹ گئی۔ گاڑی کے اندر قلابازی کھاتے ہوئے تہاں نے کورا کی تیز چمچ سنی۔ اسے لگا گاڑی کسی چوٹی حد بندی سے ٹکرانے کے بعد ہوا میں معلق ہو گئی ہے۔ وہ بلندی سے نیچے گر رہے تھے۔ پھر زوردار چمپا کسان کی دیا وہ پانی میں گرے تھے۔ چند لمحوں کے لئے تہاں حواس سے بیگانہ ہو گیا، مگر پھر اس نے خود پر قابو پایا اور کورا کی تلاش میں چاروں طرف دیکھا۔

پلٹ کی ندی میں تھا۔ کچھ ہی فاصلے پر وہ بلند چوٹی بل نظر آ رہا تھا جس کی حفاظتی حد بندی توڑ کر گاڑی نیچے گری تھی۔ دائیں جانب کچھ فاصلے پر ایک قدیم قلعے کی بلندو بالا درجیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ سامنے گھوڑا گاڑی تھی جس کا تین چوتھائی حصہ گھوڑوں سمیت پانی میں غرق ہو چکا تھا اور باقی بھی ہونے والا تھا۔ یہ سارے مناظر ایک ساعت کے مختلف

حصے میں تہاں کی نظروں سے گزرے۔ وہ پوری قوت سے پکارا۔ ”کورا..... کورا۔“ اسے کورا کے بندھے ہاتھوں کا خیال آیا اور وہ جان گیا کہ اگر وہ کورا تک نہ پہنچ سکا تو بے بسی کی موت اس کا مقدر ہوگی۔ دو تین اجسام پانی پر تیر رہے تھے۔ اس نے شام کے جھٹ پے میں غور سے دیکھا، ان میں سے دو نیم بے ہوش مقدونوی تھے اور تیسری کورا تھی۔ تہاں نے اسے دراز زلفوں سے پہچانا۔ وہ شاید تیر آب جانے سے پہلے آخری بار سطح پر آئی تھی۔ تہاں نے جسم و جان کی پوری قوت سے ہاتھ پاؤں چلائے اور کورا کے اوچھل ہونے سے پہلے اس کے سر پر چاٹ چاٹا۔ اس نے کورا کی کمر پر اپنا بازو جمایا اور رخ پھیر کر کنارے کی طرف بڑھنے لگا۔

☆-----☆-----☆

ان کے چاروں طرف تاریکی تھی۔ وہ بھاگ رہے تھے اور بھاگتے چلے جا رہے تھے۔ کبھی بھاگتے ہوئے کورا لڑکھائے لگتی تو تہاں اسے سہارا دیتا اور وہ نسبتاً دھیمی رفتار سے چلنے لگتے لیکن ایسے میں عقب سے سنائی دینے والا شور و غل ان کے نزدیک آ جاتا اور وہ پھر تیز قدم اٹھانے پر مجبور ہو جاتے۔ ان کے تعاقب میں آنے والے مقدونوی اور مقامی سپاہی تھے۔ انہوں نے قلعے کی برجیوں سے گاڑی کے ندی میں گرنے کا منظر دیکھا تھا اور تھوڑی ہی دیر میں سینکڑوں کی تعداد میں وہاں آپہنچے تھے۔ تہاں اس وقت کورا کو بمشکل ہوش میں لاسکا تھا۔ ہوش میں آتے ہی کورا کو تہاں کے ہمراہ بھاگنا پڑا تھا۔ اور اب وہ مقدونوی سپاہیوں کی زد سے نکلنے کے لئے جان توڑ کوشش کر رہے تھے۔ ندی کے ساتھ ساتھ زیتون کے درخت تھے۔ ان گوروں کی بیللیں تھیں اور آلود بخارے کے وسیع باغات تھے۔ وہ ایک بشت سے گزر رہے تھے مگر ان کے تعاقب میں دوزخ کی آگ تھی۔ آخر ایک مقام پر کورا کی ہمت جواب دے گئی۔ اس کے ہونٹوں سے کراہ نکلی اور وہ کئے شہتیر کی طرح دھڑم سے اوندھے منہ گری۔ تہاں نے اسے بمشکل اٹھایا اور اس کی کمزور مزاحمت نظر انداز کرتے ہوئے اپنے کندوں پر اٹھایا۔

متعاقب سپاہیوں کی آوازیں ایک دفعہ پھر قریب آ رہی تھیں۔ تہاں جانتا تھا کہ ان کے بچنے کے امکانات محدود ہوتے جا رہے ہیں۔ اب اس نے بہتر سمجھا کہ متعاقب سپاہیوں کے آگے آگے ”میرا تھیں“ دوڑ لگانے کی بجائے ندی کا رخ کرے۔ وہ بائیں جانب مڑا اور ان گوروں کی نیم پختہ بیللیں پھلانگتا ہوا کنارے کی طرف بڑھنے لگا۔ متعاقب سپاہیوں سے اس کا فاصلہ خطرناک حد تک کم ہو چکا تھا۔ وہ اب ان کے گھوڑوں کی ٹانگیں

من سکتا تھا اور ہاتھوں میں پکڑی مشطوں کی روشنی دیکھ سکتا تھا۔ اب تاجان کے سامنے ایک نئی راستہ تھا۔ وہ کورا سمیت ندی میں اتر جائے۔ اس نے ایسا ہی کیا پانی اس کی کمر تک پہنچ رہا تھا۔ امید کی ایک کرن دکھائی دی۔ یہ ایک بیس چپوؤں والی کشتی تھی جو پانی کے رخ پر بہتی تاجان کی سمت بڑھ رہی تھی۔ تاجان کورا سمیت پانی میں چھپ گیا اب ان دونوں کے صرف سر پانی سے باہر تھے۔ وہ گہری تاریکی میں تاریکی کا حصہ دکھائی دے رہے تھے۔ کشتی ان کے قریب سے گزری تو تاجان اس کے عقبی حصے سے لٹک گیا۔ کورا بدستور اس کی کمر سے لپٹی ہوئی تھی۔ کافی دور تک ان دونوں نے ایسے ہی سفر کیا۔ پھر جب تاجان کے بازو شل ہونے لگے تو وہ قوت صرف کر کے کشتی پر چڑھ گیا۔ بعد ازاں اس نے کورا کو بھی اوپر کھینچ لیا۔ یہ ایک خاصی بڑی کشتی تھی۔ اس میں بچہ ابھینک سے نکلا جانے والا اسٹیل لدا تھا۔ اوپر تک ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ تاجان اور کورا اس نرم و گداز اسٹیل میں گھس کر لیٹ گئے۔ ندی کا کنارہ اب خاموش تھا۔ ان کے تعاقب میں آنے والے سپاہی کہیں دور نکل گئے تھے۔

تاجان نمناک اسٹیل پر چت لیٹا سانس درست کر رہا تھا۔ پھر اس نے اطراف کا جائزہ لیا۔ اب گھنٹوں درختوں کے عقب سے چاند نمودار ہو گیا تھا اور اس کی حرارتیں چاندنی کوہ و دمن کو روشن کرنے لگی تھی۔ چاند کی کرنیں پانی کی لہروں پر چاندنی کے پھول کھلا کر اچانک کہیں گم ہو جاتی تھیں۔ شمال سے آنے والی ہوا ان کرونوں کو ڈھونڈنے نکل کھڑی ہوتی تھی۔ ایسے میں جھونکوں کی بند قباہیں کھل جاتی تھیں اور ان کے دامن میں سمی ہوئی زیتون و زعفران کی خوشبو ہر طرف پھیل جاتی تھی۔ چپو چلائے والے کشتی راں ہم آہنگ ہو کر ایک مقامی گیت گارہے تھے۔ اس گیت میں گداز درختوں والی اس مہربان عورت کا تذکرہ تھا جو بہت دور کسی سرسبز بستی کے چھوٹے سے گھر میں بیٹھی واپس آنے والوں کا انتظار کرتی ہے۔ گندم کی زیتون لگی روٹی کو ڈھانپ ڈھانپ کر رکھتی ہے اور اپنے سوئے ہوئے بچے کو بے خیالی میں تھپکتی رہتی ہے۔ کشتی ہموار رفتار سے سمندر کی جانب بہتی رہی اور کشتی راںوں کی آوازیں ہوا کی لہروں میں ڈوبتی ابھرتی رہیں۔ تاجان گہری سوچ میں گم تھا۔ یہ ایسی سوچیں تھیں کہ وہ اپنے پہلو میں کورا کا وجود بھی فراموش کر چکا تھا۔ آج طلوع آفتاب کے بعد کیا کیا سنگین واقعات اسے پیش آچکے تھے۔ سب سے پہلے اس نے فیضان کا بے جان چہرہ دیکھا تھا۔ پھر وہ شانی محل میں کورا کے ساتھ گرفتار ہوا تھا۔ تب گھوڑا گاڑی کے اندر ہونے والی خوفناک کشمکش کا منظر اس کی

نگاہوں کے سامنے آیا۔ گھوڑا گاڑی کا بلندی سے ندی میں گرنا، گھوڑوں اور مسافروں سمیت ڈوبنا، تاجان کا کورا کو بچا کر کنارے پر پہنچانا اور متعاقب سپاہیوں سے بچنے کے لئے تاریک باغیت میں اندھا دھند بھاگنا، سب خواب کی باتیں لگتی تھیں۔ اب بھی یہ خواب ٹوٹا نہیں تھا۔ وہ اور کورا نامعلوم کشتی میں سوار نامعلوم ندی میں محو سفر آن دیکھی منزل کی طرف رواں تھے۔ گویش کے ترخانے سے نکلے ہی تاجان کے لئے زندگی نے باکی رفتار اختیار کر لی تھی۔ اچانک تاجان کو اپنے خیالات سے چو نکا پڑا۔ کشتی کے اگلے حصے سے ملی جلی آوازیں آ رہی تھیں۔ کشتی کی رفتار بھی اچانک کم ہو گئی تھی۔ غالباً کسی دوسری کشتی نے اس کشتی کو روک لیا تھا۔ چند لمحوں بعد کشتی مکمل طور پر رک گئی۔ تاجان سانپ کی طرح رنکٹا ہوا چند ہاتھ آگے گیا۔ اسے مشطوں کی روشنی میں مقدونی سپاہی نظر آئے وہ ایک فوجی کشتی میں سوار یہاں پہنچے تھے اور اب کشتی راںوں کو روک کر ان سے بات چیت کر رہے تھے۔ یہ دی سپاہی تھے جو قلعے سے ان کے پیچھے لگے تھے۔ تاجان کے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ آئندہ لمحوں میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ وہ دم سادھے بات چیت کا منظر دیکھتا رہا۔ پھر یہ جان کر اس نے سکھ کی سانس لی کہ مقدونی سپاہی واپس روانہ ہو رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد کشتی پھر اپنی نامعلوم منزل کی سمت روانہ ہو گئی۔ تاجان واپس اپنی پناہ گاہ میں آیا۔ ابھی وہ بمشکل آکر دروازہ ہی ہوا تھا کہ بھاری قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ کورانے سم کر تاجان کا بازو تھام لیا۔ تاجان نے آوازوں پر غور کیا تو اسے اندازہ ہوا کہ کشتی کا مالک جو ایک فربہ اندام شخص ہے گھوم پھر کر کشتی کا جائزہ لے رہا ہے۔ یعنی بت تھی کہ مقدونی سپاہی اسے ہوشیار باش کر گئے تھے۔ فربہ اندام شخص کے ساتھ ایک نحیف و زار ملازم بھی تھا۔ وہ دونوں کونوں کھدروں میں جھانک رہے تھے۔ تاجان کے پاس ہتھیار نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اگر لڑائی بھڑائی کی نوبت آتی تو اسے خالی ہاتھ ہی لڑنا تھا۔ خطرے کے احساس سے اس کے رگ پٹھے تن گئے۔

فربہ اندام شخص نے اپنے ملازم سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”ذرا اچھی طرح دیکھ لو کہیں کوئی اسٹیل میں ہی نہ چھپا بیٹھا ہو۔“

ملازم نے ہنسی لیتے ہوئے کہا۔ ”آپ سو جائیں میں دیکھ لیتا ہوں۔“

فربہ اندام نے اسے ڈانٹا۔ ”تم بخت دھیان سے۔“

ملازم جو مالک کا منہ چڑھا تھا فانس کر بولا۔ ”آقا“ یہ بھی کوئی سمجھانے کی بات ہے۔

ساتھ میں خوبصورت لڑکی بھی ہے۔ میں دھیان سے نہیں دیکھوں گا تو اور کون دیکھے گا۔“



مالک واپس چاہا گیا تو دہلے پتلے ملازم نے چند زوردار جہانیاں لیں پھر مشعل تھا سے اسخ کے پاس آیا۔ بے دلی سے چند ٹکڑے ادھر ادھر کے ایک دو جگہ تلوار چھوٹی پھر مالک پر بڑبڑاتا ہوا مستول کے قریب جا کر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد تاجان اور کورا اس کے خزانے سن رہے تھے۔

وہ رات تاجان اور کورا نے سفر میں گزاری۔ نصف شب کے بعد کشتی کھلے سمندر میں داخل ہو کر مغربی سمت بڑھنے لگی۔ اس سے تاجان کو اندازہ ہوا کہ کشتی ران مغربی ساحل کا رخ کر رہے ہیں۔ کھلے سمندر میں بھی دو تین جگہ کشتی روک کر کشتی رانوں سے پوچھ گچھ کی گئی۔ ان واقعات سے تاجان کے علم میں آیا کہ تیرے کی چار جانب زبردست نگرانی ہے۔ مین ممکن تھا کہ اس کڑی نگرانی کا تعلق بھی تاجان اور کورا کے فرار سے ہو۔ سردار شلال کے لئے تاجان و کورا کو پکڑنا موت و حیات کا سوال تھا۔

مشرق سے سپیدہ سحر نمودار ہو رہا تھا۔ جب کشتی رانوں کی آوازوں سے تاجان نے اندازہ لگایا کہ وہ ساحل تک پہنچنے والے ہیں۔ چو اب دھیمی رفتار سے چل رہے تھے اور کشتی کے دو بڑے بادبان بھی گرا دیئے گئے تھے۔ ارد گرد دوسری کشتیوں کے ملاحوں اور ماہی گیروں کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ وہ کسی کھاڑی میں داخل ہونے والے تھے۔ یکایک کشتی رک گئی۔ تاجان نے خود کو خشک اسخ کے ڈھیر میں سے نکالا اور گردن لمبی کر کے قریب وجوار میں دیکھا۔ یکایک اسے خطرے کا احساس ہوا۔ کھاڑی ابھی کافی دور تھی لیکن کشتی کو روک لیا گیا تھا اور یہاں رکی ہوئی یہ کوئی اکیلی کشتی نہیں تھی۔ چھوٹی بڑی کم از کم بیس کشتیاں اور دو بجرے تھے جنہیں روک کر ان کی تلاشی لی جا رہی تھی۔ ہر کشتی اور بجرے پر سرخ وردیوں والے مقدونوی سپاہی چڑھے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں مشعلیں اور عریاں تلواریں چمک رہی تھیں۔ تاجان کی نگاہ ساحل کی طرف اٹھی تو ایک اور نظارہ اسے حیران کرنے کے لئے موجود تھا۔ ویران ساحل پر روشنیوں کا جھلکا تھا۔ جہاں تک نگاہ جاتی تھی روشنیاں ٹھنڈی تھیں۔ ایک جھلکا سمندر تاجان کے سامنے تھا۔ جلد ہی وہ اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ سلاوا اعظم کی عظیم الشان فوج کا پڑاؤ اس کے مقابل ہے۔ سلاوا اعظم سکندر کی قرمت نے اس کے جسم کو ایک عجیب دلولے سے بھر دیا۔ اس نے ان روشنیوں کو نگاہوں سے بوسہ دیا کیونکہ ان میں سکندر تھا اور جہاں سکندر تھا وہاں مارشا بھی تھی۔ مارشا جو اس کی زندگی تھی اور مقصد زندگی بھی۔ اپنے قرب و جوار کے خطرات سے بے نیاز ہو کر اس نے اپنا کشادہ سینہ پھیلا دیا اور سانس اندر کی طرف

کھینچا۔ جیسے بادِ صبا میں تیرتی ہوئی زلف یار کی مسک کو اپنے ہر ذرہ بدن میں جذب کرنا چاہتا ہو۔ دفعتاً کشتی کا فرش وزنی جوتوں کی صدا سے لرز اٹھا۔ تاجان نے چونک کر دیکھا۔ درجنوں مقدونوی سپاہی تلواریں اور نیزے سونے کشتی پر چڑھ آئے تھے اور تلاشی شروع کر دی تھی۔ ایک کماندار کی بھاری بھر کم آواز تاجان کی سماعت سے نگرانی۔

اسخ اٹھا کر اگلے حصے میں پیٹھک دو۔ اچھی طرح تلاش کرو ہر کونے میں۔ کئی سپاہی اسخ کے ڈھیر کی طرف آئے اور بڑے بڑے ٹکڑے اٹھا کر نیچے پھینکنے لگے۔ اب یہاں چھپے رہنا موت کو دیکھ کر آنکھیں بند کرنے کے حراف تھا۔ تاجان نے کورا کے کان میں سرگوشی کی۔ ”تیر سگو؟“ کورا نے اثبات میں سر ہلایا۔ تاجان اور وہ اسخ کے ڈھیر سے نکلے نیچے سمندر کے بلکورے پتے پانی پر نگاہ ڈالے۔ سانس اندر کی طرف کھینچا اور دو قدم بھاگ کے چھلانگ لگادی۔ وہ دونوں چھپا کے سے پانی میں گرے اور نیچے اترتے چلے گئے۔ چند ہی لمبے بعد وہ پھر سطح آب پر تھے۔ کشتی پر شور و غل سنائی دے رہا تھا۔ یقیناً سپاہی جان چکے تھے کہ کوئی کشتی سے کودا ہے۔ وہ نیزے لہرا لہرا کر پانی کی طرف اشارہ کر رہے تھے اور چلا رہے تھے۔ پھر تاجان نے کئی افراد کو کشتی سے سمندر میں کودتے دیکھا۔

تاجان اور کورا کا تعاقب شروع ہو گیا تھا۔ تاجان نے ہانپتی ہوئی سرگوشی کی۔ ”جلدی کرو کورا۔“ کورا پہلے ہی مقدور بھر طاقت سے تیر رہی تھی۔ یہ زندگی اور موت کی دوڑ تھی۔ تاجان کو ساحل کی روشنیاں سامنے دکھائی دے رہی تھیں اور عقب میں موت کے ہر کارے تھے۔ وہ ایک دو نہیں تیسویں تھے۔ ان کے نکارے تاجان اور کورا کو صاف سنائی دے رہے تھے۔

”شاہپاش کورا تیز ہاتھ چلاؤ“ تاجان بار بار کورا کو اکسا رہا تھا۔ آخر ان کے ہاتھوں نے ساحل کی ریت چھوئی اور وہ پانی سے نکل کر پور دی رفتار سے بھاگتے ہوئے روشنیوں کے نیکیاں شہر میں داخل ہو گئے۔ یہ سینکڑوں ہزاروں نیچے اور سانپان تھے جن کے ارد گرد مشعلیں بھڑک رہی تھیں اور سواری کے جانور بندھے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں خوابیدہ پہریدار بھی گشت پر نظر آ رہے تھے۔ بے شمار پرچموں کے درمیان تاجان کی نگاہ اس بلند و بالا پرچم پر جمی تھی جو شاہی خیمہ گاہ کی نشاندہی کر رہا تھا۔ تاجان اس پرچم کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ جہاں یہ پرچم تھا وہیں پر شاہ سکندر تھا۔ حسن اتفاق سے یہ پرچم زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ تاجان اور کورا کو شش کرتے تو وہاں تک پہنچ سکتے تھے۔

"تیز بھاگو کورا!" تابان نے اس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے مڑ کر دیکھا  
نیصوں کی ایک قطار کے عقب سے ہانپے ہوئے مسلح سپاہی برآمد ہوئے۔ وہ ان کے پیچھے  
آ رہے تھے۔ سامنے سے پہریدار انہیں گھیرنے کی کوشش میں تھے۔ تابان سپرہاروں کو  
پکڑ دے کر ایک بغلی راستے پر مڑ گیا۔ چالیس پچاس قدم بھاگنے کے بعد وہ ایک ایسی جگہ  
پہنچ گئے جہاں سے شاہی خیمہ گاہ کے زرد تاریخے صاف دیکھے جاسکتے تھے۔ منزل دو ہاتھ پر  
تھی مگر اب شاہی دستے کے محافظوں نے انہیں گھیر لیا۔ ان کے چمکتے دسکتے نیزوں کے  
حصار میں اگر تابان نے اضطراب کی بجائے اطمینان محسوس کیا۔ وہ شاہی محافظوں کی  
دردیاں پہچان چکا تھا۔ اب اسے یقین تھا کہ سکندر کے علم میں لائے بغیر انہیں موت کے  
گھاٹ نہیں اتارا جائے گا۔

"کون ہو تم؟" ایک چاق و چوبند شاہی محافظ نے گرج کر پوچھا۔

"میرا نام تابان ہے میں اپنی آمد کا مقصد سالار اعظم کو بتاؤں گا۔"

شاہی محافظ اب غور سے تابان کی صورت دیکھ رہا تھا۔ اندھیرے میں وہ اسے کسی  
حد تک پہچان گیا تھا۔ اس دوران متعاقب سپاہی آندھی کی رفتار سے بھاگتے موقع پر پہنچ  
گئے۔ انہیں دیوانہ وار تابان اور کورا کی طرف لپکتے دیکھ کر شاہی محافظوں نے نیزے تان  
کر دونوں کو اپنی حفاظت میں لے لیا۔

☆-----☆

منظر سالار اعظم سکندر کے خیمے کا تھا۔ یہ وسیع و عریض خیمہ کئی حصوں میں منقسم  
تھا۔ کشادہ نشست گاہ میں دبیز قالین بچھے تھے اور دیواروں سے ریشم و کوناب کے تھان  
جھول رہے تھے، خیمے کے بانسوں پر منقش طلائی خول ماحول کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے  
تھے۔ سکندر روٹی کا ٹوٹ پنے مسند پر جلوہ افروز تھا۔ اس کے عقب میں مسلح محافظ تھے اور  
اطراف میں حسین و جمیل خادماں منوب کھڑی تھیں۔ تابان اور کورا کو سکندر کے  
سامنے پیش کیا گیا۔ تابان کو دیکھ کر سکندر جہاں حیران نظر آ رہا تھا وہاں قدرے برہم بھی  
تھا۔

"تو تم ابھی زندہ ہو؟" اس نے تابان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ سکندر  
کے اس انداز نے تابان کے جسم میں خفیف جھرجھری پیدا کر دی۔ تاہم جلد ہی اس نے  
خود کو سنبھال لیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"ہاں..... جہاں پناہ میرے نصیب میں ابھی آپ کی قدم بوسی باقی تھی۔"

سکندر نے بے رحمی سے کہا۔ "تم تمہاری خوش کلامی سے متاثر ہونے والے  
نہیں تمہاری اصلیت تمہارے دوستوں نے عیاں کر دی ہے۔ اب بھڑکھا کہ تم یہاں نہ  
آتے اور اپنے لئے کوئی آسان موت منتخب کرتے۔"

"جہاں پناہ! غلام جسارت کی معافی چاہتا ہے۔ جنہیں آپ دودھت فرما رہے ہیں وہ  
میرے بدترین دشمن ہیں۔ وہ میرے لوہے کے پیاسے ہیں ہر جگہ مجھے ڈھونڈ رہے ہیں۔ اگر  
مجھے آپ کے قدموں میں پناہ نہ ملتی تو اب تک میری لاش آبی جانوروں کا رزق بن چکی  
ہوتی۔"

سکندر دھاڑا۔ "کیا بڑیاں بک رہے ہو تم۔ جن کے خلاف ہرزہ سرائی کر رہے ہو  
وہ میری فوج کے باعث مہمیدار ہیں۔ کیا تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ ان سرداروں نے  
تمہارے حوالے سے کوئی جھوٹ بولا ہے؟"

تابان نے کہا۔ "جہاں پناہ میں یہ دعویٰ کیسے کر سکتا ہوں جبکہ مجھے معلوم ہی نہیں  
انہوں نے میرے بارے میں آپ کو کیا بتایا ہے۔"

"وہ سب کچھ بتایا گیا ہے جو تم نے کیا ہے۔ تم نے اہم عسکری رازوں کا سودا کیا  
ہے اور جب تمہاری غداری کا پول کھلا اور سردار شلال نے تمہیں گرفتار کر کے واپس  
مقدونیہ لانا چاہا تو تم نے انجام سے بچنے کے لئے زہر کھایا..... کیا یہ غلط ہے؟"

تابان نے بڑے تحمل اور حوصلہ مندی سے یہ سب کچھ سنا پھر نہایت عاجزی سے  
گویا ہوا۔ "میں جانتا تھا جہاں پناہ میرے بدخواہوں نے کوئی ایسی ہی کہانی آپ کے گوش  
گزار کی ہوگی۔ میں اس کے سوا اور کیا عرض کر سکتا ہوں کہ جو کچھ آپ کو بتایا گیا درست  
نہیں تھا۔"

سکندر کی عقاب نگاہیں تابان کی آنکھوں میں پیوست تھیں۔ وہ کتنی ہی دیر خاموشی  
سے اسے دیکھتا رہا پھر اس نے مخصوص انداز میں تلی بھائی۔ یہ حاضرین کے لئے اشارہ تھا  
کہ شاہ مقدونیہ تحلیلہ چاہتا ہے۔ ایک ترتیب کے ساتھ تمام افراد خیمے سے باہر نکل گئے۔  
اب صرف دو گونگے بھرے محافظ سکندر کے عقب میں کھڑے تھے یا ایک پہرے دار خیمے  
کے دروازے پر تھا۔ کورا اور تابان شاہ مقدونیہ کے قدموں میں دوڑاؤ بیٹھ گئے۔ سکندر  
نے بارعب آواز میں کہا۔

"کیا کہنا چاہتے ہو تم؟"

تابان بولا۔ "شاہ مقدونیہ! دلو تا آپ کا اقبال بلند کریں۔ غلام کی جان آپ کے



قدموں پر پھلور ہے۔ میں جان بچانے کے لئے نہیں صرف حقیقت حال واضح کرنے کے لئے زبان کھول رہا ہوں۔ میری زندگی زہر خورانی کے سبب خطرے میں ضرور پڑی تھی لیکن مجھے یہ زہر کھلایا گیا تھا۔ اور کھلانے والے سردار شلال، گونسل اور نورین تھے انہوں نے مجھ سے وہ دستاویزات چھیننے کے لئے ایسا کیا تھا جو میں نے جزیرہ سامو تحریر سے حاصل کی تھیں۔“

22

سکندر کی آنکھوں میں حیرت اور بے یقینی کے آثار نظر آئے۔ وہ بولا۔ ”تمہارا مطلب ہے کہ وہ نوشتہ جات تم نے تن تما حاصل کئے تھے۔“

”جی ہاں عالم پناہ! آپ میرے بیان کی تصدیق فرما سکتے ہیں۔ جزیرہ سکوپے لاس کا فرمانروا ایک غیر جانبدار شخص ہے۔ وہ آپ کو حقائق سے آگاہ کر سکتا ہے۔ وہ سردار شلال کی عداوت مول لینا نہیں چاہتا تھا اس لئے بہت کچھ جانتے بوجھتے بھی خاموش رہنے پر مجبور تھا۔“

سکندر نے کہا۔ ”اگر تمہاری بات مان لی جائے تو تم یہ بتانا پسند کرو گے کہ وہ نوشتہ جات تمہیں کہاں سے ملے؟“

تہاں نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”اس شخص سے جو عالی مرتبت شاہ فیقوس کے دور میں تحقیقات کی غرض سے مشرقی سواحل کے سفر پر روانہ ہوا تھا۔ میری مراد زرتاب سے ہے۔ میں اسٹیمین کے ایک جزیرے میں اس کا کھوج لگانے میں کامیاب رہا تھا۔“

”اب وہ شخص کہاں ہے؟“

”میرے ہاتھوں ہلاک ہو کر سکندر کی نذر ہوا تھا۔“

”بہت خوب، عجیب بات ہے کہ ایک ہی شخص دو طرح سے ہلاک ہوا۔ تم کہہ رہے ہو وہ ڈوب گیا جبکہ سردار شلال اور نورین وغیرہ کا کہنا ہے کہ ایک لڑائی کے بعد وہ ڈر کر بھاگا اور جنگی کتے اسے نوچ کر کھا گئے۔ بہر طور تمہاری بات غور طلب ہے۔“

سکندر کی کشادہ پیشانی پر تفکر کی لکیریں تھیں۔ شاید وہ سچائی تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ زرتاب کے بارے میں تہاں اور شلال دونوں نے اس سے جھوٹ بولا ہے۔ شلال نے تو اس لئے جھوٹ بولا تھا کہ اسے کچھ معلوم ہی نہیں تھا۔ جبکہ تہاں نے اپنے وعدے کا پاس رکھتے ہوئے جھوٹ کا سہارا لیا تھا۔ وہ وعدہ جو اس نے دو پیار کرنے والوں اور ان کے معصوم بچے سے کیا تھا۔ اچانک سکندر کے ذہن میں کوئی خیال ابھرا۔ اس نے پوچھا۔

”اس ایرانی سوداگر کا کیا ماجرا ہے جو تمہارا دوست تھا؟“

تہاں نے کہا۔ ”سالار اعظم وہ سوداگر درحقیقت امتیاز کا ہی ایک غلام ہے اس کا نام ہوشمند ہے۔ آپ تصدیق فرما سکتے ہیں کہ چند ماہ پہلے تک وہ میرے ساتھ ہی ایک شادی گھرانے کی تحویل میں تھا۔ میں برس سے وہ ایران گیا ہے اور نہ وہاں کے کسی فرد سے اس کا تعلق ہے۔“

سکندر اب تہاں کی باتوں میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ اس نے ان دونوں کو ہدایت کی کہ وہ قالین سے اٹھ کر سامنے نشست پر بیٹھیں۔ تہاں اور کورا شکرہ ادا کر کے نشست پر بیٹھ گئے۔ سکندر نے کورا کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”ہمارا خیال ہے یہ وہی کنیر ہے جو ہم نے پہلی ملاقات میں تمہیں سونپی تھی۔“

تہاں نے اقرار میں سر ہلایا۔ ”جی ہاں عالم پناہ اس کنیر کی روئیداد بھی آپ کی توجہ جاتی ہے۔“

سکندر سوالیہ نگاہوں سے کورا کی جانب دیکھنے لگا۔ کورا نے سہمی نظروں سے پہلے تہاں کی سمت دیکھا پھر سکندر کے پُر جلال چہرے پر ایک نگاہ ڈال رک اپنی چپٹا نہانے لگی۔ اس نے مختصر الفاظ میں رک رک کر بتایا کہ کس طرح لوٹ مار کے دوران سردار شلال اس کے ہاتھوں زخمی ہو کر ہمیشہ کے لئے اس کے خون کا پیاسا ہو چکا ہے۔ اس نے سردار شلال کے ہاتھوں اپنے اغوا کا ذکر کیا اور سمندری سفر کے دوران شلال اور اس کے ساتھیوں کی دست درازی کا واقعہ سنایا۔ ہاون کے قید خانے سے لے کر سکوپے لاس کے شادی محل تک پہنچنے اور پھر تہاں کی گمشدگی تک سارے واقعات اس نے اختصار سے بیان کر دیئے۔ بار بار اس کی آنکھیں بھیگ جاتی تھیں اور وہ اپنے دہلتے سینے پر ہاتھ رکھ کر کمری سانس لینے لگتی تھی۔ اس کا لہجہ چیخ کر چپائیوں کی گواہی دے رہا تھا۔ وہ دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی ایک فریاد تھی جو براہ راست دل پر اثر کر رہی تھی۔ کورا کی روئیداد ختم ہوئی تو وہ بچکیوں سے رو رہی تھی۔ یہ آنسو غم کا نذرانہ تھے اور اس خوف کا نتیجہ بھی جو بادشاہ وقت کے سامنے زبان کھولنے کے سبب کورا کے حواس پر چھارہ پھل رہا تھا۔ وہ ان بچکیوں کو جس قدر روکنے کی کوشش کرتی تھی وہ اتنی ہی بلند ہو رہی تھیں۔ آخر کورا کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخیں نکلیں اور وہ نازک اندام بے ہوش ہو کر سکندر کے قدموں میں جا گری۔

گو ننگے سرے محافظ لپک کر آئے۔ انہوں نے کورا کو سہارا دے کر قالین سے اٹھایا

سپاہی جنگی ترانے لایچے رہے اور ہومری شہر آفاق نظم ایلید کے شعر پڑھتے رہے آخر دور سے ایشیائی ساحل کی سرخی مائل زمین نظر آنے لگی اور "ٹرائے" کی تاریخی پہاڑی بھی دکھائی دینے لگی۔ یہی پہاڑی تھی جہاں سکندر کے آباء اجداد نے بے مثال جنگی کارنامے انجام دیے تھے۔ اس پہاڑی کے پیچھے سلسلہ کوہ کے مناظر تھے۔ یہ سلسلہ ریزہ کی بڑی کی مانند دور تک پھیلا ہوا تھا۔ عسکری دستوں نے کشتی سے اتر کر ایشیائی ساحل پر قدم رکھا تو ان کے چہرے جوش سے تھمارہے تھے۔ سب نے مل کر زندہ باد مبارک اور سلامت باشد کے نعرے لگائے۔ راستے میں کہیں ایرانی جہاز یا جنگی کشتیاں نظر نہیں آئیں۔ ایک طرح سے یہ نیک شگون تھا کہ مقدونی فوج بغیر کسی مزاحمت کے ساحل پر پہنچ رہی تھی اور پھر سالار اعظم سکندر بھی آہنائے پار کر آیا۔ اس نے زرہ بکتر پہن رکھی تھی۔ سر پر آہنی خود تھا جو سورج کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ اس پر سفید پر لہرا رہے تھے۔ جب اس نے کشتی سے کود کر ایشیائی ساحل پر قدم رکھا تو ایک جوشیلے سپاہی نے آگے بڑھ کر عشق بچیاں کا ہار اس کے گلے میں ڈال دیا۔ سکندر کے پیچھے سے پیشتر ہی مقدونی سپاہی سینکڑوں کی تعداد میں سنگ سرمر کے کلڑے جمع کر چکے تھے۔ ان چھوٹے بڑے کلڑوں کو ملا کر سب سے بڑے دیوتا زئوس کے لئے قریان گاہ بنائی گئی۔ یہ دیوتا مسافروں کا محافظ سمجھا جاتا تھا۔ ایک قریان گاہ ایتھینا دیوی کے لئے بھی بنائی گئی۔ اس سے مقصود یہ تھا کہ ان اہل ایتھنز کی حوصلہ افزائی کی جائے جو اس مہم میں ساتھ دے رہے ہیں یا دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ دونوں قریان گاہوں پر سنہری پیالے سے شراب اندھالی مٹی پھر یہ عظیم لشکر ایک ترتیب کے ساتھ آگے بڑھا اور ٹرائے پہنچ گیا۔ ٹرائے شہر کی فیصل خست حال تھی اور برج گردش روزگار سے گر چکے تھے ٹرائے کی پہاڑی کے گرد بہت سے کھنڈر تھے۔ مقدونی سپاہی ان کھنڈروں میں ٹھوم پھر کر پرانی یادگاریں دیکھنے لگے۔ پہاڑی کے ارد گرد رہنے والے لوگ جو زیادہ تر مای گیر اور تاجر تھے اس لشکر کی آمد پر بے حد حیران تھے۔ وہ سب سکندر کے گرد جمع ہو گئے اور بڑی سادگی سے مقامی حالات بیان کرنے لگے۔

تَابَان سکندر کے قریب ہی موجود تھا۔ اسے مقامی لوگوں کی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی نہ ہی اس کے لئے ان کھنڈرات میں کوئی کشش تھی۔ اس کی نگاہیں مسلسل سردار شلال کو ڈھونڈ رہی تھیں مگر وہ کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ نہ ہی گونسل یا نورین نظر آتے تھے۔ سکندر حالانکہ کورا اور تَابَان کو اپنی امان میں لے چکا تھا پھر بھی تَابَان کو عیار

اور بازوں میں سنبھال کر پیچھے سے باہر لے گئے۔ اب غیے میں مکمل سکوت تھا۔ سکندر سکی جھنجھٹے کی طرح بے حرکت بیٹھا تھا۔ تَابَان بھی خاموش تھا۔ دروازے پر کھڑا پیردار بھی ساکت و جامد تھا۔ ایسی خاموشی تھی کہ دھڑکنوں کی صدا بھی سنائی دے رہی تھی۔ دفعتاً یہ سکوت ٹوٹ گیا۔ سکندر نے اپنے سڈول برہنہ بازو اٹھا کر تابی بھائی۔ چاقو و چوہند محافظ تیزی سے اندر آئے اور تعظیم پیش کر کے سلاکت کھڑے ہو گئے۔ سکندر نے رعب دار آواز میں حکم صادر کیا۔

"سردار شلال، سردار گونسل اور کمان دار کورین کو حاضر کیا جائے۔۔۔۔۔۔ اس کے علاوہ جزیرے سکوپے لاس کے فرمانروا کو راز داری کے ساتھ یہاں لانے کا انتظام کیا جائے۔"

ہوشیار محافظ سکندر کے دو جملوں سے اس کا پورا مدعا جان گئے۔ انہوں نے آبدار کھواروں کے پیش قیمت قبضوں پر ہاتھ رکھ کر سر جھکائے اور تن کر کھڑے ہو گئے۔ سکندر نے تَابَان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دوسرا حکم صادر کیا۔

"ان دونوں کو پڑاؤ میں پہنچا دیا جائے۔ یاد رہے یہ ہماری حفاظت میں ہیں۔ انہیں نقصان نہیں پہنچنا چاہئے۔"

محافظوں نے ایک بار پھر سر جھکا کر اطاعت مندی کا اظہار کیا۔ تَابَان اپنی جگہ کھڑا ہو گیا اور محافظ اسے لے کر پیچھے سے باہر آ گئے۔

☆-----☆-----☆

اگلا دن یونان کی تاریخ کا بے حد ہنگامہ خیز دن تھا۔ اس دن فینقوس کے بیٹے سکندر نے جو آئندہ دنوں میں سکندر اعظم کا لقب اختیار کر کے چار دانگ دہر شہرت پانے والا تھا۔ آہنائے دانیال کو پار کیا اور ایشیائی سرزمین پر قدم رکھا۔ وہ ایک چمکیلا دن تھا۔ مطلع صاف تھا۔ باد شمال نے آہنائے کی ابھری ہوئی موجوں میں ایک گولیں سکون پیدا کر رکھا تھا۔ غار چوچوں نے لشکر میں اعلان کیا کہ آج سکندر عبور کر کے مشرقی ساحل پر پیش قدمی کی جائے گی۔ افواج میں جوش و خروش کی ایک تند لہر ابھری۔ سینے شوق سے بھر گئے اور نگاہیں سبے قرار ہو گئیں۔ سکندر کی ہدایات پر چھوٹی چھوٹی مای گیر کشتیوں اور تجارتی جہازوں کے بیڑے نے دانیال کی انتہی سے فوج کو ایشیائی ساحل پر پہنچانے کا کام شروع کیا۔

تَابَان اور کورا بھی ایک ایسی ہی کشتی میں سوار روانہ ہوئے۔ راستے بھر مقدونی



شلال کی جانب سے خطرہ تھا۔ شلال دل کا بھی اتنا ہی بھیانک تھا جتنا اس کا چہرہ بھیانک ہو چکا تھا۔ وہ کسی لمحے کسی بھی جگہ کو مار پر قیامت بن کر ٹوٹ سکتا تھا۔ تاجان نے اس کی آنکھوں میں کورا کے لئے ہیٹ ایک وحشیانہ درندگی دیکھی تھی۔ وہ جانتا تھا شلال کو جس روز اس درندگی کے اظہار کا موقع مل گیا کورا ایک زندگی میں سینکڑوں موتوں کا صدمہ جھیلنے پر مجبور ہو جائے گی۔ کورا مسلسل تاجان کے بازو سے لگی ہوئی تھی۔ جیسے وہ ایک دو شیر نہ ہو کس بھی ہوئے پر جھوم ملے میں اپنے سر پرست سے بچھڑنے کا اندیشہ ہو۔ تاجان کو سمجھ نہیں آ رہی تھی شلال وغیرہ کہاں ہیں۔ اس نے قریب سے گزرتے ایک یک صدی سردار کو روک کر اس بارے میں پوچھا تو اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ اس کا خیال تھا کہ سالار اعظم نے انہیں کسی مہم پر روانہ کیا ہوگا۔ تاجان کو دوسری پریشانی ہو شمند کے سلسلے میں تھی۔ وہ جزیرہ سکوپے لاس بی میں رہ گیا تھا۔ سکوپے لاس سے تاجان کو کورا کو اتنی جلدی لگنا پڑا تھا کہ وہ ہو شمند کی عیادت کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اسے دوبارہ دیکھنے کی حسرت تاجان کے دل ہی میں رہ گئی تھی۔

ایکایک ایک جانب سے شور بلند ہوا۔ پتہ چلا کہ کھنڈرات میں قدیم یونانی سوراؤں ایکے لیو اور پیروکلوس کی قبریں موجود ہیں۔ ان قبروں کا سراغ بھی مقامی لوگوں نے دیا تھا۔ تاجان نے سکندر کو تیزی سے ان قبروں کی طرف جاتے دیکھا۔ اس دریافت پر وہ بے حد حیران نظر آتا تھا۔ گھنے درختوں کے نیچے پہنچ کر وہ گہری دلچسپی اور مست عقیدت سے قبروں کی ان ڈھیریوں کو دیکھتا رہا۔ اس نے مقامی لوگوں سے ان قبروں کے بارے مختلف سوالات پوچھے۔ اب شام ہو چکی تھی ان قبروں کے ارد گرد مٹھیں گاڑی گئیں اور جشن کا اہتمام کیا گیا۔ اظہار عقیدت کے لئے فوج کے ممتاز سرداروں نے اس جگہ بیٹھ کر شراب پی اور مغنیوں نے منظوم تاریخی قصے گا کر بیان کئے۔ جب نشہ تیز ہو گیا تو بعض سرداروں نے اپنے سروں پر پھول سجائے اور رقص کرنے لگے۔ سالار اعظم سکندر بھی ان میں شامل تھا۔ وہ ہانسی بجا بجا کر دالمان ناچ رہا تھا۔ اتنے میں گہرا لہو اپنے سینے کچھ بھاری سکندر کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان کی آمد پر رقص ختم کیا اور سب سردار پجاریوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ پجاریوں نے سکندر کو ایک سیاہ ڈھال اور ایک ٹوٹا ہوا برہم پیش کیا۔ انہوں نے بتایا کہ یہاں پاس ہی ایک قدیم معبد ہے یہ دونوں اشیاء عرصہ دراز سے وہاں محفوظ ہیں اور ان کے بارے پورے یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ یہ یونانی ہمارے ایک لیز کی ہیں۔ سکندر اور اس کے سرداروں نے ان اشیاء کو بے حد غور سے دیکھا پھر ان کے

چہروں پر عقیدت نمودار ہوئی۔ وہ تادیس ان اشیاء میں کھوئے رہے۔ جب سکندر نے سیاہ ڈھال نیک شگون کے طور پر اپنے پاس رک لی اور اس کی جگہ اپنی ڈھال پجاریوں کو دے دی تاکہ معبد میں رکھ دی جائے۔ اس کے علاوہ پجاریوں کو انعام و اکرام سے بھی نوازا گیا۔

تاجان اور کورا عام لشکریوں کے ہجوم میں کھڑے یہ سارے مناظر دیکھ رہے تھے۔ اس دوران چند ہاپے ہوئے گھڑسوار ہجوم میں سے راستہ بناتے مرکز کی جانب آتے دکھائی دیئے سکندر کے قریب پہنچ کر وہ گھوڑوں سے اترے اور جھک کر تعظیم پیش کی۔ یہ سب کے سب مقامی دہقان نظر آتے تھے۔ وادیاں بڑھی ہوئی لباس بوسیدہ اور پاؤں ننگے۔ تاجان سمیت بہت سے لوگوں کو حیرانی ہوئی کہ یہ بے حیثیت لوگ دندناتے ہوئے سالار اعظم تک کیسے کھرکے پہنچ گئے ہیں لیکن جلد ہی یہ حیرت دور ہو گئی۔ یہ لوگ دہقانوں کے ہمیں میں مقدونی فوج کے جاسوس تھے۔ ان کے چہروں پر پچانی کیفیت تھی۔ انہوں نے سکندر کو بتایا کہ مشرقی جانب سے بھاری ایشیائی فوج کوچ کرتی چلی آ رہی ہے۔

یہ اطلاع بے حد سرعت سے لشکر کے طول و عرض میں پھیل گئی۔ تاہم کسی ایک شخص کے چہرے پر بھی تشویش کے آثار نظر نہیں آئے۔ آخر یہ سب کچھ تو ہونا ہی تھا۔ وہ لڑنے کے لئے آئے تھے۔ دشمن کی سرزمین پر پیش قدمی کر رہے تھے۔ جلد یا بدیر دشمن نے اپنی موجودگی کا ثبوت تو دینا ہی تھا۔ رات کا باقی حصہ لڑائی کی تیاری میں کٹا۔ جاسوس لہجہ بہ لہجہ سالار اعظم کو دشمن کی نقل و حرکت سے آگاہ کرتے رہے۔ تاجان نے کورا کو ان خیموں میں پہنچا دیا جو لشکر کے عقب میں عورتوں کے لئے مخصوص تھے۔ جب تاجان کورا کو الوداع کہہ رہا تھا اس کی آنکھوں میں خوف آنسو بن کر لرز رہا تھا۔ تاجان نے کہہ "گھبراؤ نہیں کورا تم شاہ مقدونیہ کی بہن میں ہو تمہارا بال بچا نہیں ہوگا۔"

کورا نے کہہ "آپ..... میرا مطلب ہے تم لوٹ آؤ گے ناں؟"

تاجان مسکرایا۔ "تم انتظار کرو گی تو فرار لوٹ آؤں گا۔"

کورا بولی۔ "میرا دل چاہتا ہے میں کی میدان جنگ میں تمہارے ساتھ رہوں۔"

"اور میں تمہاری حفاظت کرتا ہوں اپنے سر سے ہیکدوش ہو جاؤں۔" تاجان نے اس کی بات مکمل کی۔

کورا نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر "دو بار تم کریں۔ ایسی بات مت کہو۔"

تاجان نے ایک حوصلہ بخش مسکراہٹ کورا کی طرف اچھالی اور اس سے رخصت

ہو کر وہیں لشکر کی طرف چل دیا۔ اس کا رخ ان گھڑ سوار دستوں کی طرف تھا جو پہاڑی کے دامن میں جنگی مشینیں کر رہے تھے۔ ان مشینوں کو دیکھ کر ایک عجیب ولولہ تہاں کی رگوں میں بھرتا جا رہا تھا۔ زندگی اور موت کا کھیل اس کا دل پسند مشغلہ تھا۔ خطرات میں گھر جانا اس کے لئے ایسے ہی فرحت بخش تھا جیسے مچھلی کا خشکی سے پانی میں گر پڑنا۔ علی الصبح سکندر کو اطلاع ملی کہ ایرانیوں کا لشکر مقابل پہنچ گیا ہے۔ اپنے تجربہ کار سالار پارمینو کے مشورے سے سکندر نے فوج کو دو حصوں میں تقسیم کیا اور دونوں حصوں کو منظم طریقے سے دریائے ”گرینی کس“ کی جانب بڑھایا۔ تہاں فوج کے جس حصے میں تھا وہ سکندر کی زیر قیادت آگے بڑھ رہا تھا۔ دوسرا حصہ پارمینو کی کمان میں تھا۔ دور چڑھتے سورج کی کرنوں میں ایڑا پہاڑ اور ایشیائی اولپس کی سفید چوٹیاں روشن میدانوں کی طرح دکھ رہی تھیں۔ عقب میں آبنائے کانگلوں پانی تھا اور سامنے جوش و خروش سے بہتا دریائے گرینی کس۔ جب مقدونی فوج دریا کے کنارے پہنچی تو اسے پہلی مرتبہ اپنے دشمن کی ہتھک نصیب ہوئی۔ دریا کے اس پار ایشیائی دستوں کا جھوم تھا۔ ان کے لباس مقدونی سپاہیوں سے مختلف اور عجیب وضع کے تھے تاہم ان کے گھوڑے نہایت صحت مند تھے اور گھڑ سوار چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹے دریا کے ساتھ ساتھ دوڑیں لگا رہے تھے۔ سواروں نے کٹلے لہاوے پن رکھے تھے۔ ان کی ٹوپیاں رنگین تھیں چھوٹی چھوٹی ڈھالیں اور کوتاہ قیامت برہمچیاں ان کے کولہوں سے لٹک رہی تھیں۔ مقدونی سپاہ کو دیکھ کر ایشیائی سپاہی جوش و خروش کا مظاہر کرنے لگے اور کچھ دسے نعرہ زنی کرتے تھے۔ دریا کے کنارے پہنچ گئے۔ کچھ ہی دیر بعد دونوں طرف کے سپاہیوں میں زبانی جھیمڑ جھماڑ شروع ہو گئی۔ ایشیائی سپاہی زیادہ شوخی دکھا رہے تھے وہ مقدونی سپاہیوں پر آوازے کس رہے تھے اور انہیں عجیب و غریب ناموں سے پکار رہے تھے۔ کسی نے پکار کر کہا۔

”ادوبانیو! تمہیں کس نے معاوضہ دے کر یہاں مرنے کے لئے بھیج دیا ہے۔ کون ہے تمہاری جانوں کا دشمن؟ ذرا اس کا نام تو بتاؤ۔“

کسی من چلے نے ہانک لگائی۔ ”کیا تم غور نہیں ہو کہ تم نے گھاگھرے پن رکھے ہیں۔“

جو زیادہ بلند آواز میں نہیں بول سکتے تھے۔ وہ مضحکہ خیز اشاروں سے مقدونی سپاہیوں کو تاؤ دالنے میں مصروف ہو گئے۔ سکندر کا جوان خون کھول گیا۔ اسے مقابل فوج کا یہ عامیانہ انداز بالکل پسند نہیں آیا۔ یوں بھی وہ ہمیشہ سے آگے بڑھ کر مقابلہ کرنے کا

عادی تھا اور دشمنی کی دعوت کا بروقت جواب نہ دینا اس کی شان کے خلاف تھا۔ وہ ایک نیلے پر چڑھ گیا اور با آواز بلند سپاہیوں کو پکار کر بولا۔

”ساتھیو! اپنے ہتھیار تول لو! ہم دریا پار کر کے حملہ کریں گے۔“

تہاں نے دیکھا سکندر کا چہرہ اندرونی جوش سے تھم رہا ہے۔ ابھی تقریر کا اگلہ جملہ سکندر کے ہونٹوں تک نہیں پہنچا تھا کہ بوڑھا سالار پارمینو آگے بڑھا اور اس کے قریب جب کہ سرگوشیاں کرنے لگا۔ صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ سکندر سے اختلاف کر رہا ہے اور ہمیشہ کی طرح اس کا مشورہ یہی ہے کہ جوش کی بجائے ہوش سے کام لیا جائے اور ابھی دریا پار کرنے کی بجائے ہتھک کی طرف متوجہ رہا جائے۔ سکندر بار بار نفی میں سر ہل رہا تھا۔ ردہ کر اس کی نگاہیں ایشیائی دستوں کی طرف اٹھ جاتی تھیں جو مسلسل نعرہ زنی کر رہے تھے۔ آخر پارمینو سر جھکا کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے سر دلائل، شعلہ فشاں نوجوان کو قائل نہیں کر سکتے تھے۔ سکندر نے اپنی تقریر دوبارہ شروع کی۔ اس مختصر لیکن نہایت ولولہ انگیز خطاب کا خلاصہ یہی تھا کہ تاریخی دشمن سامنے ہے اس پر تاریخی یلغار کرو اور پہلی ضرب ہی ایسی لگاؤ کہ سر زمین ایران کے اس سرے سے آخری سرے تک ہر شے تھرا اٹھے۔

سکندر کے الفاظ نے لشکر میں برقی لہریں دوڑا دیں۔ پرچم بلند ہوئے اور عوامی کھوار میں چمکنے لگیں۔ یہ لشکر اب ایک ایسے تیر کی مثل تھا جو کمان میں کھینچا رکھا تھا اور ایک جنبش سے نشانے کی طرف روانہ ہو سکتا تھا۔ سکندر نے ہراول کو حکم دیا کہ وہ فوراً دریا میں اتر پڑے اور خود گھوڑے پر سوار سمندر میں سب سے آگے جا کھڑا ہوا۔ تہاں نے دیکھا ہراول کے دریا میں کودتے ہی سکندر نے بھی اپنی کھوار بلند کی اور اپنے ساتھیوں کو ابھارتا ہوا دھیرانہ دریائے گرینی کس میں کودا، بارش کے سبب دریا زور پر تھا۔ چند لمحوں کے لئے محسوس ہوا کہ اترنے والوں کے پاؤں اکھڑ جائیں گے مگر پھر چند ایک کے سوا سب سوار سنبھل گئے۔ سالار اعظم سکندر اور دیگر جانباز سرداروں کو دشمن کی جانب بڑھتا دیکھ کر تہاں کی رگوں میں آتش بھڑک اٹھی اس کا جی چاہا وہ گھوڑے کو ہوا میں اڑا کر عفو کو پار کرے اور پانی میں اتر جائے مگر نظم و ضبط اس کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ ابھی تہاں کے دسے کو دریا میں اترنے کا حکم نہیں ملا تھا۔ تہاں نے بے قراری کے عالم میں دیکھا، دوسرے کنارے سے سکندر اور اس کے ساتھیوں پر تیروں کی بارش ہو رہی تھی۔ ہماؤ اتنا شدید تھا کہ نہ چاہنے کے باوجود سکندر اور اس کے جانباز بائیں رخ پر ہٹ گئے تھے اور یوں ایرانی ”قلب“ کے عین سامنے آ گئے تھے۔ یہ صورت حال مخدوش تھی۔



اس مقام پر بھاری ہتھیاروں والے بہترین ایرانی سوار متعین تھے۔ جو نئی مقدونی سپاہی کنارے پر پہنچنے پر دست لڑائی چھڑ گئی نعرے بلند ہوئے، برچھیاں چکیں، تلواریں کوندیں اور ہر طرف ہنگامہ مچا رہا ہو گیا۔ تاجان نے کئی مقدونیوں کو زخم کھا کر دریا میں گرتے اور تیز بہاؤ میں بہتے دیکھا، پھر وہ مشکل ترین لمحات آئے جب گھسان کی جنگ میں سالار اعظم بھی گر گیا۔ دشمن کے جنگجو اس پر عقابوں کی طرح بھجنے اور مقدونی سرفروشان نے اپنے جسموں کو دھال بنا کر پیش کر دیا۔ کچھ دیر کے لئے یوں لگا کہ یہ عظیم سرفراہدا میں ہی اپنے انجام کو پہنچ رہا ہے۔ اڑدھام میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ یہی لمحے تھے جب مکنداروں کی طرف سے تازہ دم دستوں کو آگے بڑھنے کا حکم ملا۔ تاجان کا دست بھی ان میں شامل تھا۔ سوار گھوڑے دوڑاتے ہوئے دلیرانہ پانی میں اترے اور مقام جنگ کی طرف بڑھنے لگے۔ تاجان ان سواروں میں سب سے آگے تھا۔ کنارے کے پتھروں پر چڑھتے ہی اس نے اپنا گھوڑا اس مقام کی طرف دوڑایا جہاں سکندر کے گرد گھسان کا رن پڑا ہوا تھا۔ کم از کم میں گھڑ سوار تاجان کے ساتھ تھے۔ یہ دست دیوانہ وار دشمن پر جا پڑا۔ ہتھیار ٹکرائے اور خون مندا اجسام سے خون کے فوارے ابل پڑے۔ اس شدید جھیلنے سکندر اور اس کے سپاہیوں پر دباؤ کم کر دیا۔ تاجان نے سکندر کو زمین سے اٹھتے دیکھا۔ اس کی خود ایک طرف سے پھکی ہوئی تھی اور وہ معمولی زخمی بھی ہوا تھا۔ تاہم ایک بار سنبھلنے کے بعد وہ دشمنوں کے لئے موت بن گیا۔ وہ دلیرانہ دشمنوں میں گھس گیا اور اس کی تلوار نے کشتوں کے پٹھے لگا دیے۔ یہ سکندر کا وہ روپ تھا جس کے لئے وہ مشہور تھا اور اپنے پرانے اس کی اطاعت کرتے تھے۔ یہ ایک جوشیلے نوجوان کا روپ تھا جو ایک منہ زور ریلے کی طرح میدان جنگ میں داخل ہوتا تھا اور مقابل کو خس و خاشاک کی طرح ہمالے جاتا تھا۔ ایک بار مقدونی دستوں کے قدم جم گئے تو انہوں نے ایسا شدید حملہ کیا کہ تھوڑی ہی دیر میں مقابل فوج سینکڑوں لاشیں و زخمی چھوڑ کر بھاگ نکلی۔ اس مرحلے میں وہ کرایہ دار یونانی فوجی بھی بھاگ کھڑے ہوئے جو اب تک چٹان کی طرح تھے رہے تھے۔ اب مقدونی فوج کے لئے میدان صاف تھا۔ جھگوڑے سپاہیوں کو گھیر گھیر کر قتل کیا گیا اور قریباً دو ہزار کرائے کے یونانی فوجی گرفتار کر لئے گئے۔ سکندر اپنے ہم نسلوں کو دیکھ کر حیران ہوا تو پارمیون نے کہا۔ ”اگر آپ یونانیوں کے مقابل یونانیوں کو دیکھ کر حیران ہو رہے ہیں تو آپ کو ایسی بہت سی حیرانیوں سے واسطہ پڑے گا“ میدان میں پڑی لاشوں کی جانچ پڑتال کی گئی تو ان میں ایک لاش شہنشاہ ایران کے داماد کی تھی۔ اس کا بچا اور بہت سے

ساتھی بھی مارے گئے تھے۔

☆-----☆

رات کا وقت تھا۔ گرہنی کی کاٹنی معرکہ انجام کو پہنچ چکا تھا۔ دریا کے مشرقی کنارے پر دور تک دشمن کی فائیں نکھری ہوئی تھیں۔ اس فتح نے مقدونی سپاہ کے حوصلے بلند کر دیئے تھے۔ سالار اعظم سکندر پر انہیں پہلے بھی کچھ کم بھروسہ نہیں تھا لیکن اس معرکے کے بعد یہ اعتماد اور مربوط ہو گیا تھا۔ یہ بات اپنی جگہ درست تھی کہ سکندر دریا پار کر کے حملہ آور نہ ہوتا تو کون تھا دشمن کو زیادہ کھنکھانے میں جنگ کرنا پڑتی لیکن سکندر کے فوری جواب نے انہیں موقعے پر دشمن کے دانت کھٹے کئے تھے وہاں مقدونی سپاہ کو بھی اس مایوسی سے بچالیا تھا جو تاخیر کی صورت میں پیدا ہوتی۔ درحقیقت سکندر نے ایک بار پھر وہی جارحانہ کردار ادا کیا تھا جو وہ اس سے پیشتر کئی ارنیا اور استنفر کی جنگوں میں ادا کر چکا تھا۔

دن بھر کی خوریز مشقت کے بعد تاجان ایک پتھر سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا اس کے سر پر تاروں بھرا آسمان تھا۔ ہزاروں کے جھرمٹ تھے اور انجالی نکشائیں تھیں۔ وہ اس روشن دنیا کے چٹا زخم میں کھوا ہوا تھا۔ کوئی اسے اپنی ساحرانہ جھلک دکھا کر ان حقیق زخم میں چھپ گیا تھا اور وہ اسے بھڑکا رہا تھا۔ کبھی اس جھرمٹ میں کبھی اس نکشائیں میں کمال ہے شہزادی، تو کہاں ہے؟ ان کے دل سے رہ رہ کر صدا بلند ہو رہی تھی۔ ”دیکھ میں تیرے لئے کہاں کہاں بھٹک رہا ہوں۔ کیسے کیسے ہنگاموں میں گھرا ہوا ہوں۔ تیری خاطر..... صرف تیری خاطر میرا آدم بھی اٹھتا ہے تیری راہ میں ہے کیوں میں تیرے دیدار کا حق دار نہیں ٹھہرتا۔“ اس کے سینے میں آگ سی سٹگنے لگی۔ سکندر سے اس کی ملاقات ہوئے اب تین دن ہو چکے تھے۔ ان تین دنوں میں سکندر کو حقیقت پائی چاہئے تھی۔ تاجان کے بیانات کی تصدیق کے لئے یہ تین روز بہت تھے۔ اگر جزیرہ کو پہ لاس کا قائم مقام فرمانروا سکندر سے مل چکا تھا اور گواہی دے چکا تھا تو پھر سکندر کسی فیصلے پر کیوں نہیں پہنچا تھا۔ کیوں تاجان کو عزت افزائی کے لئے نہیں بلایا گیا تھا؟ کیوں اس کی خدمات کا اعتراف نہیں کیا گیا تھا اور اسے انعام و کرام سے نہیں نوازا گیا تھا۔ وہ ہر طرح اس سلوک کا حقدار تھا۔ اگر سردار شمال، گونسل اور نورین کو جھوٹ بولنے پر اعلیٰ اعزازات اور مراتب سے نوازا جاسکتا تھا تو تاجان کی بول کر بھی سکندر کے حسن سلوک سے محروم کیوں تھا.....؟ پھر اس نے خود ہی اپنے آپ کو سمجھایا..... بے وقوف تم عشق کے مارے

ہوئے اور دیدار کے ترسے ہوئے ہو۔ تمہارے لئے انتظار کی ہر گھڑی صدی کے برابر ہے جبکہ سالار اعظم ایک معروف شخص ہے اسے تمہارے معاملے پر غور کرنے کے علاوہ بھی کچھ کام ہیں۔ ذرا حوصلہ رکھو۔ چند ایک روز میں سالار اعظم کی تحقیق مکمل ہو جائے گی۔ وہ جس گھڑی معاملے کی تمہ تک پہنچ گئے اسی گھڑی تمہاری کاپیا پلٹ جائے گی۔ تمہیں بعد شوق شانی خیمہ گھ میں طلب کیا جائے گا اور حسب وعدہ اس انعام سے نوازا جائے گا جس کے سامنے محروم برکی دو لکھ بیچ ہیں اور جسے پانے کے بعد دنیا میں کچھ اور پانے کی حسرت تمہارے دل میں نہیں رہے گی۔ ذرا تصور کرو ان لمحات کا جب شہزادی مارشا کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں تھمایا جائے گا اور پھر..... وہ ایک حسین یوسہ جس کے لئے تم اپنے جسم کے ایک ایک ذرے کو ایک ایک قیامت سے دو چار کر سکتے ہو۔ تہاں کو محسوس ہوا کہ آسمان پر چمکنے والے سارے تارے اور ساری کشتیاں آسمان کے راستے اس کے سینے میں اتر گئی ہیں اور اس کے بدن میں دور دور تک چراغیں ہو رہی ہیں۔

”میں..... میں معافی چاہتا ہوں سردار!“ یکایک ایک آواز نے تہاں کو چونکا دیا۔ تہاں نے گھوم کر دیکھا۔ اس کے پاس یک صدی سردار باکوچ کھڑا تھا۔ یہ وہی سردار تھا جس نے اسے گوفیش کے تہ خانے سے لنگوایا اور بعد ازاں فیلائتہ سے ملوایا تھا۔ تہاں اسے پہچان کر مسکرایا۔ ”معافی کس بات کی سردار؟“

سردار باکوچ بولا۔ ”میں تم سے عام سپاہی کا سا سلوک کرتا رہا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم تہاں ہو۔“

”میرے تہاں ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے؟“

باکوچ خوشامدی لہجے میں بولا۔ ”تم کوئی معمولی سردار نہیں ہو۔ ایجنٹری لڑائی میں تم نے تن تنہا تین سرداروں کو قتل کر کے جو حیران کن کارنامہ انجام دیا تھا وہ ہر سپاہی کے ذہن پر نقش ہو چکا ہے۔ میں ہی کیا مقدونوی فوج کا ہر فرد تمہارے نام سے واقف ہے اور تمہیں دیکھنے کا خواہشمند بھی۔ اگر میں اس وقت پکارنے لگوں کہ میرے سامنے بیٹھا ہوا شخص سردار تہاں ہے تو سینکڑوں سپاہی اور کماندار تمہیں دیکھنے کے لئے اکٹھے ہو جائیں۔ اس وقت بھی تمہارے ارد گرد کئی لگاؤں ایسی ہیں جو چپکے چپکے تمہیں دیکھ رہی ہیں۔“

تہاں نے پوچھا۔ ”تم میرے بارے میں اور کیا جانتے ہو؟“

باکوچ بولا۔ ”بہت کچھ جانتا ہوں۔ مثلاً یہ کہ تمہیں سردار شلال اور گونسل کے ہمراہ ایک خفیہ مہم پر مقدونیا سے یہاں بھیجا گیا تھا۔ بعد میں سردار شلال تو مقدونیا پہنچ گیا

لیکن تمہارے بارے میں بتایا گیا کہ تم نے غذاری کی قہی اور سزا سے بچنے کے لئے خودکشی کر لی ہے۔ اب تم کسی طرح جان بچا کر یہاں پہنچے ہو اور تم نے سکندر کے سامنے دعویٰ کیا ہے کہ مطلوبہ نوشتہ جات حاصل کرنے کا سہرا تمہارے سر ہے اور سردار شلال نے تم سے وہ نوشتے چھین کر تمہیں زہر دے دیا تھا۔“

باکوچ کی معلومات وسیع اور سونہد درست تھیں۔ تہاں نے یاس انگیز سانس بھر کر کہا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے باکوچ۔ تم دونوں میں سے سچا کون ہے۔ شلال یا میں؟“

باکوچ نے چند لمبے توقف کرنے کے بعد کہا۔ ”اب اس بات میں کوئی شک نہیں رہا کہ تم سچے ہو۔ سالار اعظم بھی اس ج کو قبول کر چکے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اپنے خیالات کا اظہار انہوں نے ابھی تک نہیں کیا۔ میں تو سمجھتا ہوں سالار اعظم اسی وقت قاتل ہو گئے جب تمہاری ساتھی لڑکی نے رو رو کر اپنی روسید او شانی قہی اور بے ہوش ہو کر گر گئی تھی اگر کوئی شبہ باقی بھی تھا تو وہ سکوپے لاس کے حکمران نے دور کر دیا۔ شاہ سکندر کے ساتھ اس کی طویل گفتگو ہوئی ہے اور اس نے وہ قیدی بھی پیش کر دیا ہے جس پر تمہیں زہر دینے کا الزام ہے۔ یہ قیدی ایک گھلو خادم ہے اور اس نے اعتراف کیا ہے کہ آج سے قریب ایک برس پہلے اس نے سردار شلال کا آلہ کار بن کر تمہیں اور تمہارے دوست کو زہر ملا دودھ دیا تھا۔“

تہاں کے سر سے جیسے ایک بت بڑا بوجھ اتر گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ سالار اعظم کو تہاں کی بے گناہی اور وفاداری کے فوس ثبوت مل چکے ہیں۔ اس نے باکوچ سے پوچھا۔ ”کیا سردار شلال اور اس کے ساتھیوں سے پوچھ گچھ ہوئی ہے؟“

باکوچ کی آنکھوں میں خاصی جگ نظر آئی۔ وہ تہاں کے کچھ اور نزدیک کھٹک آیا اور راز داری کے لہجے میں بولا۔ ”نام لوگ کہتے ہیں کہ سردار شلال گونسل اور نورین وغیرہ کسی مہم پر بھیجے گئے ہیں..... لیکن مجھے پتہ چلا ہے کہ وہ تینوں گرفتار ہو چکے ہیں اور سخت عذاب میں ہیں۔ میرا تو خیال تھا کہ تمہیں ان حالات کا علم ہو گا۔ حیرت ہے کہ تم بھی اندھیرے میں ہو۔“

تہاں کے ذہن میں عجیب دوسے جاگنے لگے۔ سالار اعظم نے ابھی تک اسے طلب کیوں نہیں کیا تھا۔ کیوں اسے امید و بیم میں رکھا ہوا تھا۔ نہ جانے کیوں تہاں کو پہلے دن سے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ سالار اعظم مارشا کے بارے میں جان بوجھ کر تاخیر کر رہے ہیں اور اس سے کوئی بات چھپائی جا رہی ہے۔ ایک دم تہاں بے کل سا ہو گیا۔ وہ بغیر کچھ



کے سنے باکوچ کے پاس سے اٹھا اور ایک طرف چل دیا۔ باکوچ کچھ دیر حیرت سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر آگ کے ایک بڑے لاؤ کی طرف بڑھ گیا۔ کتابان کے ذہن میں ایک آدمی سی پلٹی شروع ہو گئی تھی۔ شک کی وہ کوپل جو پچھلے ایک برس سے اس کے ذہن میں پھل پھول رہی تھی، آج ایک دم تناور درخت بن گئی تھی۔ سالار اعظم مارشا کے بارے میں اس سے کیا چھپا رہا ہے؟ یہ سوال ہتھوڑا بن کر اس کے ذہن پر برس رہا تھا۔ اس کی چاروں جانب پڑاؤ کا ہنگامہ تھا۔ لاشیں ٹھکانے لگائی جا رہی تھیں۔ زخمی کراہ رہے تھے، طبیب حکیم مصروف کار تھے۔ کتابان ان سب مصروفیات سے تعلق پڑاؤ کے اس حصے کی طرف بڑھتا رہا جہاں خواتین کی خیمہ گاہ تھی۔ خیمہ گاہ کے چاروں طرف سخت سپرو تھا۔ کتابان نے بڑے دروازے پر موجود سپریداروں سے اپنا تعارف کرایا اور ان سے کہا کہ وہ کورا کو بلا دیں۔ تھوڑی دیر بعد کورا خلیصرت ریشمی لباس میں لمبوس نمودار ہوئی۔ کتابان اسے لے کر خیمہ گاہ سے دور درختوں میں آ بیٹھا۔ کورا نے اس کے ہاتھ تھام لئے۔

”تم زخمی تو نہیں ہوئے؟“

”نہیں!“ کتابان نے مختصر جواب دیا۔ وہ جلد از جلد کورا کی زبان سے کوئی اہم بات سننا چاہتا تھا۔ کل رات اس نے کورا کو ہدایت کی تھی کہ وہ خیمہ گاہ میں شہزادی مارشا کو تلاش کرے۔ کورا چونکہ مارشا کی خاص خادمہ رہ چکی تھی اس کے لئے شہزادی کو پہچانا مشکل نہیں تھا۔ کورا کتابان کی سوالیہ نگاہوں میں کوندتی ہوئی بے تابی پڑھ چکی تھی۔ اس نے اپنا سر جھکایا اور دھیمی آواز میں بولی۔

”مجھے افسوس ہے سردار کتابان میں ہر جگہ دیکھ چکی ہوں لیکن شہزادی مارشا خیمہ گاہ میں نہیں نہ ہی کسی کو اس کے بارے علم ہے۔“

کتابان کے ذہن میں چنگاریاں بھڑکیں۔ اس کا مطلب تھا سالار اعظم سکندر اسے جان بوجھ کر بے خبر رکھ رہا ہے۔ مارشا اس کے ساتھ نہیں تھی اور وہ ظاہر کر رہا تھا کہ وہ ساتھ ہے۔ وہ شہزادی خیمہ گاہ میں نہیں تھی۔ خواتین کی خیمہ گاہ میں بھی نہیں تھی۔ ایک برس پہلے وہ ایتھنز میں بھی کہیں نہیں تھی۔ شاید وہ تھی ہی نہیں۔ شاید کسی ہوس پرست کی نگاہ اسے کھا گئی تھی یا مقدونیہ کے شاہی محل کی دیواریں اسے چٹ گئی تھیں۔ کورا نے کتابان کے چہرے کا مدد بڑھ دیکھا تو ڈر گئی۔ سہمی آواز میں بولی۔

”تم..... تم کوئی غلط قدم نہ اٹھا بیٹھنا مجھے یقین ہے کہ شہزادی زندہ ہے۔ وہ مل جائے گی۔“ کتابان نے خالی نظروں سے کورا کو، طرف دیکھا۔ اس گھڑی وہ ایک بدلا ہوا

فحش دکھائی دیتا تھا۔ یہ وہ سردار ساوا غلام نہیں تھا جو بات بات پر مسکرا دیتا تھا اور جس کے چہرے پر ہمہ وقت لاپرواہی چھائی رہتی تھی یہ ایک سنجیدہ نوجوان تھا جس کی آنکھوں میں ذہانت کی بجلی ترستی تھی اور جو ہر شخص کام کر گزرنے پر آمادہ نظر آتا تھا۔ کورا نے پھر کہا۔

”مجھے ڈر ہے کہ تم سالار اعظم سے شہزادی کے بارے پوچھو گے۔ اگر اس سوال پر سالار اعظم ناراض ہو گئے تو بہت برا ہوگا۔ شاہی عتاب تمہارے ساتھ میری جان بھی لے لے گی۔“

”میں نے تم سے مشورہ نہیں مانگا۔ تم جاسکتی ہو۔“ کتابان نے استغاثی خشک لبے میں کہا۔ اس لبے نے کورا کو لرزادیا۔ وہ میکانی انداز میں کھڑی ہو گئی اور چند لمبے انگلیاں مروڑنے کے بعد واپس لوٹ گئی۔ کتابان کچھ دیر بے حس و حرکت اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ وہ کسی لائق و دق ویرانے کی مانند خاموش تھا۔ ایک زہریلی ہوا تھی جو سائیں سائیں اس کے اندر چل رہی تھی پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور تیز قدموں سے شاہی خیمہ گاہ کی طرف چل دیا۔

☆-----☆-----☆

”کیا بات ہے؟ آج تمہیں سنجیدہ نظر آرہا ہے۔“ سالار اعظم نے کتابان سے پوچھا۔ شاہی خیمے میں ان دونوں کے عادیہ صرف گوشتے بہرے محافظ تھے۔ کتابان بولا۔ ”غلام گستانی کی معافی چاہتا ہے سالار اعظم..... میں اپنے مقدمے کا فیصلہ دریافت کرنے آیا ہوں۔“

”کیسا مقدمہ؟“

”میں جانتا چاہتا ہوں کہ سردار شلال اور مجھ میں سے کون حق پر پایا گیا ہے؟“

”تمہاری بے مہری گستاخانہ ہے۔ تمہیں یہ جسارت کیسے ہوئی کہ ہم سے فیصلہ طلب کرو۔ کیا تمہیں علم نہیں کہ ایسے معاملات کی تحقیق کے لئے وقت درکار ہوتا ہے؟“

سکندر کے تند تیز لبے کو نظر انداز کرتے ہوئے کتابان نے کہا۔ ”سالار اعظم میں جانتا ہوں میں آپ کے غضب کو آواز دے کر اپنی زندگی داؤ پر لگا رہا ہوں لیکن میں یہ کہنے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آپ کی طرف سے مجھے اندھیرے میں رکھا جا رہا ہے۔ آپ مجھے دس برس انتظار کرنے کا حکم دیں تو میں برو چشم کروں گا لیکن جب انتظار کی طوالت ہی معلوم نہ ہو تو دل کیسے قرار پائے۔ میں ایک بشر ہوں اور بشری کمزوریوں سے پاک نہیں۔“







اچانک سکندر کا ہاتھ تابان کے شانے پر آیا۔ انگلیوں نے نرمی سے شانہ دبایا۔ سکندر کی حوصلہ بخش آواز ابھری۔ ”ہم تمہارے جذبات سے آگاہ ہیں یقین رکھو ہم نے اپنی طرف سے کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا اور نہ آئندہ کریں گے۔ اس دوشیزہ کا سراغ لگنا اب تمہارا ہی نہیں ہمارا بھی مسئلہ ہے۔۔۔۔۔۔ اس کام میں تاخیر ہو سکتی ہے لیکن یہ ہو کر رہے گا۔ تم ایک طویل مہم سے واپس آئے ہو۔ بہت تھکے ماندے ہو۔ چند ہفتوں کی رخصت تمہارا حق بنتی ہے تم چاہو تو واپس ایتھنز جاسکتے ہو یا کسی ساحلی جزیرے میں آرام کر سکتے ہو اور اگر مناسب سمجھو تو ہمارے ساتھ سفر جاری رکھ سکتے ہو۔ میں نے وزیر ممانداری کو ہدایت کر دی ہے۔ وہ دو طرح تمہاری سہولت کا خیال رکھے گا۔۔۔۔۔۔ اور ہاں تمہارے لئے ایک اچھی خبر بھی ہے۔“ سکندر نے ایک لمحہ رک کر تابان کی آنکھوں میں جھانک پھر مسکرا کر بولا۔ ”آج سے تم یک ہزاری سالار ہو۔ سالار کی کی تلوار تمہیں ایک تقریب میں پیش کی جائے گی اور اس تقریب میں تمہارے بچرموں کے لئے سزا کا اعلان بھی کیا جائے گا۔“

”میرے مجرم؟“ تابان نے بے ساختہ پوچھا۔

”ہاں..... سردار شمال اور اس کے دونوں ساتھی۔ وہ تمہارے مجرم ہیں۔ اس وقت وہ حراست میں ہیں اور ہمارے عذاب کا مزا چکھ رہے ہیں۔ اگر تم چاہو تو ان کی حالت کا مشاہدہ کر سکتے ہو۔“ سکندر کے لہجے میں اچانک ہی خوفناک سفائی عود کر آئی تھی۔ اس سے پہلے کہ تابان کو کوئی جواب دیتا۔ سکندر نے تالی بجائی۔ مسلح محافظ تڑپے ہوئے سینوں کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔ سکندر نے کہا۔ ”ایک ہزاری سالار تابان کو لے جاؤ اور عقوبت خانے میں شمال اور اس کے ساتھیوں سے ملاؤ۔“

مخافتوں نے جبکہ کرتا ہاں کو تعظیم پیش کی تاہاں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ وہ سب اٹے پاؤں چلتے سکندر کے خیمے سے نکلے اور عقوبت خانے کی طرف روانہ ہو گئے۔ قریباً دو فرلانگ چل کر وہ ان مخفوس جموہیڑوں کے سامنے پہنچے جن کو باریک آہنی تاروں کے جال سے ڈھانپا گیا تھا۔ ایسے ہی ایک جموہیڑے میں رات تاہاں پر تشدد ہوا تھا۔ مسلح محافظ تاہاں کو لے کر ایک دوسرے جموہیڑے میں داخل ہوئے۔ اندر سے چیخ و پکار کی آوازیں آ رہی تھیں۔ تاہاں کو اندازہ ہوا کہ یہی آوازیں رات اس نے سنی تھیں جموہیڑے کا دروازہ کھلا تو اندرونی منظر تاہاں کو ششدر کر گیا۔ وہ سردار شلال جو کل تک سکوپے لاس میں سیاہ و سفید کا مالک تھا اور نورین و گونسل جو اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ زنجیروں میں

جکڑے اونٹھے منہ پڑے تھے۔ ان کے جسموں پر لباس نام کی کوئی چیز نہیں تھی اور چہرے پسینے و گرد و غبار سے لٹ چکے تھے۔ جھونپڑے میں جلے ہوئے گوشت کی بو پھیلی تھی اور آلاپ ایذا رسانی بکھرے ہوئے تھے۔ ایک طرف بھٹی میں چرکی ایک بڑی رسل پٹائی جاری تھی، دوسری رسل مردار گونسل کی پشت پر پڑی تھی اور وہ اس کے بوجھ سے مانی ہے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد رسل ٹھنڈی ہو گئی۔ اسے اٹھایا گیا تو رسل کے ساتھ ہی گونسل کی پشت کا گوشت اور چربی اتر آئی۔ وہ اپنا سر زمین سے ٹکرائے لگا اور دیوتاؤں سے موت طلب کرنے لگا۔ یہ نظارہ تابان جیسے چھردل کو بھی لرزا گیا۔ عتاب شامی کے بارے اس نے سنا تو بہت کچھ تھا لیکن دیکھ پہلی مرتبہ رہا تھا۔ وہ ان تینوں مکاروں کو ان کے حال پر چھوڑا اور عقوبت خانے سے باہر نکل آیا۔

☆ ----- ☆ ----- ☆

**KHAN BOOKS & LIBRARY**  
1-527, BHAGRI BAZAR, RAWALPINDI  
Tel: 0345-5048834 - 0345-5048559  
Fax: 0345-5048834  
E-mail: [info@khanbooks.com](mailto:info@khanbooks.com)  
Web: [www.khanbooks.com](http://www.khanbooks.com)  
Prop: Ali Khan

*Handwritten signature*



## KHAN BOOKS

&amp; LIBRARY

S-527, BHADRA BAZAR, RAWALPINDA

Cell: 0345-5045834 0345-5488559

Prop. Ali Khan

مسئق

میں شریک ہوتا ہے۔"

سالار خیمے سے نکل گیا تو تہاں گونسل اور نورین کے بارے سوچنے لگا۔ مکانات عمل نے آٹا ٹائما نہیں آدو چا تھا۔ تہاں اور ہوشمند کو "قتل" کر کے انہوں نے اپنے سر پر کامیابی کی دستار سجائی تھی۔ سکندر سے رہتے اور انعامات حاصل کئے تھے اور چند روز پہلے تک نشے میں ڈوب کر حسینوں کے جھرمٹ میں داد عیش دے رہے تھے۔ آج..... ان میں سے دو اذیتیں جھیل کر خاک میں پنہاں ہو گئے تھے اور ایک کو کل برسر عام پھانسی چڑھ جانا تھا۔ شلال کے بارے سوچتے ہوئے تہاں کو کورا کا خیال آیا تو شلال کے انجام کی کبک اس کے دل سے دور ہو گئی۔ وہ شخص ایسی ہی موت کا مستحق تھا نہ جانے کورا جیسی کتنی دوشیزائیں صرف اس کے خوف سے ہی مر چکی تھیں۔ وہ صنف مخالف کے لئے ایک دہشتناک خواب کی مانند تھا۔ خاص طور پر کورا تو اس کی نگاہ ستم کا مرکز تھی۔ وہ جب تک آزاد رہا تھا کسی خون آشام درندے کی طرح کورا کے خون کی بو سونگتا پھرتا تھا..... تہاں کا دل چاہا کہ وہ اسی وقت خواتین کی خیمہ گاہ میں جائے اور ڈری سہمی کورا کو مبارکباد دے۔ اسے بتائے کہ اس کی آپیں رنگ لائی ہیں۔ اس کی عزت اور زندگی کا دشمن کل سرعام اپنے انجام کو پہنچ رہا ہے۔

وہ کھانا کھاتے ہی اپنے خیمے سے نکلا اور کورا کی طرف روانہ ہو گیا۔ تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ شاہی خیمہ گاہ کے پاس پچھل نظر آئی۔ ایک ہجوم سکندر کے خیمے کو گھیرے ہوئے تھا۔ تہاں کے قدم بے اختیار شاہی خیمہ گاہ کی طرف اٹھ گئے۔ سپرداروں نے اسے پہچان کر راہداری دی۔ تہاں نے دیکھا خیمے سے باہر سکندر ایک پتھر کھڑا تھا۔ سورج کی روشنی میں اس کا چہرہ تانبے کی مانند چمک رہا تھا۔ سکندر کے ساتھ ایک اوجیز عمر جی تھا۔ اس کے بال گھو گھریالے اور آنکھیں گہری پتیلی تھیں۔ چہرہ دیکھتے ہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک طویل سفر طے کر کے آیا ہے۔ اس نے کمانداروں اور سرداروں کے ہجوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

"سرداران لشکر! میں نے جو کچھ دیکھا تھا سالارِ اعظم اور آپ کے سامنے بیان دیا ہے۔ ممکن ہے مجھ سے اندازے کی بھول ٹوک ہو گئی ہو لیکن مجموعی صورت حال یہی ہے جو میں نے بیان کی ہے۔ شاہ مقدونیہ کے ایک ادنیٰ خدمتگار کی حیثیت سے میری ذمے داری ختم ہوتی ہے۔ اب آپ سرداروں کا یہ کام ہے کہ غور و خوض کریں اور حتمی فیصلہ کرنے میں سالارِ اعظم کی معاونت کا فرض انجام دیں۔"

جنگ گرینی کس کے بعد سکندر نے پانچ روز تک اسی جگہ قیام کیا۔ اس دوران سکندر نے نرائے کی خستہ حال اور کھنڈرات کی لاوارٹی پر بھی توجہ دی۔ اس نے اہل شر کو شاہی خزانے سے رقوم دیں تاکہ فیصل کی مرمت کی جائے اور آثارِ قدیمہ کی حفاظت کا انتظام کیا جائے۔ اس نے نرائے کے باشندوں پر کسی طرح کا محمول بھی نہیں لگایا۔ ایک ہزاری سردار کا رتبہ پانے کے بعد تہاں بڑی آسائش سے پڑاؤ میں رہ رہا تھا۔ اس کا خیمہ شاندار تھا اور خدمت پر دو ملازم مامور تھے۔ وہ جو کل تک خود خدمتگار تھا آج سرداری کی مشین پر بیٹھا تھا۔ وہ دستہ جو تہاں کی کمان میں آیا تھا خود کو خوش قسمت سمجھ رہا تھا کہ اسے ایک نامور بہادر کی قیادت نصیب ہوئی ہے۔

یہ پانچویں روز کی بات ہے عسکری مشقوں کے بعد تہاں ابھی اپنے خیمے میں واپس لوٹا ہی تھا کہ سکندر کے حفاظتی دستے کا سالار اس کے پاس پہنچا۔ سالار نے تہاں کو اطلاع دی کہ کل شام ایک تقریب میں ترقی پانے والے سالاروں کو تلواریں اور پوشاکیں دی جائیں گی، تہاں کو بھی ایک ہزاری سردار کی تلوار اور پوشاک دی جائے گی۔ اس کے علاوہ تقریب کے بعد چند مجرموں کو موت کی سزا دی جائے گی ان میں سردار شلال کا نام بھی شامل ہے۔ تقریب میں شریک تمام افراد سزاؤں پر عملدرآمد دیکھ سکیں گے۔

اس اطلاع سے تہاں کا دل بچھ سا گیا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسے کچھ حیرت بھی ہوئی۔ سالار نے صرف شلال کا نام لیا تھا جبکہ شلال کے ساتھ نورین اور گونسل بھی شاہی معززین میں شامل تھے۔ اس نے سالار سے پوچھا۔ "شلال کے ساتھیوں کے بارے کیا فیصلہ ہوا؟"

سالار نے اطمینان سے کہا۔ "ان کا فیصلہ قدرت نے کر دیا۔ وہ دونوں کل رات عقوبت خانے ہی میں دم توڑ گئے تھے۔"

بمردہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ "یاد رہے کل غروب آفتاب سے قبل آپ کو تقریب





آگیا ہے جس کا ہم نے تم سے ذکر کیا تھا۔

”کہاں ہے وہ؟“ تہاں کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

سکندر نے پہلو کی طرف دیکھ کر ادھیڑ عمر حبشی کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہی تو ہے

یرغلا۔ یہ والد محترم کے زمانے سے ہمارے لئے خدمت انجام دے رہا ہے۔ ہمارے دل میں اس کی اور اس کے اہل خانہ کی بہت عزت ہے۔“

تہاں نے بے تابی سے پوچھا۔ ”محترم یرغلا کیا خبر لائے ہیں؟“

سکندر نے کہا۔ ”جاسوسوں کی اطلاعات درست تھیں۔ وہ دوشیزہ شہزادی مارشائی ہے۔ اس وقت وہ پہلی کارہیض کے ایک بڑے عبادت خانے میں موجود ہے۔ باقی تفصیلات تم یرغلا سے جان سکتے ہو۔“ یرغلا اپنی جماندیدہ نگاہوں سے تہاں کو دیکھ رہا تھا۔ سکندر نے یرغلا سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”یہی وہ یک ہزاری تہاں ہے جس کا ذکر تم سنتے رہے ہو۔ ہم چاہیں گے کہ آج شب پڑاؤ میں اسے تم شہزادی کے بارے میں تمام تفصیلات سے آگاہ کرو۔“

یرغلا نے اطاعت مندی سے سر ہلایا، تاہم منہ سے کچھ نہیں بولا۔ وہ ہنسی بھری آنکھوں والا ایک خاموش طبع شخص تھا۔ تہاں کو اس کی آنکھوں میں عجیب درد کرو نہیں لیتا محسوس ہوا۔

شام کا انتظار تہاں کے لئے روح فرسا تھا۔ سورج غروب ہونے تک وہ ایک ایک پل گنتا رہا۔ آخر شام نے پر پھیلائے اور ایک سرسبز ویرانے میں لشکر کے خیمے اُبتادہ ہو گئے۔ پڑاؤ کے طول و عرض سے بلند ہونے والا دھواں اس امر کی نشاندہی کرنے لگا کہ رات کا کھانا تیار ہو رہا ہے۔ کھانا کھا کر اور شراب پی کر جب لشکریوں نے الاؤ بھڑکائے اور حسب معمول ٹانچ گانا شروع کیا تو تہاں اپنے خیمے سے نکلا اور تیز قدموں سے یرغلا کے مسکن کی جانب روانہ ہو گیا۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ یرغلا اسے خیمے میں مل گیا اور تمنا بھی مل گئی۔ تہاں نے اندازہ لگایا کہ یہ بوڑھا شخص الگ تھلک رہنے کا عادی ہے۔ تہاں نے جبکہ کراسے سلام کیا اور پھر قریب ہی ایک غالیچے پر منودب بیٹھ گیا۔ ادھیڑ عمر حبشی اپنی گھٹی بھونٹوں کے نیچے سے اسے بغور دیکھتا رہا پھر بزرگانہ لہجے میں بولا۔

”تم صحت مند ہو، جوان ہو، زور آور ہو۔ ان خرافات میں کیوں پڑ گئے ہو۔ یاد رکھو عورت مرد کے پاؤں کی زنجیر ہوتی ہے۔ یہ زنجیر پاؤں میں ہو تو ترقی کے راستے پر دو گام چٹنا محال ہو جاتا ہے۔ میں نے تمہارے بارے میں بہت کچھ سنا ہے۔ شاید تمہیں خود

بھی معلوم نہیں کہ تم کیا چیز ہو تم ایک چڑائی جیگو ہو۔ میں تمہاری پیشانی پر بلند اقبالی کا ستارہ دیکھ رہا ہوں۔ مقدونوی لشکر میں تمہارے لئے ترقی کے بے شمار راستے کھلے ہیں اور قابلِ رشک عسکری عہدے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ تم ایک تہاں کا مستقبل کو ایک اندھی خواہش پر قربان کیوں کر رہے ہو؟“

”اندھی خواہش؟ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھتا۔“

”میری مراد یونانی دوشیزہ سے ہے۔ میں نے اسے دیکھا ہے۔ تم نے اس پر عاشق ہو کر کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا۔ دیوتاؤں نے اسے صورت ہی ایسی دی ہے جو بھی اسے دیکھتا ہو گا دل دے بیٹھتا ہو گا اور ایسے ہیروئنوں میں امیرزادے، شہزادے اور بڑے بڑے صاحبِ ثروت شامل ہوں گے۔ ظاہر ہے ان میں سے کئی تم سے زیادہ وجہہ اور پُرکشش ہوں گے ان کا اثر و رسوخ، ان کا حسبِ تم سے کہیں زیادہ قابلِ قدر ہو گا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ عشاق کی اس بھیڑ میں سے اپنی مرہائیوں کے لئے تمہیں منتخب کرے گی؟ یہ تو ایسے ہی ہے جیسے آگ سے ٹھنڈک پانی سے حدت اور چاند سے ہم آغوشی کی تمنا کی جائے۔“

تہاں نے ایک گہری سانس بھر کر کہا۔ ”سردار محترم! میں آپ سے بحث کی جسارت نہیں کر سکتا صرف اتنا کہوں گا کہ ارشاد کی تمنا وہ شعلہ ہے جس سے میری زندگی کی حرارت قائم ہے۔ یہ شعلہ بجھ گیا تو مجھے بھی باقی نہیں رہے گا میری پیشانی پر چمکتا ہوا بلند اقبالی کا ستارہ بھی آپ کو کہیں نظر نہیں آئے گا میں۔ میں جانتا ہوں سردار محترم میری آرزو دیوانے کا خواب ہے اور اس آرزو کا حاصل محرومی کے سوا اور کچھ نہیں لیکن میں اس آرزو سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔ ایسا کرنا میرے اختیار سے باہر ہے۔“

یرغلا نے کہا۔ ”ہر عاشق کی بربادی ان جملے میں پنہاں ہوتی ہے کہ وہ اپنی آرزو سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔ وہ اس آرزو کو لہرے دے کر پالتا ہے اور ایک روز وہ ناگ بن کر اسے ڈستے ہے۔ پھر وہ اپنے پاؤں پر کڑا نہیں رہ سکتا اور اپنی تمام تر شہ زوری کے باوجود منہ کے بل خاک پر گر جاتا ہے۔ عورت کی محبت ایک ٹاپائیدار جذبہ ہے نوجوان۔ یہ جسم کی پیاس ہوتی ہے جو چند راتوں کی رفاقت میں بجھ جاتی ہے اس ٹاپائیدار جذبے کے لئے کیا تم اس اعتماد کا فن کرو گے جو سالارِ اعظم نے تم پر کیا ہے؟ ان تمام اعلیٰ مقاصد کو پس پشت ڈال دو گے جو تمہارے منصب سے وابستہ ہیں اور جن کا حصول تمہیں نام و نمود اور آسائش کی دہائوں سے مالا مال کروے گا۔“

تایمان بے دلی سے مسکرایا۔ "گستاخی معاف بزرگوار! آپ کسی منصب اور کن اعلیٰ مقاصد کی بات کر رہے ہیں۔ میں کسی اعلیٰ مقصد کو لے کر میدان جنگ میں نہیں آیا لوگ مال غنیمت کے لئے لڑتے ہیں۔ عہدوں کے لئے لڑتے ہیں اور جو زیادہ اعلیٰ طرف ہوتے ہیں ملک و قوم اور مذہب کے لئے برسرِ پیکار ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کچھ لوگ اس سے بھی اعلیٰ مقاصد لے کر میدان جنگ میں اترتے ہوں لیکن آج آپ کے سامنے ایسا شخص بیٹھا ہے جو صرف ایک عاشق ہے اور محبت کی خاطر میدان جنگ میں موجود ہے۔ میری تمام وفاداریاں اور کوششیں میری آرزو سے مشروط ہیں۔"

یرغائے کمال۔ "تم جیسے نوجوان قابلِ مجرورہ نہیں ہوتے۔ میں نہیں سمجھتا تم زیادہ دیر سکندر کے حلقہ احباب میں رہ سکو گے۔ جلد یا بدیر تمہیں پشیمان ہو کر اپنا عہدہ اور مقام چھوڑنا پڑے گا۔"

تایمان نے کمال۔ "بزرگوار! میں آپ کی دانشمندی کا قدر دان ہوں، لیکن اس وقت آپ کی کوئی نصیحت مجھ پر اثر نہیں کر رہی۔ میرا دھیان شہزادی مارشا کی طرف لگا ہوا ہے۔ میں اس کے حالات سننے کے لئے بے تاب ہوں۔"

تایمان کی صاف گوئی نے یرغائے کمال کو ایک گہری سرد سانس لینے پر مجبور کر دیا۔ اس نے پچونک مار کر شہزادان کی قاتلوں شمعیں گل کر دیں۔ خیمے میں خوابناک روشنی باقی رہ گئی یرغائے کمال سے ٹیک لگا کر بولا۔

"میں شاہ فیلقوس کے دور میں کئی مرتبہ یونان آچکا ہوں۔ یہاں میں نے غارس زئوب کی بیٹی مارشا کو دیکھا تھا۔ اس وقت وہ دس بارہ برس کی تھی لیکن حسن و جمال میں کوئی اس کا جانی نہیں تھا۔ جو دیکھتا تھا پیار کرنے کو چل جاتا تھا..... پچھلے مہینے سکندر کو میں نے ہی بتایا تھا کہ میں شہزادی مارشا کو پہچانتا ہوں اور "ہیلی کارنیں" جاکر تصدیق کر سکتا ہوں کہ جاسوسوں نے جس لڑکی کے بارے میں اطلاع دی ہے وہ مارشا ہے یا نہیں۔ سکندر نے مجھے ہیلی کارنیں بھیجے کا فیصلہ کر لیا۔ میں ایک چرواہے کے گھس میں روانہ ہوا تھا۔ یہ ایک کٹھن اور طویل سفر تھا جس کی تفصیلات تمہارے لئے بیکار ہیں۔ ہیلی کارنیں پہنچ کر میں نے مقدونی جاسوسوں سے رابطہ قائم کیا اور ان کے ذریعے زر نشینوں کی اس عظیم عبادت گاہ میں پہنچا جہاں پتھر کے بڑے بڑے ستونوں پر آگ جلتی ہے۔ وہاں میں نے شہزادی مارشا کو ایک مقدس دیوی کے روپ میں دیکھا لوگ اس کے سامنے سجدہ ریز تھے اور چڑھاوے چڑھا رہے تھے۔ وہ ایک عجیب و غریب منظر تھا جب تک آدمی خود نہ دیکھے

اس کی پراسراریت کو محسوس نہیں کر سکتا۔ اس عبادت گاہ میں صدیوں پرانے تیل میں بجلی ہوئی شمعیں جلتی ہیں اور سنگی محرابوں میں انجانی خوشبوئیں سلگتی جاتی ہیں۔ میں نے شہزادی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی ہمت کوشش کی لیکن کچھ پتہ نہ چل سکا کہ وہ اتھنٹر کے نواح سے غائب ہونے کے بعد مشرقی ساحل کے شہر ہیلی کارنیں تک کیسے پہنچی ہے اور کیونکر زر نشینوں کے ہتھے چڑھ کر اس عبادت گاہ کی زینت بنی ہے۔ صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ چند ماہ پہلے ہیلی کارنیں کے کانٹوں کو دریا میں بہتا ایک بند صندوق ملا تھا اور خیال ہے کہ مارشا کا تعلق اس صندوق سے ہے لیکن یہ بات غلط بھی ہو سکتی ہے کیونکہ اطلاع دینے والا اس خوالے سے کوئی نوس ثبوت پیش نہیں کر سکا....."

جیسی یرغائے کمال نے بتایاں کے سینے میں ایک لچل چکا رہی تھیں۔ یہ لچل بتدریج طوفانی صورت اختیار کر رہی تھی۔ ایک عجیب طرح کا جوش تایمان کے دگ وپے میں بھرتا جا رہا تھا..... ایک سال بعد آخر اسے مارشا کے متعلق ایک اچھی اطلاع مل گئی تھی مارشا ہیلی کارنیں میں تھی اور تایمان ایک عقیم الشان لشکر کے ساتھ ہیلی کارنیں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کا رخ مارشا کی طرف تھا۔ جلد یا بدیر اسے اس شہر کے دروازے پر دستک دینا تھی جس میں مارشا رہتی تھی اس کا دل ہلا اندھیرے کی چادر آنا فانا چاک ہو جائے۔ خورشید ہمتناک اچھل کر مشرق سے طلوع ہو۔ کوچ کا قافارہ بجے اور وہ اپنے سفر پر روانہ ہو جائیں۔ اس وقت تک چلتے رہیں جب تک ان کے گھوڑوں میں دم ہو، اور جب گھوڑے ہانپ کر گر جائیں، وہ پیادہ بھاگنا شروع کر دیں اور ہیلی کارنیں کی تفصیل تلے پہنچ کر دم لیں۔

جیسی یرغائے کمال نے پوچھا۔ "کیا سوچ رہے ہیں؟" تایمان چونک کر اپنے خیالوں سے یاہر آیا۔ پھر گھمبیر لہجے میں بولا۔ "آپ کو یقین ہے کہ وہ شہزادی ہی تھی۔ میرا مطلب ہے آپ نے اسے کئی برس پہلے دیکھا تھا۔ اب وہ ایک نو عمر لڑکی نہیں، جوان دوشیزہ ہے۔"

جیسی یرغائے کمال۔ "میرے جواب سے اس لڑکی کی تعریف کا پہلو لگتا ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ جو اس چہرے کو ایک بار دیکھ لے پھر بھول نہیں سکتا۔"

تایمان اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ "ہمت شہر یہ سردار یرغائے کمال..... میں اب سالار اعظم کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا ہوں۔"

"رک جاؤ۔" یرغائے کمال نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ تایمان نہ چاہتے ہوئے بھی پھر





طاقتور اور مضبوط شخص ہے۔ تہاں کا یہ تجربہ سو فیصد درست تھا۔ حملہ آور نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اپنی دونوں ٹانگیں سمیٹ کر تہاں کے سینے پر رکھیں اور پوری قوت سے اسے پیچھے اچھال دیا۔ تہاں جیسے ہوا میں اڑا ہوا دوبارہ اپنے بستر پر گر۔ اس نے ایک پرچھائیں خود پر جھپٹنے دیکھی۔ تلوار دکھائی نہیں دے رہی تھی لیکن وہ اس کے نشانے پر تھا۔ اس نے تڑپ کر اپنی جگہ چھوڑ دی اور ایک بار پھر اپنی زندگی بچانے میں کامیاب رہا۔ تلوار اس کے کندھے کو زخمی کرتی ہوئی زمین میں پیوست ہو گئی۔ یہ ایک چھوٹی تلوار تھی اور حملہ آور نے اسے بعینہ خنجر کی طرح استعمال کیا تھا۔ وار خالی گیا مگر حملہ آور کے جسم کا پورا بوجھ تہاں پر آن پڑا۔ اس کے ساتھ ہی ایک مضبوط ہاتھ بے پناہ قوت سے تہاں کے جڑے پر پڑا۔ اس کی آنکھوں میں ہفت رنگ ستارے نچ گئے۔ ابھی وہ اس صدمے سے سنبھلا بھی نہ تھا کہ تلوار کی دھار اسے اپنی گردن کے آس پاس محسوس ہوئی۔ یہ اس لڑائی کے نازک ترین لمحے تھے۔ تہاں نے وحشیانہ غلٹ کے ساتھ ایک بار پھر حملہ آور کی تلوار بدست کلائی تلاش کی اور اسے گرفت میں لے لیا۔ حملہ آور نے تلوار کی دھار تہاں کی گردن تک پہنچانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ اس کے حلق سے خوفناک غراہٹیں برآمد ہو رہی تھیں مگر تہاں اب پرسکون تھا۔ وہ اچانک حملے کے صدمے سے سنبھل چکا تھا اور یہ بھی اندازہ لگا چکا تھا کہ اسے زیر کرنا حملہ آور کے بس کا روگ نہیں۔ بہت طاقتور ہونے کے باوجود لڑائی جیتنے کا لمحہ حملہ آور کی گرفت سے نکل چکا تھا۔ تہاں نے ہر مقابل کا داؤ اس پر لگاتے ہوئے اپنی ٹانگیں سمیٹ کر اس کے پیٹ سے لگائیں اور زبردست قوت سے اسے پیچھے اچھال دیا۔ وہ گرانڈیل شخص ایک دھماکے سے دروازے کے پاس گرا اور گرتے ساتھ ہی باہر نکل گیا۔ تہاں جست کر کے دروازے پر پہنچا۔ پردہ اٹھا کر باہر نکلا اور چند قدم بھاگ کر ٹھہر گیا۔ حملہ آور خیموں کے جنگل میں کم ہو چکا تھا۔

”کون ہے؟“ پشیدار کی کڑکٹی ہوئی آواز آئی۔

تہاں نے اپنی شناخت کرائی اور زخمی کندھے کو دبائے ہوئے خیمے میں واپس آگیا۔ خون کے گرم قطرے اس کے نئے پاؤں پر گر رہے تھے۔

☆-----☆

ٹھیک چوتھے روز سکندر کی فوج پہلی کارپس کے بند دروازے پر دستک دے رہی تھی۔ خدشے کے مین مطابق اہل پہلی کارپس نے اطاعت قبول کرنے کی بجائے مزاحمت کا فیصلہ کیا تھا اور شر کو بند کر کے بیٹھ گئے۔ سکندر جب یونان سے چلا تو اس کے

پاس چالیس ہزار کے قریب سپاہ تھی۔ خیال تھا کہ راستے کی یونانی نوآبادیوں سے بھی ہماری تعداد میں رضاکار یونانی فوج میں شامل ہوتے جائیں گے مگر یہ امید بر نہیں آئی تھی۔ یونانی و مقدونی فوج میں شامل ہو کر ایرانی شہروں پر حملے کرنے کے سلسلے میں بہت کم لوگوں نے جوش و خروش کا مظاہرہ کیا تھا۔ ہر حال سکندر کو اس سے کچھ زیادہ فرق پڑنے والا نہیں تھا۔ وہ دل میں نہ صرف ایران پر قابض ہونے کا تیر کرچکا تھا بلکہ اس سے بھی بہت آگے جانا چاہتا تھا۔ وہ اپنے سرداروں میں بیٹھ کر ہمہ وقت لرزے زمین کے نقشوں کی باتیں کرتا تھا اور ان انتہائی بر زمینوں کے خواب دیکھتا تھا جن کے تذکرے اس نے عالموں سے سنے تھے اور درسی و تحقیقی کتابوں میں پڑھے تھے۔

شام کا وقت تھا، تہاں گھوڑے پر سوار پڑاؤ سے نکلا اور مغربی جانب کے بے آباد نیلوں پر آگیا۔ یہ جگہ بلندی پر واقع تھا نہ صرف یہاں سے پہلی کارپس کی بلند دیوار فیصل نظر آتی تھی بلکہ وہ مقدونی لشکر بھی دور دور تک دکھائی دیتا تھا جس نے شہر کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ تہاں عویت سے دیکھنے لگا۔ نگاہ تک رنگ برنگ پرچم اڑ رہے تھے۔ ان پرچموں تلے پربوش سپاہیوں کے جتنے نقل و حرکت میں مصروف تھے۔ محاصرہ کرتے ہی سکندر نے فوج کے انجینئروں کو بڑے بڑے برج بنانے کا حکم دیدیا تھا۔ ان برجوں سے نہ صرف شہر پناہ پر اچھی طرح نگاہ رکھی جاسکتی تھی بلکہ دشمن پر کارگر تیر اندازی بھی ہو سکتی تھی۔ ان برجوں کی تعمیر کے ساتھ ساتھ مینجیوں کی نقل و حرکت کا کام بھی جاری تھا۔ شہر پناہ کے ارد گرد ہر بلند مقام پر مورچے کھودے جا رہے تھے اور حفاظت کے لئے عارضی دیواریں تعمیر ہو رہی تھیں۔ سکندر اہل شہر پر واضح کر دیتا چاہتا تھا کہ وہ بہت بار کریں سے جانے والا نہیں۔ وہ طویل محاصرے کے لئے پوری طرح تیار ہے اور شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا کر ہی آگے جائے گا۔ بلند پتھر فیصل پر چلتے پھرتے ایرانی سپاہی تہاں کو یونوں کی مانند نظر آرہے تھے۔ ان کے جسموں پر ہتھیار چمک رہے تھے اور حرکات و سکنات میں چستی تھی۔ تہاں نے سوچا اس بلند فیصل کے پیچھے پہلی کارپس کا کھنڈر آباد شہر ہو گا۔ گلیاں ہوں گی، بازار ہوں گے، باغات اور محلات ہوں گے اور انہی درو دیوار میں کہیں وہ قدیم عبادت گاہ ہوگی جہاں مارشا کا حسین و جمیل وجود کسی مورتی کی طرح سجا ہوا ہو گا۔

اس کا قی چاہا وہ سینے کی پوری قوت سے شہزادی کا نام پکارے اور اس کی صدا بلند دیوار کلاؤں کو پار کرتی ہوئی مارشا کے گاہوں تک پہنچ جائے۔ اچانک تہاں نے دیکھا ایک بہت بڑا گول پتھر ہوا میں تیرتا ہوا فیصل کی طرف جا رہا ہے۔ پھر ایک خوفناک دھماکا ہوا



اور زمین دہل گئی۔ تابان سمجھ گیا کہ فیصل پر سنگ باری شروع ہو گئی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کئی بمبھٹتیں فیصل کی طرف پتھر چلانے لگیں۔ یہ کوئی معمولی پتھر نہیں تھے۔ ان میں بڑی بڑی چٹانیں بھی تھیں۔ جنہیں فوجی سنگ تراشوں نے تراش کر گولوں کی شکل دے دی تھی۔ انجنیئر دیاوس کی تیار کردہ طاقتور بمبھٹتوں کے ذریعے یہ پتھر حیرت انگیز قوت سے فیصل کی طرف جا رہے تھے۔ کچے بعد دیگرے ہونے والے دھماکوں نے ایک طویل گڑگڑاہٹ کی صورت اختیار کر لی اور تابان کو فیصل پر ہر طرف سراپیسگی کے آثار نظر آئے۔ چمٹل قدمی کرنے والے ایرانی دستے محفوظ برجوں میں جا چپے اور وہاں سے تیر اندازی کرنے لگے۔ اس دوران تابان کو اپنے عقب میں قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اس نے گھوم کر دیکھا، سامنے گورا کھڑی تھی۔ اس کا سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا اور شفاف گردن پسینے میں تر تھی۔ وہ پڑاؤ سے بھاگتی ہوئی یہاں پہنچی تھی۔ اس نے ہراساں نظروں سے تابان کو دیکھا پھر دور فیصل کی جانب دیکھنے لگی جہاں بمبھٹتوں کے گولے برس رہے تھے۔

”کیا بات ہے گورا؟“ تابان نے نرمی سے پوچھا۔

”مجھ سے کیا پوچھ رہے ہو؟ خود دیکھ لو۔ کیا جنگ شروع نہیں ہو گئی؟“

تابان دھڑکے سے مسکرایا۔ ”نہیں..... ابھی شروع نہیں ہوئی۔ یہ تو معمولی سا ہنگامہ ہے۔ ایسے ہنگامے ہر روز دو تین مرتبہ ہوا کریں گے۔ مقصد محصور فوج کو پریشان کرنا ہے۔ بڑا حملہ اس وقت ہو گا جب دوسرے تمام حربے ناکام ہو جائیں گے۔“  
گورا کا وجود دھڑکے سے جھپٹا۔ لڑ رہا تھا۔ تابان کے حوصلہ بخش انداز سے اسے کچھ اطمینان ہوا۔ وہ سر جھکا کر تابان کے قریب ہی گھاس پر بیٹھ گئی۔ تاثرات رو دینے والے تھے۔ وہ آنسو روکنے کے لئے نچلا ہونٹ مسلسل دانتوں سے کاٹ رہی تھی۔

”کیا بات ہے۔ پریشان ہو؟“ تابان نے پوچھا۔

”مجھے اکیلا مت چھوڑا کرو تابان!“ گورا نے رو بانسی آواز میں کہا۔ ”تمہارے بغیر مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ مجھے لگتا ہے وہ بھیڑیا میری ناک میں ہے۔ جو نمی تم نے مجھ سے لگاؤ پھیری وہ مجھے چیر پھاڑ جائے گا۔“

تابان جان گید۔ گورا کا اشارہ شمال کی طرف تھا۔ اس نے گورا کے نزدیک بیٹھ کر بڑی محبت سے اس کے گلے میں پانہ ڈالی اور کندھے سے لگایا۔ ”وہ تمہاری پرچھائیں کو بھی نہیں چھو سکتا۔ وہ تو خود موت کے آگے بھاگ رہا ہے۔ ممکن ہے وہ بحر متوسط پار

کر کے ایران سے ہی نکل چکا ہو اور اگر ایسا تھیں ہوا تو تم ایک دو روز میں اس کی موت کی خبر سن لو گی۔ مقدونی چھاپا مار شکاری کتوں کی طرح اس کی بو سونگھ رہے ہیں۔“  
گورا قدرے مطمئن نظر آنے لگی اس نے آنسو پونچھ کر تابان کی طرف دیکھا اور بولی۔ ”سالار اعظم بہت اچھے ہیں۔ میں نے شہر سے ہی انہیں انصاف پسند پایا ہے۔ تم خواہ مخواہ ان کی نیت پر شبیر کرتے رہے۔“

”ہاں!“ تابان نے گھمبیر آواز میں کہا۔ ”نہ سے یہ خطا ہوئی ہے۔ مارشا کی گمشدگی نے مجھے دیوانہ کر رکھا تھا۔ دل میں سو طرح کے دوسے جاگتے تھے۔ سالار اعظم کی خاموشی نے میرے شک کو تقویت دی اور ایک موقع پر مجھے یقین ہونے لگا کہ مارشا سالار اعظم کے قبضے میں ہے۔“

گورا نے عجیب نظروں سے تابان کو دیکھا پھر نگاہ جھکا کر بولی۔ ”کسی نے سچ کہا ہے محبت اندھی ہوتی ہے“ اسے اپنے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔“

تابان مسکرایا۔ ”تم بڑی سمجھداری کی بائیں کرتی ہو۔ اگر میری زندگی میں شہزادی مارشانہ آئی ہوتی تو شاید میں تمہیں دل دے بیٹھتا۔“

گورا کے رخسار شہابی ہو گئے۔ ہونٹ قرعے لیکن وہ کچھ بول نہ سکی۔ تابان نے کہا۔ ”گورا تم ایک عورت ہو۔ عورت کے دل کو اچھی طرح سمجھتی ہو“ تم شہزادی کے قریب بھی رہی ہو۔ میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔“

گورا رضامندی سے تابان کی طرف دیکھنے لگی۔ تابان نے کہا۔ ”جب ایتھنز تباہ ہوا“ شہزادی کی شادی تھسلی کے کسی امیر زادے سے ہونے والی تھی۔ اس شادی کی تیاریاں بھی وسیع پیمانے پر شروع ہو چکی تھیں۔ تمہارا کیا خیال ہے شہزادی اس شادی پر رضامند تھی؟“

گورا نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ”ہاں..... وہ رضامند تھی۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ وہ اس امیر زادے کو پسند کرتی تھی؟“

”میں نے یہ تو نہیں کہا؟“

”تو پھر کیا کہا ہے؟“

”میں نے کہا ہے کہ وہ اس شادی پر رضامند تھی..... دراصل.....“ گورا کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔ تابان نے اصرار کیا کہ وہ بات پوری کرے۔ گورا نے کمری سنجیدگی سے کہا۔ ”دراصل..... شہزادی پر لڑکپن سے بے تحاشہ پابندیاں تھیں وہ بے







دو تین افراد اٹھے اور بدحواسی میں ہتھیار ڈھونڈنے لگے۔ تابان پھر باہر پلکا۔ ایرانی سپاہیوں کی تعداد سو سے کم ہرگز نہیں تھی۔ وہ دونوں مقدونوی سپاہیوں کے بالکل نزدیک پہنچ چکے تھے۔ مقدونوی سپاہیوں نے بے وقوفی کی تھی لیکن کچھ بھی تھا وہ تابان کے دستے کے سپاہی تھے۔ انہیں بچانے کی سب سے زیادہ ذمہ داری تابان پر عائد ہوتی تھی۔ وہ تلوار سونت کر ”ذیراند“ اپنے سپاہیوں کی طرف بڑھا۔ ساتھ ساتھ وہ دوسرے سپاہیوں کو بیدار کرنے کے لئے چلاتا بھی جا رہا تھا۔ ایرانی سپاہیوں نے تابان کو چٹان کی جانب بڑھتے دیکھا تو تیزی سے تیر بر سائے۔ کئی تیر اس کے دائیں بائیں سے گزر گئے۔ جھک کر بھاگتے بھاگتے اس نے جست لگائی اور چٹان کی اوٹ میں گرا۔ دو ایرانی سپاہی چٹان کے بالکل پاس پہنچ چکے تھے۔ تابان نے اوٹ سے نکل کر یکبارگی ان پر حملہ کیا۔ اس کی وزنی تلوار ایک سپاہی کی زرد توڑتی ہوئی سینے میں اتر گئی اور وہ پلٹ کر پیچھے جا گرا۔ دوسرا سپاہی بڑی بے بھری سے تابان پر آیا۔ تابان نے چند وار مہارت سے روک کر اسے پیچھے دھکیل دیا۔ پس ایرانی اور آگئے۔ اب تابان کے پانچ چھ ساتھی اس کی مدد کو آگئے تھے۔ ان سب نے مل کر ایک زور دار نعرہ لگایا اور ایرانیوں سے بھڑکے۔ تلوار بازی شروع ہوتے ہی تیر اندازی رک گئی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے چٹان کے ارد گرد گھسٹان کا دن پڑ گیا۔ دونوں طرف کے کم از کم چار سو سپاہی اس لڑائی میں شریک ہو چکے تھے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے عام حملہ ہو گیا ہے۔ ایرانی سپاہیوں میں لمبے نیزوں والا ایک دستہ شامل تھا۔ اس دستے نے مقدونوی سپاہیوں کو خاصا نقصان پہنچایا کئی سپاہی ہلاک و زخمی ہو گئے۔ ہلاک ہونے والوں میں ایک دستہ سالار بھی شامل تھا۔ دستہ سالار کی سربریدہ لاش دیکھا کر تابان کے سپاہیوں نے پورے جوش سے حملہ کیا اور ایرانیوں کو ایک درجن لاشیں میدان میں چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ تابان کی ہدایت پر اس کے سپاہیوں نے بھاگنے والوں کا پیچھا کیا وہ اس کوشش میں تھے کہ واپس جانے والے ایرانیوں کے ساتھ ہی تفصیل تک پہنچ جائیں اور کسی طرح ایرانیوں کو دروازہ بند کرنے سے روک دیں۔ اگر وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہو جاتے تو مقدونوی سپاہیوں کا سیلاب بلاخیز دروازے پر اٹھ پڑتا اور وہ حفاظتی حصار ٹوٹ جاتا جس نے کئی ہفتوں سے سکندری فوج کو شر سے باہر روک رکھا تھا۔ دروازے تک پہنچنے والوں میں تابان سب سے آگے تھا۔ اس کے جڑے پیچھے ہوئے اور آنکھوں میں انگاروں کی جلن تھی۔ ایرانی سپاہیوں نے جب دیکھا کہ لینے کے دینے پڑ گئے ہیں اور مقدونوی سپاہی ان کے ساتھ ہی دروازے میں داخل ہو جانا چاہتے ہیں تو وہ واپس پلٹے اور ایک بار پھر



مقدونوی دستے سے ٹکرا گئے۔ تاہم اس دفعہ مقابلہ کرنے والوں کی تعداد بہت کم تھی۔  
بمشکل میں تیس افراد ہوں گے اور ان میں سے بھی کچھ دروازے میں گھسنے کی کوشش  
کر رہے تھے۔ پھر اچانک بلند وبالا دروازہ ایک گڑغڑاہٹ کے ساتھ بند ہو گیا۔ جو ایرانی  
سپاہی باہر رہ گئے وہ تاجان وغیرہ کے لئے ترلقہ تھے۔ ان میں سے کچھ قتل ہوئے اور  
باقیوں کو تاجان اور اس کے ساتھی اپنے ساتھ گھسیٹتے ہوئے واپس پڑاؤ میں آئے۔

علی الصبح سکندر کو اس جھڑپ کی خبر ملی۔ اس نے تاجان کو بلایا۔ جالی نقصان ہوا تھا  
لیکن سکندر اس بات پر خوش تھا کہ تاجان نے دونوں سپاہیوں کو ایرانیوں کے قبضے میں  
نہیں جانے دیا۔ اس واقعے سے جہاں مقدونوی سپاہیوں کے حوصلے بلند ہوئے تھے وہاں  
محصور فوج کو بھی حملہ آور فوج کی طاقت کا تھوڑا سا اندازہ ہوا تھا۔ اپنے ہلاک  
شدگان کی موت کا بدلہ لینے کے لئے سکندر نے دوپہر کے وقت شرکی فصیل پر زبردست  
سنگ باری کروائی۔ جانبازوں کی مختلف ٹولیوں نے ڈھالوں کے سائے تلے شہر کے  
دروازوں پر بار بار بلہ بولا اور انہیں نقصان پہنچایا۔ شام تک فصیل کئی جگہوں سے ٹوٹ  
چکی تھی اور ایرانی معیار مسلسل اسے مرمت کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ سکندر شہر پر  
حملہ کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن اس نے فصیل کے گرد ایسے حالات پیدا کر دیے تھے کہ محصور  
فوج کو ہر لمحہ یہی محسوس ہوتا تھا کہ بڑا حملہ ہونے والا ہے۔ یہ ایک ایسا نفسیاتی دباؤ تھا  
جس کے بوجھ تلے شہر کے عوام و خواص پُور پُور ہو رہے تھے۔

دوسرے تیسرے روز سکندر کو نہایت اہم ذرائع سے اطلاع ملی کہ ”میمنان“ شہر  
خالی کرنے کے بارے سوچ رہا ہے۔ روسائے شہر کوئی ایسا طریقہ وضع کرنے میں مصروف  
ہیں جس سے شہر اور اہل شہر کا کم سے کم نقصان ہو اور انہیں بربت بھی نہ اٹھانی  
پڑے۔ ان ذرائع نے یہ خبر بھی دی کہ ممینان نے شہر میں موجود مجتہدین اور ہتھیاروں کے  
ذخائر تباہ کرنے شروع کر دیے ہیں اور اناج کے ذخیروں کو آگ لگائی جا رہی ہے۔ یہ اطلاع  
سننے کے بعد سکندر فوراً اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ مقابل فوج کی کسر بہت کم ہو چکی ہے اور  
اب اسے مہلت دینا اپنی چمکتی دمکتی فتح کو داغدار کرنے کے مترادف ہے۔ اس رات  
نہایت خاموشی سے تیاری کی گئی اور اگلے روز علی الصبح بھر پور حملے کا حکم دے دیا گیا۔

تاجان جسم پر مکمل ہتھیار سجائے جنگی گھوڑے پر سوار تھا۔ اس کا نصف دستہ مہنت  
کے ہراول میں شامل کر لیا گیا تھا جبکہ نصف پچھلی صفوں میں تھا۔ نلے کے آغاز سے قبل  
تاجان نے دیکھا قلعے کی فصیل پر اکا دکا پریدار نظر آرہے تھے۔ دست قدموں سے روز

مہ کے گفت میں مصروف تھے۔ انہیں معلوم نہیں تھا، موت ان کے سروں پر منڈا رہی تھی۔ جس طوفانی یلغار نے انہیں سنی شب و روز سے خوفزدہ کر رکھا ہے وہ بوائے چاہتی ہے۔ مقدونی لشکر کی صف بندی سے بالکل ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ کوئی بڑا حملہ کرنے والے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہی سمجھا جاسکتا تھا کہ وہ عسکری مشقوں کی تیاری کر رہے ہیں۔ جب اچانک فلک شگاف نعرے بلند ہوئے اور مختلف سمتوں سے مقدونی دیوثانی سپاہی سیلاب کی مانند فسیل کی جانب بڑھے تو اوپر کھڑے سپہرادوں اور تیراندازوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ مستعدی سے مورچہ زن ہوتے اور حملہ آوروں پر سنگ و آہن کی بارش کرتے سینکڑوں میزحیائیں فسیل سے لگ گئیں اور لاتعداد مقدونی چاناز حشرات الارض کی مانند فسیل پر چڑھنے لگے۔ یہ ایک دیدنی منظر تھا۔ تابان نے حیرت سے ان جنگ بازوں کو دیکھا جو پتھروں اور تیزوں کی بارش میں جان ہتیلی پر لئے اوپر چڑھتے چلے جا رہے تھے۔ اس وقت تابان کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ بھی کبھی کسی ایسی ہی دلیرانہ کارروائی میں حصہ لے۔ فی الوقت تابان کو اپنے دست کے ساتھ کوئی دروازہ بھلنے کا انتظار کرنا تھا۔ زور مار کر اندر گھسنے کی کوشش کرنا تھی۔ اس کام کے لئے اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا جلد ہی فسیل پر جنگ کا ہنگامہ عروج کو پہنچ گیا۔ فسیل کے ایک شلے حصے پر مقدونی سپاہیوں نے سینکڑوں ایرانیوں اور تنخواہ دار یونانیوں کو تھمے تنق کر کے نیچے جانے کا راستہ بنالیا اور دو دروازے کھول دیے۔ مختصر مقدونی رسالوں نے گھوڑوں کو ایڑی لگائی اور آب دار تلواریں پکاتے شاندار رفتار سے دروازوں پر بھینٹے۔ دونوں مقامات پر خوریز لڑائی ہوئی۔ جھگڑنے کے باعث لمبی تلواریں اور برہمچیاں بیکار ہو گئیں تو پیش قبض اور خنجر چلائے گئے۔ آخر مقدونی دستے لاشوں کے ڈھیر روند کر شہر میں داخل ہو گئے۔ تابان نے لڑتے لڑتے پیچھے مڑ کر دیکھا، مقدونی سپاہیوں کا سیل رواں دروازوں کی طرف بڑھا آ رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ اب فتح اور مقدونی فوج کے درمیان کوئی شے حائل نہیں۔ پہلی کارئیں کا شہر ہو اپنے خوبصورت آثار قدیمہ۔ اپنی خوشحالی اور گماگماہی کی وجہ سے مشہور تھا، مقدونی سپاہ کے قدموں سے دہل رہا تھا۔

☆-----☆-----☆

سکندر نے ایک بڑے رتھ میں سوار شہر کا چکر لگایا۔ گلیوں میں چاہتا ایرانیوں اور تنخواہ دار یونانیوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ گھروں سے روئے پینے کی آوازیں آ رہی تھیں اور

پورے شہر پر انجانا خوف مسلط تھا۔ ایک بازار سے گذرتے ہوئے سکندر کو اطلاع ملی کہ فتح کے نشے میں خور کچھ مقدونی سپاہی ایک محلے سے کئی نوجوان لڑکیوں کو گھوڑا گازیوں میں بٹھا کر لے گئے ہیں سکندر نے فوراً حکم جاری کر دیا کہ کوئی سپاہی کسی گھر میں گھسنے کی کوشش نہ کرے۔ نہ لوٹ مار کی جائے اور نہ کسی عمارت کو نقصان پہنچا جائے۔ سکندر کو شہر کا تعمیراتی حسن بہت متاثر کر رہا تھا اور وہ اس حسن کو غارت کرنا نہیں چاہتا تھا۔ شہر کے وسط میں سکندر کو اطلاع دی گئی کہ روڈ کا سالار مہمنان بہت سی فوج کے ساتھ فرار ہونے میں کامیاب رہا ہے۔ اس کی باقی ماندہ فوج شہر کے دو محفوظ گوشوں میں محصور ہو کر بیٹھ گئی ہے اور مسلسل مزاحمت کر رہی ہے۔ کماندادوں نے اجازت طلب کی کہ بھرپور حملہ کر کے ان محصورین کو پھیل دیا جائے لیکن سکندر نے اجازت نہیں دی۔ وہ شہر کے آثار قدیمہ کو ہر نقصان سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ اس نے دو ایک ہزاری دستوں کو حکم دیا کہ وہ مزاحمت کرنے والے ایرانیوں کو مکمل طور پر محاصرے میں لے لیں جن کماندادوں کو محاصرے کا حکم ملا ان میں تابان بھی شامل تھا۔ وہ دست بہتہ سکندر کی خدمت میں پیش ہوا اور گذارش کے انداز میں بولا۔

”سالار اعظم! میں آپ کو شہزادی مارشا کے بارے میں یاد دہانی کراتا چاہتا ہوں۔ کہیں وہ کسی مصیبت میں گرفتار نہ ہو جائے۔“

تابان کا مقصد پورا ہو گیا۔ سکندر کو سب کچھ یاد آ گیا۔ وہ بولا۔ ”تم نے بہت اچھا کیا ہمیں یاد دلا دیا۔ ہم محاصرے کے لئے تہماری جگہ کسی اور کو بھیجیں گے۔ تم فوراً کسی باختر شخص کو ساتھ لے لو اور شہزادی کو برآمد کرو۔“

تابان خوشی سے پھولا نہیں سہلایا۔ تعظیم پیش کر کے فوراً واپس مڑا۔ سامنے اسے جشی ریغا نظر آیا۔ وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے اطمینان سے تابان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ آنکھوں میں وہی اداس نمی تھی جو اس کی شخصیت کو پراسرار بنا دیتی تھی۔ تابان نے کہا۔

”محترم سردار! آپ میرے ساتھ اس عبادت گاہ تک چلیں گے جہاں شہزادی رہتی ہے۔“

میرا مطلب ہے جہاں اسے قید کیا گیا ہے۔ ”میں تو خود تمہیں ڈھونڈ رہا تھا یہ تھا“ تابان کی بے تابی دیکھ کر زیر لب مسکرایا۔ ”میں تو خود تمہیں ساتھ لے رہا ہوں۔“

”چلو آؤ میں خود تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔“

دونوں گھوڑے بھگاتے جھوم میں سے نکلے اور جنوبی رخ پر روانہ ہو گئے۔ تابان



ہوئی دیواریں تھیں۔ خوبصورت محرابیں تھیں اور ایسے طالبان تھے جن میں سونے کی ہیروں بڑی صورتیں رکھی ہوئی تھیں لیکن وہ زندہ مورتی کیس نہیں تھی جس کی تلاش میں تابان یہاں آیا تھا۔ اچانک تابان کو ایک دیو پر دے کے پیچھے ایک خوبصورت نسوانی پاؤں دکھائی دیا۔ سیاہ فام برہما بھی یہ پاؤں دیکھ چکا تھا۔ وہ آگے گیا اور جھپٹ کر پردے کے پیچھے سے دو خوبصورت لڑکیاں برآمد کر لیں۔ لڑکیوں کے بال برہما کے منہ میں آئے تو وہ زور زور سے چیخنے لگیں۔ وہ بری طرح خوف زدہ تھیں۔ ان کے اوجڑے ہوئے لباس اور ننگے پاؤں دیکھ کر تابان کو یقین ہو گیا کہ وہ اپنے مردوں کے ساتھ قتل ہونے سے بچنے کے لئے یہاں چھپی ہوئی تھیں۔

تابان نے ایک لڑکی کے شانے تھامے اور اسے جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔ "شہزادی مارشا کہاں ہے..... وہ لڑکی کہاں ہے جسے یہاں دیوی کہا جاتا تھا؟"

"ہمیں کچھ معلوم نہیں دیوتا گواہ ہیں ہمیں کچھ معلوم نہیں۔"

"پھر یہ عمارت خالی کیوں ہے؟" تابان نے پوچھا۔

"وہ سب لوگ چلے گئے۔ کل راتیں انہیں لینے آئی تھیں۔ انہوں نے دیوی کو ساتھ لیا اور راتوں پر سو ہو کر نکل گئے۔ چند راہب یہاں رہ گئے تھے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے انہوں نے تمام عورتوں کو قتل کیا اور خود بھی بھاگ گئے۔"

"کہاں گئی ہے دیوی؟" اس دفعہ برہما نے پوچھا۔

لڑکی نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ "ہمیں کچھ معلوم نہیں" ہماری جان بخشی کرو۔ ہم بے گناہ ہیں۔"

برہما کے حکم پر مقدونوی سپاہی جو توں سمیت اس عبادت گاہ میں پھیل گئے۔ انہوں نے یہاں کا کونہ کونہ چھان مارا لیکن کسی تھن کا سراغ نہیں ملا۔ یہ وسیع و عریض عمارت بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ نذرانے کے طور پر اس معبد پر چڑھائی جانے والی بہت سی قیمتی اشیاء ابھی تک مختلف ایوانوں میں بکھری ہوئی تھیں اور آثار سے نظر آتا تھا کہ بھاگنے والے بڑی افراطی میں بھاگے ہیں۔

تابان سر قدام کر فرش پر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں لیکن آنسوؤں کا ایک آبشار حلق کے اندر گر رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر مارشا کو کھو دیا تھا بہت قریب پہنچ کر وہ پھر دور چلا گیا تھا۔ شاید کل اس وقت وہ سراپا شباب و رعنائی اپنے وجود کی شمع سے اس

کے دستے کے پچاس سوار بھی پیچھے چل دیئے۔ تابان کی بے تابی غروب پر تھی کسی وقت وہ تیز رفتاری سے گھوڑا بھاگتے ہوئے برہما سے بھی آگے نکل جاتا تب اسے خیال آتا کہ وہ تو راستے سے ہی واقف نہیں وہ رفتار دھیمی کر کے پھر برہما سے آگے گلیوں بازاروں میں متحدہ یونانی جمیٹ کے سپاہی فاتحانہ نعرے لگانے میں مصروف تھے۔ لاشوں کو ٹھکانے لگایا جا رہا تھا اور کئی جگہ اس آگ کو بجھانے کی کوشش کی جا رہی تھی جو ہمنان کے سپاہی بھاگتے ہوئے نلے کے ذخیروں کو لگا گئے تھے۔

کچھ ہی دیر بعد تابان اور سیاہ فام برہما اپنے گھوڑے دوڑاتے ایک عظیم الشان عمارت کے سامنے پہنچے۔ یہ عمارت گو شہر نہا کے اندر ہی تھی لیکن اس کے چاروں طرف ایک وسیع میدان تھا اور چھوٹے چھوٹے تالاب بہتے ہوئے تھے۔ جہاں ان تالابوں کا سلسلہ ختم ہوتا تھا وہاں سنگ سرخ سے بنی ہوئی وسیع و عریض سیڑھیاں تھیں۔ یہ سیڑھیاں تابان برہما اور ان کے ساتھیوں کو ایک بیکراں صحن میں لے آئیں اس صحن کی ایک جانب کئی ایک فلک بوس ستون تھے۔ ان ستونوں کے بالائی سروں پر بڑے بڑے پیالے تھے اور ان میں آگ جل رہی تھی۔ ان دیو پیکل ستونوں اور آگ کے بھڑکتے شعلوں کو دیکھ کر دل پر بہت سی طاری ہوتی تھی۔ ستونوں کے عقب میں ایک عمارت تھی۔ یہ عمارت بھی سیڑھیوں اور ستونوں کی طرح اپنے حجم اور وسعت میں غیر معمولی تھی۔ تابان اور برہما بھاگتے ہوئے اس عمارت کی بلند بالا چھت تلے پہنچے تو ان کے جوتوں کی ٹھک ٹھک دور تک گونج گئی۔ عمارت کے صدر دروازے پر تابان کو کم از کم پچاس خوبصورت دو شیزاؤں کی لاشیں دکھائی دیں۔ ان سب کو پیت یا سینے میں نیزہ گھونپ کر ہلاک کیا گیا تھا۔ وہ الٹی سیدھی سنگ مرمر کے فرش پر پڑی تھیں اور ان کا لوہور دور تک پھیل کر جم چکا تھا۔ سب دو شیزاؤں کے لباس ایک جیسے تھے۔ سفید قبائیں جن پر سینے کی جانب زربفت کی پٹیاں تھیں۔ ارسطوانی شکل کی ٹوپیاں جن کے سرخ فیتے ٹھوڑیوں کے نیچے بندھے ہوئے تھے۔ سب کے پاؤں ننگے تھے۔ تابان کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ اس عبادت گاہ کی خادما ہیں جنہیں قابض فوج سے محفوظ رکھنے کے لئے عبادت گاہ کے منتظمین نے ہلاک کر دیا ہے۔ آثار سے نظر آتا تھا کہ عمارت میں اب کوئی ذی نفس موجود نہیں۔ تابان نے بلند و بالا دروازے کو دھکیلا اور تیزی سے اندر داخل ہوا۔

"کوئی ہے..... کوئی ہے؟"

اس کی آواز بلند ایوان میں دور دور تک گونجی۔ چاروں طرف گل کاری سے جی

ایوان کو روشن کئے ہوئے تھی، لیکن آج یہاں تیرگی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ایک خلا تھا جس میں لامتناہی جدائی کا مغربیت پھنکار رہا تھا اس مغربیت کے خونی پیچھے تباہان کے سینے پر تھے۔ وہ اپنے ناخنوں سے ہولے ہولے تباہان کا جگر لٹوچ رہا تھا۔ نہ جانے تباہان کتنی دیر ساکت و جامد اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ آخر یہ غمانے اس کا شانہ ہلایا۔ ”اٹھو تباہان! شام ہونے والی ہے، ہمیں واپس جانا ہو گا۔“

”نہیں سردار آپ جائیں۔“ تباہان نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ”میں کچھ دیر بعد آ جاؤں گا۔“

یہ غمانے رحم آمیز نظروں سے تباہان کو دیکھا۔ پھر دونوں لڑکیوں کو ساتھ لیا اور گھوڑوں کی طرف بڑھ گیا۔ بد نصیب دو شیرازوں کی لاشیں پہلے ہی دو گھوڑا گاڑیوں پر پارکی جا چکی تھیں۔ ذرا ہی دیر بعد مقدونی سواروں کا دستہ عبادت گاہ سے روانہ ہو گیا۔ شام کے غلبے اندر سے میں تباہان انہیں دور تک جاسے دیکھتا رہا۔ اب وہ اس ہیبت ناک آتش کدے میں یکسر تھا تھا۔ ٹانوس خوشبوئیں اس کے منتھوں سے نکلا رہی تھیں اور بلند ذیلا چھتوں کے نیچے کیس کیس روشن شمع دان جگنوؤں کی طرح ٹمٹماتے نظر آتے تھے۔ تباہان بے متعقدان درودیواروں میں پکڑا لے لگا۔ ذہن کے کسی گوشے میں یہ امنونی خواہش پل رہی تھی، ”کاش کسی ستون کی اوٹ سے یا دیوار پر دے کے عقب سے مارا شاکا ہیولا نمودار ہو۔ وہ حیران نظروں سے اس کی طرف دیکھے اور ریلی آواز میں پوچھے۔“

”غلام تم یہاں؟ کہاں تھے اب تک تم؟“ وہ کوئی جواب نہ دے۔ بس گھٹنوں کے بل اس کے سامنے جھک جائے اور آنکھیں بند کر کے سر اس کے قدموں میں رکھ دے۔ اس کے پیاسے ہونٹ اپنی منزل پالیں اور سر اٹھانے کی خواہش بیش کے لئے سینے میں دفن ہو جائے۔

اچانک ایک آہٹ نے تباہان کو چونکا دیا۔ وہ اپنے قدموں کی جانب دیکھنے لگا۔ آواز عین اس کے نیچے سے آئی تھی۔ اس نے ایک موڑی کے قریب رکھا ہوا طلائی شمع دان اٹھایا اور غور سے فرش کو دیکھنے لگا۔ یہ جاننے میں سے ذرا دیر نہیں لگی کہ وہ ایک تہہ خانے پر کھڑا ہے۔ معمولی کوشش سے اس نے وہ طریقہ دریافت کر لیا جس سے تہہ خانے کا راستہ بند کرنے والی پتھریلی ریل کو سرکایا جاسکتا تھا۔ ایک آہنی کدے کی حرکت دینے کے بعد اس نے ریل کو دھکیلا تو وہ چھوٹے چھوٹے پیوں پر با آسانی حرکت کرتی ہوئی ایک طرف ہٹ گئی۔ سامنے تہہ خانے کی سیڑھیاں تھیں۔ تباہان نے کھوار بے نیام کر کے چند

زینے طے کئے تو اس کے سامنے ایک انتہائی حیران کن منظر آیا۔ یہ ایک کتب خانہ تھا۔ یہاں کتابیں رکھنے کے لئے بڑے بڑے آہنی چوکھٹے بنے ہوئے تھے۔ ان چوکھٹوں میں فرش سے چھت تک کتابیں بھری ہوئی تھیں۔ اس کتب خانے میں سینکڑوں کتابیں تھیں۔ یہ کتابیں زیادہ تر باریک چڑے کے ٹکڑوں پر لکھی گئی تھیں۔ تباہان یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ بیشتر کتابوں کو آگ لگ چکی ہے اور وہ دھڑا دھڑل رہی ہیں۔ جلتے چڑے کی بو چاروں طرف پھیل رہی تھی اور گاڑھا سیاہ دھواں تیزی سے تہہ خانے میں بھرتا جا رہا تھا۔ دفعتاً تباہان کو ایک شخص نظر آیا، وہ اپنا ڈھیلا ڈھالا لباس پھڑپھڑاتا، تیزی سے سیڑھیوں کی طرف آ رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں جلتی ہوئی مشعل تھی۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ کتب خانے کو آگ لگانے والا یہی شخص ہے۔ زینوں پر پہلا قدم رکھنے سے پہلے اس شخص کی نگاہ تباہان پر پڑی۔ وہ خشکا پھر ایک قدم پیچھے ہٹنے کے بعد اس نے مشعل ایک قریبی الماری کی طرف اچھال دی اور نیام سے تلوار کھینچ کر سینہ میں لیا۔ وہ کوئی چالیس برس کا ایک درویش نما شخص تھا چہرے سے وقار اور بزرگی نکلتی تھی۔ اس کے شانے پر کپڑے کی دورنگی پٹیاں دیکھ کر تباہان کو اندازہ ہوا کہ وہ اس عبادت گاہ میں کوئی اہم مرتبہ رکھتا ہے۔ جسمانی لحاظ سے وہ تباہان سے کہیں کمزور تھا لیکن اس نے ایک سماعت ضائع کئے بغیر تباہان پر بھروسہ کر دیا۔ تباہان اس کے وار تلوار پر روکتا ہوا اگلے قدموں تہہ خانے سے باہر نکل آیا۔ کھلی جگہ پر پہنچتے ہی نووارد کے حملوں میں شدت آ گئی۔ نووارد کی جھنکار وسیع ایوان میں دور دور تک گونج رہی تھی۔ تباہان کو اپنا دفاع کرنے میں مطلق دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔ اسے صاف طور پر اندازہ ہو رہا تھا کہ ہر مقابل کوئی مذہبی قسم کا آدمی ہے اور لڑائی بھڑائی سے اس کا کبھی کوئی تعلق نہیں رہا۔ تاہم وہ بے پناہ جوش کا مظاہرہ کر رہا تھا اور تلوار چلانے کے ساتھ ساتھ تباہان کو دھکا کا تا بھی جا رہا تھا۔

”بھلا کسے؟“ لنگر جاؤ یہاں سے دور ہو جاؤ اس متبرک مقام سے۔“ اس کی بدکامی سے بھگ آ کر تباہان نے ایک ہلکا سا وار اس کے دائیں کندھے پر کیا۔ وہ سنبھلنے کی کوشش کرتا ہوا اپنے ہی زور میں ”دیوی ہنیدہ“ کے ایک قد آدم جیسے کے قدموں میں گرا۔ تباہان کی ایک چمچی تلی ٹھوکر نے اس کی تلوار ہوا میں اڑا دی۔ جب وہ اٹھا تو اس کا گردبان تباہان کی مضبوط گرفت میں تھا۔ تباہان کا خیال تھا کہ وہ خود کو بے بس پا کر کم جائے گا لیکن اس نے بڑی بے خوفی سے تباہان کے منہ پر تھوک دیا اور اس سے تلوار چھیننے کی کوشش کرنے لگا۔ تباہان کا دماغ جھج گیا۔ اس کا دل چاہا ایک ہی وار سے اس شخص کا کام



تمام کروے مگر پھر وہ سنبھل گیا۔ اسے احساس ہوا کہ یہ مقابلہ خود بھی یہی چاہتا ہے کہ اسے قتل کر دیا جائے اور اگر تہاں نے ایسا کیا تو یہ مقابلہ کی خواہش کا احترام ہو گا۔ تہاں نے اپنے اشتعال پر قابو پا کر تلوار کو خون آلود ہونے سے بچایا۔ تہہ خانے کی آگ اب پھنکارتی ہوئی باہر نکل رہی تھی اور ایوان کی بلند چھت کے نیچے دھواں بھرتا جا رہا تھا۔ تہاں نے اپنے جوشیلے حریف کو بازوؤں میں بھرا اور اس کی مزاحمت کو خاطر میں لائے بغیر اٹھا کر باہر لے آیا اسے فرش پر پھینک کر تہاں پھنکارا۔

”کون ہو تم اور کتب خانے میں آگ کیوں لگائی تم نے؟“

ادیجر عمر حریف سینہ کان کر بولا۔ ”میں محافظ ہوں اس عبادت گاہ کا“ تم نے یا تم جیسے کسی اور کتے نے اس جگہ کو بخش کرنے کی کوشش کی تو میں بوٹیاں نوچ لوں گا اس کی۔“ پھر اس کی نگاہ اس خون پر پڑی جو بد نصیب دو شیرازوں کے بدن سے لگا تھا اور سنگی فرش پر دور تک پھیلا ہوا تھا۔ وہ وحشتانہ لہجے میں بولا۔ ”دیکھ رہے ہو یہ ابو۔ اس معصوم ابو کا ہر قطرہ تمہاری گردن پر ہے۔ تم جو نامعلوم باپوں کی اولاد ہو ہمارے جوانوں کے ہاتھوں وحشت الارض کی موت مرو گے یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔“

تہاں پر اب یہ واضح ہو چکا تھا کہ یہ شخص اسے اشتعال دلانے کی شعوری کوشش میں مصروف ہے اور چاہتا ہے کہ تہاں اسے زندگی کی قید سے آزاد کر ڈالے۔ وہ باطمینان اپنی جگہ کھڑا رہا۔ بارش شخص نے مایوس ہو کر تہاں پر چھلانگ لگائی اور اپنی انگلیوں سے اس کی آنکھیں نوچ لینا چاہیں۔ تہاں نے بمشکل اپنا چہرہ بچایا۔ وہ شخص غلی باتھ ہونے کے باوجود بار بار تہاں پر حملہ آور ہونے لگا۔ اب تہاں کا پیانا صبر بھی لبریز ہو گیا۔ اس نے تلوار ایک طرف جھینگی اور چند زور دار ہاتھ یہ مقابلہ کو رسید کئے۔ اس کا ایک ہونٹ پھٹ گیا اور ناک سے خون بہہ نکلا۔ تہاں کی آخری ضرب کھانے کے بعد وہ اونٹھے منہ خون آلود فرش پر گرا تھا۔ اس کا چہرہ اور کپڑے خون سے لٹھر گئے اور وہ اچانک ہتھیوں سے روٹنے لگا۔ کافی دیر رو پھٹنے کے بعد اس نے التجائی انداز میں تہاں سے کہا کہ وہ اسے جان سے مار ڈالے۔ تہاں نے اسے سارا دے کر اٹھایا۔ صحن کے تالاب سے اس کا چہرہ دھلایا اور ہونٹ کے زخم سے خون روکنے کی کوشش کی۔

تہہ خانے میں بزم کئی آگ تہہ خانے تک ہی محدود رہی تھی لیکن دھواں چاروں سو پھیل گیا تھا۔ تہاں نے ادیجر عمر شخص کو ساتھ لیا اور دھوئیں کے مرغولوں سے کافی بہت کر آتش کدے کی طویل و عریض میزبوں میں آ بیٹھا۔ ادیجر عمر شخص اب قدرے حواس

میں تھا۔ تہاں کے کچھ پوچھے سے پیشتر ہی وہ کہنے لگا۔ ”میرا نام روہتا ہے۔ میں اس معبد کا منتظم اعلیٰ ہوں۔ ایک خلقت میری مداح ہے اور دل و جان سے میری عزت کرتی ہے۔ یہ مرتبہ مجھے یونسی نہیں ملا۔ میں نے ہر قسم کی دنیاوی لذتوں سے کنارہ کشی اختیار کر کے یہ مقام حاصل کیا ہے۔ ہوش سنبھالنے سے اب تک میں نے ایک وقت میں سات لٹے سے زیادہ کھانا نہیں کھیا۔ ایک دن میں ایک سپرے زیادہ نہیں سویا اور عورت کو اپنی خلوت سے ہمیشہ دور رکھا ہے۔ کڑی ریاضتوں نے مجھے اس مقام کا حقدار ٹھہرایا ہے اور اب میں یہ مقام کھو نہیں چاہتا۔ لہذا بہتر ہے کہ اب جہان فانی سے اپنی آنکھیں بند کر لوں۔ میرے عقیدے کی رو سے خود کشی گناہ عظیم ہے ورنہ میں اب تک تہہ خانے کے شعلوں میں جھسم ہو چکا ہوتا۔“

تہاں نے پوچھا۔ ”اسے محترم بزرگ کون تم سے تمہارا منصب چھین رہا ہے۔ ہم شیرے ہیں اور نہ غارت گر“ ہمارا سلاور اعظم بتیاس بسانے پر یقین رکھتا ہے اجازت پر نہیں۔ ہم نے اب تک جن شیروں کو زیر نگین کیا ہے ان میں سے چند کے سوا سب کے سب آباد ہیں اور وہاں کے باشندے ہی وہاں حکومت کرتے ہیں سب کی عزتیں محفوظ اور منصب برقرار ہیں۔“

روہتا نے دبی آواز میں کہا۔ ”میں یہ سب جانتا ہوں‘ سچ پوچھتے ہو تو..... میں نے تمہیں صرف اشتعال دلانے کے لئے وہ الزامات لگائے تھے۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہاری وجہ سے میرے منصب اور مرتبے کو کوئی خطرہ لاحق نہیں۔“

”تو پھر کس سے خطرہ لاحق ہے؟“

”اپنے آپ سے۔“ روہتا نے سکون سے جواب دیا۔ ”میں خود ہی اپنی عزت کا

ظہار اور اپنی ناموس کا دشمن ہو گیا ہوں۔“

تہاں نے حیرانی سے کہا۔ ”میں کچھ سمجھا نہیں۔“

روہتا نے ایک گہری سانس لی سر پر تاروں بھرا آسمان تھا۔ شمال جنوباً ایک فرشتہ بخش ہوا چل رہی تھی۔ روہتا کے لیے پھردی بال ہوا میں لہرا رہے تھے اور چہرے کی نمکت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ بولا۔ ”نود جان“ میری ساری زندگی لوگوں کو یہ درس دیتے ہوئے گزری ہے کہ وہ نفسانی خواہشات سے دور رہیں خاص طور پر صنف بازک کی قربت سے۔ میں اس موضوع کے حق میں ساری زندگی دلائل کے انبار لگا رہا ہوں۔ کہیں لکھتا رہا ہوں اور جمع کرتا رہا ہوں۔ آج صبح شب و روز میں نے اپنے موقف کو

تقویت دینے کے لئے سوچ بچار میں گزار دیے اور ہر موسم میں میرے دل و دماغ پر فکر اور تحقیق کا موسم چھایا رہا۔ لوگوں نے میرے افکار کو سنا اور روح میں بسایا۔ چاہئے والوں نے اپنی زندگیاں میرے فلسفے کے تابع کر دیں۔ لیکن پھر ایک روز میری زندگی میں ایک چہرہ آیا۔ اسے اجنبی نوجوان! وہ چہرہ اتنا حسین تھا کہ اس کی ایک جھلک نے میری بروں کی ریاضت پر پانی پھیر دیا۔

ایکایک بوڑھا چپ ہو گیا۔ غالباً وہ بات کو اتنے واضح انداز میں کہنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے نگاہیں جھکا لیں اور موضوع بدل کر بولا۔ ”تم میرے دشمن ہو اور میں تم سے کوئی ایسی چیز نہیں مانگ رہا جو تم دے نہ سکو۔ تمہاری تلوار کا ایک وار میرے سارے مصائب کا خاتمہ کر سکتا ہے۔“

تابان نے کہا۔ ”آپ کسی چہرے کا ذکر کر رہے تھے، کس کا چہرہ تھا وہ؟“  
”یوں سمجھ لو کہ میری دہلی ہوئی خواہشات کا چہرہ تھا۔ ان ناآسودہ جذباتوں کا چہرہ جو ہر کر بھی انسان کے اندر زندہ رہتے ہیں۔“

روہتاس کے انداز سے واضح تھا کہ وہ اب اس موضوع پر کھل کر بات کرنا نہیں چاہتا۔ تابان نے کہا۔ ”آپ نے مجھے غضب ناک کرنے کی کوشش کی اور میں واقعی غصے کی انتہا کو چھو گیا تھا۔ اگر میں نے اس وقت آپ کو قتل نہیں کیا تو اب کیسے کر سکتا ہوں؟“

روہتاس نے کہا۔ ”تمہارے قتل نہ کرنے سے میں بچ نہیں جاؤں گا۔ جو شخص مرنے کا ارادہ کر لے اکثر تقدیر بھی اس کے راستے سے ہٹ جاتی ہے۔“ اس نے اٹھ کر اپنی تلوار اٹھائی اور چل دیا۔

”کہاں جا رہے ہیں؟“ تابان نے پوچھا۔  
”سوت کی تلاش میں۔ مجھے یقین ہے کہ کل طلوع آفتاب سے پہلے پہلے میں اسے ڈھونڈ لوں گا۔“

”لیکن آپ کے عقیدے کی رو سے خودکشی گناہ عظیم ہے۔“  
”میں خودکشی نہیں کروں گا۔ لڑتے ہوئے جان دوں گا۔ شہر میں گشت کرتے ہوئے کسی بھی مقدونی دست پر ٹوٹ پڑوں گا۔“

”ممکن ہے آپ گرفتار ہوں اور طویل عرصے کے لیے قید خانے میں ڈال دیے جائیں۔“

”ہاں، اس بات کا بھی امکان ہے۔ تاہم طویل عرصے کے لیے گرفتار ہونے سے بھی میرا مقصد پورا ہو جائے گا۔“

تابان نے کہا۔ ”محترم بزرگ، مجھے آپ کی باتوں کا مضمون سمجھ میں نہیں آ رہا لیکن یہ اندازہ ہو رہا ہے کہ آپ وہی کریں گے جو کہہ رہے ہیں۔ معلوم نہیں کہ آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ میں تو بس یہی کہہ سکتا ہوں کہ آپ کو اپنی زندگی یوں داؤ پر نہیں لگنی چاہئے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ گرفتاری سے آپ کا مسئلہ حل ہوتا ہے تو میں آپ کو گرفتار کرتا ہوں اور جب تک آپ کہیں گے آپ کو گرفتار رکھوں گا۔“

ادویز عمر روہتاس مسکرایا۔ اس کے باوقار چہرے پر کئی خوبصورت شکنیں ابھر آئیں۔ ”نہیں نوجوان، یہ اختیار اور بے اختیاری کا مسئلہ بہت باریک ہے۔ شاید تم سمجھ نہ سکو۔“ اچھا اب میں چلتا ہوں۔ نیکی کے دیوتا تمہاری حفاظت کریں۔“

ادویز عمر روہتاس نے چند زینے طے کئے اور دیکھتے ہی دیکھتے دھمیں کے سیاہ مرغولوں میں روپوش ہو گیا۔ تابان بے حس و حرکت اپنی جگہ بیٹھا رہ گیا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی ملاقات کسی جیتے جاگتے انسان سے نہیں ہوئی۔ یہ کسی قدیم داستان کا افسانوی کردار تھا جو اس دیران معبد میں ایک جھنک دکھا کر او جھل ہو گیا ہے۔ آخر اس کی کیا مجبوری تھی کہ وہ مرنا چاہتا تھا؟ یہ سوال بار بار تابان کے ذہن میں ابھر رہا تھا۔ اس نے کسی حسین چہرے کا ذکر کیا تھا۔ وہ کس کا چہرہ تھا اور روہتاس کے مرنے یا قید ہو جانے سے اس چہرے کا کیا تعلق تھا۔ ادویز عمر روہتاس اب یہاں نہیں تھا۔ ان سوالوں کے جواب تابان کو کون دیتا۔ شاید یہ سوال ہمیشہ اس کے لیے حل طلب رہے لیکن دوبارہ تہ خانے کی طرف جانے سے اسے ان سوالوں کا جواب مل گیا۔ کافی رات گئے وہ میڑھنوں سے اٹھا اور اس بلند و بالا ایوان میں داخل ہوا جہاں روشن طاقتوں میں ”تابید دیوی“ کی چھوٹی بڑی صورتیں فضا سے جھکی تھیں اور منتقل محرابوں میں ایسے چراغ جل رہے تھے جن میں صدیوں پرانا تیل ڈالا گیا تھا۔ اسی ایوان کے فرش میں کتب خانے کا راستہ تھا۔ کتب خانے کی آگ اب بجھ چکی تھی اور ایوان میں جلتے ہوئے ”چری کاٹھ“ کی بو رہی بسی تھی۔ ایک نظر کتب خانے کو دیکھنے کے لیے تابان نے میڑھنوں پر قدم رکھا اور آہستہ آہستہ اترنے لگا۔ کتب خانے میں حرارت ابھی باقی تھی اور در و دیوار سیاہ نظر آ رہے تھے۔ کئی الماریاں ابھی تک سنگ دی تھیں۔ زینوں کے قریب کتابوں کا ایک ذخیرہ غیر متوقع طور پر بالکل محفوظ رہا تھا۔ تابان ان کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ یہ فارسی



میں تھیں اور تہاں فارسی اچھی طرح سمجھتا تھا۔ تاہم ان کتابوں کے مضامین بہت مشکل اور تہاں کے لیے ناقابل فہم تھے۔ ان کتابوں میں رکھی ہوئی ایک لیبرٹری سی کتاب قدرے مختلف تھی اور اس کی تحریر بھی نسبتاً آسان نظر آئی۔ تہاں نے اس کی ورق گردانی کی تو جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ یہ ایک روزنامہ ہے اور اسے لکھنے والا خود روہتاس ہے۔ اس روزنامے میں آٹھ دس روز پہلے تک کا احوال تفصیل سے درج تھا۔ تہاں کو اس روزنامے میں دلچسپی محسوس ہوئی اور وہ اسے لے کر باہر آگیا۔ "ناہید دیوی" کی سب سے بڑی مورتی کے قریب شمعوں کی روشنی میں ایک چوڑے پرچہ کر اس نے یہ روزنامہ پڑھنا شروع کیا۔ ایک صفحے پر دس ماہ پہلے کی ایک تاریخ درج تھی۔ اس صفحے کی تحریر نے تہاں کو بری طرح چونکا دیا۔

لکھا تھا۔ "وہ ایک صندوق میں بند" دریا کی لہروں پر بہتی یہاں پہنچی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ یونان کی شہزادی ہے مگر مجھے تو وہ آسمان کی شہزادی دکھائی دیتی ہے۔ میرے علاوہ صرف تین افراد نے اسے قریب سے دیکھا ہے اور وہ تینوں بھی حیران ہیں کہ کیا انسانی چہرے میں اتنی وجاہت سا سکتی ہے۔ وہ حسین سا رہا ہے۔ اس کا اٹھنا بیٹھنا ہونٹ ہلانا، پلکوں کو جنبش دینا سب کچھ اپنے اندر بیکراں حسن سمیٹے ہوئے ہے۔ ایسی عورت بڑے سے بڑے عابد زاہد کے لیے خطرہ ثابت ہو سکتی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ اس عبادت گاہ میں آئے لیکن والدی شر حکم صادر کر چکا ہے۔ اب مجھے رضامندی ظاہر کرنا ہی پڑے گی۔"

تہاں نے جلدی جلدی چند ورق پلٹے۔ پانچ روز بعد کی ایک اور تاریخ میں اسے یہی سنسنی خیز ذکر ملا۔ روہتاس نے لکھا تھا۔ "وہ اپنا نام مارشا بتاتی ہے۔ یہ خوبصورت نام ہے جیسے دھند میں چھپی ہوئی انگوروں کی بیلوں پر کوئی تیلی منڈلا رہی ہو۔ یا گرم دودھ میں خالص شہد ملایا جا رہا ہو اور اس کی خوشبو ہوا میں اڑ رہی ہو۔ مگر اسے دیوی کی مسند پر بٹھانے سے پہلے ہمیں اس کے لیے کوئی اور نام بھی تجویز کرنا ہو گا۔ کوئی متبرک اور مقدس نام۔ میں آج سارا دن قدیم مذہبی کتب کے نسخے کھنگالتا رہا ہوں لیکن کوئی ایسا نام سامنے نہیں آیا جو اس کی شخصیت پر چمک سکے۔ کچھ عجیب شخصیت کی مالک ہے وہ۔ اس کے اندر سے مظاہرشی شعائیں پھوٹی ہیں اور ہر قریبی جسم کو اپنی طرف کھینچتی ہیں یا شاید مجھے ہی ایسا محسوس ہوتا ہے۔ وہ ایک خطرناک عورت ہے" بے حد خطرناک۔ کبھی کبھی اس کی موجودگی کے تصور سے میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ میں خود کو ملامت کرتا ہوں لیکن اس کا تصور

بار بار میرے ذہن سے آچپکا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں جب مجھ جیسے شخص کی یہ کیفیت ہے تو ان پجاریوں کی کیا کیفیت ہو گی جو اس معبد میں اسے دیکھ چکے ہیں یا آئندہ دیکھیں گے۔"

اس تاریخ کے بعد قریباً ایک ماہ تک مارشا کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ بس مذہبی رسوم کی تفصیل تھی۔ مانی کے پیروکاروں کے ساتھ مباحثوں کا تذکرہ تھا یا معبد کی آمدن و خروج کا حساب لکھا تھا۔ پھر ایک جگہ مارشا کا ذکر ان الفاظ میں آتا تھا۔ "یہ عورت میرے لیے دیوتاؤں کی طرف سے آزمائش بن کر آئی ہے۔۔۔۔۔۔ ایک ایسی آزمائش جو ہر طرح عذاب کی ہم پلہ ہے۔ میرے سارے نظریات اور عقائد ایک ایک کر کے ریت کی دیواروں کی طرح ڈھیر ہوتے جا رہے ہیں۔ کبھی یوں لگتا ہے کہ میری برسوں کی ریاضت رائیگاں جانے والی ہے۔ میں سب کچھ جانتے بوجھتے بھی کچھ سمجھنے سے قاصر ہوں۔ میری روح درمیان سے دولت ہو گئی ہے اور ایک حصہ میرے اختیار میں نہیں رہا۔ وہ کچھ لمحہ اس عورت کی طرف کھینچتا چلا جا رہا ہے۔ یہ سوچ کر لرز جاتا ہوں اگر میری ان کیفیات کا علم میرے پیروکاروں کو ہو جائے تو کیا ہو وہ سب کے سب صدمے سے پاگل نہ ہو جائیں گے۔۔۔۔۔۔ چند روز پہلے سکندر مقدونی کی چالیس ہزار سپاہ شہر کا محاصرہ کر چکی ہیں۔ خدشہ ہے کہ بات چیت ناکام ہو گئی تو ایک دو دن میں شہر پر بلہ بول دیا جائے گا۔ سوچا ہوں اس جنگ میں میری روح بھی جسم سے آزادی پا جائے تو کتنا اچھا ہو۔ اس رسوائی سے توجہ جاؤں جو قدم قدم میری طرف بڑھ رہی ہے۔ نہ جانے کیوں مجھے یقین ہے کہ اگر میں زندہ رہا تو اپنے اندر کے شیطان کو جو روز بروز طاقتور ہو رہا ہے" اس عورت کی جانب بڑھنے سے نہ روک سکوں گا۔ میرے اندر اس کے حسن کے لیے" نہ ختم ہونے والی بھوک پیدا ہوتی جا رہی ہے۔"

روزنامے میں درج یہ تحریر آخری تھی۔ تہاں نے یہ چری کتاب تہ کی اور خیالوں میں کھو گیا۔ روہتاس کی گتھی سلجھ چکی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے اس نے جس حسین چہرے کا ذکر کیا تھا وہ مارشا ہی کا تھا۔ روہتاس نے اسے دیکھا تھا اور اس کے پتھر لیے دل میں چونک لگ گئی تھی۔ انجام کار نوبت یہاں تک پہنچی تھی کہ اس کے جذبے بے لگام ہو گئے تھے اور وہ خود اپنے سامنے بے بس ہو گیا تھا۔ یہ بے بسی اسے خود کشی کی طرف لے جا رہی تھی لیکن خود کشی اس کے نزدیک گناہ عظیم تھی۔ جب لوگ شہر سے بھاگ رہے تھے وہ معبد کی حفاظت کے بہانے یہاں تھما رہا تھا۔ شدید مایوسی کے عالم میں اس نے وہ

کتابیں جلا ڈالیں تھیں جن پر اب تک اس کا غیر متزلزل ایمان تھا۔ پھر اس نے تاجان پر حملہ کر کے موت کو گھلے لگانا چاہا تھا مگر ناکام رہا تھا۔ وہ ہر صورت مرنا چاہتا تھا کیونکہ اس کا یہ وہم پختہ ہو چکا تھا کہ اگر وہ زندہ رہا تو اپنی خواہشات پر قابو نہ رکھ سکے گا اور مارشکی جانب کھینچا چلا جائے گا۔

مارشکی صورت تاجان کی نگاہوں میں گھومنے لگی۔ ہاں..... وہ چہرہ ایسا ہی تھا۔ اسے دیکھ کر دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوتی تھیں اور پھر یہ بے ترتیبی آنے والے روز و شب اور ماہ و سال پر حاوی ہو جاتی تھی۔ کوئی اس حشر سے کم متاثر ہوتا تھا اور کوئی زیادہ لیکن ہوتا ضرور تھا۔ شاید اس حسن کو دیکھ کر فراموش کر دینا انسان آگے کے بس میں ہی نہیں تھا۔ سو رتی کے چوتھے سے ٹیک لگائے تاجان سرد آہیں کھینچتا رہا اور ان دردناک اور میں مارشکی خوشبو سونگھتا رہا۔ ایک ناقابل برداشت درد تھڑہ قطرہ اس کے سینے میں جمع ہو رہا تھا اور اب کرب کا سمندر بن گیا تھا۔ تاجان کا دم گھٹنے لگا۔ وہ گھبرا کر معبد کے بلند و بالا ایوان سے نکل آیا۔ ان لمحات میں اسے کسی ہمزاد دیرینہ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ کوئی ایسا ساتھی جو اس کے روگ سے آگاہ ہو اور اس کی روح میں اتر کر اس کے غم کو محسوس کر سکے۔ اس کی نگاہوں میں کورا کی صورت گھومنے لگی۔ اس کا دل چاہا کہ کورا اس کے سامنے بیٹھی ہو اور وہ اس کی آغوش میں سر رکھ کر آنکھیں بند کر لے۔ بند بچکوں کے نیچے سے آنسوؤں کا سوتا پھوٹے اور اس کے رخساروں پر پڑنے لگے۔ وہ ان آنسوؤں کو روکنے کی کوشش نہ کرے اور نہ منہ سے کچھ بولے۔ بس اسی طرح گم لینا رہے۔

وہ ویران معبد کی سیڑھیاں اتر کر اپنے تھا گھوڑے تک پہنچا۔ وہ اس ویرانی اور تاریکی کا ایک حصہ محسوس ہو رہا تھا۔ گھوڑے پر سوار ہو کر اس نے ایزد لگائی اور شہر کے گنجائش جسے کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ شدید مایوسی اور اداسی اس کی زندگی میں پہلی بار وارد ہوئی تھی۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اداسی اور مایوسی کا اس کی زندگی میں دخل ہی نہ تھا۔ وہ تو یونان کے گھنے جنگوں کا ایک آزاد "دوپایہ" تھا۔ شوخ و چٹیل اور بے حد برق رفتار۔ اس کی صورت کا بھوپن شکاریوں کو دام پھیلانے پر اکساتا تھا۔ مگر وہ ہر دام کاٹتا تھا اور شکاریوں کو یادگار صدمے دے کر نکل جاتا تھا۔ یہ سلسلہ فارس زئوب کی بنی پر آکر ختم ہوا تھا۔ اس سین شکاری نے اسے ایسا چھانسا تھا کہ وہ ساری چوڑی بھول گیا تھا۔ اس کی ساری شوخیاں دھری رہ گئی تھیں۔ اب وہ مایہ بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا اور اپنے درد کی دوا ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔

جلدی تاجان شہر کے رہائشی علاقے میں پہنچ گیا۔ بیشتر مقامات پر لگی ہوئی آگ اب بجھ چکی تھی اور غلے کے ادھ جلے گوداموں کے گرد مسلح مقدونی گشت کر رہے تھے۔ تاجان شہر کے مرکز میں پہنچا۔ سالار اعظم سکندر دانی شہر کے محل نما مکان میں قیام پذیر تھا۔ اس مکان کے قریب ہی کسی مدرسے کی بہت بڑی عمارت تھی۔ اس عمارت کو عارضی طور پر لشکر کے ساتھ آنے والی خواتین کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ تاجان کو راک کی تلاش میں یہاں پہنچا اور پھانک پر موجود محافظوں کو اپنی شناخت کرانے کے بعد کورا کو بلانے کی ہدایت کی۔ محافظوں نے یہ اطلاع دے کر تاجان کو حیران کیا کہ کورا ابھی تھوڑی دیر پہلے شہر سے باہر گئی ہے۔ تاجان سوچ میں ڈوب گیا۔ کورا کو اس عمارت سے باہر کیا کام ہو سکتا تھا۔ اس نے محافظوں کو کورا کی ایک قریبی سہیلی کا نام بتایا اور اسے بلانے کی ہدایت کی۔ تھوڑی دیر بعد یہ لڑکی تاجان کے سامنے حاضر تھی۔ تاجان کو دیکھ کر لڑکی کے چہرے پر شدید حیرت نمودار ہوئی۔ تاہم اس کیفیت کو چھپاتے ہوئے وہ تاجان کے قریب چلی آئی اور سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگی۔

"سردار! آپ یہاں؟ کورا تو آپ کی طرف گئی ہے۔"

تاجان بولا۔ "کیوں میری طرف کیوں گئی ہے؟"

لڑکی نے اپنی آواز کچھ اور دھیمی کی۔ "کیا آپ زخمی نہیں ہوئے؟"

تاجان بولا۔ "کیوں تاجان کو احساس ہوا کہ کوئی تشویش ناک واقعہ پیش آچکا ہے۔ وہ تیزی سے بولا۔ "کون لایا تھا زخمی ہونے کی اطلاع؟"

"آپ ہی کے دستے کے سپاہی تھے۔ ایک کا نام فرال ہے اور دوسرے کو میں شکل سے جانتی ہوں۔"

"کیا بتایا ہے انہوں نے؟"

"وہ کہہ رہے تھے کہ آپ کسی کو بتائے بغیر شہزادی مارشکی تلاش میں شہر پہنچے سے باہر گئے تھے اور قریبی جنگل میں شدید زخمی ہو گئے ہیں۔"

تاجان بولا۔ "کسی نے تمہیں بتایا ہے۔ میں سالار اعظم کی اجازت سے گیا تھا اور مجھے کوئی حادثہ بھی پیش نہیں آیا۔"

لڑکی کا چہرہ اب واضح طور پر خوف و ہراس کی زد میں تھا۔ اس کے ہونٹ لرزے۔

"تو پھر وہ کہاں گئی ہے؟"

اچانک سردار شلال کا منہ اس چہرہ اپنی پوری حشر سامانیوں کے ساتھ تاجان کے تصور





خود بند کروں گا۔" شلال کے لہجے میں نیچائی کیفیت تھی۔ یوں لگتا تھا عقوبت خانے میں جھیلی ہوئی تمام اذیت زہرین کر اس کی آواز میں گھل مل گئی ہے۔ تلوار کے دستے پر تابان کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ وہ دیکھ رہا تھا دونوں گھڑ سوار اسے بے خبری میں آئینے کے لیے عقب سے بڑھ رہے ہیں۔ یہ دونوں سوار فرمال اور بھورن تھے۔ ان دونوں کا تعلق تابان ہی کے "ٹیک ہزاری" دستے سے تھا۔ انہوں نے شلال سے درپردہ وفاداری نبھائی تھی اور کورا کو پھسلا کر یہاں لے آئے تھے۔ ان دونوں کے لیے تابان کے جسم میں بجلی بھر گئی تھی۔ وہ جو کسی قریب تک پہنچنے کے لیے دروغ ان پر جھپٹ پڑا مگر وہ قریب پہنچے نہیں۔ شلال کی زور دار آواز نے انہیں روک دیا۔ اس نے گرج کر اعلان کیا کہ تابان کا مقابلہ وہ تھا کرے گا۔

یہ سننی خیز اعلان تابان نے بڑے اطمینان سے سنا اور اس کی رگوں میں ایک مینھا مینھا جوش لہریں لینے لگا۔ شلال جیسے دیرینہ دشمن سے دوبارہ مقابلہ تابان کے لیے فرحت بخش تھا۔ شلال نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا۔ وہ سر ہٹکا کر ٹیلے کے عقب میں اوجھل ہو گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ دو بہت وزنی تلواریں اور ڈھائیں لئے برآمد ہوا۔ شلال نے تابان سے کہا کہ وہ ایک تلوار اور ڈھال منتخب کر سکتا ہے۔ تابان نے کہا۔

"فی الحال میرے پاس اپنے ہتھیار موجود ہیں۔"

اس نے کمر سے ہلکی پھلکی ڈھال اتار کر ہاتھ میں کر لی اور شلال سے مقابلے کے لیے تیار ہو گیا۔ شلال نے تانبے کی نقش ڈھال سنبھالی پھر تلوار پر گرفت مضبوط کی اور تابان کے رو برو آ گیا۔ قدم کے اعتبار سے دونوں مساوی تھے لیکن پھیلاؤ کے لحاظ سے شلال زیادہ جسیم نظر آتا تھا۔ اس نے مچھا ہونٹ دانتوں میں دبا رکھا تھا اور آتھیں لگا دیں تابان کی آنکھوں میں بڑبڑت تھیں۔ چٹکیے اجالے نے جنگل کے شیب و فراز کو روشن کر دیا تھا۔ شبنم آلود برگ و بار بار صبا میں جھوم رہے تھے اور پھلکی شاخوں پر پرندے نغمہ سرا تھے تاہم اس خوبصورت ماحول میں جو کچھ ہونے جا رہا تھا وہ نہایت بد صورت اور خوفناک تھا۔ دو طاقتور جنگجو تیز دھار آلے لئے مقابل تھے اور نگاہوں نگاہوں میں ایک دوسرے کی قوت بازو کا جائزہ لے رہے تھے۔ ایک ایک سردار شلال کے حلق سے لرزہ خیز چٹکنا بند ہوئی۔ جیسے کوئی خوابیدہ آتش فشاں کسی ارضی جنبش سے یک لخت جاگ اٹھے اور اس کا دہانت سماعت دشمن دھماکے سے پھٹ جائے۔ شلال کا پہلا وار تابان کی توقع سے کہیں زیادہ مسلک اور بھرپور تھا۔ اس طوفانی وار میں وہ تمام نفرت یکجا ہو گئی تھی جو پچھلے ڈیرہ برس

سے شلال نے ریزہ ریزہ کر کے اپنے دل میں جمع کی تھی اور وہ عداوت بھی شامل تھی جسے وہ اپنی وحشوں کا خون دے کر پال رہا تھا۔ شلال کی منہ زور جسمانی قوت نے اس دار کو دو آتشہ کر کے بمقابل کے لیے سراسر موت بنا دیا تھا۔ تابان نے اپنی جگہ چھوڑنے میں ایک ساعت کی بھی تاخیر کی ہوئی تو اس کا سر ڈھلوان پر لڑھکتا نظر آتا پھر بھی اپنی بہترین کوشش کے باوجود وہ خود کو زخمی ہونے سے نہ بچا سکا۔ اس کا ایک بازو کندھے سے کھنی تک چر گیا، ڈھال دو ٹکڑے ہو گئی اور تلوار دستے سے ٹوٹ کر دور جا گری۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد شلال کی تلوار کا زور ٹوٹا۔ اس نے بے حد تیزی سے تلوار کو سر پر لہرایا اور وحشیانہ چٹکناؤ کے ساتھ دوسرا وار تابان پر کیا۔ تابان یہ وار بچانے ہوئے بے اختیار زمین پر گر گیا۔ اس گھڑی موت اسے آنکھوں کے رو برو دکھائی دی۔ اسے لگا جیسے اچانک وہ ایک پاگل باتھی کے سامنے آ گیا ہے اور وہ اسے ہر صورت کھل دینا چاہتا ہے۔ ان لمحات میں تابان حواس بحال نہ رکھتا تو اس کی ہلاکت یقینی تھی۔ وہ ان لمحوں کی نزاکت اچھی طرح سمجھتا تھا۔ تمام تر توانائی جمع کر کے وہ شلال کے ہاتھوں میں کوندنی برق سے پہنچنے کے لیے تیار ہو گیا۔

دو وار خالی جانے کے بعد شلال مکمل طور پر آپے سے باہر ہو چکا تھا۔ وہ تابان پر ہموار توڑ مٹلے کرنے لگا۔ تابان کی تمام تر توجہ اس کے ہاتھوں کی حرکت پر تھی۔ وہ ہر وار قابل دید پھرتی سے بچا رہا تھا۔ اب یہ کام اس کے لیے پہلے سادھوار نہیں رہا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ تلوار کتنی تیزی سے اور کس رخ سے آئے گی۔ وہ ہر بار جسم کی ایک تیز جنبش کے ساتھ موت کو چمک دے رہا تھا۔ آنا فنا شلال ہانپ گیا۔ اس کے وار اونچے پڑنے لگے۔ تابان نے جھکاؤ دے کر ایک لمبی جست کی اور سیدھا اس بھاری بھر کم تلوار پر آیا جس کی پیشکش شلال اسے کچھ دیر پیشتر کر چکا تھا۔ اس تلوار کے استعمال کا یہ بہترین موقع تھا۔ جو کسی یہ تلوار تابان کے ہاتھ میں آئی اور گرد کھڑے تینوں افراد کے چروں پر سراسیمگی کے آثار نظر آئے۔ تابان کو دوبارہ مسلح دیکھ کر شلال بھی سنبھل گیا۔ اس نے تابان کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑیں اور مہارت سے قدموں کو آگے پیچھے حرکت دینے لگا۔ تابان کی تمام تر توجہ اس کی حرکات پر تھی۔ آنکھوں میں ایک وحشی پنک عود کر آئی تھی۔ پھر اچانک جیسے بجلی لپک گئی۔ تابان نے دونوں ہاتھوں کے زور سے ناک کر دیا اور اسے ڈھال پر لینے کی کوشش میں شلال اٹ کر ایک گھوڑے کے پاؤں میں جا گرا۔ گھوڑے نے بدک کر ٹانگیں چلائیں اور شلال کو اپنے آپ میں ابھال لیا۔ تابان کے لیے



یہ مہلت بہت تھی۔ وہ جھپٹ کر آگے آیا اور اس کی تلوار کسی نیزے کی مانند شلال کی کلائی میں پیوست ہو کر زمین میں دھنسن گئی۔ یہ وہی ہاتھ تھا جس میں شلال نے تلوار سنبھال رکھی تھی۔ اب شلال بے بس تھا۔ اسے شکست خوردہ دیکھ کر اس کے تینوں ساتھی متحرک ہوئے لیکن انہیں ٹھنک کر رکنا پڑا۔ ایک جانب کے درختوں سے گھوڑوں کی ٹائیں سنائی دیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے مقدونی سپاہیوں کی رنگین وردیاں نظر آئیں۔ وہ نیزے چمکاتے ہوئے موقع کی طرف آرہے تھے۔ تہاں اپنا نچلا ہونٹ دانتوں سے کاٹ کر رہ گیا۔ اس کی شعلہ بار ٹانگیں شلال پر جمی تھیں۔ مقدونی سپاہیوں کی آمد میں چند ساتھیوں کی دیر ہوئی تو تہاں شلال کو قید زندگی سے آزاد کر چکا تھا مگر سپاہیوں کی موجودگی میں وہ اسے ہلاک نہیں کر سکتا تھا۔ شلال سکندر کا مجرم تھا اور اس کے بارے میں آخری فیصلے کا حق بھی سکندر ہی کو تھا۔ گھڑسوار سپاہی قریب پہنچے اور انہوں نے کہا جے ہوئے شلال کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ تہاں نے چونک کر ٹیلے کی طرف دیکھا اس لمحائی مہلت سے فائدہ اٹھا کر شلال کے تینوں ساتھی راہ فرار اختیار کر چکے تھے۔ ٹیلے کے عقب میں جہیم کتے مسلسل بھونک رہے تھے۔ تہاں نے تلوار شلال کی کلائی سے کھینچی اور ٹیلے کی طرف دوڑا۔ بلندی پر پہنچ کر اس نے خشیب میں جھانکا۔ یہاں قریباً تین بھیڑیوں کا ایک ریوڑ موجود تھا۔ ان بھیڑیوں کے گرد رکھوالی کے تین چار بھیڑیاں نما کتے پھرا رہے تھے۔ آبی رویا کی برفانی سطح مرتفع پر پائے جانے والے یہ کتے اپنی خون آشامی میں مشغول تھے۔ ان کی زرد آنکھوں میں ہلاکی سفائی تھی۔ بھیڑیں ان کے خوف سے ایک جگہ سمٹی ہوئی تھیں۔ ان بھیڑیوں میں ایک انسان بھی تھا اور وہ کورا تھی۔ اس کے بالائی جسم پر لباس کے نام پر بس چند دھجیاں دو گئی تھیں۔ وہ اپنے آپ میں سکڑی سمٹی بیٹھی تھی۔ جوئی وہ ریوڑ سے نکلنے کی سعی کرتی ایک خوفناک کتا کان کھڑے کرتا اور دم کو گردش دے کر زور سے بھونکتا کورا کے حلق سے گھنی گھنی چیخ نکلتی اور وہ چہرہ گھٹنوں میں چھپا لیتی۔ رو رو کر اس کا برا حال ہو رہا تھا۔ تہاں کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں دنیا جہان کی فریاد سمٹ آئی۔ تہاں نے بلا تاخیر ایک کتے پر حملہ کیا۔ اس سے پیشتر کہ کتا رخ پھیر کر تہاں پر جھپٹا وہ درمیان سے دو ٹکڑے ہو چکا تھا۔ یہ کرزہ خیز منظر دیکھ کر کورا نے دلخراش چیخ ماری اور چرا ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔ دیگر دو کتے پوری وحشت سے تہاں پر آئے۔ گرتے گرتے تہاں نے ایک کتے کا پیٹ چاک کر دیا مگر دوسرے نے اپنے نوسیلے دانت تہاں کے زخمی بازو میں گاڑنے کی کوشش کی۔ اس اثناء میں مقدونی سپاہی موقع پر پہنچ چکے تھے۔ انہوں

نے پلک جھپکتے میں ایک کتے کو پکڑ لیا اور دوسرے کو بے تیق کر ڈالا۔ تہاں کپڑے بھراز کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا بازو مسلسل خون اگل رہا تھا۔

~~~~~

شر پھینچتے ہی سردار شلال کو سکندر کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔ سکندر نے اس وقت شر کے قلعے میں دربار لگا رکھا تھا۔ شلال کو دیکھ کر سکندر کی بڑی بڑی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ ابتدائی معلومات حاصل کرنے کے بعد اس نے کاتب کو حکم دیا کہ شلال کے خلاف تہاں اور دیگر سپاہیوں کا بیان قلم بند کیا جائے۔ اپنا بیان قلمبند کرانے کے فوراً بعد تہاں شاہی دربار سے باہر نکل آیا۔ اس نے یہ جاننے کی کوشش بھی نہیں کی کہ شلال کا کیا انجام ہوا ہے۔ وہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ رہا تھا۔ آتی جاتی سانس ایک آرسے کی مانند سینے کو کاٹ رہی تھی۔ ہر دھڑکن مار شاکی بدلتی پر ماتم کتاں تھی اور ہر نگاہ غار مغیلاں ہو کر اس کی آنکھوں میں ٹوٹ آتی تھی۔ کہاں ہے مار شاہو کہاں ہے؟ وہ بے زبان خاموشی برہم و دیوار سے پوچھ رہا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک سوال آجیئی منج کی طرح گزرا رہتا تھا۔ کیا مار شاہ اس کے دل کی حالت سے آگاہ ہوگی۔ کیا اسے معلوم ہوگا کوئی اس کے لیے عتا تڑپ رہا ہے؟ وہ سوچتا رہا اور چلتا رہا آخر اس کے پاؤں ایک پڑنگام مد خانے میں جا رکے۔ معلوم نہیں کیوں آج شراب کی کرسہ کو اس کی حس شامہ کو بھاری تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھایا کسی نے جام اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ وہ اس آنکھیں جام کو حلق میں اندر لے گیا اور اس کے بعد کئی ایسے جام لوں سے لگا کر خالی کر ڈالے۔ دیکھنے والے اس مد نوش کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ وہ شخص جس نے افواج سکندر میں بے استائیازی سے ترقی کی منازل طے کی تھیں اور میدان جنگ میں جوانوں کی آنکھ کا تارہ بنا رہا تھا آج یوں سے خانے میں گھوم رہا تھا کہ نہ اس کا سر کندھوں پر ٹھہرتا تھا اور نہ زمین پاؤں تلے۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ مد ہوش ہو کر کسی گوشے میں جا کر تاور نشے میں دھت شرابیوں کی طرح اپنی ہی تہے میں لتھڑ جاتا دو تازک بازوؤں نے اسے تھام لیا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا اور دیکھتے رہ گئے۔ ان میں سے کچھ اسے پہچان بھی گئے۔ وہ کورا تھی۔ وہ اسے بازوؤں میں سمیٹے ہوئے مد خانے سے باہر آئی اور ایک گھوڑا گاڑی میں لا کر کچھ دور ایک خوبصورت مکان میں لے آئی۔ مکان کے دروازے پر موجود پیریدار نے کورا کو روکے ہوئے کہا۔

”غصہ ہے، کہاں جا رہی ہیں آپ؟“

تھام رہا تھا۔
 ”مارشا.....“ تابان نے سینے کی پوری طاقت سے پکار کر کہا اور لوگوں کو دھکیلتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ نوجوان عورت نے گھوم کر اس کی طرف دیکھا۔ تابان ٹھنک گیا۔ اب وہ مارشا نہیں تھی۔ وہ چند لمحوں کے عالم میں تابان کی طرف دیکھتی رہی۔ ”کون ہے یہ؟“ ایک راہ گیر نے عورت سے سوال کیا۔ راہ گیر کی طرف دیکھنے کے لیے عورت نے رخ پھیرا تو وہ ایک بار پھر مارشا نظر آئے گی۔ تابان کا سینہ بچھر دھڑکا اٹھا۔ یہ عورت عجیب معر تھی۔ ایک رخ سے ہو ہو مارشا دکھائی دیتی تھی۔ جب اس کا چہرہ ایک مخصوص زاویے سے ہٹ جاتا تھا تو وہ مارشا نہیں رہتی تھی۔

KHAN
& LIBRARY
 S-527, PHARRA BAZAR, Ferozpur
 Cell: 0345-504834 0345-504859
 Prop: Ali Khan

"لیکن یہ مکان ایک ہزاری سزدار تاجان کے لیے مخصوص ہے۔"

”یہ سردار تابان ہی ہے۔“ کور نے مختصر جواب دیا۔

دربان نے حیرت سے تابان کو دیکھا جو چہرے مہرے سے ہرگز اتنا بڑا سردار نظر نہیں آتا تھا، پھر جلدی سے اسے سہارے میں کورا کی مدد کرتے لگا۔ تھوڑی ہی دیر بعد تابان ایک شاندار خواہگاہ کی آرام دہ مصی پر دراز تھا۔ مصی کے سین اوپر ایک بیش قیمت فانوس جھلک رہا تھا۔ درو دیوار کی آرائش سے ظاہر تھا کہ یہ کسی بڑے رئیس کا مکان ہے جو موت کے خوف سے اہل و عیال سمیت یہاں سے نکل بھاگا ہے۔ سکندر ایسے خالی مکانات اپنے سرداروں کی رہائش کے لیے استعمال کرتا تھا اور درجہ بدرجہ انیس بہترین مکانات میں شمار آتا تھا۔

کچھ دیر بعد تباہان کے حواس قدرے بحال ہوئے تو اس نے کورا کو اپنے سرہانے پایا۔ اس کی گرم و گداز قربت نے تباہان کو ایک گوندہ سکون بخشا۔ ”کیا بات ہے تباہان۔ تم نے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟“

”گورو! مجھے ایک روگ لگ گیا ہے۔ اب میں تم سب کے لیے کسی کام کا نہیں رہا۔۔۔۔۔۔۔۔ میں بے کار ہو گیا ہوں۔ مجھے غرہ چان کر تھا چھوڑ دو۔ سالار اعظم سے بھی یہ کہہ دو کہ وہ تابان جو تمہارا غلام تھا مر گیا۔“

”تباہ! ایسی مایوسی کی باتیں زبان پر کیوں لاتے ہو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔
 حوصلہ رکھو شہزادی صاحبہ مل جائیں گی۔“
 ”مجھے جھوٹی تسلی مت دو کورا!..... میں اسے کھو چکا ہوں۔ کبھی نہ پانے کے
 لیے۔“

گورا اس کے بالوں میں اپنی نرم انگلیاں چلانے لگی۔ اس عمل نے تابان کو بے سکون کرنے کی بجائے اور بے چین کر دیا۔ اس نے گورا کا ہاتھ بری طرح جھینکا۔ "مت ہمدردی متاؤ مجھ سے۔ تمہاری محافظت اب میرے بس کا روگ نہیں۔ کوئی اور سہارا ڈھونڈ لو۔ میں ایک گرتی دیوار ہوں۔ میرے سائے میں مت ٹھیکو۔"

کو را حیرت سے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ وہ کتنی روکھائی سے بول رہا تھا۔ کتنی آسانی سے دیرینہ ٹاپے توڑنے کی بات کر رہا تھا۔ پھر کو ارا کے سنبھاتی بنی روکھائی۔ وہ اس کے ہاتھوں سے نکل کر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اس کے سینے میں ایک نیلی آگ

بازو کا اندازہ کر چکی ہو۔ اگر میری نیت تمہارے بارے میں خراب ہو، تو کوئی نہیں بچا نہیں سکتا۔ تمہارے ہونٹوں سے ہاتھ اس لیے ہٹا رہا ہوں کہ میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ میرا وعدہ ہے کہ اگر تم شور نہیں مچاؤ گی تو میری ذات سے تمہیں کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔" کوشش بسیار کے بعد تباہ عورت کو قائل کرنے میں کامیاب رہا اور اس نے تباہ کو سر کی جنبش سے بتایا کہ اگر وہ اس کے ہونٹ آزاد کر دے تو وہ چیخ و پکار نہیں کرے گی۔ تباہ نے اس کے ہونٹوں سے ہاتھ ہٹایا تو وہ پھینکاری۔

"کیا چاہتے ہو مجھ سے؟" "آسو اس کے حسین رخساروں پر آبشار کی مانند بہہ رہے تھے۔

"تمہاری محبت!"

"میری محبت اپنے بچوں کے لیے ہے اور اپنے شوہر کے لیے۔"

"لیکن تمہارے چہرے میں اس عورت کی شبابت ہے جو میرے لیے دنیا کی ہر شے سے بڑھ کر عزیز ہے۔ میں تمہارے چہرے کی اس جھلک سے دور نہیں رہ سکتا جس میں میرے محبوب کا عکس دکھائی دیتا ہے۔"

"تم پاگل ہو یا پاگل بن رہے ہو۔ میں تمہاری محبوبہ نہیں ہوں۔ میں ایک مختلف عورت ہوں۔ میری اپنی ایک زندگی ہے۔ اپنی ایک دنیا ہے۔ میرے چہرے کا کوئی نقش تمہاری محبوبہ سے ملتا ہے تو اس کی سزا میرے لیے یہ نہیں ہے کہ تم مجھے برباد کر ڈالو۔"

"میں تمہیں برباد کرنا نہیں چاہتا جس تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔ تمہیں..... تمہیں اپنے قریب رکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے اس کا کوئی حل بتاؤ، ورنہ میں مرجاؤں گا اور میرا خون تمہاری گردن پر ہو گا۔ ہاں..... اگر تم نے مجھے دھتکار دیا تو شاید میں اسی چوکتھ پر یہ پیش قبض اپنے سینے میں اتار لوں میں مقدونوی فوج کا ایک ہزاری سپہ سالار ہوں۔ میری لاش تمہارے گھر سے نکلی تو تم اور تمہارا شوہر دونوں مورد الزام ٹھہرو گے..... اور یہ بات بہت دور تک جائے گی۔ تم دیوتاؤں کو مانتی ہو تو دیوتاؤں کے نام پر اور آتش پرست ہو تو تمہیں آتش کا واسطہ مجھے غلط مت جانو۔ میری بھجوری کو سمجھو۔ میں ایک ڈوٹیا ہوا شخص ہوں اور سمارے کے لیے تمہاری جانب بڑھا رہا ہوں۔"

تباہ کے لیے میں نہ جانے کیا بات تھی کہ وہ خود بھی اپنے لمبے کے اثر میں آ رہا تھا۔ اس نے دیکھا عورت کی آنکھوں میں ہراس ماند پڑ گیا ہے اور چہرے کے تاثرات بدل رہے ہیں۔ وہ قدرے نرمی سے بولی۔ "مجھے لگتا ہے نشے نے تمہاری عقل خبط کر رکھی

کچھ ایک نیٹنگوں روشنی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس دوسرے عمارت کے قریب جوار میں کشادہ اور تنگ گلیوں کا جال سا بچھا ہوا تھا۔ تباہ جانتا تھا کہ میں کسی گلی میں وہ پراسرار سائے بھی موجود ہوں گے جو کئی روز سے اس کے تعاقب میں تھے۔ وہ روز و شب ایک فاصلے سے اس کے ساتھ رہتے تھے۔ معلوم نہیں وہ کون تھے؟ اس ایک سوال سے کئی سوال پھوٹتے تھے۔ تباہ ان تمام سوالات کو ذہن سے جھٹک کر پیچھے جانے والے زینوں کی طرف بڑھا۔ زمین پر پاؤں رکھنے سے پہلے اس نے اپنے لبہات میں سے چمکتی و پھٹتی قبض نکال لی تھی۔ ہوتا اس کے پاؤں میں پہلے ہی نہیں تھا۔ وہ بلی کی چال جتنا دوسری منزل کے ایک کمرے میں پہنچا اور وہاں سے ایک بھی جھانکی خوابگاہ میں آگیا۔ خوابگاہ میں نیٹنگوں فانوس کی مدھم روشنی بکھری ہوئی تھی۔ ایک پیش قیمت مسمری پر گھوٹھ پالے بالوں والا ایک تو مند شخص سو رہا تھا جبکہ اس کے پیلو میں دی عورت تھو خواب تھو۔ عورت کے چہرے کا وہ رخ اور جھل تھا جسے دیکھ تباہ کو اپنے آپ پر قابو نہیں رہتا تھا۔ وہ خوابگاہ کے وسط میں نکلی تلوار ہاتھ میں لیے دم بخود کھڑا اس عورت کو دیکھتا چلا جا رہا تھا جو ایجنٹر کے چاند کا "ایک کھڑا" اپنے چہرے پر سجائے ہوئے تھی۔ تباہ کو عورت کے پیلو میں وہ کل والا بچہ نظر نہیں آیا لیکن خواب گاہ میں موجود مختلف اشیاء سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس گھر میں ایک یا ایک سے زائد بچے موجود ہیں۔ کچھ دیر اس جوڑے کو عورت سے دیکھنے کے بعد تباہ دبے قدموں آگے بڑھا۔ مسمری کے پاس پہنچ کر اس نے پیش قبض دوبارہ لباس میں رکھی۔ نیچے جھک کر ایک ہاتھ خوابیدہ عورت کے ہونٹوں پر بنایا اور پھول کی مانند اسے مسمری سے اٹھالیا۔ بیدار ہو کر عورت بری طرح چلی اور خود کو اٹھانے بازوؤں سے رہا کرانے کے لیے زبردست کوشش کرنے لگی لیکن تباہ کے سامنے اس کی ایک نہیں چلی۔ وہ اپنے ساتھی مرد کو جگانے کے لیے حقیر سی آواز بھی پیدا نہ کر سکی اور تباہ اسے لے کر خوابگاہ سے باہر نکل آیا۔ نہایت خاموشی اور احتیاط سے وہ اسے ایک دوسرے کمرے میں لے آیا۔ آرائش سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ کمرہ نشست گاہ کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ کھڑکیوں پر دینر پردے، مفتش پشت والی نشستیں اور فرش پر نفیس قالین۔ تباہ نے عورت کو یہ آہستہ قالین پر رکھ دیا۔ اس کا ہاتھ ابھی تک مضبوطی سے عورت کے ہونٹوں پر رہا تھا ورنہ وہ چیخ و پکار کر کے عمارت میں موجود ہر ذی نفس کو جگا دیتی۔ وہ مزاحمت کر کے تھک چکی تھی اور اب مکمل طور پر تباہ کے رحم و کرم پر تھی۔ اس کے ہونٹوں سے ہاتھ اٹھانے سے پہلے تباہ نے اسے سمجھایا۔ "دیکھو تم میرے زور

ہے ورنہ تم اس پھت تلے کھڑے ہو کر ایسی باتیں نہ کرتے۔ شاید تمہیں معلوم نہیں کہ یہ امیر ارٹنگ دوم کی حویلی ہے اور امیر ارٹنگ کوئی معمولی شخص نہیں ہے۔ امیر کا تعلق ایک قبائلی خاندان سے ہے اور یہ خاندان اپنے دشمن کو معاف نہ کرنے کے لیے مشہور ہے۔ تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔ یو تاگوہ میں مجھے تمہاری صورت پر ترس آ رہا ہے۔“ دفعتاً کسی قریبی کمرے سے بچے کے رونے کی آواز آئی۔ عورت تڑپ کر بولی۔ ”میرا بچہ جاگ گیا۔ اب تم جاؤ یہاں سے ورنہ کسی بڑی مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔“

تہان نے دلیری سے اس کا شانہ تھام لیا۔ ”پہلے مجھ سے وعدہ کرو کہ کل مکان کی چھت پر مجھ سے ملو گی۔“

عورت کے چہرے پر شدید ناگواری کے تاثرات ابھرے لیکن اس نے خود پر قابو پا لیا اور کوئی سخت کلمہ کہنے سے باز رہی۔ تہان نے اس کی خاموشی سے حوصلہ پایا اور لمبے میں فریاد سمیٹ کر بولا۔ ”میں تمہیں دل چیر کر نہیں دکھا سکتا لیکن یہ حقیقت ہے کہ تم میرے لاعلاج مرض کی دوا بن گئی ہو۔“

”ایک ایسی تہان کو خاموش ہونا پڑا۔ عورت بھی ٹھنک کر دروازے کی سمت دیکھنے لگی۔ بھاری قدموں کی آواز بالکل نزدیک سنائی دی تھی۔ یہ نہایت عمدہ صورت حال تھی۔ تہان کا ہاتھ خود بخود اپنی قبض تک پہنچ گیا۔ عورت تڑپ کر اٹھی اور دروازے کی طرف لپکی لیکن چند قدم چل کر اسے رک جانا پڑا۔ دروازہ کھلا اور سامنے وہی نومند شخص نظر آیا جو تھوڑی دیر پہلے خوابگاہ کی کشادہ مسہری پر محو خواب تھا۔ اس کی آنکھوں میں نیند کی سرخی تھی۔ تہان کو دیکھ کر پہلے اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹیں پھر ان میں غضب کی چنگاریاں بھڑکیں۔ وہ کتنی ہی دیر وحشت ناک انداز میں تہان کو گھورتا رہا۔ پھر اس کا ہاتھ بڑے دھیمے انداز میں دیوار کی طرف بڑھ گیا جہاں خوفناک پھل والی دو کھناڑیاں آویزاں تھیں۔ اس نے ایک کھناڑی اتاری اور آگ برساتے لمبے میں بولا۔

”تو تم بد نصیب ہو جو صبح سے اپنی موت کا تعاقب کر رہے ہو۔“ تہان اپنی جگہ پر خاموش کھڑا رہا۔ نومند شخص نے کسی خوشخوار دردندے کی مانند دانت نکوتے اور غرا کر بولا۔ ”ہتھیار پھینک کر چہرہ دیوار کی طرف کر لے کتے۔ میں تجھے اس قابل نہیں سمجھتا کہ تیرے سینے پر زخم لگاؤں۔“

بھاگتے قدموں کی آواز آئی۔ وہی مضحی بوڑھا کمرے میں داخل ہوا جو دوسرے کو گلی

میں دکھائی دیا تھا۔ وہ شب خوابی کے لباس میں قد سفید بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے عقب میں دو ہانپے ہوئے مسلح غلام بھی نظر آ رہے تھے۔ بوڑھے نے گھبرا کر کہا۔ ”رک جاؤ جیلا اس کو مارنا ہمارے لیے مصیبت بن جائے گا۔ یہ مقدونوی فوج کا ایک ہزاری سردار ہے اور کل دوپہر کی لوگ یہ جان چکے ہیں کہ اس نے افشاہہ کا تعاقب کیا تھا اور میں نے اسے سرزنش کی تھی۔“

نومند شخص دھاڑا۔ ”تو آپ کیا چاہتے ہیں بلبلہ۔ ہم عزت کے اس لٹیرے کو احترام کے ساتھ رخصت کر دیں؟“

”نہیں۔۔۔۔۔۔ لیکن ہمیں سوچ لینا چاہیے کہ اس کی موت کا انجام کیا ہوگا۔ ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اس کے ہاتھ پاؤں توڑ ڈال اور چارپائی پر ڈال کر وائی شہر کے پاس لے جاؤ۔ پھر اس سے پوچھو کہ اس شرابی زانی کی سزا کیا ہونی چاہیے۔“

”نہیں بلبلہ۔“ نومند شخص فیصلہ کن انداز میں بولا۔ ”یہ ہماری خاندانی آن کے خلاف ہے ہم اپنے مجرموں کو خود سزا دیتے ہیں حکمرانوں سے انصاف کی بھیک نہیں مانگتے۔“

اب تین چار اور مسلح افراد بھی کمرے میں جمع ہو چکے تھے۔ سب فونی نگاہوں سے تہان کو گھورتے رہے تھے۔ کتنی مونچھوں اور سرخ انگڑا آنکھوں والا ایک جلا صورت شخص بولا۔ ”میرا خیال ہے بچپا“ اسے مار کر اسی کمرے میں دفن کر دیتے ہیں کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہو گی اور ہوئی بھی تو کوئی لاش ڈھونڈنے میں کامیاب نہ ہو گی۔“

ایک شخص نے دیوار سے دوسری کھناڑی اتاری اور فیسے سے بے قابو ہو کر تہان پر ٹوٹ پڑا۔ تہان نے دیکھا خود بخود عورت جو اب تک سنی کھڑی تھی پھین مارتی ہوئی دوسرے کمرے میں بھاگ گئی۔ کھناڑی کا ایک بار دیوار پر پڑا اور دوسرا تہان کے کندھے پر۔ بوڑھا ایک بار پھر تہان اور حملہ آور کے درمیان آ گیا۔ اس نے بمشکل حملہ آور کو پیچھے دھکیلا اور ہانپے ہوئے لمبے میں بولا۔ ”محل کی بات کرو۔ اپنے پاؤں پر کھناڑی نہ مارو۔۔۔۔۔۔ اگر اسے قتل کرنا ہی ہے تو کسی جے سے کرو۔“ ایک شخص جو صورت سے نسبتاً معاملہ فہم دکھائی دیتا تھا۔ آگے آیا اور سنسنی خیز انداز میں ساتھیوں کو سمجھانے لگا۔ ”بیبا ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اسے حیلے سے مارنا چاہیے۔ صاف نظر آ رہا ہے کہ یہ نشے میں ہے۔ اسے زبردستی اور شراب پلاؤ۔ بالکل مدبوس ہو جائے تو باہر سڑک پر ڈال کر اوپر سے گھوڑا گاڑی گزار دو۔ یہی سمجھا جائے گا کہ نشے میں مدہوش حادثے کا شکار ہو گیا

”ہے۔“

وہ لوگ بڑے اطمینان سے تہاں کے سامنے اس کے قتل کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں چھپتے ہتھیار تھے اور چہرے غصہ سے تھمتائے ہوئے تھے۔ اس وسیع و عریض مکان میں انہوں نے خون آشام بھیڑیوں کی طرح تہاں کو گھیر رکھا تھا۔ اب ان کی تعداد دس تک پہنچ چکی تھی۔ ان میں چار تو اپنے لباس سے اہل خانہ نظر آتے تھے اور باقی وقار ملازم اور غلام تھے۔ تہاں کے قتل کی منصوبہ بندی جاری تھی۔ کھڑی بردار جو شیلا نوجوان اپنا چنانہ صبر پھر چھلکا بیٹھا۔ وہ اپنے بزرگوں کے عقب سے نکلا اور مخالفت بکاتا ہوا ایک بار پھر تہاں پر جھپٹا۔ اس مرتبہ اس کے حملے میں پہلے سے زیادہ شدت اور وحشت تھی۔ اسے حملہ آور دیکھ کر ایک ایک دوسرے افراد بھی خود پر قابو نہ رکھ سکے۔ وہ سب کے سب ہتھیار لہراتے تہاں پر جھپٹے۔ تہاں سمجھ گیا کہ اب اسے جان بچانے کے لیے بھڑور مزاحمت کرنا ہوگی۔ اس نے کھڑی کے دو وار بچائے اور پیش قبض کھینچتے ہوئے کھڑی کی طرف جست بھری۔ پھولدار رنگین شیشے کو چٹکنا پھوڑ کرتے ہوئے وہ دوسرے کمرے میں گرا اور اٹھ کر زخموں کی طرف بھاگا مگر وہاں پہلے سے دو مسلح افراد پہنچ چکے تھے۔ ایک شخص نے وحشیانہ انداز میں اسے برچی میں پڑنا چاہا لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کا واسطہ مقدونی فوج کے ایک بے مثال جنگجو سے پڑا ہے۔ اس کے سامنے وہ شخص ہے جو مقدونیہ کے تین بہترین جنگ بازوں کو ایک ہی حملے میں قتل کرنے کی شہرت رکھتا ہے۔ تہاں نے برچی کا وار بچایا اور اس سے پیشتر کہ برچی بردار کو اپنا وار خالی جانے کا احساس ہوتا اس کی آنتیں پیٹ سے باہر بھول رہی تھیں۔ اس کا ساتھی ایک ساعت کے لیے ٹھکنا۔ تہاں جیسے جنگجو کے لیے یہ سہلست بہت تھی۔ اس نے اپنی پیش قبض دستانے تک اس کے سینے میں گھونپ دی اور اس کی تلوار چھین کر پشت کے بل قاتلین پر گرا۔ ایسا کر کے اس نے خود کو دو قاتل تلواروں کی زد سے بچالیا۔ قاتلین سے اٹھتے ہی وہ بے خوف ہو کر اپنے حریفوں سے بھڑ گیا۔ وہ ایک دو افراد کو زخمی کر کے یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا لیکن اسے گھیرنے والے بھی اب مرنے مارنے پر آگئے تھے وہ ہر صورت اس کے خون سے ہاتھ رنگنا چاہتے تھے۔ کھڑی کے وار نے تہاں کا کندھا زخمی کیا تھا اور وہ اپنی تلوار کو پوری آزادی سے حرکت نہیں دے پا رہا تھا۔ حریفوں نے اسے تین اطراف سے گھیرا ہوا تھا اور کسی لمحے کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ دفعتاً گھر کے در و دیوار وزنی جوتوں کی دھجک سے لرز اٹھے۔ ہاں لگا میسے بہت سے افراد بھرا مار مار اندر گھس آئے

ہیں۔ آنے والے اگر دشمن تھے تو اب تہاں کی موت یقینی تھی۔ چند لمبے شدید تذبذب میں گزرے اور پھر تہاں نے مقدونی سپاہیوں کی جھجک دیکھی وہ گھری ہر کھڑی اور دروازے سے اندر داخل ہو رہے تھے ان کے ہاتھوں میں عریاں تلواریں تھیں۔ بے اتنا پھرتی سے انہوں نے گھر کے مردوں کو تلواروں کی نوک پر رکھ لیا اور گردن آوازوں میں انہیں حکم سنایا کہ وہ ہتھیار پھینک دیں۔ اس اچانک اقدام نے تہاں کے حریفوں کو سراسیمہ کر کے رکھ دیا تھا۔ ان کے لیے اس فیصلے پر پہنچنا قطعی مشکل نہیں تھا کہ اگر وہ جانیں بچانا چاہتے ہیں تو بے چوں چوں ہتھیار پھینک دیں۔ پھر انہوں نے ایسا ہی کیا۔ تہاں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ اس کی مدد کو پہنچنے والے سکندر کے ایک خصوصی دست کے ارکان ہیں۔ چابازی اور سفاکی میں یہ لوگ اپنی مثال آپ تھے۔ اہل خانہ کی آدمی جان تو ان کی صورتیں دیکھ کر ہی نکل گئی تھی۔ چند لمبے بعد گھر کی خواتین کو بھی اس وسیع کمرے میں حاضر کر دیا گیا۔ ان میں افشاںہ بھی شامل تھی۔ تہاں نے دستہ سار کو ہدایت کی کہ اہل خانہ سے نرمی کا سلوک کیا جائے اور ان میں سے کسی کو کوئی گزند نہ پہنچے۔ تہاں کے ہاتھوں زخمی ہونے والے ایک شخص کو تہاں کی ہدایت پر فوراً ٹھٹھا خانے روانہ کر دیا گیا۔ تہاں اپنے مددگاروں کی آمد پر کچھ زیادہ حیران نہیں ہوا۔ اب اس کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ پچھلے چند روز سے اس کے تعاقب میں رہنے والے یہی مددگار تھے۔ یقینی طور پر سالار اعظم نے انہیں ایسا کرنے کی ہدایت کر رکھی تھی۔ انہوں نے تہاں کی ہر نقل و حرکت پر نگاہ رکھی ہوئی تھی اور یہی وجہ تھی کہ وہ بروقت اس مکان میں داخل ہو گئے تھے۔ یہ بات جان کر تہاں کو خوشگوار احساس ہوا کہ وہ سالار اعظم کی نگاہ میں اس قدر اہمیت رکھتا ہے۔

☆-----☆-----☆

اگلے روز دربار سے پہلے سکندر نے تہاں کو خلوت میں طلب کیا۔ تہاں سکندر کے سامنے پیش ہوا تو وہ ابھی ابھی صبحائے سے فارغ ہوا تھا۔ خدام دسترخوان سے سونے چاندی کے برتن اٹھا رہے تھے اور وہ خود نشست سے ٹیک لگا کر دانتوں میں خال کر رہا تھا۔ تہاں کو دیکھا تو سکندر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ تہاں نے تعظیم پیش کی اور سکندر کی ہدایت پر قریب ہی ایک نشست سنبھال لی۔ سکندر بھاری بھر کم آواز میں بولا۔

”ہم نے شاہ آج کل تم بہت شراب پی رہے ہو اور راتوں کو اپنی قیامگاہ پر بھی نہیں پہنچتے۔“ تہاں نے سر جھکا لیا اور خاموش رہا۔ سکندر کچھ دیر اسے گہری نظروں سے

5

نہیں آ رہی تھی کہ اس کا موقف کیا ہونا چاہئے۔ کیا اسے حق پہنچتا ہے کہ وہ ایک عیال دار عورت کو اس کے بچوں اور شوہر سے جدا کرے اور اپنی بے جا ضد کی بمینٹ چڑھائے۔ اگر تہاں کو اس میں مارشاک جھلک نظر آتی تھی تو اس میں اس بیچاری کا کیا قصور تھا۔ اسے اتنی بڑی سزا کیسے دی جاسکتی تھی۔۔۔۔۔۔ دوسری طرف تہاں کی پیاس اور ناآسودگی کسی عفریت کی مانند منہ پھاڑے کھڑی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ مارشاک جہاں کے اس لقا و دن صحرائیں وہ افشاںہ کے نخلستان سے دور رہا تو تڑپ کر مر جائے گا۔ اس کی بغیر آنکھیں پھٹ جائیں گی اور وہ کسی اندھے کنویں میں گر کر دم توڑ دے گا۔ یہی کچھ سوچتا وہ اپنی قیام گاہ پر پہنچا اور بے دم ہو کر مہسری پر گر پڑا۔ نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔ وہ دوبارہ اٹھا تو شاہی طیب اس کے بازو کی مرہم پٹی کر رہا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ کوئی طرہ یہ گیت بھی گنگنا رہا تھا۔ تہاں کو بیدار ہوتے دیکھ کر اس کی گنگناہٹ تو رک گئی لیکن آنکھوں میں بدستور شوفی ناچتی رہی۔

اصدار نامی یہ جوان سال طیب تہاں سے خاصا بے تکلف تھا۔ ایتھنز میں جب تہاں کی قسمت نے پلٹا کھایا تھا اور وہ شاہی نوازشات کا مستحق ٹھہرا تھا تو اسی طیب نے اس کی چھاتی کے زخم کا علاج کیا تھا۔

اصدار نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری تو قسمت کی پڑیا نکل آئی۔ دربار میں وہی فیصلہ ہوا ہے جو تم چاہتے تھے۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ وہ حور شام کل پری خصال لڑکی تمہیں دستیاب ہو گئی ہے۔“

”لیکن اس کا شوہر؟“

”یہی تو لطف کی بات ہوئی ہے۔“ اصدار نے مزالے کر کہا۔ ”ہم تم جسے اس کا شوہر سمجھ رہے تھے وہ اس کا شوہر نہیں تھا۔ اس کا شوہر تو کوئی دو برس پہلے مر چکا ہے اور اسے مارنے والا اسی امیر ارژنگ کا کوئی رشتہ دار تھا۔“

تہاں انھہ کر بیٹھ گیا۔ ”تمہارا کیا مطلب ہے۔ ارژنگ اس کا شوہر نہیں!“

”ہرگز نہیں۔ افشاںہ اس کی زر خرید لونڈی ہے اور اس سے پہلے بھی وہ بیچاری کئی جگہ فروخت ہو چکی ہے۔ اس نے سالار اعظم کے سامنے ساری روئیداد و وضاحت سے بیان کی ہے۔ اس کے دونوں بچے اپنے شوہر سے تھے۔ اس کا شوہر جو دہائی ٹی ٹی کس کا غلام تھا، بحیرہ، ایتھین میں قراقوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ قراقوں نے افشاںہ اور اس کے دونوں

بچوں کو غلام بنا لیا۔ قراقوں کا سردار امیر ارژنگ کے قبیلے ہی کا کوئی فرد ہے۔ اس نے افشاںہ کو پہلے کچھ عرصہ اپنے پاس رکھا پھر امیر ارژنگ کے ایک سگے چچا کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ افشاںہ کوئی ڈیڑھ برس تک دیسی علاقے میں اس اذیت پسند آقا کی ملکیت رہی۔ آخر اس نے اوپر تلے کئی بار خودکشی کی کوشش کی تو اس شخص نے اسے شہر لا کر اپنے بھتیجے ارژنگ کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ دونوں بچوں سمیت افشاںہ کی قیمت ڈیڑھ صد روپے ٹیلنٹ ملے پائی۔ اب پچھلے نصف برس سے افشاںہ ارژنگ کے پاس تھی۔ ارژنگ کا باپ افشاںہ کے حسن سلوک اور فطری ذہانت سے بہت متاثر تھا۔ وہ بیٹے پر زور دیتا تھا کہ وہ افشاںہ سے شادی کر لے۔ افشاںہ کو اپنی بہو سمجھتا تھا اور اسی لقب سے بلاتا تھا لیکن ارژنگ جو بے حد عیاش ہونے کے علاوہ اتنا پرست بھی تھا ایک کنیز کو اپنے حرم میں داخل کرنے پر رضامند نہیں تھا۔ وہ افشاںہ کو زر خرید لونڈی سمجھتا تھا اور افشاںہ سے اس کا سلوک اسی حوالے سے تھا۔ وہ افشاںہ کے بچوں کو اپنی نگاہ سے دور رکھتا تھا اور اس نے افشاںہ کو بدایت کر رکھی تھی کہ وہ جب اس کے سامنے آئے تو پہنے اس کے ساتھ نہ ہوں۔ افشاںہ نے سالار اعظم کے سامنے برملا اظہار کیا ہے کہ وہ اپنے مالک سے آزادی چاہتی ہے۔“

”پھر سالار اعظم نے کیا حکم دیا ہے؟“ تہاں نے بے تابی سے پوچھا۔

”افشاںہ آزاد ہو گئی ہے اور اب تم دونوں کے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں رہی۔“

تہاں کے چہرے پر ایک معصوم خوشی نمودار ہوئی لیکن اگلے ہی لمحے یہ تاثر گہرے

فکر میں ڈوب گیا۔

اصدار نے کہا۔ ”کیوں! خاموش کیوں ہو گئے ہو؟ کیا اب کوئی اور مطالبہ ہے؟“

”نہیں اصدار!“ تہاں نے پُر سوچ انداز میں کہا۔ ”سوچتا ہوں کیا افشاںہ کسی

دوسری عورت کا قصور اجاگر کرنے کے لیے میری غلوٹ کی ساتھی بننا قبول کر لے گی۔“

اصدار نے قہقہہ لگایا۔ ”معلوم نہیں سالار اعظم نے تمہیں یک ہزاری سردار کیسے

بنا دیا ہے۔ بہتر تھا پہلے تمہیں کسی مدرسے میں داخل کرا دیا جاتا۔ بھلے مائیں وہ اب تمہاری

کنیز ہے۔ اب اس کی اپنی کوئی مرضی نہیں۔ جو تمہاری آرزو ہو گی وہ اس کی مرضی ہو

گی۔“

”نہیں اصدار۔“ تہاں نے سمجھ بھلے میں کہا۔ ”ہر شخص کی اپنی مرضی ہوتی ہے“

اور اس پر مرضی ٹھونسنے والا جاہر ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔ کہاں ہے اس وقت افشاںہ؟“

امداد نے کہا۔ ”جب میں آیا تو وہ زنان خانے میں تھی۔ میرا خیال ہے آج رات تک اسے بنا سنوار کر تمہاری قیام گاہ میں پہنچا دیا جائے گا تاکہ وہ تمہاری تھائی کو رکنیں بنا سکے۔“

”نہیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے۔“ تہاں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ ”تم میری طرف سے زنان خانے کے منتظم کے نام پیغام لے جاؤ کہ افشاہدہ کو فی الحال وہیں رہنا چاہئے جب میں ضروری سمجھوں گا اسے خود بلا لوں گا۔ بلکہ بہتر ہے میں تمہیں یہ پیغام تحریر کر دوں۔“ تہاں لکھنے والی چوکی کے پاس پہنچا اور قلم سے ایک چمڑے پر یہ مختصر حکم لکھ دیا۔ ”افشاہدہ مای وہ کنیز جو سالار اعظم کی طرف سے مجھے سونپی گئی ہے فی الوقت دوسری عورتوں کے ساتھ رکھی جائے۔ زنان خانے میں میری ایک کنیز کو رہا کر دیا جائے۔“

بہتر ہوگا اگر افشاہدہ کو کورا کی تحویل میں دے دیا جائے۔“

یہ سطور لکھ کر تہاں نے نیچے اپنی مر لگائی اور دستخط کر کے چمڑے کا چوکور ٹکڑا امداد کو دے دیا۔

امداد اجازت لے کر تہاں سے رخصت ہوا تو وہ اپنے زخمی بازو کو تھام کر پھر بستر پر گر گیا۔ افشاہدہ کے بارے میں اس کا ذہن زبردست کشش کا شکار ہو چکا تھا۔ اگلے روز سکندر نے دربار میں بہت سے سرداروں اور مصاحبوں کو طلب کر رکھا تھا۔ خیال تھا کہ کوئی اہم اعلان کیا جائے گا۔ تہاں مقررہ وقت سے کچھ تاخیر کے ساتھ دربار میں پہنچا۔ حسب معمول اس کا لباس بھی موزوں نہیں تھا۔ وردی حکمن آلود، پال منتشر اور ہتھیار لاپرواہی سے باندھے گئے تھے۔ سکندر اپنی تقریر شروع کر چکا تھا۔ وہ حسب معمول اپنے تھے الفاظ ادا کر رہا تھا اور بولتے ہوئے اس کی نگاہیں مسلسل حاضرین کے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔

سکندر باقی سپاہ کے ساتھ آئی روڈیا کی برف پوش سطح مرتفع پر گشت کرے گا۔ سلسلہ ہائے کوہ میں جو قبائلی آباد ہیں انہیں زیر کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ تاکہ اس سے پہلے کہ ایرانی افواج سے کوئی بڑی جنگ ہو قرب و جوار کے علاقوں کو مطیع کر لیا جائے۔ اس کے علاوہ بھی مختلف فوجی امور کے بارے میں اور عام اور خصوصی فیصلے کئے گئے۔ تہاں اس ساری مصغلو سے لائق رہا۔ اسے ان پیچیدہ معاملات سے دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو اتنا جانتا تھا اسے میدان جنگ میں اپنی سپاہ کی کمان کرنی ہے اور جہاں سالار اعظم کا حکم ہو وہاں سیدہ پلائی دیوار کی طرح جم جاتا ہے۔ وہ حکم کا بندہ تھا۔ کبھی کبھی وہ خود بھی سوچتا تھا کہ وہ اتنے بڑے عہدے کے قابل ہرگز نہیں۔ اس سے زیادہ تجربہ کار اور پاملاہیت لوگ اس کے ماتحت تھے۔ معلوم نہیں سالار اعظم کو اس میں کیا بات نظر آئی تھی کہ اتنا بڑا عہدہ اسے سونپ دیا تھا۔

بیلی کار نہیں سے کوچ کرنے کے بعد یونانی و مقدونی سپاہ نے ایشیائے کوچک کے ساحل پر پڑاؤ کیا تاکہ جتنا علاقہ فتح ہو چکا ہے اس کا انتظام درست کر لیا جائے۔ یونانیات سپاہیوں کو رخصت پر وطن بھیج دیا گیا۔ سکندر نے آزمودہ کار پیادہ فوج کا کچھ حصہ ساتھ لیا اور ایران کے اندرونی حصے کی طرف روانہ ہو گیا تاکہ ہر فستائی سطح مرتفع پر تسلط قائم کر سکے۔ سکندر کے ساتھ جانے والی فوج میں تہاں کا دست بھی شامل تھا۔ یونان سے روانہ ہونے کے بعد سکندر کی سپاہ کا واسطہ سندھ سے رہا تھا یا ساحلی علاقوں سے۔ اب ان کے قدموں تلے برقی زمین آئی تھی اور انہوں نے برف پوش ٹیلوں کا نظارہ کیا تھا تو طبیعتوں پر چھائی ہوئی آکٹاہٹ خود بخود دور ہونے لگی تھی۔ وہ انجانے علاقوں سے گزر رہے تھے اور نئے نئے لوگوں سے ان کا واسطہ پڑ رہا تھا۔ راستے میں چھوٹی موٹی لڑائیاں بھی ہو رہی تھیں لیکن مجموعی طور پر وہ اس سفر سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ تہاں خود کو سارا دن مصروف رکھتا۔ کبھی وہ ساتھی کمانداروں کے ساتھ گھڑ دوڑ میں حصہ لیتا، کبھی وہ سب شکار کو نکل جاتے، کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کسی مقامی قبیلے سے جھڑپیں شروع ہو جاتیں اور کئی روز اس مصروفیت میں گزر جاتے۔ شام کو تہاں تھکا ماندہ اپنے خیمے میں لوٹتا اور نڈھال ہو کر بستر پر گر پڑتا۔ اسے معلوم ہوتا کہ قریب ہی ایک خیمے میں افشاہدہ موجود ہے۔ وہ چند قدم اٹھانے کی زحمت کر لے تو اس کے خیمے میں پہنچ سکتا ہے اور صبح تک اس کے حسن سے سیراب ہو سکتا ہے۔ اس کے چہرے میں کسی کا چہرہ تلاش کر کے اپنے دیکھنے دل کو آرام پہنچا سکتا ہے لیکن وہ ایسا نہیں کرتا تھا ایسا کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اسے لگ رہا تھا

تباہ نے کہا۔ "افشاں کو میرا پیغام پہنچاؤ۔ میں اس سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"بہت بہتر سردار۔" خادم نے فرط احترام سے دوہرا ہو کر کہا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

تباہ نیچے سے ٹیک لگائے اپنے خیالوں میں کھویا رہا۔ نیچے سے باہر بے قرار سرد ہوا ٹیلوں میں چکراتی رہی اور شاخوں سے ابھرتی رہی۔ آخر نیچے سے باہر قدموں کی چاپ سنائی دی اور تباہ کا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ چند لمحوں بعد خادم افشاں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ وہ سبز رنگ کے زرد مار رہشی لباس میں تھی۔ بال سلیپ سے تھے ہوئے تھے اور چہرے پر غماز تھا۔ وہ نیچے میں آئی تو ایک بھینی خوشبو نے تباہ کو گھیر لیا۔ وہ بے حس و حرکت کھڑی رہی۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ نہ خوشی نہ غم نہ ہمدردی نہ نفرت۔ وہ ایک بے جان تصویر تھی۔

"بیٹھ جاؤ۔" تباہ نے آہستگی سے کہا۔

وہ بیٹھ گئی۔ اس کے کنگنوں کی ٹھکنے نے شب کے سناٹے میں جلتی جگ بکیر دیے۔ تباہ نے شمع اندر اٹھا کر اس کے عین سامنے رکھ دیا۔ وہ خوبصورت چہرہ روشنی میں چمک اٹھا۔ تباہ اس کے نقوش پر نگاہیں گاڑے دھیرے دھیرے نیم دائرے کی شکل میں حرکت کرنے لگا۔ وہ اس زاویے کی تلاش میں تھا جو اس کے چہرے پر خوبصورت ترین تھا اور جس میں مارشا کے حسن کی کرن چمکتی تھی۔ آخر وہ رخ تباہ کی نگاہوں میں آیا۔ اس کے قدموں کے ساتھ اس کی دھڑکن بھی ختم گئی۔ وہ اپنی جگہ ساکت و جلد رہ گیا۔ پھر جیسے اس میں کھڑے رہنے کی تاب بھی نہ رہی۔ وہ اپنے کھنکھوں پر گرا اور دو زانو بیٹھ گیا۔ جیسے وہ پہلاری ہو اور افشاں ایک مقدس مورتی۔ وہ اسے دیکھتا چلا گیا اور اس کی گرمی نگاہ افشاں کو بے قرار کر کرتی چلی گئی۔ وہ اضطراب میں اپنی تنہائی انگلیاں مروڑ رہی تھی اور اپنے لڑزاں ہونٹوں کو قابو میں رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ آخر اس بے دھنگی خاموشی کو توڑنے کے لیے وہ بولی۔ "آپ مجھ سے خفا ہیں؟"

"نہیں۔" تباہ نے گشدرہ لمحوں میں کہا۔ نگاہیں بدستور افشاں کے چہرے پر تھیں۔

افشاں نے کہا۔ "آپ کے 'نہیں' کہنے سے حقیقت بدل نہیں جائے گی۔ مجھے آپ سے وابستہ ہونے چار ماہ گزر گئے۔ آج میں پہلی دفعہ آپ کی صورت دیکھ رہی

ہوں۔"

تباہ نے کہا۔ "تم میری صورت کہاں دیکھ رہی ہو۔ میں تمہاری صورت دیکھ رہا ہوں اور تمہاری صورت بھی کیا دیکھ رہا ہوں۔ اس صورت میں کسی اور کا عکس دیکھ رہا ہوں۔" افشاں نے کن اکھیں سے تباہ کی طرف دیکھا اور نگاہیں جھکا لیں۔ تباہ کی کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ مارشا کا عکس اس کے دل و دماغ پر حاوی ہو رہا تھا۔ ایک عجیب خود فراموشی کے عالم میں وہ افشاں کی طرف سیدھا مگر پھر ایک جھٹکے سے رک گیا۔ جیسے سوتے میں چلنے والا اچانک جاگ جائے۔ اس نے اپنی نگاہیں جھکا لیں اور بے حد گھمبیر آواز میں بولا۔

"افشاں! تم جاسکتی ہو۔"

تباہ کی ہدایت کے باوجود افشاں اپنی جگہ سے اٹھنی نہیں۔ چند لمحوں بعد تباہ نے سر اٹھا کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ تباہ سے نگاہ ملائے بغیر بولی۔ "آپ مجھے بھیجنا نہیں چاہتے اس کے باوجود بھیج رہے ہیں۔" تباہ نے غلط کہہ دی ہوں؟

"نہیں۔" تباہ نے ہونٹوں سے بے سانس لگلا۔

افشاں بولی۔ "ایک عورت کے لیے یہ بات تکلیف دہ ہوتی ہے کہ مرد اس سے اس لیے محبت کرے کہ وہ کسی دوسری عورت سے مشابہ ہے لیکن میں آپ کی دلی کیفیت سمجھ رہی ہوں۔ میں آپ کا بے پناہ دکھ سینا چاہتی ہوں اور اس کے لیے ہر قربانی دے سکتی ہوں۔ میری صرف ایک گزارش ہو گی۔"

"وہ کیا؟" تباہ نے پوچھا۔

"آپ مجھے زندگی بھر خود سے جدا نہیں کریں گے۔ اگر آپ کو عارض زہن کی خوش نصیب بیٹی مل بھی گئی تو مجھے اپنے قدموں میں پڑا رہنے دیں گے۔ کوئی تھا کوٹ مجھے دے دیں گے جہاں بیٹھ کر میں آپ کی سلامتی کی دعا میں ملگتی رہوں۔"

تباہ نے دیکھا افشاں کے چہرے پر عورت کی ازلی خواہش آئینہ بن کر چمک رہی تھی۔ وہ دائمی رفاقت کے سوا تباہ سے کچھ نہیں مانگ رہی تھی۔ تباہ نے کہا "افشاں! پھر میری بھی ایک شرط ہے۔"

وہ فوراً بولی۔ "کنیز کو آپ کی ہر شرط بغیر منظر ہے۔"

تباہ نے کہا۔ "آج سے تم کنیز نہیں ہو۔ میں تمہیں اور تمہارے بچوں کو آزاد کرتا ہوں۔ تم جب چاہو مجھے چھوڑ کر جاسکتی ہو۔ اگر چاہو تو میں ابھی تمہاری آزادی کا

ہو گئی ہے۔

افشاہدہ نے کہا۔ ”مجھے جرأت نہیں ہو رہی کہ اس معاملے پر اظہار کروں لیکن کے بغیر چارہ نہیں۔ دیوتا کریں میرا اندازہ غلط ثابت ہو اور مجھے اپنے کے پر شرمندگی اٹھانا پڑے۔۔۔۔۔۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ کورا۔۔۔۔۔۔ کسی کے کہنے میں اگلی ہے اور اس کی ذات سے آپ کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔“

تباہ حیرت زدہ رہ گیا۔ اسے امید نہیں تھی کہ افشاہدہ ایسی بات کہے گی۔ وہ روکھے لمبے میں بولا۔ ”یہ اندازہ تم نے کیونکر لگایا ہے؟“

افشاہدہ نے کہا۔ ”میں نے محسوس کیا تھا کہ کورا آپ کا کھانا اپنے ہاتھوں سے تیار کرنا چاہتی ہے۔ ایک روز مجھے لگا کہ وہ کھانے میں کچھ ملائے کی کوشش کر رہی ہے۔ مجھے دیکھ کر ٹھنک گئی اور کوئی چیز بلا سے میں چسپا کر خیمے سے باہر نکل گئی۔“

تباہ نے کہا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ تم تصدیق کے بغیر ایک نہایت سنگین الزام لگا رہی ہو۔“

افشاہدہ نے گریبان کی طرف ہاتھ بڑھایا اور ایک پڑیا نکل کر تباہ کو تھامی۔ ”یہ پڑیا آج مجھے کورا کے بستر سے ملی ہے۔ اس نے اپنے تھکنے کے غلاف میں چسپا رکھی تھی۔“ تباہ نے پڑیا کھولی۔ اس میں سفید رنگ کا ایک نہایت ہی باریک ستوف تھا۔ افشاہدہ نے کہا۔ ”میرے خیال میں یہ زہر ہے یا کوئی نہایت تیز اثر خواب آور دوا۔“ تباہ نے پڑیا کو بند کر کے احتیاط سے لباس میں رکھ لیا۔ اس کے دل و دماغ میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ اگر اس پڑیا میں زہر تھا تو کیا واقعی کورا اس کی جان لینا چاہ رہی تھی۔ وہ کورا جو اس سے بے لوث محبت کا دم بھرتی تھی اس کے پسینے پر خون گراتی تھی اور راستے میں پلکیں بچھائے رہتی تھی۔ جس سے تباہ کا کوئی رشتہ نہیں تھا اور بہت سے رشتے تھے۔ اسے اپنی سماعت پر بھروسہ نہیں ہو رہا تھا۔ بہت سے سوال ذہن میں سر اٹھا رہے تھے اور کسی سوال کا جواب واضح نہیں تھا۔ یکبارگی اس کا دل چاہا کہ وہ افشاہدہ پر برس پڑے اور اس سے پوچھنے کہ ایسی باتیں زبان پر لانے کی جرأت اسے کیونکر ہوئی۔ کیوں اس نے ایسی سنگین الزام تراشی کی۔۔۔۔۔۔ لیکن پھر اس نے خود پر قابو پایا اور منہ مٹا لیمے میں بولا۔

”افشاہدہ“ تم یہ ساری باتیں اپنے تنک رکھو گی۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونی چاہئے۔ جب تک کوئی ٹھوس ثبوت نہ ملے کورا پر شبہ کرنے کا کوئی حق نہیں۔ تم نہیں جانتی۔۔۔۔۔۔ میری نگاہوں میں کورا کا کیا مقام ہے۔“

افشاہدہ کی آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔ ”مجھے بے حد افسوس ہے کہ میں آپ کے لیے دکھ کا باعث بن رہی ہوں۔ کاش یہ اطلاعات آپ تک میری وساطت سے نہ پہنچتیں۔“

وہ دونوں کافی دیر اگلیٹھی کے گرد گم صم بیٹھے رہے۔ آگ اب راکھ میں تبدیل ہو رہی تھی۔ سردی کا عفریت جو اگلیٹھی کے دیکھنے انگاروں سے ڈر کر خیمے سے باہر کھڑا تھا اب آہستہ آہستہ پھر خیمے میں داخل ہو رہا تھا۔ تباہ کی یادوں کی طرح گھٹنوں پر زور دے کر اگلیٹھی کے سامنے سے اٹھا اور نڈھال قدموں سے دروازے کی طرف بڑھنا۔ معلوم نہیں کیوں تھوڑی ہی دیر میں اس کا چاقی و چوبند جسم نہایت کے جال میں الجھ کر رہ گیا تھا۔ اس نے ڈوری کھول کر دروازے کا پردہ داکیا اور خادم کو خشک ٹکڑیاں لانے کے لیے آواز دی۔ خادم نے اپنے خیمے کے اندر سے ”اچھا مالک“ کی صدا لگائی۔ تباہ دوبارہ خیمے کا پردہ برابر کرنا چاہ رہا تھا جب اس کی نگاہ تاریکی میں ایک ہیولے پر پڑی۔ یہ کوئی عورت تھی جو گرم شال میں لپٹی ایک خیمے کے عقب سے نکلی تھی اور تیز رفتاری سے نشیب کی طرف جا رہی تھی۔ تباہ کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ یہ چال اس کی جانی پہونی تھی۔۔۔۔۔۔ خشک کی ایک تیز لہر اس کے رگ و پے میں دوڑ گئی۔ وہ کچھ دیر اس ہیولے کو نشیب میں او جھل ہوتے دیکھتا رہا پھر تیزی سے واپس لڑا۔ اپنی اوتی صدری اور تلوار اٹھا کر کمر سے باندھ لی۔ ”کہاں جا رہے ہیں؟“ افشاہدہ نے اس کی تیاری دیکھ کر پوچھا۔

”تم خیمہ اندر سے بند کر لو۔ میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔“ تباہ نے کہا اور تیزی سے باہر نکل آیا۔ ایک مختصری ہوئی گدلی چالنی نے نشیب و فراز کو دور تک ڈھانپ رکھا تھا۔ جہاں تک تباہ کی نگاہ جا رہی تھی خیمہ یونانی فوج کے خیمے دکھائی دیتے تھے۔ ان خیموں کے اوپر مختلف رنگوں کے شاخیں پر چڑھتا ہوا میں پھل پڑا رہے تھے۔ ابھی پرید اردن کا گشت شروع نہیں ہوا تھا تاہم اکا دکا سپہ سالار قد ملیں اٹھائے گھوم رہے تھے۔ تباہ اس سارے منظر پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالتا ہوا خشک کی طرف گھوم گیا۔ اس کی عقابلی نگاہ چادر پوش ہیولے کو تلاش کرنے لگی۔ جلد ہی اسے اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی۔ سرو کے درختوں کے بیچ اسے وہ عورت نظر آگئی۔ اس کی بے خوفی حیران کن تھی۔ یونانی عورتیں رات اترنے کے بعد خیمے سے باہر نہیں نکلتی تھیں اور کہاں یہ پڑاؤ کو چھوڑ کر جا رہی تھی۔ تباہ بغور اس کی چال دیکھ رہا تھا اور اب اسے ذرا بھی شبہ نہیں رہا تھا کہ یہ کورا ہے۔ اتنی سخت سردی میں اتنی رات گئے کورا کہاں جا رہی تھی یہ سوال بے حد

اسرار انگیز تھا۔ قریباً ایک سینڈیم فاصلہ طے کرنے کے بعد کورا پڑاؤ سے دور نکل آئی اور ایک خشک نالہ پار کر کے اپنے دائیں ہاتھ مڑ گئی۔ یکایک تہاں کو اندازہ ہو گیا کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔ سکندر کی افواج میں جہاں کم و بیش چالیس ہزار سپاہی تھے وہاں بہت سے فن کار، اہل علم، اہل دانش، ہنرمند اور روحانی پیشوا بھی شامل تھے۔ سکندر نوجوانی ہی میں مذہبی رجحانات رکھتا تھا۔ لہذا روحانی علم رکھنے والوں کی ایک جماعت اس کے ساتھ رہتی تھی۔ وہ ان کی بہت قدر کرتا تھا اور مختلف مواقع پر ان سے رہنمائی بھی حاصل کرتا تھا۔ اس جماعت میں کچھ لوگ تو واقعی قابل قدر تھے اور ان کی نیکوکاری سلسلہ تھی لیکن کچھ روحانیت کے نام پر صرف شعبہ بازی کرتے تھے اور نت نئے سوامیگ رچا کر ملالہ اعظم کو متاثر کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ ان ہی میں سے ایک شخص خود کو کاہن اور ساحر مقدونیہ کے القابات سے نوازا تھا۔ عرف عام میں اسے خاتام کہا جاتا تھا۔ اس کے سیاہ بال شانوں تک بکھرے رہتے تھے۔ آنکھیں بھوری اور رنگ سرخ و سپید تھا۔ وہ آئے روز کوئی سخت قسم کا چلہ شروع کر دیتا اور لوگ اس کی چلہ کشی دیکھنے کے لیے چلے آتے تھے۔ جب سے سکندر نے اس وادی میں پڑاؤ کیا تھا خاتام ایک چوٹی پر چڑھا ہوا تھا اور اپنا نصف دھڑ برف میں دفن کر رکھا تھا۔ بالائی جسم پر بھی برائے نام لباس تھا۔ صرف ہتھ کی شب وہ پڑاؤ میں آتا تھا ورنہ شب و روز بخ بستہ ہوا میں برف کے اندر کھڑا رہتا تھا۔

کورا کا رخ دیکھ کر تہاں بخوبی سمجھ گیا کہ وہ کاہن خاتام کی طرف جا رہی ہے۔ مناسب فاصلے سے اس نے کورا کا تعاقب جاری رکھا۔ وہ جلد ہی چڑے کے بلند و بالا درختوں میں پہنچ گئی۔ کچھ فاصلے پر وہ روشنی دکھائی دی جو کاہن خاتام کی جھوپڑی میں جل رہی تھی۔ تہاں نے اب محتاط انداز اختیار کر لیا اور درختوں میں سائے کی مانند رہتا ہوا جھوپڑی کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے خاتام کو دیکھا۔ وہ حسب معمول ٹاف تک برف میں چھپا ہوا تھا۔ اس کے سامنے دو چٹائیوں پر چھ سات مرد اور دو عورتیں بیٹھی تھیں۔ تیسری عورت ان میں کورا شامل ہو گئی تھی۔ ان سب کا انداز نہایت متوجہانہ تھا۔ وہ دو زانو بیٹھے تھے اور ہاتھ سینے پر بندھے ہوئے تھے۔ خاتام کچھ پڑھ پڑھ کر ان پر ہنسی بکھڑکاتا تھا اور دھیسے لہجے میں باتیں بھی کر رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں حاضرین کی تعداد کم ہو گئی۔ اب کورا سمیت وہ صرف تین تھے۔ چند لمحوں بعد دوسرے دو بھی وہیں چلے گئے۔ اب خاتام اور کورا کے سوا وہاں کوئی نہیں تھا۔ جھوپڑی سے چھوٹی ہوئی روشنی میں تہاں نے غور سے دیکھا۔ کورا خاتام سے کچھ کم رہی تھی لیکن وہ آنکھیں بند کئے یکسر خاموش تھا۔

اس کی جانب دیکھ ہی نہیں رہا تھا۔ پھر تہاں نے کورا کو کاہن کے سامنے سجدہ دینا دیکھا۔ وہ فریادی لہجے میں بول رہی تھی۔ کورا کی آواز سننے کے لیے ضروری تھا کہ تہاں کچھ مزید آگے جائے۔ مزید آگے جانے کے تہاں کو بے حد احتیاط کرنا پڑی۔ وہ اندھے منہ لیٹ گیا اور خشک پتوں پر سانپ کی مانند بے آواز رہتا ہوا درختوں کے ایک جھنڈ میں پہنچ گیا۔ اب کاہن خاتام اس سے تین ہاتھ کی دوری پر تھا۔ جھوپڑی سے پھوٹنے والی روشنی میں کاہن کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا اور اس کا آنے جیسا بدن بھی۔ کورا نے اب سجدے سے سر اٹھایا تھا اور خوفزدہ نظروں سے کاہن کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں سے لرزاں آواز نکلی۔

”میں بہت شرمندہ ہوں خاتام..... مجھے زیوس دیوتا کے صدقے عوف کر دیں۔“ تہاں نے دیکھا کورا کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا ہے۔ ہر لمحے ہوا کی سائیں سائیں کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ پھر خاتام نے بوجھل لہجے میں کہا۔

”تم معافی کے قابل تو نہیں ہو، لیکن میں تم پر ترس آ رہا ہے..... اب جاؤ“

جیسا تمہیں کہا گیا تھا وہ کرو..... اور ایک بات یاد رکھو۔ خاتام کے حکم کو شک کی نگاہ سے دیکھنے والوں کا انجام بہت برا ہوتا ہے۔“

کورا گھٹکیالی۔ ”نہیں خاتام..... میں نے شک نہیں کیا تھا۔ میں گھبرا گئی تھی۔ دراصل افسانہ نے مجھے دیکھ لیا تھا۔“

”ٹھیک ہے۔ اب تمہیں کوئی شیں دیکھے گا۔ ہم اس لڑکی کی نگاہ بند کر دیتے ہیں۔ تم جاؤ اور اپنا کام کرو۔ اس میں ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ تم اپنے مالک کی بھلائی کر رہی ہو۔ اس کا نقصان نہیں کر رہی ہو۔“

کورا نے کہا۔ ”لیکن..... لیکن ظالم وہ مقوف تو میں نے کہیں کھو دیا۔ وہ پڑیا میں نے نکلنے کے غلاف میں رکھی تھی اب وہاں نہیں ہے۔“

تہاں نے دیکھا۔ خاتام کے چہرے پر شدید برہمی کے آثار نظر آئے۔ اس کی بھوری آنکھیں کورا کو غضبناک انداز میں گھورتے گئیں۔ پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور منہ میں کچھ بڑبڑانے لگا۔ ہاتھ دو برق گردید شاخوں کی طرف آسمان کی طرف اٹھے ہوئے تھے۔ معلوم نہیں وہ اپنا غضب دیانے کی کوشش کر رہا تھا یا کورا کو مرعوب کرنے کی۔ کافی دیر اسی عالم میں گزر گئی۔ پھر کورا نے سہمی سہمی آواز میں کہا۔

”خاتام! مجھے انوس ہے میں ابھی تک آپ کے لیے کوئی کام کی بات معلوم نہیں

کر سکی۔

خاتام نے اپنی بھوری آنکھیں کھولیں۔ کورا کے سوال نے ان میں عجب سی چمک بھری تھی وہ ٹھہرے ہوئے لمحے میں بولا۔ "اب اس کی ضرورت نہیں۔ ہم اپنے اندر کی آنکھوں سے شہزادی کو ڈھونڈ چکے ہیں۔ وہ اس وقت بھی ہماری نگاہوں کے دربرو ہے۔ ہم کل اس کی طرف روانہ ہوں گے۔"

کورا کے چہرے سے شادی مرگ کی کیفیت ظاہر ہوئی۔ وہ عاجزی سے بولی۔ "خاتام! آپ عظیم ہیں۔ مجھے یقین تھا یہ کام آپ کے سوا کوئی اور نہ کر سکے گا۔ کیا میں یہ خبر تابان کو دے سکتی ہوں؟"

"خبردار۔" کاہن خاتام گر جل۔ "اس بیوقوف کو ہرگز معلوم نہیں ہونا چاہئے بلکہ کسی کو بھی اطلاع نہیں ہونی چاہئے۔ اگر ایسا ہوتا تو دیوتا کروٹوں کا قہر نازل ہو گا تم پر۔" کورا نے سسم کر ہونٹ پہنچ لیے جیسے دیوتا کروٹوں کو اس نے اپنے سامنے دیکھ لیا ہو۔ کچھ دیر وہ خاموشی سے اپنے سامنے کی زمین کو گھورتی رہی پھر حوصلہ جمع کر کے بولی۔

"شہزادی یہاں کب تک پہنچ جائے گی؟"

"کچھ معلوم نہیں۔" خاتام نے روکھائی سے جواب دیا۔

"کیا شہزادی اور تابان کا ملاپ ہو جائے گا؟" کورا نے دبے دبے اشتیاق سے پوچھا۔

"ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اس کا فیصلہ شہزادی کو کرنا ہے، ہمیں نہیں۔ اب تم یہاں سے جا سکتی ہو۔"

کورا ڈر رہی تھی لیکن یہاں سے نکل بھی نہیں رہی تھی۔ اس نے کہہ "خاتام! آپ کے لیے کچھ ناممکن نہیں۔ آپ کے حکم سے کیا نہیں ہو سکتا۔ آپ کو دیوتاؤں کا واسطہ، شہزادی کے دل میں بھی وہی درد دنگا دیتے جو تابان کے دل میں جاگا ہے۔ ان دونوں کے غم اور خوشیاں ایک کر دیجئے۔"

تابان کورا کے اس نالہ نیم شب کو حیرت سے سن رہا تھا۔ اس کی نگاہیں خاتام کے چوڑے چمکے چہرے پر تھیں جو کہ کورا کی دھل در معطلات پر سرفنی مائل ہو رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے تابان کو لگا جیسے وہ برف سے نکل کر کورا پر ٹھوکروں اور تھپڑوں کی بارش کر دے گا لیکن پھر اچانک اس کے چہرے نے تاثر بدلا جیسے کوئی نیا خیال اس کے دماغ میں

آیا ہو۔ اس نے ایک بار پھر آنکھیں بند کیں اور اپنے جھلے ہوئے بازوؤں کو آسمان کی طرف اٹھا کر پروانے لگا۔ آواز کے آہنگ سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کئی قدیم مناجات دہرا رہا ہے۔ کورا کسی پچارن کی مانند دم بخود بیٹھی تھی۔ آخر خاتام نے کیلی اٹھائیں اور کورا کو حکم دیا کہ وہ جھوپڑی کے وسط میں لٹکی ہوئی کپڑے کی سیاہ تھیلی لے آئے۔ کورا اپنی جگہ سے اٹھی۔ تیز ہوا میں اس کی چادر کسی عفریت کی مانند ہلچل مچا رہی تھی۔ بادل گھر آئے تھے اور وہ رہ کر بجلی نشیب و فراز کو روشن کر دیتی تھی۔ وہ جھوپڑی میں داخل ہوئی اور ایک سیاہ تھیلی نکال لائی۔

خاتام نے پوچھا۔ "جانتی ہو اس میں کیا ہے؟" کورا نے ٹہنی میں سر ہلایا۔ خاتام بولا۔ "اس میں سانپ ہے۔ دنیا دار اسے زہریلا سانپ کہیں گے اور اس سے دور بھاگیں گے لیکن جسے ہم پر بھروسہ ہے وہ ہمارے کہنے پر اس سانپ کو بلا جگ منہ میں رکھ لے گا۔ بس یہی فرق ہے اعتقاد میں اور بے اعتقادی میں۔ بے اعتقادی محرومی کے سوا کچھ نہیں بخشتی اور اعتقاد سے فیض کے چشمے پھوٹتے ہیں۔" ایک لمحہ توقف کر کے خاتام نے عقابی نگاہوں سے کورا کو دیکھا پھر سلسلہ کام جوڑتے ہوئے بولا۔ "ہمارے آقا کے جسم میں مایوسی اور قنیت کا بے پناہ زہر ہے جو اس کے ذہن کو منتشر رکھتا ہے اور اسے عام انسانوں سے بہت دور لے جا رہا ہے۔ ہم نے پہلے بھی تم سے یہی کہا تھا کہ اس کی بھلائی چاہتی ہو تو ہماری ہدایات پر عمل کرو۔ یہ سانپ لے جاؤ اور اس کے بستر پر چھوڑ دو۔ اس سانپ کا زہر ہمارے آقا کے زہری کٹ کرے گا اور وہ ایک بار پھر عام انسانوں جیسا ہو جائے گا۔" اس کی جتنی کیفیت باقی رہے گی وہ شراب میں ڈوبے گا اور نہ آدمی آدمی رات کو دیرانوں میں گھوڑا بھگاتا پھرے گا۔ اگر شہزادی مارشا کے ٹٹے میں تاثیر بھی ہوئی تو وہ اس کے انتظار کی گھڑیاں سکون سے کٹ سکے گا۔"

ایک بار زور سے ہلکی چٹکی۔ تابان نے دیکھا کہ کورا کی آنکھوں میں ہراس کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ جو خسی خاتام نے انکشاف کیا تھا کہ سیاہ تھیلی میں زہریلا سانپ ہے کورا نے تھیلی ہاتھ سے گرا دی تھی۔ اب وہ سہمی ہوئی نظروں سے غیبی کو دیکھ رہی تھی۔ "اسے اٹھاؤ۔" خاتام کی گرجدار آواز بادلوں کی گرج سے ہم آہنگ ہو گئی۔ "کیا تمہیں ہم پر بھروسہ نہیں۔ اگر بھروسہ نہیں تو چلی جاؤ یہاں سے۔" اور اگر ہے تو ہمارا کہنا مانو۔"

کورا لرز کر جھکی اور تھیلی کو اٹھالیا۔ لگتا تھا خاتام نے اسے مسکور کر رکھا ہے اور

وہ اس کی ہدایات پر معمول کی طرح عمل کر رہی ہے۔ ”جاؤ۔“ خاتم نے زور سے کہا۔
”دیوتا تمہاری من کی مرادیں پوری کریں گے۔“

کورا بدحواسی میں واپس مڑی لیکن پھر اسے یاد آیا کہ اس نے تعظیم پیش نہیں کی۔ وہ گھٹنے ٹیک کر بیٹھی اور سر اس طرح جھکایا کہ وہ برف پوش زمین کو چھونے لگے۔ تب وہ اٹھ کر اٹلے پاؤں چلتی چیز اور سرو کے پیڑوں میں روپوش ہو گئی۔ اس کے روانہ ہوتے ہی تہاں نے بھی اپنی جگہ چھوڑی اور پڑاؤ کی طرف چل دیا۔ تہاں کے پڑاؤ تک پہنچتے پہنچتے تیز بارش شروع ہو چکی تھی۔

بارش ایک بار شروع ہوئی تو پھر اس نے رکنے کا نام نہیں لیا۔ سردی جو پہلے ہی کم نہیں تھی اب اور بڑھ گئی۔ یہ اگلی شب کی بات ہے جب حسین و جمیل افشاں تہاں کے خیمے میں گہری نیند سو گئی۔ وہ خاموشی سے اٹھا اور خیمے کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ سامنے ہی ایک اور چھوٹا سا خیمہ تھا۔ اس خیمے میں تین افراد قیام پذیر تھے۔ یہ تینوں خادم تھے اور ان میں تہاں کا ذاتی خادم بھی تھا۔ تہاں ان کے خیمے میں داخل ہوا تو وہ تینوں ٹھٹھک گئے لیکن انہیں کچھ زیادہ حیرانی نہیں ہوئی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اکثر تہاں وقت گزاری کے لیے ان کے خیمے میں چلا آتا تھا۔ یہ بات بھول کر کہ وہ ایک بڑاری سردار ہے وہ ان خادمین گھل مل جاتا تھا۔ ان کے ساتھ بوسیدہ دری پر آلتی پالتی مار کر بیٹھا تھا، قہوہ پیتا تھا۔ شطرنج نما کھیل کھیلتا تھا اور بعض اوقات زور آزمائی پر بھی اتر آتا تھا۔ اس وقت بھی تینوں خادم یہی سمجھے کہ ”آقا“ کھیل کود کے لیے تشریف لائے ہیں لیکن جلد ہی انہیں معلوم ہو گیا کہ آج صورت حال مختلف ہے۔ تہاں کے چہرے پر سنجیدگی کی گہری پرچھائیاں تھیں اور وہ خادمین سے لئے دیئے نظر آ رہا تھا۔ اس نے خادموں کو حکم دیا کہ وہ اپنے بستر پر آرام کریں وہ کچھ دیر خیمے میں بیٹھ کر واپس چلا جائے گا۔

ایک خادم نے بے تکلفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے وضاحت چاہی تو تہاں نے اسے ڈانٹ دیا۔ یہ ڈانٹ دوسرے خادمین کے لیے بھی مؤثر ثابت ہوئی۔ وہ کان لپیٹ کر اپنے بچھونوں کی طرف چلے گئے۔ تہاں نے انہیں شمعیں گل کرنے کا حکم دیا خیمے میں مکمل تیرگی چھا گئی تو وہ خیمے کے در کے پاس نیم دراز ہو گیا۔ یہاں سے اسے اپنا خیمہ اور خیمے کا در صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ جس مقصد سے یہاں لیٹا تھا وہ بہت جلد پورا ہو گیا۔ اسے کورا کے لیے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ رم بھم برستی بارش میں ایک تاریک دیوالا مشرقی خیموں کی طرف سے برآمد ہوا اور تہاں کے خیمے کے سامنے آ کر تہاں صاف دیکھ رہا

تھا، وہ کورا تھی۔ ڈری سہمی ہوئی اور چوروں کی طرہ چاروں طرف دیکھتی ہوئی۔ وہ چند لمبے دروازے کے سامنے رک کر آگے بڑھ گئی۔ توڑی دور جا کر واپس آئی اور بے قراری سے خیمے کا نصف پکر کاٹا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی چیز تھی اور تہاں جانتا تھا یہ چیز سیاہ تھیلی کے سوا اور کچھ نہیں۔ وہ کچھ دیر خیمے کی آتش کھڑی رہی۔ سپریدار گشت مکمل کر کے آگے نکل گیا تو کورا پھر دروازے پر آکھڑی ہوئی۔ تہاں نے دیکھا سیاہ تھیلی اس کے ہاتھ میں ہے اور وہ شدید نگاہ کے عالم میں دروازے کی طرف دیکھ رہی ہے۔ دروازے کے عین اوپر ایک روزن نما سوراخ تھا۔ تھیلی کا منہ کھول کر اسے یہ آسانی سوراخ سے اندر پھینک سکتی تھی لیکن اس کا تہذیب اسے کچھ کرنے نہیں دے رہا تھا۔ بے حال ہو کر اس نے ایک بار پھر خیمے کا پکر لگایا۔ چند لمبے دروازے کے سامنے کھڑی رہی۔ کبھی روزن اور کبھی ہاتھ کی تھیلی کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر تہاں نے دیکھا وہ تھیلی پھینکنے بغیر بھاگتی ہوئی واپس لوٹ گئی۔

تہاں کچھ دیر بے حس و حرکت اپنی جگہ بیٹھا رہا تب اس نے خادمین کو خیمہ اندر سے بند کرنے کا حکم دیا اور کورا کے تعاقب میں روانہ ہوا۔ وہ اپنے خیمے کی طرف جانے کی بجائے غیب کی طرف چلی گئی تھی۔ غیب میں پہنچ کر تہاں نے دیکھا وہ شاہ بلوط کے بلند پیڑوں تلے کسی پتھر کی طرح بے حرکت بیٹھی تھی۔ سردی اور بارش جیسے اس پر اثر انداز ہی نہیں ہو رہی تھی۔ نزدیک پہنچ کر تہاں کو اندازہ ہوا کہ اس نے اپنا سر گھٹنوں میں دے رکھا ہے اور سسکیوں سے رو رہی ہے۔ تہاں چند قدم مزید آگے گیا تو وہ اس کی موجودگی سے آگاہ ہو گئی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا اور ششدر رہ گئی۔

”تم یہاں؟“ وہ پھلائی۔

”یہی سوال میں تم سے پوچھ سکتا ہوں۔“ تہاں نے کہا۔

”مہم..... میں..... میرا دل گھبرا رہا تھا..... اس لیے۔“

”وہ تھیلی کہاں ہے؟“ تہاں نے اس کی بات کاٹی۔

”تہاں..... کون سی تھیلی؟“ کورا کا خوف نقطہ عروج کو پہنچ گیا۔

”وہ جو تمہارے ہاتھ میں تھی اور جس میں خاتم کا دیا ہوا ساپ تھا۔“

کورا کی آنکھیں حیرت سے وا ہو گئیں۔ اس کے ہونٹ لرزاں تھے اور وہ مبسوت سی تہاں کو دیکھے چلی جا رہی تھی۔ تہاں غریبا۔ ”کچھ بھی چھپانے کی کوشش فضول ہے میں کل تمہاری اور خاتم کی تمام باتیں سن چکا ہوں۔“

”میں کچھ نہیں جانتی تہاں۔ تمہیں..... غلط..... فنی ہو رہی ہے۔“
ایکایک تہاں غصے سے بے قابو ہو گیا۔ اس نے ہاتھوں سے پکڑ کر کورا کو زور کا ہنکا دیا۔ وہ لڑکھڑا کر زین پر گرئی۔ اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ تہاں نے ایک بار پھر اس کے بال جکڑ لئے۔ ”مجھ سے جھوٹ مت بول کورا۔ خاتم نے تجھے جس جال میں الجھا رکھا ہے وہ میری نظر سے اوجھل نہیں..... بتا کس کی اجازت سے تُو جاتی تھی اس کے پاس۔ کیوں اس کے کہنے پر میرے لئے موت کا سامان اکٹھا کر رہی تھی؟ کیوں یہ سب کچھ چھپا رہی تھی مجھ سے؟“

ایکایک کورا نے اپنا بازو موڑ کر چہرے پر رکھا اور زور سے رونے لگی۔ ”میں تمہاری مجرم ہوں۔ میں نے تمہیں قتل کرنے کی کوشش کی ہے۔ مجھے مار ڈالو..... مار کر میس دفن کر دو..... میں اسی لائق ہوں..... ہاں میں اسی لائق ہوں۔“ تہاں نے اس کے بال پھوڑ دیے اور خاموشی سے اس کے رونے کا نظارہ کرنے لگا۔ اسے کچھ بھائی نہیں دے رہا تھا کہ اس موقع پر کیا کرے۔ وہ جانتا تھا کہ کورا سے سنگین غلطیاں ہوئی ہیں مگر وہ بے وفا نہیں تھی۔ اس نے جو کچھ کیا نیک نیتی سے کیا اور تہاں کی بھلائی کے لیے کیا۔ خاتم جیسے شعبہ باز نے کورا جیسی نہ جانے کتنی سادہ لوح عورتوں کو درغلا رکھا تھا۔ اپنے شعبہ دلوں کو ”پڑا سرار علوم“ قرار دینے والے یہ لوگ آسیب کی طرح اپنے ہیرو کاروں پر حاوی ہو جاتے تھے۔

تہاں نے کورا کے دل کا غبار اس کی آنکھوں کے راستے نکلنے دیا۔ وہ کافی ردحو چکی تو وہ نرمی سے بولا۔ ”میرے ساتھ آؤ کورا۔ میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“ کورا کو اپنے کندھے سے لگائے وہ اسے اپنے خیمے میں لے آیا۔ اس نے کورا کی بھیگی ہوئی گرم چادر اتاری اور ایک دوسری چادر دے کر اسے انگلیٹھی کے قریب بٹھایا۔ پھر اس نے شمع ان کی ساری شمعیں روشن کر دیں اور کورا کے قریب آ بیٹھا۔ آہٹ سن کر افشاہہ جاگ اٹھی اور حیرت سے ان دونوں کو دیکھنے لگی۔ تہاں نے افشاہہ کو تھوڑی دیر کے لیے دوسرے خیمے میں بھیج دیا اور مکمل تہاں میں کورا سے ہمکلام ہوا۔ اس نے کورا سے قہقہے کے بارے میں پوچھا تو کورا نے روتے ہوئے بتایا کہ وہ اس نے نشیبی درختوں میں پھینک دی ہے۔

تہاں نے کہا۔ ”کورا میں جانتا ہوں وہ قہقہے تم نے کیوں پھینکی ہے اور یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ تمہیں کیوں دی گئی تھی۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تمہیں خاتم کے جال میں

الجھانے والا کون ہے؟“

کورا نے ڈری ہوئی آواز میں کہا۔ ”تہاں! تم کاہن خاتم کا نام گستاخی سے مت لو۔ وہ اپنے مخالفین کے لیے قہر آسمانی سے کم نہیں ہے۔“
تہاں نے میزبانی سے کہا۔ ”وہ جو کوئی بھی ہے مجھے اس سے سروکار نہیں۔ میں صرف یہ جانتا چاہتا ہوں کہ تم اس تک کیسے پہنچیں؟“
جواب میں کورا کچھ دیر تک خاموشی کے خول میں مغمی رہی۔ پھر اس نے ڈرے ڈرے انداز میں آہوں اور سسکیوں کے درمیان جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ کچھ اس طرح تھا۔

”یہ کوئی چار ماہ پہلے کی بات ہے“ پہلی کار نہیں فتح ہو چکا تھا۔ فوج نے ایک بڑی جھیل کے کنارے پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔ میں رات کو اپنے خیمے میں افشاہہ کے ساتھ سوئی۔ کسی پہراچانک میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے دیکھا خیمے میں پھرا رہی روشنی پھیلی ہے اور ایک ہیوا سا میرے بالکل قریب کھڑا ہے۔ اس ہیوے کا لباس سفید تھا اور سینے کے مقام پر لباس کے اندر سے روشنی پھوٹی محسوس ہوتی تھی۔ میں دہشت زدہ ہو گئی۔ یہ ہیوا کاہن خاتم کا تھا“ میں تب تک اسے جانتی نہیں تھی لیکن وہ بہت بارعب نظر آ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”میرا علم کتا ہے کہ تمہارا نام کورا ل دیر ہے تم اپنے خیمے سے آئی ہو“ غارس زنوب کی کنیر ہو اور شہزادی مارشا کی خادمہ خاص رہ چکی ہو۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“
میں نے بے اختیار نفی میں سر ہلا دیا۔ اس کے بعد کاہن خاتم نے میرے بارے میں اور بھی بہت کچھ بتایا۔ میں اس کی سحرانہ گفتگو سے بے حد مرعوب ہوئی۔ اس نے مجھے اپنے ہاتھ دکھائے جو کنیوں تک چلے ہوئے تھے اور بتایا کہ آسمانی جلیں اس سے ہمکلام ہوتی ہیں اور وہ غیب کے پردوں میں جھانک سکتا ہے۔ میں بہ جان کر حیران ہوئی کہ اس ساری گفتگو کے دوران افشاہہ اپنے بستر پر بے حس و حرکت پڑی رہی۔ مجھے اس کی طرف دیکھتے پاکر خاتم نے کہا۔ ”اس کی طرف سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ جب تک میرا حکم نہ ہو گا یہ نہیں جاگے گی..... میں تم سے کچھ باتیں دریافت کرنا چاہتا ہوں اور یہ چاہتا ہوں کہ تم ان کے جواب پوری تفصیل سے دو۔“ میں کاہن کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو گئی۔ وہ مجھ سے مارشا کے بارے میں دریافت کرنے لگا۔ اس نے کئی سوال پوچھے۔ آخری بار وہ مجھے کہاں لی تھی؟ مقدونی ملے کے وقت وہ محل کے کس حصے میں تھی؟ کیا میں نے اسے گرفتار ہوتے دیکھا تھا؟ وغیرہ۔ مجھے جو کچھ معلوم تھا

بلاکم و کلاست کاہن کو بتا دیا۔ وہ پھر بھی مطمئن نہیں ہوا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ کشمگی کے بعد مجھے کبھی مارشا کا کوئی سراغ ملا ہے۔ میں نے ایسے تمام سوالات کا جواب نفی میں دیا۔ آخر میں وہ بولا میں ایک ٹیپی آواز کی ہدایت پر مارشا کو ڈھونڈنے یونان سے برلن پہنچا ہوں اور وہ تا دیر میری نظروں سے اوجھل نہیں رہ سکے گی۔ وہ جہاں کہیں بھی ہے اس کے لیے اتلا کے دن ختم ہوئے۔ اب وہ بہت جلد اپنوں میں ہوگی اور عیش و آرام کی زندگی شروع کرے گی۔ میں کاہن کے پاؤں میں گر گئی۔ میں نے بڑلا کہا۔ ”اے کاہن! اس لشکر میں ایک ایسا شخص بھی ہے جو مارشا سے بے پناہ پیار کرتا ہے۔ اتنا پیار جو شاید ہی کسی مرد نے کسی عورت سے کیا ہو گا۔ وہ اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ کیا میں اسے یہ نوید سناسکتی ہوں کہ مارشا مل جائے گی؟ کاہن خاتام نے مجھے ایسا کرنے سے روک دیا۔ اس نے کہا فی الحال تم یہ راز اپنے تک رکھو ورنہ میرے عملیات میں خلل پڑے گا۔ ہاں تم اپنے ارد گرد کڑی نگاہ رکھو۔ اگر مارشا کے بارے کوئی اہم یا غیر اہم کھوج ملے، مجھے مطلع کرو۔“ میں نے کاہن خاتام کی ہدایت پر پوری طرح عمل کیا اور خواہش کے باوجود تھمیں کاہن خاتام کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔ چند روز بعد مجھے یہ معلوم ہوا کہ کاہن خاتام سپارٹا سے آیا ہے اور سکندر نے اس کی جادوئی قوتوں سے متاثر ہو کر اسے اپنے دربار میں جگہ دے دی ہے۔

”بہت جلد کاہن خاتام کے عقیدت مندوں کی تعداد سینکڑوں تک جا پہنچی۔ میں بھی کئی بار اس کی خدمت میں حاضری دے چکی ہوں۔ چند ہفتے پہلے میں نے اس سے تمہاری جد سے بڑھی ہوئی مایوسی اور پریشانی کا ذکر کیا۔ خاتام نے مجھے کچھ عملیات بتائیں اور ایک پڑا دی۔ خاتام نے کہا اس میں تمہارے آقا کی تمام زہرتائیوں کا تریاق موجود ہے۔ خاتام کی ہدایت کے مطابق مجھے وہ سفوف تمہارے کھانے میں ملانا تھا لیکن یہ نہیں کیوں میں کئی مرتبہ کوشش کے باوجود ایسا نہ کر سکی۔ ایک دوسرا سامیرے دل کو گھیر لیتا تھا۔ کاہن خاتام پر مجھے پورا بھروسہ تھا اور شاید کسی حد تک اب بھی ہے لیکن میں نہ تو تمہارے کھانے میں سفوف ملا سکی اور نہ وہ زہریلا سانپ تمہارے خیمے میں چھوڑ سکی۔ معلوم نہیں میں نے اچھا کیا ہے یا برا۔ اگر برا کیا ہے تو میں ہر سزا کے لیے تیار ہوں اور اگر اچھا کیا ہے تو تم مجھے معاف کر دو۔“

تباہان نے کورا کی ساری روئیداد قتل سے سنی۔ صورت حال اب کچھ کچھ واضح ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے کورا سے پوچھا۔ ”خاتام کہہ رہا تھا کہ وہ اپنے اندر کی آنکھوں

سے شہزادی مارشا کو دیکھ چکا ہے اور کل اس کی طرف روانہ ہو رہا ہے۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ واقعی وہ شہزادی کا کھوج لگا چکا ہے؟“ کورا آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ ”اگر تم خاتام کو پراسرار فوٹوں کا مالک نہ بھی سمجھو تو یہ حقیقت ہے کہ وہ بہت دور تک دیکھ سکتا ہے۔ وہ اپنی قہم فراست سے ایسی گتیاں سلجھاتا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ وہ کوئی عام انسان نہیں ہے اگر وہ کہہ رہا ہے کہ وہ شہزادی مارشا تک پہنچ گیا ہے تو ضروری ایسی کوئی بات ہو چکی ہے۔ میں پُر امید ہوں کہ ہم جلد ہی شہزادی صاحبہ کی صورت دیکھ سکیں گے۔“

تباہان کافی دیر تک کورا سے سوال و جواب کرتا رہا۔ اس معاملے میں اس کی دلچسپی ہر لحاظ بڑھتی جا رہی تھی۔ اگر خاتام نے شہزادی مارشا کا کھوج لگایا تھا تو کیسے؟ اور اس سے بھی اہم سوال یہ تھا کہ وہ شہزادی کو ڈھونڈنا کیوں چاہتا تھا؟ اب یہ بات کوئی راز نہیں رہی تھی کہ وہ کورا کے ہاتھوں تباہان کو مروانا چاہتا تھا۔ اس کا مطلب تھا مارشا کو ڈھونڈنے میں بھی اس کا کوئی سنگین مقصد پوشیدہ تھا۔ تباہان اب جلد از جلد کورا کے پاس سے اٹھنا چاہتا تھا۔ اس کا فوری طور پر کسی اہم سرکاری عہدیدار سے ملنا ضروری ہو گیا تھا۔ اس نے کورا کی طرف دیکھا۔ اس کے زرد چہرے پر خوف کی پرچھائیاں تھیں۔ یہ کیفیت وہ اکثر کورا کے چہرے پر دیکھ چکا تھا لیکن اس سے پہلے یہ کیفیت سردار ٹال کے خوف کا نتیجہ ہوتی تھی جبکہ آج وہ کاہن خاتام کے قہر سے سہمی ہوئی تھی۔ اس نے خاتام سے وعدہ کر رکھا تھا کہ وہ تباہان کو ان تمام حالات سے بے خبر رکھے گی اور وہ اپنے وعدے پر قائم نہیں رہ سکی تھی۔ تباہان نے اس سے تسلی بخشی کی باتیں کیں اور اس کے دل و دماغ سے وہ نراسرار خوف کھرچنے کی کوشش کرتا رہا جو خاتام کی بھوری آنکھوں نے پیچھے چار ماہ میں نقش کیا تھا۔

جب رات کا تیسرا پھر شروع ہوا، تباہان نے کورا اور انشاؤد کو خیمے میں چھوڑا اور بارش سے محفوظ رکھنے والی موی چادر اوڑھ کر شاہی خیمہ گاہ کی طرف روانہ ہوا۔ اتنی رات گئے کسی سرکاری اہلکار کو ڈیگنا قطعی نامناسب اور خلاف ضابطہ تھا، لیکن تباہان نے قاعدوں ضابطوں کی کب پرواہ کی تھی جو اب کر رہا۔ وہ تکرے ہاتھوں اور آلودہ وردی کے ساتھ میدھا شانی نائب بلیوس کے خیمے میں گھس گیا۔ بلیوس کچی نیند میں تھا، پہلے اسے دیکھ کر حیران ہوا۔ پھر برے برے منہ بنانے لگا۔ کہیں قریب ہی سے ایک دوشیزہ متحرک ہوئی اور چھپاک سے خیمے کے دوسرے حصے میں گھس گئی۔ بلیوس نے خشک لمبے

میں پوچھنا۔ ”کیا بات ہے، کیوں چلے آئے ہو؟“

تہاں رسی انداز میں بولا۔ ”بے وقت مداخلت کے لیے معذرت چاہتا ہوں۔ مجھے ایک شخص کے بارے میں معلومات درکار ہیں اور یہ معلومات آپ ہی دے سکتے ہیں۔“
”کوہ۔“ بطلمیوس نے نکتے سے ٹیک لگا کر انہی ہوئی صراحتی سیدھی کی اور اس میں سے شراب منقش پیالے میں ڈکانے لگا۔

تہاں نے بغیر کسی تمہید کے بات شروع کر دی۔ ”محترم بطلمیوس! مذہبی پیشواؤں اور یونانی کاہنوں کی جماعت میں ایک خاتام نامی شخص سلار اعظم کے مقررین میں شامل ہے۔ میں اس کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔“
بطلمیوس نے جہاں لیتے ہوئے کہا۔ ”وہ تو آج کل چلہ کشی کر رہا ہے۔ بہت دن ہوئے میں نے اسے دیکھا نہیں۔“

”لیکن میں نے سنا ہے کہ وہ اپنا چلہ ادھورا چھوڑ کر کہیں روانہ ہو رہا ہے۔“
بطلمیوس بولا۔ ”میں اس بارے میں زیادہ نہیں جانتا..... ٹھہرو میں تازہ کاری کو جلاتا ہوں۔“

تازہ کاری پیشواؤں کی جماعت کا خدمتگار اعلیٰ تھلا۔ بطلمیوس نے ایک خادم کو دوڑایا۔ وہ تھوڑی ہی دیر میں تازہ کاری کو بطلمیوس کے وسیع خیمے میں لے آیا۔ قاتلین کا ایک حصہ مشروب سے تریختھا اور فضا میں ایک خوابیدہ نسوانی مسک رہی ہوئی تھی۔ تازہ کاری نے ناک سکوڑ کر اس رنگین ماحول کی بوسہ لگائی اور لپٹائی نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے کے بعد بطلمیوس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ بطلمیوس نے تازہ کاری کی توجہ تہاں کی جانب دلائی اور اسے بتایا کہ تہاں کیا معلوم کرنا چاہتا ہے۔ کاہن خاتام کا نام سن کر تازہ کاری نے تعمیری انداز میں سر اوپر نیچے ہلایا اور بولا۔ ”آپ کا قیافہ درست ہے۔ کاہن خاتام اپنا چلہ چھوڑ کر کسی اہم مقصد سے پہاڑی علاقے کی طرف جا رہے ہیں، تاہم یہ کوئی ایسی انوکھی بات نہیں ہے۔ قدرت نے انہیں غیب دانی کا وصف بخشا ہے۔ وہ اکثر اس طرح اچانک فیصلے کرتے ہیں۔ ہمیں ان فیصلوں کی اہمیت معلوم نہیں ہوتی مگر یہ فیصلے بہت دور رس ہوتے ہیں۔“

تہاں نے تازہ کاری کی مدح سرائی کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھنا۔ ”وہ کب روانہ ہو رہا ہے؟“
تازہ کاری نے کہا۔ ”مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں۔ شاید آج رات..... یا پھر کل صبح ویسے میں ان سے الوداعی ملاقات کر چکا ہوں۔“

تہاں نے پوچھنا۔ ”وہ اکیلا جا رہا ہے؟“

”نہیں۔“ تازہ کاری نے کہا۔ ”ایک مرید خاص ہمہ وقت ان کے ساتھ رہتا ہے۔ اس کا نام ازبک ہے۔ وہ شہنشاہی کاتبوں میں شامل ہے اور خط و کتابت کا زیادہ کام اسی کے ذمے ہوتا ہے۔ اس کا خیمہ یہاں سے زیادہ دور نہیں۔ ہم ابھی جا کر دیکھ لیتے ہیں۔ اگر وہ خیمے میں موجود ہے تو اس کا مطلب ہے کاہن خاتام بھی ابھی روانہ نہیں ہوئے۔“

تہاں نے بطلمیوس سے اجازت چاہی اور تازہ کاری کو لے کر خیمے سے نکل آیا۔ کوئی سو قدم دور وہ ازبک کے خیمے میں پہنچے تو وہاں ایک بوڑھے خادم کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ تہاں نے خادم کو مخاطب کرتے ہوئے بے تابی سے پوچھا ”تمہارا آقا کہاں ہے؟“
خادم نے کھانسنے ہوئے کہا۔ ”وہ تو چلے گئے حضور۔“

”کہاں؟“
”حضور! انہیں کاہن مقدونیہ محترم خاتام کے ساتھ کسی سفر پر روانہ ہونا تھا۔“
”کب گئے وہ؟“ تہاں نے خادم کی بات کاٹ کر پوچھا۔
”دو سوا پیر کوئی دو گھنٹی گزرا تھا جب وہ یہاں سے چلے تھے۔“

خادم کا جواب سنتے ہی تہاں واپس مڑا اور پڑاؤ کی گلیوں میں بھاگتا ہوا اپنے خیمے میں واپس آ گیا۔ وہاں افشاہدہ اور کورا ابھی تک جاگ رہی تھیں۔ تہاں نے جلدی جلدی انہیں کچھ ہدایات دیں اور ان سے فارغ ہو کر اصطبل کی طرف دوڑا..... اصطبل میں ہنگامی ضرورت کے لیے خرچینوں میں راشن بھر کر رکھ دیا جاتا تھا۔ تہاں نے راشن سے بھری ہوئی ایک خرچین اٹھا کر گھوڑے پر رکھی اور سوار ہو کر اصطبل سے نکل آیا.....

تھوڑی ہی دیر بعد وہ سریت گھوڑا دوڑاتا شمال مشرق کی طرف جا رہا تھا۔ اونچی نیچی گھاٹیوں میں بل کھاتائی واحد راستہ تھا جو مسافروں کو شمال مشرق کے بلند پہاڑی علاقے میں لے جا سکتا تھا۔ خاتام اور اس کا مرید خاص شمال مشرق کی طرف گئے تھے، لہذا تہاں کو یقین تھا کہ جلد یا بدیر اسی راستے پر ان سے ملاقات ہو جائے گی۔ تاریکی اور پھسلنے سے اس خطرناک راستے کو اور پرخطر بنا دیا تھا۔ اس پر یارش اور بخ بستہ ہوا کا زور..... یہ سفر کسی آزمائش سے کم نہیں تھا۔ تہاں کے ایک جانب گرمی کھائی تھی اور اسے معلوم تھا پائے رخش کی ایک لغزش کا مطلب موت کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ مگر رکتا تو دور کی بات ہے وہ اپنی رفتار بھی کم نہیں کر سکتا تھا۔ خاتام کو پڑاؤ سے نکلے چار گھنٹاں ہو چکی تھیں۔ اگر تہاں مزید تاخیر کرتا تو اس کا ہاتھ آنا بے حد دشوار تھا۔ کل

رات شروع ہونے والی بارش تھوڑی دیر کے لیے بھی نہیں رکی تھی اور اب تو اس میں مزید شدت پیدا ہو رہی تھی۔ اچانک تباہان کو احساس ہوا کہ کچھ گھڑسوار اس کے عقب میں آ رہے ہیں۔ اس نے لگام ہینچ کر گھوڑے کو روکا اور دھیان سے آوازوں پر غور کرنے لگا۔ آواز میں قریباً ایک سیٹیم دور تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ گھڑسوار تباہان کے سر پر پہنچ گئے۔ وہ تعداد میں تین تھے اور انہوں نے بارش سے بچاؤ کے لیے موی چادریں اوڑھ رکھی تھیں۔ وہ قریب پہنچے تو تباہان دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یہ وہی تین خادم تھے جنہیں تباہان تھوڑی دیر پیشتر خیمے میں چھوڑ کر آیا تھا۔ ان میں سے ایک خادم تباہان کی خدمت پر مامور تھا۔ تباہان نے استغاثی کڑے لمبے میں پوچھا۔

”تم تینوں یہاں کیا کر رہے ہو؟“

تباہان کے خادم نے اطمینان سے کہا۔ ”یک ہزاری سردار بن کر پوچھ رہے ہو یا بے تکلف دوست بن کر؟“

تباہان دانت پیس کر بولا۔ ”اغت ہے تم پر اور تمہاری دوستی پر۔ میں کہتا ہوں تم میرے پیچھے کیوں آئے ہو؟“

خادم نے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے یک ہزاری سردار بن کر پوچھ رہے ہو۔ اب ہمیں بھی خادم بن کر جواب دینا ہو گا۔“

تباہان اس شخص کے لمبے پر حیران ہو رہا تھا۔ وہ تینوں اس سے بے تکلف ضرور تھے لیکن اتنے بھی نہیں کہ یوں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال و جواب کریں اور تباہان کے تیوروں کو خاطر میں ہی نہ لائیں۔ دفعتاً تباہان کو احساس ہوا کہ کوئی خلاف توقع بات ہو چکی ہے۔ اسے اپنی دائیں جانب مدہم آہٹ سنائی دی۔ وہ تیزی سے گھوم۔ ایک تنگ گھائی میں سے نکل کر دو اور گھڑسوار اس کے سامنے آ گئے۔ تباہان نے تاریکی میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ ایک جانی بچائی آواز اس کے کانوں سے نکلی۔

”خوش آمدید سردار تباہان..... میں امیر ارژنگ ہوں۔“

تباہان کی سماعت میں دھماکا ہوا۔ وہ اس کا نام کیسے بھول سکتا تھا۔ یہی شخص تو تھا جس سے چند ماہ پہلے تباہان نے افشاہ کو چھینا تھا۔ وہ افشاہ جو اب اس کی کالی سنسان راتوں میں جگنو کی چمک تھی۔ ارژنگ کی آواز ایک بار پھر اندھیرے سے ابھری۔

”مجھے تجھ پر ترس آ رہا ہے سردار تباہان۔ کاش تجھے کسی نے بتا دیا ہو تا کہ تو جس خانوادے سے نکملے رہا ہے وہ سوسل تک اپنی دشمنی نہیں بھولتا اور اپنے مجرم کو زمین

کی ساتویں تہہ سے ڈھونڈ نکالتا ہے.....“ امیر ارژنگ کے پیچھے چند اور گھڑسوار نمودار ہوئے۔ ان سب کے ہاتھوں میں عریاں تلواریں تھیں۔ ارژنگ نے تباہان کے بالکل سامنے پہنچے ہوئے کہا۔ ”آہ..... کتنے افسوس کی بات ہے۔ اس طوفانی شب میں کوئی تمہاری مدد کو نہیں آنے والا۔ متحدہ جمہیت یونان کا سالار اعظم سکندر اپنی لاتعداد سپاہ کے باوجود تمہاری جان بچانے سے قاصر ہے۔“

تباہان نے دیکھا امیر ارژنگ کے ساتھ آنے والے تقریباً سبھی افراد کے بال لمبے اور کانوں میں کسی دھات کے باریک چھلے تھے۔ ان میں وہ تینوں خادم بھی شامل تھے۔ تباہان کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ تینوں خادم درحقیقت امیر ارژنگ کے قیدی کے افراد ہیں۔

☆-----☆-----☆

امیر ارژنگ بیش قیمت لباس میں تھا۔ ہاتھوں میں قیمتی انگشٹریاں رک رہی تھیں۔ گھوڑے پر ایک ملازم امیر کے پیچھے بیٹھا تھا۔ اس کے سینے پر ایک بڑے موی چھاتے کا دست چری کسموں سے بندھا ہوا تھا۔ چھاتے ایسے زاویے سے جھک ہوا تھا کہ امیر پر بارش کی ایک بوند نہیں پڑ رہی تھی۔ ملازم کے داہنے ہاتھ میں ایک مشعل تھی۔ مشعل کی روشنی امیر ارژنگ کے ارد گرد ایک مختصر سے دائرے کو روشن کر رہی تھی۔ امیر کی آنکھوں میں زہریلے سانپ کی چمک تھی اور یہ آنکھیں تباہان پر گڑی ہوئی تھیں۔

”کیا چاہتے ہو مجھ سے؟“ تباہان نے غصے ہوئے لمبے میں پوچھا۔

”تمہاری موت۔“ ارژنگ نے جواب دیا۔ ”لیکن کوئی ایسی دلی موت نہیں۔“

جہیں جہنم واصل ہی کرنا ہوتا تو پچھلے ایک ماہ کئی مواقع ایسے آئے تھے کہ تمہارے سینے میں زہریلا تیرپوست کیا جاسکتا تھا لیکن ہم تمہیں شایان شان موت دینا چاہتے ہیں۔ آخر تم نے امیر ارژنگ سے دشمنی مول لی ہے کسی معمولی شخص کو نہیں لگا رہا ہے۔“

تباہان کے کانوں میں افشاہ کے الفاظ گونج رہے تھے۔ تباہان سے وابستہ ہونے کے بعد وہ کئی بار یہ بات کہہ چکی تھی کہ امیر ارژنگ اپنی شکست کو فراموش نہیں کرے گا۔ ایسا کرنا ”طہرائی قبیلے“ کے کسی فرد کو آتا ہی نہیں..... وہ انتقام کے لیے جیتے ہیں اور انتقام کے لیے مرتے ہیں۔ دشمن کی بوسو گھنا اور مرنے مارنے کے لیے اس تک پہنچ جانا طہرائیوں کا صدیوں پرانا شعار ہے..... اچانک کوئی بہت وزنی چیز تباہان کی پشت سے ٹکرائی۔ وہ گھوڑے سے اچھل کر سنگناخ زمین پر گرا۔ گھٹنے اور رکتیاں پھیل گئیں۔ چہرہ

دانتوں سے ان کی چوڑی اویڑ دیتا تھا، کپڑے پھاڑ ڈالتا تھا اور نیچے گرا کر اوجہ ہوا کر دیتا تھا۔ اور اگر یہ سب کچھ نہ کر سکتا تھا تو بھاگ جاتا تھا۔ اس دیدہ دلیری کے نتائج بڑے سنگین نکلا کرتے تھے۔ کبھی اسے مادرِ زاد برہنہ کر کے چٹنی ریت پر لٹایا جاتا تھا۔ کبھی غلاعات گھول کر پانی جاتی تھی اور کبھی گھوڑوں کے پیچھے گھسیٹا جاتا تھا۔ لیکن پھر دھیرے دھیرے اسے اپنے منہ زور جذبات کو چھپانا آ گیا تھا۔ اس نے اپنی دلانگیزی کو سینے میں دفن رکھنے کا ہنر سیکھ لیا تھا۔ وہ ضبط کرتا تھا اور کاری ضرب لگانے کے لیے انتظار کرتا تھا۔ امیر ارژنگ کے سامنے بھی اس نے اپنے سینے کی اتھل پھل کو چہرے پر نمایاں نہیں ہونے دیا اور عام سے لہجے میں بولا۔

”میں نہیں سمجھتا کہ میرے ہاتھوں کوئی ایسا کام ہوا ہے جس کے لیے تم مجھے ملعون ٹھہراؤ۔“

امیر ارژنگ کے ہونٹ زہر خند انداز میں کھینچ گئے۔ ”بہت خوب۔۔۔۔۔۔ بہت ہی خوب۔۔۔۔۔۔ ایک راہ چلتی گھریلو عورت پر لگاؤ بد ڈالتا اس کے گھر میں گھسنا اسے اغوا کرنے کی کوشش میں دو افراد کی جان سے کھیلنا اور پھر اپنے عہدے و مرتبے کے بل بوتے پر اسے گھر میں ڈال لینا کیا یہ سب معصومانہ افعال ہیں؟“

تباہان نے کہا۔ ”میں نے اس عورت پر ظلم نہیں ڈھایا، اسے ظلم اور برہنہ سے بچایا ہے۔ اس نے خود شہائی دربار میں فریاد کی تھی کہ اسے امیر ارژنگ کی غلامی سے نجات دلانی جائے۔ تم نے اس پر عرصہ حیات تک کر رکھا تھا، شریک حیات کا جبر دیتا تو دور کی بات ہے تم اسے کینز کا درجہ دینے پر بھی آمادہ نہیں تھے۔ تم لوگوں نے اسے اس کے وارثوں سے جدا کیا تھا، بچوں سے جدا کیا تھا، یہاں تک کہ زندگی کی حقیر خوشیوں سے بھی جدا کر رکھا تھا، آج وہ خوش ہے اور زندگی کی آخری سانس تک میرا ساتھ دیتا چاہتی ہے۔“

تباہان کے کلمات نے ارژنگ کی جلتی پر تیل کا کام کیا۔ وہ غرا کر بولا۔ ”لے آؤ اس بد بخت کو اوپر۔۔۔۔۔۔ یہ جتنی دیر زندہ ہے ہمارے پرکھوں کی زمین پر بوجھ ہے۔“

نیزہ برداروں نے تباہان کے شرابور جسم کو تیز دھار انیوں سے خون کی بوتلے دیئے اور ارژنگ گھوڑے پر بیٹھا بیٹھا اس کی گردن کی رسی کھینچنے لگا۔ تباہان لڑکھڑاتا ہوا گھوڑے کے پیچھے چل دیا۔ یہ ایک توہین آمیز سلوک تھا۔ تھوڑی سی رعایت کے ساتھ اسے ذلت ناک بھی کہا جاسکتا تھا لیکن ایسے سلوک کا نشانہ بن کر تباہان کے اندر ایک عجیب طرح کا

کسی پتھر سے ٹکرایا اور زیریں ہونٹ خون آلود ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ ہاتھ نیام تک پہنچاتا اور منہ کیچ سے بے پردہ ہو کر حملہ آوروں پر ٹوٹ پڑتا۔ کم از کم چھ نیزے اس کے جسم سے آ گئے۔

”غردار۔“ ایک نہایت ہی کرشت آواز گونجی۔ ”حرکت کی تو یونٹوں کے پاس پہنچ جاؤ گے۔“

یہ سب کچھ آٹا ٹانا ہو گیا تھا۔ درحقیقت بلندی پر کھڑے ایک شخص نے تباہان کی پشت پر ایک گول پتھر دے مارا تھا۔ اسی کے دھکے سے تباہان نیچے گرا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ خود کو سنبھالنا نصف درجن نیزوں کی انیاں اسے بوتے دینے لگی تھیں۔ یہ نجات تباہان کے لیے بے حد کٹھن تھی۔ وہ کاہن خاتم کے تعاقب میں تھا اور کاہن خاتم کا سفر معمولی نوعیت کا نہیں تھا۔ وہ کسی ایسی منزل کا راہی تھا جہاں مارشا تھی۔۔۔۔۔۔ مارشا جو تباہان کے لیے زندگی ہی کا دوسرا نام تھی۔۔۔۔۔۔ ہاں کاہن خاتم، تباہان کی زندگی کی طرف جا رہا تھا۔۔۔۔۔۔ تباہان کو بہر صورت اس کے تعاقب میں رہنا تھا۔ اس نے نگاہ اٹھا کر امیر ارژنگ کی طرف دیکھا۔ وہ چھاتی تانے کسی دیوار کی طرح تباہان کے سامنے کھڑا تھا۔ تباہان کا دل چاہا کہ وہ اٹھے اور جسم و جان کی پوری قوت کے ساتھ اس دیوار سے جا ٹکرائے۔۔۔۔۔۔ اس سبک راہ کو پاش پاش کر ڈالے جو خاتم اور اس کے درمیان حائل ہو گیا تھا۔۔۔۔۔۔ اس نے اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن ابھی جسم کو جنبش ہی دی تھی کہ گردن اور چھاتی پر نیزوں کا دباؤ جان لیوا ہو گیا۔ دو مقابل اسے ذرا بھی رعایت دینے کو تیار نہ تھے۔ غالباً ان کے ذہنوں میں یہ بات بٹھا دی گئی تھی کہ وہ پوری طرح چوکس رہیں اور خطرہ محسوس ہوتے ہی اسے چھینی کر ڈالیں۔۔۔۔۔۔ تباہان دل مسوس کر رہ گیا۔ امیر ارژنگ نے گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے ایک رسی اچھالی۔ رسی کے سرے پر پھندا تھا جو چکرا کر تباہان کی گردن میں آ پھنسا۔ ”چل اٹھ غلام زادے!“ ارژنگ کرچل۔ ”اگر مقدونوں نے تیری اصل جانتے ہوئے بھی تجھے سرداری دی ہے تو ان سے بڑا بیوقوف اور کوئی نہیں۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے تھا رگوں میں ”نکم ذات“ خون ہو تو سرداری اور مرجہ بھی کسی کو قابلِ عزت نہیں بنا سکتا۔“

”غلام زادے“ کے خطاب نے تباہان کے دماغ میں چنگاریاں سی بھردیں۔ ایسے موقعوں پر اس کی یہی کیفیت ہوا کرتی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ شروع شروع میں وہ اس کیفیت کو چھپا نہیں سکتا تھا۔ پھر کر ”آقا زادوں“ پر جا پڑتا تھا، کسی وحشی جانور کی طرح

بیٹھا بیٹھا غضب جاگ اٹھا تھا۔ ایک سفلی سی رگ و پے میں دوڑنے لگتی تھی اور وہ کوئی خونی تماشہ دکھانے کے لیے پوری طرح تیار ہو جاتا تھا۔ امیر ارڈنگ اسے گھوڑے کے پیچھے گھسیٹا اور کھینچتا ہوا بلندی پر لے آیا۔ بارش کی طوفانی بوچھاڑوں میں جڑ اور اخروٹ کے درخت خاموش کھڑے تھے۔ ان درختوں کے درمیان عمیق کھائیاں منہ کھولے ہوئے تھیں اور چٹانوں کے سائے معمول سے زیادہ ہیبت ناک دکھائی دیتے تھے۔ یکایک زور سے بجلی چمکی۔ تاریک آسمان پر برقی شاخوں کا جال سا بچھ گیا۔ اس روشنی میں تہاں نے اپنے سامنے ایک غار کا دہانہ دیکھا۔ دہانہ دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ غار کشادہ ہے اور دور تک چلا گیا ہے۔ دہانے پر چند گھوڑے بھی بندھے ہوئے تھے جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ اندر تین یا چار افراد اور موجود ہیں۔ جونہی تہاں نیزہ برداروں کے ساتھ اندر داخل ہوا تیز بارش اور برفانی ہوا کی کٹ سے نجات مل گئی۔ غار میں کچھ فاصلے پر روشنی ہو رہی تھی اور چند سائے متحرک تھے۔ کوئی شخص مدہم خروں میں ایک بانسری نما ساز بجا رہا تھا۔ اس ساز کی دھن غار میں ایک سرلی گونج سی پیدا کرتی تھی لیکن جس آواز نے تہاں کو چونکایا اور پوری طرح اپنی طرف متوجہ کر لیا وہ ایک چیخ تھی جو کہیں قریب سے رہ رہ کر بلند ہوتی تھی اور غار میں دور تک گونج جاتی تھی..... صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ یہاں کسی شخص کو دردناک عذاب سے دوچار کیا جا رہا ہے۔

جونہی تہاں 'امیر ارڈنگ کے پیچھے چلا آگ کی جانب بڑھا وہاں بیٹھے تین افراد میں سے دو مذکورہ کھڑے ہو گئے لیکن تیسرا بدستور ساز بجا رہا۔ اس کا رخ مخالف سمت میں تھا۔ تہاں نے دیکھا یہاں موجود تینوں افراد کے کانوں میں بھی دھات کے باریک جھلے چمک رہے ہیں۔ غار میں زندگی بخش حرارت تھی اور اس شخص سے ہونے والے دیرانے میں گھر جیسے ماحول کا احساس ہوتا تھا۔ قریب ہی کہیں گوشت بھونا جا رہا تھا یا کباب بنائے جا رہے تھے۔ شراب اور گوشت کی مہک 'مدہم' روشنی اور موسیقی کی تانوں میں یوں گھل مل گئی تھی کہ تہاں کو امتیاز کے بیچ گھروں کی یاد آگئی جہاں حسین خوش نما عورتیں خوش پوش مردوں سے قدم ملا کر ناچتی تھیں 'شراب کے دور چلتے تھے' لذیذ کھانے کھائے جاتے تھے اور سردی میں ٹھہرے ہوئے فاتحہ زدہ بچے کھڑکیوں سے یہ منظر دیکھ کر آہیں بھرتے تھے۔ تہاں کو لگا جیسے اس غار میں سب کچھ امتیاز کے بیچ گھر جیسا ہے سوائے اس بیچ کے جو رہ رہ کر غار کے تاریک حصے سے ابھرتی تھی اور جسم و جال کو دبلا جاتی تھی۔ آخر کون شخص تھا وہاں اور اس پر کیا گزر رہی تھی؟ تہاں یہی سوچ رہا تھا جب اسے دھکیل کر فرش پر گرا

دیا گیا پھر دو پہلوں نما افراد نے بڑی چال کدستی سے اس کے پاؤں رسی میں بکڑ دیئے۔ بعد ازاں ہاتھوں کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا۔ اس کارروائی کے دوران نیزہ بردار پوری طرح چوکس کھڑے رہے۔ وہ جیسے پلک جھپکنے کا خطرہ بھی مول نہیں لے رہے تھے..... تہاں کی آنکھیں اب قرب و جوار کو اچھی طرح دیکھنے کے قائل ہو گئی تھیں۔ اسے خود سے دس پندرہ قدم کے فاصلے پر ایک خوفناک منظر دکھائی دیا۔ ایک شخص غار کی چھت سے اٹنا لٹکا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر صرف ایک لٹکوت تھا اور ہاتھ پشت سے بندھے ہوئے تھے۔ اس کے سر کے عین نیچے پتھروں کی ایک عارضی انجمیٹھی میں بست سے انگارے دبک رہے تھے۔ آگ کی دھبے ہوئی زبان لپک لپک کر اس شخص کے سر کو چھونے کی کوشش کر رہی تھی جیسے وہ آگ نہ ہو کوئی ناگن ہو اور اپنی زہم پر اچھل کر شکار کو ڈسنا چاہ رہی ہو۔ بد قسمت شخص کا چہرہ انگاروں سے اتنا بلند تھا کہ وہ نہ تو جھل کر کباب ہو سکتا تھا اور نہ چین پا سکتا تھا۔ وہ ایک دھیمی آج پر پک رہا تھا اور دھیمے وقتے سے کرناک آواز میں چیخ اٹھتا تھا۔ اب تہاں پر انکشاف ہو رہا تھا کہ غار میں بجلی ہوئی سوختہ گوشت کی مہک یہ حقیقت یہی خوفناک بو تھی۔

شب کا باقی حصہ تہاں نے یہی پڑھول چھینیں سنتے ہوئے گزار دیا۔ ان چیزوں کو سب فراہم کرنے کے لیے وہ آوازیں اور بھی تھیں 'ایک بارش کی آواز جو مسلسل غار کے دہانے پر برس رہی تھی اور دوسری بانسری کی آواز جو الاؤ کے قریب بیٹھا ہوا ایک شخص پورے اٹھناک سے بجا رہا تھا۔ نہ جانے کیوں تہاں کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اس بانسری کا تعلق اس سزا سے ہے جو اٹنا لٹکا ہوا شخص بھگت رہا ہے۔ کوئی ربط ہے اس چیخ اور اس ساز میں۔ تہاں کو یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ امیر ارڈنگ اور اس کے ساتھیوں کو کسی کا انتظار ہے۔ شاید تہاں کو کسی کرناک عذاب میں مبتلا کرنے سے پہلے وہ کسی اور تماشائی کو بھی یہاں دیکھنا چاہتے تھے۔

یہ تماشائی اگلے روز دن چڑھے غار میں پہنچا۔ غار کے دہانے پر گھوڑوں کی ٹائیں گونجیں پھر چند آوازیں آئیں اور ایک بوڑھا شخص دو دوسرے افراد کے ہمراہ اندر آ گیا۔ اسے پہچاننے میں تہاں کو دیر نہیں لگی۔ یہ امیر ارڈنگ کا باپ تھا۔ وہی مضمی بوڑھا جو افشاہدہ کو بسوکتا تھا اور جس نے حویلی میں مشتعل افراد کو تہاں کے قتل سے روکا تھا..... لیکن آج اس کی آنکھوں میں بھی تہاں کے لیے وحشت اور بے رحمی کے سا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ وہ جلتی نظروں سے تہاں کو گھور رہا تھا اور فرہ غضب سے اس کا

سر دھیرے دھیرے کانپتا چلا جا رہا تھا۔

”کاش“ میرے بس میں ہو اور میں تمہیں دس بار زندہ کر کے مار سکوں۔“ وہ بھونکا۔

”لیکن میرا قصور؟“ تابان نے کمال اطمینان سے پوچھا۔

”تمہارا کوئی قصور نہیں..... قصور اس ناپاک خون کا ہے جو تمہاری رگوں میں دوڑتا ہے۔“ وہ زہر خند لہجے میں بولا۔ ”بد قسمت انسان! تو نے میری عزت پر ہاتھ نہیں ڈالا پورے قہیلے کی غیرت کو لاکرا ہے۔“

تایان نے مرعوب ہوئے بغیر کہا۔ ”غالباً آپ اس لڑکی کے لیے غمزدہ ہیں جسے آپ ہو کہتے تھے۔۔۔۔۔۔ لیکن محترم۔۔۔۔۔۔ وہ آپ کی بہو نہیں تھی۔ جب آپ کا بیٹا اسے بیوی نہیں سمجھتا تھا تو آپ اسے کیسے یہ رتبہ دے سکتے ہیں۔ وہ آپ کے فرزند کی ذر خرید لوٹتی تھی۔ آپ کی چھت تلے اس پر مظالم توڑے جا رہے تھے۔ غرضہ حیات تنگ کیا جا رہا تھا اس۔۔۔۔۔۔“

”قزاقی“ کہتے ”سو“..... ”ارڈنگ کے منہ سے گالیوں کی بوچھاڑ نکلے اور وہ بے قابو ہو کر تابان پر ٹوٹ پڑا۔ اسے ٹھوکروں اور مکوں سے مارا پھر گریبان سے پکڑ کر پتھر کی یوار کے ساتھ بچ دیا۔ تابان کی منگلیں کسی ہوئی تھیں وہ لڑکھڑاکر اٹکے لٹکے ہوئے معتب کے قریب جاگرا۔ وہ شخص رات بھر جان کنی کی اذیت سے گزر کر اب قریب المرگ تھا۔ اس کے حلق سے آواز نکلتا اب بند ہو چکی تھی۔ بس کسی وقت ایک خروارہٹ سی ابھرتی تھی اور پتہ دیتی تھی کہ تار مار زندگی کی کچھ دھجیاں اب اذیت کے کانٹوں میں الجھی ہوئی تھیں۔ دن کی روشنی میں اس کا چہرہ دیکھ کر تابان جیسا شخص بھی لرز گیا۔ سر کے بال جھلس چکے تھے۔ چہرہ دھیمی آج پک کر سیاہی مائل سرخ ہو گیا تھا اور جگہ جگہ آبلے پڑ چکے تھے۔ ایک رخسار سے چربی ہمہ ہمہ کر نیچے انگاروں پر گرتی تھی اور آگ کے اندر سسکیاں سی گونجنے لگتی تھیں۔ تابان جانتا تھا کہ تھوڑی دیر کے بعد اسے بھی اس آگ پر اٹا لٹایا جائے گا۔ وہ دھیمی آج پر ہو گا۔ زندگی اس کے منہ ناک اور کانوں سے ہمہ کر قطرہ قطرہ آگ پر گرے گی اور اس ویران غار میں چیخوں اور قہقروں کے درمیان طہرام قبیلے کے افراد کا انتقام پایہ تکمیل کو پہنچ جائے گا۔ دو افراد نے تابان کو سنگلاخ زمین پر تھمیت کر دوبارہ دیوار کے سارے بٹھا دیا۔ امیر ارڈنگ کے اشارے پر ایک جلاز صورت نیم برہنہ شخص آگے بڑھا اور جاں بلب شخص کے نیچے جلتی ہوئی آگ کو

اپنے نیزے سے کرید لے گا۔ بڑے بڑے انگارے متحرک ہونے اور شعلوں کی لولہند ہو جی۔ اب یہ شعلے بد قسمت شخص کے سر کو چھونے لگے تھے۔ اس کے نیم جان بہم میں سر تپا ایک جھر جھری نمودار ہوئی۔ چہرے اور گردن کے مساموں سے اب ایک تیل سا ہنسنے لگا تھا۔ آگ کے قریب بیٹھا ہوا سارھو نما شخص بڑے وجد میں ہانسی بجا رہا تھا۔ یہ ہانسی دراصل ایک انسانی ناگ کی ہڈی تھی۔ اس میں مناسب جھکوں پر سور اتر کے ہانسی کی شکل دے دی گئی تھی..... دیکھتے ہی دیکھتے بد نصیب شخص جان کنی کے مذاب سے نجات پا گیا۔ اب اس کی بے جان لاش سر کے بل جھول رہی تھی اور سر دیکھتے کوکلوں کی آج پر ترخ رہا تھا۔ امیر ارثرنگ کی ہدایت پر دو افراد آگے بڑھے اور انہوں نے مرنے والے کو چھت سے اتار لیا۔ جب اسے فرش پر سیدھا لایا گیا تو تابان بری طرح چونک اٹھا۔ اسے پہلے ہی کچھ شبہ سا ہوا تھا لیکن اب اس نے متوکل کو ٹھیک سے دیکھ لیا تو پہچان لیا..... اس کی رگوں میں خون کھول اٹھا تھا۔ اس کے سامنے پڑا ہوا مسخ شدہ چہرہ سکندر کے ذاتی دستے کے سالار بنیاز کا تھا۔ بنیاز وہی شخص تھا جس نے پہلی کارنس میں تابان کی جان بچائی تھی۔ جب تابان 'افشاہ' سے ملنے امیر ارثرنگ کی حویلی میں گھسا تھا اور اہل خانہ نے اسے گھیر لیا تھا تو بنیاز ہی چھاپے مار سپاہیوں کے ساتھ اندر داخل ہوا تھا اور اس نے تابان کو حویلی سے نکالا تھا۔ یقیناً اس کارروائی کی پاداش میں وہ آج اپنے ناقابل شناخت چہرے کے ساتھ اس سنگلاخ فرش پر پڑا تھا۔ تابان کو امیر ارثرنگ کے لیے ہاتھوں کا اعتراف کرنا پڑا۔ یہ دیدہ دلیری کی انتہا تھی کہ وہ جذبہ اشتقام کی تحکین کے لیے اپنے شکار کو مقدونوی فوج کے پڑاؤ سے اٹھا لایا تھا۔ معلوم نہیں وہ یہ کام کیسے کر سکا تھا، بہر حال یہ کام ہو چکا تھا اور سکندر کے ذاتی دستے کے سالار کی لاش عبرت نگاہ بنی اس دوران غار میں پڑی تھی۔

جہاں چکا تھا کہ تابان نے دستہ سالار کو پہچان لیا ہے۔ بڑے زہریلے لہجے میں بولا۔

”اے دوست کو پہچان کر یقیناً تمہیں خوشی ہوگی ہوگی۔“
ایک دوسرے شخص نے اقمہ دیا۔ ”ہم دیرینہ سے ملاقات کس کے لیے باعث
صرت نہیں ہوئی۔“

مرست میں ہوئی۔
ارژنگ کی آنکھوں میں ہفانہ چمک نمایاں ہونے لگی۔ غرا کر بولا۔ ”دیکھ لے
غلام زادے اس شخص نے صرف تیری معاونت کی تھی۔ اب اس کے انجام کو سامنے رکھ

غضب کی رفتار سے سفر کرتے ہوئے پہلی کار میں کی طرف بڑھنے لگے۔

ہوشمند زور شور سے اپنے نکیہ کلام کا استعمال کر رہا تھا اور مقبوضہ علاقوں کا احوال کھول کھول کر بیان کرتا چلا جا رہا تھا۔ آخر میں اس نے سفر کا اختتامی احوال بتایا۔ اس کی باتوں سے پتہ چلا کہ وہ اور اس کے بیٹوں ساتھی کل شام کو وہ لام کے نواح میں پہنچ چکے تھے اور انہیں توقع تھی کہ اندھیرا پھیلنے سے پہلے پہلے سکندری فوج کے پڑاؤ میں داخل ہو جائیں گے لیکن پھر اندھیرا اور طوفان ایک ساتھ آیا۔ تند و تیز موسم میں وہ راستہ بھٹک کر اس طرف آ گئے۔ رات ایک چٹان کے سائبان تلے گزار دی۔ اب موسم بہتر ہونے کا انتظار کر رہے تھے کہ امیر ارژنگ کے ساتھیوں سے مل بیٹھیں ہو گئی۔

امیر ارژنگ کرید کرید کر ہوشمند سے اپنے مطلب کے سوال پوچھنے لگا۔ وہ مقبوضہ بستیوں، راستوں اور مقدونوی سپاہ کی آمد و رفت کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ غار سے باہر بدستور بادل گرتے رہے اور بارش برسی رہی۔ غار کے اندر تابان چھت سے لگا رہا اور ارژنگ کے ساتھی مسافر و مینا سے دل ہلاتے رہے۔ شواہد سے اندازہ ہوتا تھا کہ ابھی امیر ارژنگ کو کچھ اور لوگوں کا انتظار ہے۔ اب معلوم نہیں یہ نئے آنے والے تماشائی تھے یا تماش۔ اگر تماشائی تھے تو ان کا تعلق یقیناً امیر ارژنگ سے تھا اور اگر تماش تھے تو وہ سکندر کے ذاتی دستے کے مزید محافظ ہو سکتے تھے۔ اس تذبذب میں رات ہو گئی۔ سر کے بل جھولتے جھولتے تابان کا نچلا دھڑکن ہو چکا تھا۔ آنکھوں میں خون جمع ہو گیا تھا اور کانوں میں پیسے مسلسل بیٹھیاں بج رہی تھیں۔ اس نے اپنے ہاتھوں کو لگاتار متحرک رکھا تھا۔ اب وہ بندش کو ایسی حالت میں لا چکا تھا کہ بوقت ضرورت معمولی سی کوشش سے اپنی کلایاں آزاد کر سکتا تھا۔ اندھیرا پھیلنے ہی اس نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ وہ امیر ارژنگ کو خطرناک نتائج کی دھمکیاں دینے لگا اور یہ واضح کرنے لگا کہ وہ عافیت چاہتا ہے تو اسے چھوڑ دے۔ اس چیخ و پکار کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا کہ ہوشمند اس کی یہاں موجودگی سے آگاہ ہو جائے۔ ہوشمند کی اس غار میں موجودگی تابان کے لیے جہاں مسرت بخش تھی وہاں نہایت خوش آئند بھی تھی۔ اسے معلوم تھا ہوشمند اس صورت حال سے عمدہ برآ ہوئے کے لیے کوئی موزوں رست تلاش کر لے گا۔

تابان اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اسے ہوشمند کی آواز سنائی دی۔ وہ ارژنگ کے والد سے پوچھ رہا تھا۔ ”محترم! یہ کون شخص ہے؟“

ارژنگ کا والد بولا۔ ”ہے ایک بد بخت۔ شاہ مقدونیہ سکندر کا معتب ہے۔“

”کیا میں اسے دیکھ سکتا ہوں؟“ ہوشمند نے دریافت کیا۔

”ہاں دیکھ لو۔“ بوزھے کے بھائے امیر ارژنگ نے خود جواب دیا۔

تابان کو قدموں کی آہستہ سنائی دی۔ پھر اس نے ہوشمند کا لنگڑا ہوا ہونا دیکھا وہ اس کی جانب بڑھ رہا تھا۔ یہ عجیب ملاقات تھی۔ وہ ایک دوسرے کو صرف دیکھ سکتے تھے۔ بات کر سکتے تھے نہ بعض گہیر ہو سکتے تھے۔ نہ ایک دوسرے کے رخسار چوم سکتے تھے۔ کتنی طویل جدائی تھی جس کے بعد یہ گھڑی دیکھی تھی انہوں نے۔ سکوپے لاس کے قائم مقام فرمانروا کے محل میں تابان نے ہوشمند کو ایسی حالت میں پایا تھا کہ اس کے سینے میں ایک خنجر بوس تھا اور چہرے کی خوفناک زردی اس کی موت کا اعلان کر رہی تھی۔ تابان پیش کی حالت میں محل سے نکلا تھا اور شمال کے قنائب میں روانہ ہو گیا تھا۔ پھر راستے میں زہریلے دودھ نے اثر دکھانا شروع کیا تھا اور وہ گھوڑے سے گر کر دینا و مینا سے بے خبر ہو گیا تھا۔ اس دن سے آج تک کم و بیش ڈیڑھ برس گزر چکا تھا۔ بے شمار شب و روز تابان نے ہوشمند کے بارے میں سوچتے ہوئے گزارے تھے۔ اس کی گفتگوں باتیں یاد کی تھیں اس کی پُر خلوص محبت کا تصور کیا تھا۔

ہوشمند کی آنکھوں میں بے پناہ حیرت تھی۔ ہونٹوں پر سوال پھر کر رہے تھے لیکن وہ جانتا تھا اسے خاموش رہنا ہے۔ موت کے اس گہرے میں خاموشی ہی ان کی سلامتی کی ضامن تھی۔ وہ کچھ دیر تابان کو دیکھتے رہنے کے بعد واپس چلا گیا۔ آگ کے گرد بیٹھے افراد کے قہقہے غار میں گونجتے رہے۔ وہ اس گرتے برستے موسم سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ یہ موسم ان کے لیے یوں بھی سازگار تھا کہ اس غار کی طرف کسی انہیبی کے آنے کا امکان نہیں رہا تھا۔ بس وہ تھے اور ان کا قیدی تھا جسے کرناک موت سے دوچار کرنے کے لیے وہ پوری طرح آزاد تھے۔ ان کی گفتگو سے تابان کو اندازہ ہوا تھا کہ جس شخص کا انتظار ہو رہا ہے وہ ابھی پہنچا نہیں۔ اس کی آمد میں ہونے والی تاخیر ارژنگ کے لیے کچھ زیادہ ہی پریشان کن تھی۔ وہ بار بار اندھ کر شلنے لگتا تھا۔ کبھی دہانے کی طرف نکل جاتا تھا کبھی آگ کے سامنے رک کر شعلوں کو گھورنے لگتا تھا۔ ایسے میں آگ کا ٹکس اس کے چہرے پر پڑتا تھا اور وہ خود بھی ایک شعلہ نظر آنے لگتا تھا۔ انسانی ہڈی کا بانسری نما ساز آج بکسر خاموش تھا۔ شاید اس ساز کو اس وقت بجنا تھا جب تابان کا کاسہ سر شعلوں پر رکھا جاتا۔

شب آہستہ آہستہ ریگتی رہی۔ پانی کے جلتے پر اندھیرا رقصا رہا۔ یہاں تک کہ امیر ارژنگ کی بے قراری عروج پر پہنچ گئی۔ اس نے اپنے چار ساتھی ہمراہ لئے اور وہ

پر اوندھالٹایا اور ان کے ہاتھ پشت پر باندھ دیے۔ اس مقصد کے لیے وہی رسی استعمال ہوئی تھی جس کے ذریعے تباہان دوپہر سے اٹا لٹکا ہوا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد دہانے پر گھوڑوں کی ٹانگیں گونجنے لگیں۔ امیر ارژنگ اور اس کے ساتھی واپس آگئے تھے۔ تباہان اور ہوشمند ان کے استقبال کے لیے ذہنی طور پر تیار تھے۔ اپنے مبینہ ساتھیوں سمیت وہ تیرکمان منہوال کر مناسب جگہوں پر چھپ گئے۔ جو نبی ارژنگ اور اس کے ساتھی اپنی موی چادریں بھاڑتے اور آپس میں کنگھو کرتے اندر داخل ہوئے تباہان نے لگا کر انہیں ہتھیار پھینکنے کا حکم دیا۔ ان سب پر جیسے برق گر پڑی۔ امیر ارژنگ نے دھیان سے غار کا جائزہ لیا۔ اس کی نگاہ سرمدیہ لاشوں پر پڑی پھر اس نے چونک کر پھست کی طرف دیکھا۔۔۔۔۔۔ ایک ہی ساعت میں وہ حالات کی سبب سے آگاہ ہو گیا۔ اس کے دو ساتھیوں نے تیزی سے گھوڑوں پر کھانا چاہیں لیکن سنسناتے تیران سے زیادہ تیز تھے۔ ایک کی گردن اور دوسرے کی چھاتی نشانہ بنی۔ دونوں اچھل کر الاؤ کے پاس گئے اور پڑنے لگے۔ امیر ارژنگ کا گھوڑا اس کی جانب بڑھا ہوا ہاتھ ساکت رہ گیا۔

”خبردار!“ تباہان کی نہایت سفاک آواز نے ماحول کو جھنجھوڑ دیا۔ ”اپنے قدموں پر کھڑے رہو اور اپنے ہتھیار کھول کر نیچے پھینک دو۔“ کچھ ایسی وحشت تھی اس کی لگا کر میں کہ ارژنگ اور اس کے چاروں ساتھی مسموت رہ گئے۔ ان کی نگاہیں اپنے جاں بلب ساتھیوں پر جمی تھیں۔ چند لمحے پہلے وہ ان کے شانہ بشانہ چلے آ رہے تھے لیکن اب خاک و خون میں لتھڑے ہوئے آخری ہچکائی لے رہے تھے امیر ارژنگ کا چہرہ سروسوں کی طرح زرد ہو گیا۔ اس کا ہاتھ بہ آہستگی اپنی کمر کی طرف بڑھا اور انگوٹھیوں سے بھی ہوئی انگلیاں نیام کا تمسہ کھولنے لگیں۔

ذرا ہی دیر میں ارژنگ اپنے ساتھیوں سمیت غیر مسلح ہو چکا تھا۔ ہوشمند نے بڑی پھرتی سے ان کے ہاتھ بھی رسیوں سے باندھ دیئے اور ان سب کو ایک قطار میں کھڑا کر دیا۔ ارژنگ قبر آلود نگاہوں سے ہوشمند کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ یہ پانسہ ہوشمند کے سبب ہی پلٹ سکا ہے۔

امیر ارژنگ تھوڑی دیر قبل غار سے نکلا تھا تو اس کے ساتھ چار افراد تھے لیکن اب واپس آیا تو چھ تھے۔ اس بات کا امکان تھا کہ یہ دونوں زائد افراد وہ ہیں جو افشاہدہ کو یہاں لانے کے ذمہ دار تھے۔ ان میں سے ایک شخص کی قبض ادھڑی ہوئی تھی اور دوسرے کے چہرے پر خراشیں نظر آ رہی تھیں، لگتا تھا وہ دونوں کسی ہاتھ پائی میں شریک

رہے ہیں۔ تباہان نے ان دونوں افراد کو علیحدہ کیا اور غار سے باہر لے آیا۔۔۔۔۔۔ اب بارش ختم ہو چکی تھی۔ تیز ہوا بادلوں کو تتر بتر کر کے چاند کی کرنوں کو راست دے رہی تھی۔ رات کا تیسرا سہر قریباً ختم ہونے والا تھا۔ تباہان نے ان دونوں افراد سے افشاہدہ کے حلق پوچھا۔ پہلے تو وہ پس و پیش سے کام لیتے رہے لیکن جب انہیں اندازہ ہوا کہ پوچھنے والے کے سر پر خون سوار ہے اور وہ انہیں راسی عدم کرنے میں زیادہ ہچکچاہٹ سے کام نہیں لے گا تو انہوں نے زبان کھولنے میں غایت جانی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ چند برس طرامیوں کی طرح پچھلے ایک ماہ سے بطور رضاکار سکندر کے لشکر میں موجود تھے۔ امیر ارژنگ کی ہدایت پر آج وہ افشاہدہ کو پڑاؤ سے نکالنے کی کوشش میں تھے کہ محللوں کو ان پر شک ہو۔ محافلوں نے انہیں گھیر کر پکڑنا چاہا لیکن وہ بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ پڑاؤ سے کافی دور آنے کے بعد انہیں پتہ چل سکا کہ ان کا تیسرا ساتھی گرفتار ہو گیا ہے۔

صورت حال اب واضح ہو چکی تھی۔ تباہان نے امیر ارژنگ سمیت تمام قیدیوں کو غار سے نکالا اور بلندی کی طرف لے چلا۔ سب کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے، وہ ایک قطار میں چل رہے تھے۔ عقب سے تباہان اور ہوشمند نے انہیں تیروں کی زد میں لے رکھا تھا۔ ہوشمند کے تین ساتھی اس قطار کے دائیں بائیں چل رہے تھے۔ کوئی ایک سٹیڈیم فاصلہ طے کر کے وہ چوٹی پر پہنچ گئے۔ یہاں ہوا بہت تیز تھی اور بلند و بالا درخت وہاں میں جھوم رہے تھے۔ بادلوں کا زور اچانک ہی ٹوٹ گیا تھا بس کیس کیس نیلگوں نکلنے تیرتے رہ گئے تھے۔ صاف آسمان پر چاند تارے قندیلوں کی طرح روشن تھے۔ چوٹی کے عقب میں گہری کھائی تھی۔ کھائی کی تہ میں پہاڑی نالے کا جھاگ دار پانی سفید اڑدھسے کی طرح تل کھا رہا تھا۔ چاند آج کئی راتوں کے بعد نکلا تھا لیکن ایسی آب و تاب سے لگا تھا کہ رات میں دن کا سماں بندھ گیا تھا۔ اس کھائی سے آگے بہت فاصلے پر پہاڑوں کی پیالہ نما گود میں ان گنت جگنو ٹمٹا رہے تھے۔ یہ سکندری فوج کا پڑاؤ تھا۔ وہ فوج جو ایک سیلاب بے دریاں تھی اور بہت جلد بلند و بالا لہری طرح ایرانی پانیہ تخت کی اونچی دیواروں سے کمرانے والی تھی۔

تباہان نے نیچے گہرائی میں جھانک پھر ایک قیدی پر تیرکمان تانا اور اسے چھلانگ لگانے کا حکم دیا۔ قیدی کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ تباہان کا لہجہ خوفناک حد تک فیصلہ کن تھا۔ قیدی خشک ہونٹوں پر زبان بھیرنے لگا۔ اس کی نگاہیں آہنی تیر پر مرکوز

تھیں جو اس کے سینے کی جانب تباہا تھا۔ یہ دو انگلی موٹا دور مار تیر تھا۔ اسے چھوڑنے کے لیے ہند کی ساخت ایک کڑی کمان استعمال ہوتی تھی۔ تباہان نے اس کمان کے زہ کو دور تک کھینچ رکھا تھا۔ اس کی نگاہیں قیدی کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ وہ پتہ کارا۔

"چھلانگ لگا بد بخت۔ ورنہ یہ تیر کھوپڑی توڑ ڈالے گا۔"

قیدی نے وحشت زدہ نظروں سے امیر ارژنگ کی طرف دیکھا۔ امیر ارژنگ کا اپنا چہرہ برباد کھنڈر کا منظر پیش کر رہا تھا۔ وہ اپنے کارندے کو کیا حوصلہ دیتا۔ یکایک قیدی کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ اپنی مرداگی اور شجاعت کو خیاد کہہ کر لمبی آواز میں بولا۔

"مم..... میں مرنا نہیں چاہتا..... میں بے گناہ ہوں، میرا کوئی جرم نہیں۔ میں امیر کا تنخواہ دار ملازم ہوں۔"

تباہان نے جیسے اس کی فریاد سنی ہی نہیں۔ وہ خطرناک لمبے میں بولا۔ "میں کہتا ہوں چھلانگ لگاؤ، ورنہ میں تیر چھوڑ رہا ہوں۔"

قیدی نے کھائی کی طرف دیکھا، تب ایک بار پھر فریاد کرنے کے لیے منہ کھولا۔ اسی وقت تیر سرسرایا اور کھلے ہوئے منہ سے گزر کر قیدی کے تالو میں لگا۔ کھوپڑی کی ہڈی ٹوٹ گئی اور سر کے عقبی جانب سے تیر کا ایک بالشت سرا باہر نکل آیا۔ قیدی ایک آہ کے ساتھ پتھری زمین پر گر اور ترپنے لگا۔

"تم چھلانگ لگاؤ۔" تباہان نے دوسرے قیدی کو حکم دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے کمان پر دو سرا تیر چڑھالیا۔

یہ قیدی پڑاؤ میں تباہان کا ذاتی ملازم تھا۔ وہ ترپ کر تباہان کے قدموں میں گر گیا۔

"مجھے..... مجھے معاف کر دو سردار۔ میری جان بخشی کرو۔ میں شرمندہ ہوں..... بہت شرمسار ہوں۔"

"چھلانگ لگاؤ۔" تباہان نے بے لگ آواز میں اپنا حکم دہرایا۔

وہ شخص مناجات کرنے کے انداز میں زمین پر اوندھا لیٹ گیا اور گھگیلنے لگا۔ تباہان نے کہل۔ "ابھی ملت ہے۔ چھلانگ لگا دو۔ ممکن ہے بچ جاؤ لیکن یہ تیر چل گیا تو تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

اس شخص نے پھر بھی سر نہیں اٹھایا۔ تباہان نے چٹکی کھولی۔ تیر اس کے سینے میں لگا اور بالشت بھر اندر کھس گیا۔ وہ اچھل کر تیرپا اور ایک جھٹکے سے ساکت ہو گیا۔

"تم چھلانگ لگاؤ۔" تباہان نے تیسرے قیدی کو حکم دیا۔

اپنے دو ساتھیوں کا دردناک انجام دیکھنے کے بعد یہ شخص حتیٰ فیصلے پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے ایک دہشت زدہ نگاہ تباہان کی کچی ہوئی کمان پر ڈالی۔ پھر آنکھیں کیس اور چیخ کر کھائی میں چھلانگ لگا دی۔ اس کے گرنے کی آواز دو تین لمحوں کی تاخیر سے آئی۔ تباہان کے ہونٹوں پر ایک زہرناک مسکان تھی۔ اس نے عودی کنارے پر جبک کر بیٹھے دیکھا۔ دور بھاگ اڑاتے پانی کے کنارے ہموار سطح پر ایک بے حرکت دھبہ نظر آ رہا تھا۔ تباہان دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن وہ تصور کر سکتا تھا کہ پہاڑی نالے کے کنارے خون میں لتھڑے ہوئے انسانی اعضاء بکھرے ہیں۔ اس کے کانوں میں بد نصیب دستہ سالار بنیا ز کی وہ جینیں گونج رہی تھیں جو اس نے کل شب تین پہر تک سنی تھیں۔ اس کی آہ و پکار فریادیں، التجائیں سب کچھ تباہان کے حافظے میں محفوظ تھا۔ اس گھڑی وہ بے ضرر سا تباہان کسی گناہم اندھیرے میں چھپ گیا تھا اس کی جگہ ایک سفاک بے رحم شخص نے لے لی تھی۔ یہ شخص موت کا کھلاڑی تھا۔ قضا کی بساط پر خود کو زندہ رکھنا اور دشمن کو مار دینا اس کا نصب العین تھا..... تباہان کے قاتل تیر سے ڈر کر دو مزید افراد نے نیچے چھلانگ لگا دی۔ ان میں امیر ارژنگ کا سگا بھائی اور پہلی کارئیں کا نائب ناظم امیر اعمر اس بھی تھا۔ اب ارژنگ اور اس کے باپ کے علاوہ صرف ایک شخص زندہ بچا تھا۔ یہ وہی کارندہ تھا جس نے بارش کے دوران امیر ارژنگ کے سر پر چھاتے کا سایہ کئے رکھا تھا..... وہ دیکھ چکا تھا کہ نیچے چھلانگ لگانے والوں میں سے کوئی زندہ نہیں بچا۔ لہذا اس کی باری آئی تو وہ اوندھے منہ زمین پر گر گیا اور زور زور سے رونے لگا۔ یہ گویا اپنی لاش پر ماتم نکلیں ہونے کے مترادف تھا۔ تباہان نے آگے بڑھ کر اس کی پسلیوں میں زوردار ٹھوکر لگائی۔

"چھلانگ لگاؤ۔" وہ غیر انسانی آواز میں دھاڑا۔

بد قسمت طہرائی چیخ کر سیدھا ہو گیا۔ ٹھوکر شدید تھی وہ درد سے کرا رہے تھے تباہان اپنی کمان کا زہ کھینچ چکا تھا۔ وزنی تیر کا رخ طہرائی کے سر کی طرف تھا۔ وقتاً تباہان کی نگاہ اس کے اودھ کھلے گریبان پر پڑی اور وہ چونک گیا۔ اس کے سینے پر کوئی چیز چبک رہی تھی۔ یہ ایک انگوٹھی تھی جسے سیاہ دھاگے میں پرو کر گھگھے میں آویزاں کر لیا گیا تھا۔ تباہان نے جبک کر بڑے غور سے اس طلائی انگوٹھی کو دیکھا اور اس کی رگوں میں خون کی گردش اکتا کو پہنچ گئی۔ وہ اس بیضوی انگوٹھی کو پہچانتا تھا۔ ایسی ہی ایک انگوٹھی تباہان نے اس دو شیزو کی حنائی انگلی میں دیکھی تھی جو اس ڈوئے زمین پر تباہان کے لیے محبوب ترین تھی۔ جس کے تصور سے تباہان کی راتیں مسکتی تھیں اور جس کی خوشبو سے اس کے دن

سنورتے تھے۔ وہ اس انگوٹھی کو اور اس کی مالکہ کو کیسے بھول سکتا تھا۔ یہ مارشاکی انگوٹھی تھی۔ تہان نے کمان پھینک کر دونوں ہاتھوں سے طہرائی کا گریبان تھا اور ایک جھکے سے اسے سیدھا کھڑا کر دیا۔ اس کی آنکھوں میں ہلاکی بے قراری تھی۔ وہ انگوٹھی کو گھورتے ہوئے کڑاں آواز میں بولا۔

”یہ انگشتی تم نے کہاں سے لی تھی؟“

طہرائی نے پکڑے ہوئے انداز میں انگوٹھی کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”یہ..... یہ مجھے راستے میں ملی تھی۔“

”کب موت!“ تہان کا بھرپور تپش اس کے گال پر پڑا۔ وہ لڑکھا کر کھنڈ کے کنارے پہنچ گیا۔ ”بتاؤ..... کب اور کہاں ملی یہ انگوٹھی؟“

ایک ہی تپش میں طہرائی راہ راست پر آ گیا۔ وہ ہکا کر بولا۔ ”یہ..... مجھے..... ایک لڑکی نے دی تھی۔“

”کون لڑکی؟“

”یونانی لڑکی..... وہ..... بڑی مصیبت میں گرفتار تھی۔ میں نے اس کی مدد کی تھی۔“

”یہ کب کی بات ہے؟“

”کوئی ڈیڑھ برس پہلے کی۔“

تہان چند لمبے خاموش رہا۔ اس کی سوچتی ہوئی نگاہیں طہرائی کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ آخر وہ خمیر آواز میں بولا۔ ”تمہاری جان بچ سکتی ہے..... اگر تم اس انگوٹھی کے بارے میں سب کچھ صاف صاف اگلی دو۔“

”میں سب کچھ بتا دیتا ہوں..... جو مجھے معلوم ہے میں بتا دیتا ہوں۔ مجھے زبوس دیوتا کی قسم۔ اپنے معصوم بچوں کی قسم..... میں کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ کچھ بھی نہیں.....“ طہرائی کی آنکھوں سے اشک رواں تھے۔ موت کے گھناؤنپ اندھے میں زندگی کی کرن دیکھ کر سر تپا فریاد و التجا بن گیا تھا۔ تہان اسے کچھ دیر ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھتا رہا پھر اس نے ہوشمند کو اشارہ کیا۔ ہوشمند آگے بڑھا اور اس نے طہرائی کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ ارڈنگ اور اس کا باپ اپنی جگہ ساکت و جاہل کھڑے تھے۔ چروں پر موت کی زردی تھی۔ وہ کوئی معمولی لوگ نہیں تھے۔ سفائی، خوریزی اور بے رحمی میں ان کا نام تھا۔ ان کا خاندان اپنے دشمن کو ڈھونڈ کر نیست و نابود کرنے میں

شہرت رکھتا تھا۔ لیکن اس وقت انہوں نے سفائی اور ہلاکت کا جو مظاہرہ دیکھا تھا وہ انہیں مبسوت کر گیا تھا۔ اپنے نام و نسب کے گھمنڈ میں دوسروں پر قہر توڑنے والوں کو اپنی موت یقینی نظر آنے لگی تھی تو ان کے تیور قبل رجم ہو گئے تھے۔

تہان نے تلوار کی نوک مٹھنی بوڑھے کی گردن پر رکھی اور پھکارا۔ ”جاؤ..... چلے جاؤ یہاں سے۔ مجھے تمہاری جہان سالی پر ترس آ رہا ہے۔“

بوڑھے نے سوالیہ نظروں سے تہان کی طرف دیکھا۔ ”کیا تم ہم دونوں کو چھوڑ رہے ہو؟“ اس کا اشارہ بیٹے کی طرف تھا۔

”ہاں۔“ تہان نے جواب دیا۔

”لیکن کیوں؟ ہم پر یہ مہربانی کس لیے؟“

”اس لئے کہ تم اپنے لواحقین کے سامنے جا کر انہیں اپنی بربادی کی داستان سنا سکو انہیں بتا سکو کہ تم اپنے دونوں شیع بیٹوں کو ایک ”غلام زادے“ کے ہاتھوں کھو آئے ہو۔ مجھے یقین ہے امیر ارڈنگ اور امیر اعراش کے بغیر جب تم نجیوط الحواس عورت کی طرح لڑھکتے ہوئے اپنے گھر کی ڈیوڑھی میں پہنچو گے تو بڑا دلچسپ منظر ہوگا۔“

”کیا مطلب؟“ بوڑھا کراہا۔ ”تم..... تم ارڈنگ کو چھوڑنے کا وعدہ کر چکے ہو۔“

تہان بولا۔ ”چھوڑنے کا وعدہ کیا ہے۔ ساتھ بھیجے کا وعدہ نہیں کیا۔ یہ برفانی ٹٹو میرے ساتھ جائے گا..... اگر میرے بعد یہاں اشتادہ کے ساتھ کچھ ہوا تو اس ٹٹو کی موت سالار بنیاز کی موت سے کہیں دردناک ہوگی۔“

بوڑھا منہ کھول کر رہ گیا۔ ارڈنگ اب تک بہت مشکل سے برداشت کر رہا تھا۔ یہ بے بسی کی انتہا تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے جاں نثار ساتھی حسرت ناک موت سے دو چار ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ اس کا نوجوان سگ بھائی چوٹی سے کود کر پارہ پارہ ہو گیا تھا۔ وہ خود مجرم کی طرح کھڑا تھا اور باپ کے سامنے ”برفانی ٹٹو“ جیسے خطابات سے نوازا جا رہا تھا۔ چند لمحوں کے لیے وہ جیسے غصے سے پاگل ہو گیا۔ اس نے تڑپ کر تہان پر حملہ کرنا چاہا لیکن عقب میں کھڑا رضا کار پوری طرح چوکس تھا۔ اس نے اپنی کمان ارڈنگ کی گردن میں ڈالی اور اسے پیچھے کی طرف بھیج دی۔ وہ توازن کھو کر چھروں پر گر رہا تھا۔ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ لہذا چہرہ زمین سے ٹکرایا اور لولہاں ہو گیا۔

☆-----☆

غار میں واپس پہنچ کر تابان اور ہوشمند نے سب سے پہلے لاشوں کو ٹھکانے لگایا۔
دست سالار بنیاز سمیت یہ پانچ لاشیں تھیں۔ بنیاز کے علاوہ باقی ساری لاشیں اٹھارہ تاریک
درختوں میں پھینک دی گئیں۔ بنیاز کی لاش کو وہ کنبوں میں لپیٹ کر ایک کوتا گھوڑے پر
رکھ دیا گیا۔ ہوشمند نے اپنے تین ساتھیوں سے کہا کہ وہ اس لاش کے ساتھ پڑاؤ میں
پہنچ جائیں اور سالار اعظم یا کسی دوسرے ذمہ دار سالار سے ملاقات کر کے تمام حالات
تفصیل سے بتائیں۔ تابان نے انہیں سالار اعظم کے نام ایک خط بھی تحریر کر دیا۔

یہ لوگ رخصت ہو گئے تو تابان اور ہوشمند نے خود بھی رخت سفر باندھا۔ تابان
نے ہوشمند کو ضروری تفصیلات بتا دی تھیں اور اسے سمجھا دیا تھا کہ ان کا جلد از جلد
روانہ ہونا بے حد ضروری ہے۔ وہ جتنی دیر کریں گے کہیں خاتم ان سے اتفاقی دور چلا
جائے گا اور جوں جوں یہ فاصلہ بڑھے گا شہزادی مارشا کا کھوج بھی معدوم تر ہوتا چلا جائے
گا۔ تابان نے امیر ارٹھک کو بھیچے گا کہ اس کی ناگئیں باندھنا شروع کیں تو وہ بری طرح
گر بنے برتنے لگے۔ تابان کے کان پر جوں تک نہیں رہتی۔ امیر کے ہاتھ پہلے سے بندھے
ہوئے تھے تابان نے اسے کندھے پر اٹھا کر اوندھے منہ ایک گھوڑے پر بٹخ دیا۔ مزید
اصطلاح کے طور پر ایک رسی کے ذریعے اسے زمین سے کس دیا گیا۔ تابان کی ہدایت پر
ہوشمند نے پھرتی بردار ملازم کے ہاتھ کھول کر اسے سواری کے لیے گھوڑا دے دیا مگر
گھوڑے کی نگام اس گھوڑے کی زمین سے شلک کر دی جس پر تابان کو سوار ہونا تھا۔
تابان نے ہلاک شدگان کے گھوڑوں میں سے صرف ایک صحت مند گھوڑا رکھا باقی کو
تاریک درختوں میں تھرتھرت کر دیا۔ اس کے بعد مخفی بوڑھے کے ہاتھ کھول دیئے گئے۔ وہ
خوف اور غصے سے لرز رہا تھا لیکن یہ بھی جانتا تھا کہ کچھ کر نہیں سکتا۔ اس کا ایک بیٹا
ہلاک ہو چکا تھا جبکہ دوسرا آنکھوں کے سامنے نامعلوم اندھیرے میں کھو رہا تھا۔ معلوم
نہیں اسے واپس لوٹنا نصیب ہوتا تھا یا نہیں۔ بوڑھا طہرائی جو بڑے چاؤ سے تابان کا انجام
دیکھنے کے لیے یہاں پہنچا تھا حسرت و الم کی تصویر بنا کھڑا تھا۔ اس دیرانے میں اس کا واسطہ
ایک ایسے شخص سے پڑ گیا تھا جو سفاکی اور عداوت پروری میں اس کے سورما بیٹوں سے
کبیں بڑھ کر تھا۔

گھوڑوں کو ایڑ لگتے سے پہلے تابان کی پات دار آواز تاریک ویرانے میں گونجی۔
”میری بات یاد رکھنا طہرائی! اگر افشاں دے یا اس کے بچوں کو کوئی گزند پہنچا تو تیرے گھرانے کا
یہ آخری بدبودار چراغ بھی بجھا ڈالوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔“ اس کی آواز پہاڑوں میں

گونجی پھر گھوڑوں کو ایڑ لگی اور وہ تھماتے ہوئے بوڑھے کو چھوڑ کر تیزی سے
بڑھنے لگے۔

جیسا کہ تابان جانتا تھا خاتم اور ازبک شمال مشرق کی طرف گئے تھے۔ رات میں
لنے والے کچھ شواہد سے بھی اندازہ ہوا کہ انہوں نے اسی رخ پر سفر جاری رکھا ہے۔
راستہ دشوار گزار تھا لیکن تابان اور ہوشمند نے ایک پل کے لیے بھی قیام نہیں کیا۔ یہاں
تک کہ مسلسل چھ پر سفر میں رہنے کے بعد گھوڑوں کی ناگئیں جواب دے گئیں اور وہ
ڈھنگانے لگے۔ مجبوراً انہیں ایک چھوٹے سے کارواں سرائے میں اترنا پڑا۔ ویران پہاڑوں
میں یہ سرائے ایک اوجیز عمارت اور اس کے بائینا شوہر کا تھا۔ ایک ندی کے کنارے
لکڑی کے چند ڈرہ نما کمرے تھے تاہم ان کمروں میں مسافر کی ضرورت کا ہر سامان موجود
تھا۔ یہاں تک کہ گھوڑوں کے لیے سبز چارہ اور بیمار مسافروں کے لیے جڑی بوٹیوں کے
مرکبات بھی موجود تھے۔ کھانا کھاتے ہی ہوشمند اور ارٹھک پیال کے بستر پر خراٹے لینے
لگے لیکن تابان جاگتا رہا اور پھرتی بردار ملازم جالی کو لے کر ایک کونے میں جا بیٹھا۔ نیند
اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ جلد از جلد جالی کے گلے میں آویزاں انگوٹھی کے
بارے میں جانتا چاہتا تھا۔ اسے اس انگوٹھی کی چمک میں مارشا کے بیٹے دنوں کی جھلک
دکھائی دیتی تھی۔ معلوم نہیں کل سے اب تک اس نے کیسے صبر کر رکھا تھا۔ اب سفر کا
سلسلہ منقطع ہوا تھا تو وہ جالی کے ہونٹوں سے کچھ سننے کے لیے بے تاب ہو گیا تھا۔

سرائے کی چوبی دیواروں سے باہر تاریک جنگل کی بھول بھلیوں میں بج رہا
سرسرا رہی تھی۔ جالی ایک موٹا کنبل اوڑھے تابان کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس کی نگاہیں
چراغ کی غمگینی کو پر تھیں اور ہونٹ خوابناک انداز میں متحرک تھے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”وہ
بہت حسین لڑکی تھی۔ اتنی حسین کہ آنکھوں کو بھروسہ نہیں ہوتا تھا۔ اس سے بھی حسین
اس کا اخلاق اور رکھ رکھاؤ تھا۔ یقیناً وہ کوئی دیوی تھی جو انسانی قالب میں ڈھل کر اس
زمین پر اتر آئی تھی۔ وہ ایجنٹری رہنے والی تھی۔ اپنے باپ کا نام غارس زونب بتاتی تھی
اور یہ بھی بتاتی تھی کہ وہ شاہی گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ جب ایجنٹری مقدونوی سپاہ
نے چڑھائی کی اور شرکی ایجنٹ سے ایجنٹ بنی تو شہزادی ایک ایرانی غلام کی مدد سے نڈ
لنگھ میں کامیاب ہو گئی۔ وہ غلام کے ساتھ شہر سے باہر نکل آئی اور اخروٹ کے ایک گٹے
جنگل میں چھپ گئی لیکن یہاں مقدونوی سپاہیوں کے ایک دستے سے ان کی ٹھیکر ہو گئی۔
جہاں غلام بڑی ہمدردی سے لڑا لیکن مارا گیا یا شدید زخمی ہوا۔ شہزادی مزاحمت کرتی

ہوئی گرفتار ہوئی۔ فتح کے نشے میں خور مقدونوی سپاہی اسے ایک غار میں لے گئے۔ وہ بھوکے بھینروں کی طرح اسے گھور رہے تھے اور پلک جھپکتے میں جبر پھاڑ دینا چاہتے تھے۔ اس ویرانے میں گھنے درختوں میں گھرے ہوئے اس غار کے اندر شتراوی کو بچانے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ قطعی طور پر بے دست و پا تھی لیکن دیوتاؤں کو اس کی آبرو اور زندگی کی حفاظت مقصود تھی..... بے یار و مددگار ہونے کے باوجود وہ وحشی سپاہیوں کے چنگل سے بچ گئی۔ دو سالار شتراوی کی ملکیت کے معاملے میں الجھ پڑے۔ دیکھتے ہی دیکھتے تلواریں نکل آئیں اور دونوں سالاروں کے حمایتی ایک دوسرے پر پل پڑے۔ کم از کم بیس افراد ہلاک و زخمی ہو گئے جب کہ باقی لاتے ہوئے درختوں میں تتر بتر ہو گئے۔ شتراوی نے یہ موقع غنیمت جانا اور وہاں سے بھاگ نکلی۔ اسے کچھ بھائی نہیں دے رہا تھا کہ وہ کہاں جائے کس طرف کا رخ کرے۔ وہ دشوار گزار جنگل میں بھرنے پا بھاگتی رہی۔ آخر دو روز بھٹکنے کے بعد ساحل پر جا نکلی۔ یہاں اسے ایک وفادار یونانی سپاہی مل گیا۔ یہ ادھیڑ عمر شخص شاہی محل کے محافظ دستوں میں شامل تھا اور اب سب کچھ برباد ہونے کے بعد براستہ سمندر ایران کا رخ کر رہا تھا۔ اس وفادار محافظ کا نام غارس تھا۔ یعنی وہی نام جو شتراوی کے والد محترم کا تھا۔ غارس کے پاس پہنچ کر شتراوی پر یہ روح فرسا انکشاف ہوا کہ غار میں اس کی خاطر لڑنے مرنے والے دستے کے کچھ سپاہی ابھی تک اس کے تعاقب میں ہیں اور ساحل پر جگہ جگہ اس کی بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ محافظ غارس نے شتراوی کو آمادہ کر لیا کہ وہ اس کے ساتھ ہی ایران چلی جائے اور جب تک ایجنٹوں میں حالات سازگار نہیں ہوتے وہ دونوں کسی ایرانی قصبے میں روپوش رہیں۔ غارس نے شتراوی کو بندرگاہ سے نکالنے کے لیے بڑی مہارت سے اسے ایک بد صورت بڑھیا کا روپ دے دیا۔ اس کے بال سفید کر دیئے۔ رنگت سیاہ کر دی اور ”لیس دار“ ٹھول کے ذریعے اس کے چہرے پر جھریاں ڈال دیں۔ پچھلے پرانے کپڑوں میں جھک کر چلتی ہوئی جب وہ بادبانی جہاز میں سوار ہوئی کسی کو شبہ تک نہیں ہوا کہ وہ ایک حسین یونانی شتراوی ہے۔ ہوا غیر موافق تھی اس لیے جہاز کو بحیرہ ایجیئن پار کرتے کرتے پورا ایک دن لگ گیا لیکن جب وہ ساحل کے قریب پہنچ چکے تھے اچانک موسم کے تیز بدل گئے۔ تند و تیز ہوا چلی اور آنا فانا سمندر میں طغیانی نمودار ہو گئی۔ اس سے پہلے کہ جہاز داں کسی قریبی جزیرے کا رخ کرتے بلند لہروں نے جہاز کو کھلوں کی طرح اٹھانا اور پٹھنا شروع کر دیا۔ جہاز بے ست ہو گیا اور طوفان کی شدت لکھ بے لکھ بڑھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ جہاز کسی زیر آب چٹان سے ٹکرا

کر ٹکڑے ہو گیا۔ یہ حادثہ ٹرائے کے ساحل سے چند کوس کے فاصلے پر پیش آیا تھا۔ درجنوں مرد و زن پانی میں ڈوب گئے۔ ان میں ادھیڑ عمر محافظ غارس بھی تھا۔ شتراوی نے اپنے آنکھوں کے سامنے اسے زخمی ہوتے اور بے ہوشی کی حالت میں موجوں کا لقمہ بنے دیکھا۔ صدمے کی شدت سے وہ خود بھی حواس کھو بیٹھی۔ تاہم اس کی خوش قسمتی تھی کہ اس کے کھلے لہارے میں ہوا بھر گئی اور وہ ڈوبنے سے محفوظ رہی۔ تند و تیز لہروں نے اسے لہجوں میں ساحل پر لایا۔ یہ ایک ویران ساحل تھا۔ پھیسروں کی ایک چھوٹی سی بستی کے سوا یہاں اور کچھ نہیں تھا۔ وہ بستی بھی طوفان کی آمد کے سبب خالی پڑی تھی۔ سمندر کے تیز دیکھتے ہی لوگ اپنے قیمتی سامان کے ساتھ ساحل سے دور بھاگ گئے تھے۔ صرف ایک شخص یہاں موجود تھا۔ وہ ساحلی جنگل سے لکڑیاں کاٹنے یہاں پہنچا ہوا تھا اور اسے طوفان کا خطرہ بھانپنے میں کچھ تاخیر ہو گئی تھی۔ تاہم اب وہ بھی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر راہ فرار اختیار کر رہا تھا۔ وقتاً اس کی نگاہ ساحل پر پڑی جہاں ایک عورت لہروں پر ڈوب ابھر رہی تھی۔ بڑھئی کچھ دیر تک سوچا رہا۔ طوفانی لہروں کسی بھی لمحے ان درختوں تک پہنچنے والی تھیں عورت کو بچانے کی کوشش میں اسے اپنی زندگی کے لالے پڑ سکتے تھے لیکن یوں ایک انسان کو موت کے منہ میں چھوڑ کر بھاگنا اسے منظور نہ ہوا۔ وہ بھاگتا ہوا ساحل پر پہنچا۔ گھٹنوں گھٹنوں پانی میں چل کر عورت کو کندھے پر اٹھایا اور دیوہیکل لہروں کا ایک نیا ریلا پہنچنے سے پہلے پہلے سمندر سے نکل آیا۔ ساحلی جنگل، طوفان کی آمد سے کاپ رہا تھا۔ لہروں اچھل اچھل کر درختوں کو ہڑپ کر رہی تھیں..... اور بڑھئی شتراوی کو کندھے پر اٹھا کر بھاگ رہا تھا۔ اس کے لیے وہ ایک مفلوک الحال بڑھیا تھی..... لیکن کچھ بھی تھی ایک انسان تھی..... اور وہ ایک انسان کو بچا رہا تھا۔ اس نے بیسیوں اسٹیڈیم کا فاصلہ اسی طرح بھاگتے اور ہانپتے ہوئے طے کیا۔ آخر محفوظ علاقے میں پہنچ گیا۔ اس نے شتراوی کو ایک جگہ لٹا کر اس کے شکم سے پانی نکالا اس کے سانسوں کی آمد و رفت بحال کی اور پھر ایک گھوڑا گاڑی میں ڈال کر اسے گھر لے آیا۔ یہاں اس کی بیوی اور چار بچے موجود تھے۔ شتراوی ہوش میں آکر حیران نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ بڑھئی اور اس کی بیوی کو معاملے کی تہ تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ وہ بان چکے تھے کہ یہ بڑھیا ایک حسین و شیزو ہے جس نے کسی سبب یہ بہروپ بھر رکھا ہے۔ یہاں تک بتا کر جالی نے سر جھکایا اور کھوئی ہوئی نظروں سے گھلے میں آویزاں اٹھوٹھی کو دیکھنے لگا جیسے ڈیڑھ برس پرانی یادوں کو کربدے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر کمری

سانس لے کر بولا۔ ”..... وہ بڑھتی میں ہی ہوں..... شہزادی میرے گھر میں قریباً ایک ماہ رہی۔ میں نے اسے سات پردوں میں رکھا اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئے دی لیکن اس بے چاری کے ساتھ سب سے بڑی بد قسمتی یہ تھی کہ وہ بہت خوبصورت تھی۔ یہ خوبصورتی سات پردوں میں سے بھی چھلک گئی۔ پڑوس کی ایک عورت نے اسے دیکھ لیا اور ہستی بھر میں یہ بات پھیل گئی کہ بڑھتی کے گھر میں ایک حسین لڑکی موجود ہے۔ جلد ہی یہ خبر باہل شیرازی تک بھی پہنچ گئی۔ باہل شیرازی ’ٹرائے‘ کے علاقے کا سب سے ثروت مند اور بارسوخ شخص ہے۔ وہ مائی گیری کی کشتیاں بنواتا اور فروخت کرتا ہے۔ میرے جیسے کئی بڑھتی اس کے تنخواہ دار ملازم ہیں۔ باہل شیرازی کے بیٹوں میں وہ تمام بد عادتیں موجود ہیں جو امیر اور بارسوخ باپوں کی اولاد میں ہوتی ہیں۔ باہل شیرازی کا سب سے چھوٹا بیٹا بن دیکھے ہی شہزادی پر فریفت ہو گیا اور مجھے اپنے راستے پر لانے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ لڑکی ایتھنز کے شاہی گھرانے کی فرد ہے اور یہ کوئی معمول شاہی گھرانہ نہیں ہے۔ اسے کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہئے جس پر اسے بعد میں پچھتاہٹا پڑے۔ مگر امیر زادے کے کان پر جوں تک نہیں رہتی اور وہ اپنی بات پر اڑا رہا ایک روز جب وہ بڑی شان و شوکت سے میرے گھر کی طرف آ رہا تھا، گھوڑے سے گر کر شدید زخمی ہوا اور اس کا زیریں دھڑ مفلوج ہو کر رہ گیا۔ اس حادثے سے پشیمتری کچھ لوگ یہ کہنے لگے تھے کہ یہ لڑکی انسانی شکل میں کوئی دیوی ہے جو بحیرہ اسفینج کے کسی مقدس جزیرے سے سمندری لہروں پر سوار ہو کر یہاں آئی ہے۔ اس واقعے کے بعد ان کا یقین اور پختہ ہو گیا۔ وہ واشکاف الفاظ میں اسے دیوی کہنے لگے اور اپنے موقف کے حق میں دلیلیں پیش کرنے لگے۔ وہ اس کے منہ سے یونانی زبان کے الفاظ سنتے۔ بیشتر لوگ اس زبان سے آگاہ نہیں تھے لہذا وہ اسے الہامی سمجھنے لگے۔

”چھوٹے بیٹے کے بعد باہل شیرازی کے منگلے بیٹے نے شہزادی پر آنکھ رکھ لی..... یہ سب کچھ خدا اور بہت دھرمی میں ہو رہا تھا۔ باہل کے بیٹے ثابت کرنا چاہتے تھے کہ بنے لوگ مقدس دیوی قرار دے کر عزت اور احترام کا حقدار سمجھ رہے ہیں وہ کسی یونانی گھرانے کی لاوارث لڑکی ہے اور اس کا مقدر کسی امیر زادے کے بہتری زینت بننا ہے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ بے وطن شہزادی کے گرد ہوس کاروں کا گھیراؤ ہو رہا ہے۔ مجھ میں اتنی طاقت تھی اور نہ میں اس حیثیت کا مالک تھا کہ اسے اس مصیبت سے بچا سکتا، لہذا میں نے ہستی کے اتروان (آتش کدے کا محافظ) سے مشورہ کیا۔ اس نے کہا کہ

مجھے دو شیرو کے بارے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں اس پر دیوتاؤں کا سایہ ہے اور دیوتا خود اس کی حفاظت کریں گے۔ میں جا کر آرام سے سو جاؤں۔ باہل شیرازی کے بیٹے مہمان دو شیرو کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ میں اتروان کی بات سن کر گھر آ گیا لیکن دل کو سکون نصیب نہیں ہوا۔ میں جانتا تھا آسمانی قوتیں اسی وقت مدد کرتی ہیں جب انسان اپنی مدد آپ کرتا ہے..... اگلے روز میں نے ٹرائے کے ایک اور اتروان سے رابطہ قائم کیا۔ اس نے پوری روئیدار سننے کے بعد میری دلجوئی کی۔ پھر مجھے ایک خواب آور مخلوق دیا اور کہا کہ میں یہ مخلوق شہزادی کو پالنے کے بعد اسے ایک صندوق میں بند کروں اور دریائے گرینی کس کی لہروں پر بہا دوں۔ اگر اس پر دیوتاؤں کا سایہ ہے تو وہ کسی نہ کسی مقام پر محفوظ ہاتھوں میں پہنچ جائے گی..... ورنہ اس کی موت اس کی عزت و آبرو کا پردہ بن جائے گی..... میں نے اسی رات شاہ بلوط کی لکڑی سے ایک صندوق تیار کیا اور خوابیدہ شہزادی کو اس میں لیٹا دیا۔ پھر اس صندوق کو ایک بند گھوڑا گاڑی میں رکھا اور دریائے گرینی کس کے کنارے پہنچ گیا۔ رات کا وہ آخری پھر مجھے کبھی نہیں بولے گا۔ میری آنکھوں سے اشک رواں تھے۔ ایک ماہ پہلے میں نے جس جسم کو پانی سے نکالا تھا آج پھر اسے پانی کے حوالے کر رہا تھا۔ میری ساری بھاگ دوڑ ساری محنت اور کوشش بیکار گئی تھی۔ میرا دل روتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”اے اجنبی سرزمین کی معزز شہزادی! میں تیری حفاظت کے لائق نہیں تھا، مجھے معاف کر دینا۔ اپنے غریب میزبان کو معاف کر دینا۔“ اور پھر میں نے شہزادی کو گرینی کس کے تاریک پانیوں پر بہا دیا..... اس کے بعد آج تک مجھے شہزادی کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چلا وہ کہاں ہے؟ کس حال میں ہے؟ زندہ بھی ہے یا نہیں؟“

بات کہتے کہتے جالی کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے تھے۔ اس نے کمبل کے کونے سے آنسو پونچھے اور آنکھیں کمرے کی الوکٹی کھڑکی پر گاڑ دیں۔ برافٹن ہوا در و دیوار سے سرخ رہی تھی۔ کچھ جھونکے راہ تلاش کر کے کمرے میں بھی در آتے تھے اور ان کی خشکی سے چراغ کی لو کپکپانے لگی تھی۔

تہاں نے پوچھا۔ ”تم ٹرائے سے یہاں کیسے پہنچے؟“ جالی بولا۔ ”شہزادی کے بعد میرا ٹرائے میں رہنا ناممکن تھا۔ باہل شیرازی کے بیٹے مجھ سے خوفناک انتقام لینا چاہتے تھے۔ میں نے ان کے منہ سے نوالہ چھینا تھا، وہ مجھے معاف کیسے کر سکتے تھے! ایک اندھیری شب میں نے چپکے سے دیوی بچوں کو ساتھ لیا اور

اشیاء تھیں۔ تاہاں کو چرمی کانڈوں کا ایک چھوٹا سا پلندہ نظر آیا۔ اسے گول لینا گیا تھا۔ تاہاں نے دیکھا ان چرمی کانڈوں میں دو نقشے اور کچھ خطوط تھے۔ اس نے دھیان سے دیکھا نقشوں پر کس نشان وغیرہ نہیں لگائے گئے تھے خطوط میں سے چند پر پھسل کی مرگی ہوئی تھی یہ خط غالباً بو ذکرت کے اہل خانہ کی طرف سے تھے لیکن ایک خط پھسل کی بجائے دمشق سے آیا تھا اور اسے لکھنے والی کوئی عورت تھی۔ تاہاں اس خط کو دیکھ کر چونکا۔ دمشق سے آنے والا یہ خط یونانی زبان میں تھا اور یہی امر تاہاں کے لیے زیادہ حیرت کا باعث تھا۔ اس نے جلدی جلدی خط کے مضمون پر نگاہ دوڑائی۔ جوں جوں وہ پڑھتا گیا اس کی آنکھیں پھیلتی گئیں اور رگوں میں خون کی گردش تیز تر ہوتی گئی۔ لکھا تھا:

”سلار اعظم سکندر مقدونی کے نام..... یونان کی ایک بیٹی کا پیغام

”سلار اعظم! ہم ایجنٹر کے رہنے والے ہیں۔ ہمارا نام مارشا ہے اور ہم شاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ آج سے قریباً دو برس پہلے مقدونی فوج نے ایجنٹر پر حملہ کر کے اسے تاخت و تاراج کر دیا۔ ایجنٹر کی سینکڑوں خواتین کی طرح ہم بھی اپنی آبرودار جان کی حفاظت کے لیے شہر چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ ہمارے ساتھ ایک غلام تھا جو ہماری حفاظت کرتے ہوئے مارا گیا یا شاید زخمی ہو کر گرفتار ہوا۔ ایک وقادار یونانی سپاہی کی مدد سے ہم ایران سے ساحل پر پہنچے لیکن یہاں سمندری طوفان کے سبب ہمارا جہاز تباہ ہوا اور ایک ایرانی بڑھی نے ہماری جان بچائی۔ اس ایرانی بڑھی نے بڑی حفاظت سے ہمیں اپنے گھر میں رکھا لیکن ہمیں یہاں بھی تا دیر پناہ نہیں مل سکی۔ ہم کئی مشکل مراحل سے گزر کر پہلی کارنیں کے سب سے بڑے آتش کدے میں پہنچ گئے۔ آتش کدے کے پجاریوں نے ہمیں کسی ٹاہید دیوی کا پرتو قرار دیا اور ایک زندہ مورتی کی طرح اپنے معبد میں سجایا۔ یہ عظیم الشان معبد ہمارے لیے ایک طلائی بجزے سے کم نہیں تھا۔ ہم اس میں پھر پھرتا تو سکتے تھے لیکن اس کی دیواریں تو زکرا باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ ان گنت شب و روز ہم نے قید اور غریب الوطنی کے کرب میں گزار دیئے۔ پھر ایک روز ہمارے کانوں تک یہ خبر پہنچی کہ سکندر مقدونی جو اب متحدہ جمیعت یونان کا سلار اعظم ہے پہلی کارنیں کا محاصرہ کر چکا ہے۔ اس خبر سے ہمارے دل میں امید کی شمع روشن ہوئی۔ ہماری آنکھوں میں آزادی کے خواب سجے گئے۔ ہم شب و روز دعا کرتے گئے کہ شرف فتح ہو جمیعت یونان کے سپاہی دندناتے ہوئے اس عبادت گاہ میں گھس گھس آئیں اور ہمیں ایرانیوں کے جنگل سے نکال لیں..... محصور فوج کو شکست ہوئی شہر بھی فتح ہوا لیکن ہماری تمام

امیدیں نقش بر آب ثابت ہو گئیں۔ یونانی فوج کے شہر میں داخل ہونے سے پہلے ہی آتش کدے کے پجاری ہمیں وہاں سے نکال لے گئے۔

”سلار اعظم! اب ہم دمشق میں ہیں۔ ہمیں پھر ایک بہت بڑے آتش کدے میں زندہ مورتی کی طرح سجایا گیا ہے۔ یہ آتش کدہ شہر کے شمال میں ایک بلند مقام پر واقع ہے۔ ہمارے گرد بلند و بالا دیواریں ہیں جن کے اندر سے روشنی پھوٹی ہے۔ ریشم و کنوایں کے دیز پردے ہیں۔ یہاں لوہاں سلکتی ہے اور زعفران کی مٹھیاں بھر بھر کر آگ میں جھینگی جاتی ہیں۔ عجیب و غریب لوگ ہمارے ارد گرد سجدہ ریز رہتے ہیں اور ان سے بھی بڑھ کر عجیب لوگ وہ ہیں جو ہر وقت ہمیں اپنے حصار میں رکھتے ہیں۔ اس ناقابل شکست حصار میں ہمارا دم گھٹ رہا ہے۔ اگر یہ سب کچھ جوں کا توں رہا تو شاید ہم زیادہ دیر زندہ نہ رہ سکیں۔ یہاں پراسرار آنکھیں ہر وقت ہم پر نگران رہتی ہیں۔ ہم نے یہ خط بہت دشواری سے لکھا ہے اور ایک یونانی غلام کے ذریعے آپ کو ارسال کر رہے ہیں۔ دیوتا کریں یہ اپنی منزل مقصود تک پہنچ جائے..... سلار اعظم! اب آپ صرف مقدونیہ کے نہیں متحدہ یونان کے سلار ہیں۔ یونان کی ایک بے آسرا بیٹی نے آپ تک اپنی فریاد پہنچا دی ہے..... وہ نہ ہی جنونیوں کے جنگل میں آپ کی منتظر ہے اور آخری سانس تک رہے گی.....“

تاہاں کا ذہن برق رفتاری سے کام کر رہا تھا۔ خط فہم کرتے کرتے وہ بات کی تہ تک پہنچ گیا۔ یہ خط جو مارشا نے دمشق کے کسی معبد سے لکھا تھا سلار اعظم سکندر تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ یہ خط سکندر تک پہنچانے کا ذمے دار اذیک یعنی بو ذکرت تھا۔ وہ خط کتابت کے شعبے میں تھا اور شاہی خطوط کو چھانٹنے اور ترتیب دینے کا کام جن دو افراد کے سپرد تھا ان میں سے ایک بو ذکرت تھا۔ اس نے اپنی سابقہ منگیت کا خط موصول ہوتے ہی دمشق کا رخ کر لیا تھا اور اب کاہن خاتام کے ہمراہ عازم سفر تھا۔ تاہاں کے سینے میں لودیتی ہوئی راقیت کی آگ یک دم بھڑک کر الاز بن گئی۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے ایک فیصلہ کیا۔ یہ فیصلہ جتنا فوری تھا اتنا ہی بر محل بھی تھا۔ اس نے خط اپنی صدری میں رکھا۔ کمرے کے در پہچے میں سے ایرانی بڑھی جالی باہر بھاگ رہا تھا۔ تاہاں نے اسے اشارہ کیا کہ وہ ہوشمند اور ارشنگ کو لے کر فوراً باہر آجائے۔ جالی نے اس حکم کی تعمیل کی۔ ذرا ہی دیر بعد ہوشمند امیر ارشنگ کو کدے پر لا دے باہر نکلا۔ ساتھ ساتھ جالی آ رہا تھا۔ انہوں نے جلدی جلدی گھوڑے سنبھالے تاہاں نے بو ذکرت اور خاتام کے گھوڑوں کی

راہیں کھول کر اپنے ہاتھ میں لے لیں..... پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ سب جنگل میں روپوش ہو گئے۔

انہوں نے شام تک تیز رفتاری سے سفر کیا اور سرائے سے قریب ایک منزل کی دوری پر پہنچ گئے۔ یہاں مختصر وقفے کے لیے ٹھہر کر انہوں نے کھانا وغیرہ کھایا اور ایک بار پھر گھوڑوں کی پیٹھ سنبھال لی۔ اس دفعہ دو تھکے ہوئے گھوڑوں کی جگہ خاتم اور بو ذکرت کے گھوڑے استعمال کئے گئے۔ تہاں کو یقین تھا کہ خاتم اور بو ذکرت بو کھلاہٹ میں تاج کر رہ گئے ہوں گے۔ نہ صرف یہ کہ وہ سواری کے جانوروں سے محروم ہوئے تھے بلکہ رخت سڑے بھی ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ یقینی بات تھی کہ وہ ایک دو دن تو کشدہ گھوڑوں کو ڈھونڈنے میں گزار دیں گے۔ پھر تھک ہا کر بیٹھیں گے اور متبادل انتظام کا سوچیں گے۔ رخت سفر تو وہ کسی نہ کسی طرح جمع کر لی لیں گے لیکن اس دیرانے میں سواری کا بندوبست کرنا آسان نہیں ہوگا۔ شاید انہیں کسی مسافر سے زبردستی کرنا پڑے یا پھر کسی بستی میں پیدل پہنچ کر وہاں سے گھوڑے خریدنا پڑیں۔ درحقیقت تہاں ان دونوں کو گوناگوں مسائل میں یہ گھرا چھوڑ آیا تھا۔

☆-----☆-----☆

تہاں اپنے ساتھیوں کے ساتھ حتی المقدور رفتار سے آگے بڑھتا چلا گیا۔ وہ شب کو ایک مختصر وقفے کے لیے آرام کرتے۔ اب ان کے سامنے جنوبی حصوں کی زمینیں تھیں۔ راستہ دشوار گزار تھا۔ گھائیوں اور درختوں سے اٹا ہوا اور تنج در تنج۔ بعض مقامات پر گزر گاہ اتنی تنگ تھی کہ اس میں سے بمشکل ایک گھوڑا گاڑی گزر سکتی تھی۔ تہاں اس فکر میں غطال آگے بڑھ رہا تھا کہ چند روز بعد جب سکندر اپنے لاؤ لشکر اور بھاری گاڑیوں کے ساتھ یہاں سے گزرے گا تو اسے کسی قدر دشواری پیش آئے گی۔ تہاں اور اس کے ساتھی جلد ہی میدانی علاقے میں پہنچ گئے۔ یہاں زمین کا رنگ سرفنی مائل تھا اور ہر طرف گرد و غبار دکھائی دیتا تھا۔ کہیں کہیں گرم علاقوں میں پائے جانے والے درختوں کے جھنڈ بھی نظر آتے تھے۔ اب ان کے سامنے ایک جانب سیاہی مائل پہاڑ تھے جن کی چوٹیاں برف پوش تھیں اور موسم گرما میں بھی ان کے اندر برفالی ہوا چل رہی تھی جبکہ سامنے وہ میدان پھیلا ہوا تھا جسے انہوں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ راگبھروں سے اس علاقے کا نام باپ سیلیٹا معلوم ہوا۔ تہاں اور ہوشمند رستے میں پڑنے والی ایرانی فوجی چوکیوں سے کترا کر سفر کر رہے تھے لیکن ایک شام ان کا سامنا ایرانی سپاہیوں سے ہو ہی گیا۔ یہ چوکی ایک

غیر معروف راستے پر واقع تھی اور یوں بھی درختوں کی اوٹ میں تھی۔ تہاں اور ہوشمند کو اس وقت علم ہوا جب انہوں نے ایرانی سپاہیوں کو ناکہ بندی کئے دیکھا۔ اب بہت تاخیر ہو چکی تھی۔ وہ واپس بھی نہیں لوٹ سکتے تھے۔ ایرانی سپاہی قریباً سو قدم دور تھے ان کی تعداد خاصی تھی۔ تہاں اور ہوشمند بھاگنے کی کوشش کرتے تو کھڑا جانا لازمی تھا۔ بہترین تھا کہ اب گھوڑوں کو رواں رکھا جائے۔ تہاں کے علاوہ ہوشمند اور جالی بھی مقامی لباس میں تھے۔ جالی فارسی روانی سے بول سکتا تھا جبکہ ہوشمند اور تہاں بھی اس قابل تھے کہ مختصر سوالوں کے مختصر جواب دے سکیں۔ اصل مسئلہ امیر ارڈنگ کا تھا۔ اس کی مشکلیں کسی ہوئی تھیں اور وہ خواب آور دوا کے زیر اثر گھوڑے پر اونڈھا پڑا تھا۔ اسے گھوڑے کی پشت پر سیدھا رکھنے کے لیے زین کے ساتھ باندھ دیا گیا تھا۔ سپاہیوں کو ارڈنگ کے سلسلے میں مطمئن کرنا خاصا دشوار کام تھا۔ بہر طور اب اس مشکل سے تو گزرنا ہی تھا۔ تہاں اور ہوشمند جالی کے پیچھے پیچھے گھوڑوں کو دھکی چال چلاتے رہے آخر ناکہ بندی پر پہنچ گئے۔ ایک ذرہ پوش ایرانی سالار آگے آیا۔ اس نے تیز نظروں سے تینوں کو سر تا پا گھورا اور پھر جالی سے سوال و جواب کرنے لگا۔ جالی نے مناسب جوابات دیئے۔ تہاں اور ہوشمند کو امید پیدا ہونے لگی کہ شاید وہ غافیت سے گزر جائیں لیکن اچانک ایک سپاہی امیر ارڈنگ کی طرف بڑھا۔ سپاہی کے بال لمبے اور کانوں میں دھات کے باریک جھلے چمک رہے تھے..... وہ طہرائی قبیلے سے تھا۔ پلک جھپکتے میں اس نے امیر ارڈنگ کو پہچان لیا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت آمیز طیش دکھائی دے رہا تھا۔ اپنے سالار کی طرف جھک کر اس نے کان میں کھسر پھسری۔ پلک جھپکتے میں ایک درجن کھواریں نیاموں سے باہر نکل آئیں۔

”بھاگو!“ تہاں نے چلا کر کہا اور اپنے سامنے کھڑے دست سالار پر گھوڑا چڑھا دیا۔ دست سالار گھوڑے تلے روند ا گیا جبکہ اس کے دائیں پہلو پر کھڑا برہمچی بردار تہاں کی قاتل کھوار کا لقمہ بنا۔ بجلی سی لپکی اور اس کا سر شانوں سے اچھل کر دور جاگرا۔ دوسری طرف ہوشمند نے بھی گھوڑا دو ذرہ پوش پیادوں کے درمیان سے یوں گزارا کہ وہ دھکے سے پتھرلی زمین پر گر گئے۔ جالی اور امیر ارڈنگ کے گھوڑے بھی ایک دم بھاگ کھڑے ہوئے۔ چند لمحوں کے لیے یوں لگا جیسے تہاں اور اس کے ساتھی یہ ناکہ توڑ کر نکل جائیں گے مگر پھر ایک تیر سب سے پچھلے گھوڑے کی ٹانگ پر لگا۔ اس پر امیر ارڈنگ لدا ہوا تھا۔ گھوڑا لڑکھڑا کر منہ کے بل گرا۔ ارڈنگ کو سنبھالنے والی رسیاں ٹوٹ گئیں اور وہ لڑھک

کر پتھری زمین پر جاگرا ابھی تہاں اور ہوشمند یہ منظر دیکھ ہی رہے تھے کہ پسلی کی تڑپ سے درجنوں گھوڑوں کے سر نمودار ہوئے۔ تہاں اور ہوشمند نے اپنے دوبرو ایک زار پوش ایرانی رسالہ دیکھا۔ اب بھاگنے کی کوشش بے سود تھی۔ وہ تین اطراف سے گھیر چکے تھے اور انہیں گھیرنے والے تعداد میں ان سے کہیں زیادہ تھے۔

”تکوار میں پھینک دو۔“ دست سالار نے گرج دار آواز میں کہا۔

تہاں ہوشمند اور جالی نے تکواریں پتھری زمین پر پھینک دیں۔ دست سالار آگے بڑھا۔ آہنی خود کے اندر سے اس کی آنکھیں بغور تہاں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ وہ تہاں کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ تہاں کی نگاہیں سالار کے تکوار بدست بازو پر جمی تھیں۔ وہ کسی بھی حملے سے خود کو بچانے کے لیے پوری طرح چوکس تھا۔ سالار نے تہاں کے سامنے پہنچ کر اپنا خود اتار دیا۔ تہاں دیکھتا رہ گیا۔ اس کے سامنے آتش کدے کا منتقم اعلیٰ روہتاس کھڑا تھا۔ وہی بچاری جو آگ کی پوجا کرتا کرنا ایک زندہ دیوی کے عشق میں گرفتار ہو گیا تھا اور پھر بدنامی و رسوائی کے خوف سے خودکشی کرنے نکل کھڑا ہوا تھا۔ تہاں سے اس کی آخری ملاقات آتش کدے کی ویران بیڑھیوں پر ہوئی تھی۔ تہاں کو اس کے الفاظ ابھی تک یاد تھے۔ اس نے کہا تھا۔ ”جب کوئی شخص اپنی جان لینے کی سوچ لیتا ہے تو اکثر تقدیر بھی اس کے راستے سے ہٹ جاتی ہے۔ میں شرمیں گفت کرتے ہوئے کسی بھی مقدونی دستے پر نوٹ پڑوں گا اور لڑتے ہوئے جان دے دوں گا۔“ لیکن آج قریباً تین ماہ گزر جانے کے بعد وہ تہاں کے سامنے زندہ سلامت کھڑا تھا۔ نہ صرف زندہ تھا بلکہ زندگی سے بھرپور نظر آتا تھا اس کے چہرے کے بال صاف تھے۔ سر کے بال سلیقے سے ترشے ہوئے تھے۔ جسم پر فوجی وردی تھی اور وہ کسی جواں سال سپاہی کی طرح سینہ تانے تہاں کے سامنے کھڑا تھا۔

”آپ یہاں؟“ تہاں نے حیرانی سے کہا۔

”ہاں۔ تم نے ٹھیک پچھانا ہے۔“ روہتاس کا لہجہ غیر جذباتی تھا۔ اس کے حکم پر تہاں کو گری ہوئی تکوار واپس تھما دی گئی پھر روہتاس ان تینوں کو لے کر چوکی کی طرف بڑھا۔ چوکی کے قریب ہی چھوٹا سا پڑاؤ تھا۔ گھنے درختوں کے نیچے خیمے الٹادہ تھے اور چھگڑے وغیرہ کھڑے تھے۔

اب شام ہونے والی تھی۔ روہتاس کے اوٹی خیمے میں شمع دان روشن کر دیے گئے۔ کمپن قریب سے گرما گرم کھانے کی بھاپ بلند ہو رہی تھی۔ خیمے کے دروازے پر

مسخ پھیردار موجود تھے۔ تہاں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اس خیمے میں قیدی ہے یا مہمان۔ اس کی تکوار واپس کر دی گئی تھی مگر ہوشمند اور جالی کے ہتھیار واپس نہیں کئے گئے تھے۔ ویسے بھی انہیں کسی دوسرے خیمے میں رکھا گیا تھا۔ تہاں گہری نظروں سے روہتاس کا جائزہ لینے لگا وہ ایک قلعی مختلف شخص نظر آ رہا تھا۔ آج اس کے چہرے پر اداسی کی چمکاوڑیں نہیں لٹک رہی تھیں، آنکھوں میں امنگوں کے رنگین پرندے پڑ پڑا رہے تھے۔ وہ مکمل طور پر ایک دنیا دار شخص دکھائی دیتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد جب کھانا ان کے سامنے آیا تو اس میں شراب سرخ بھی شامل تھی۔ کھانا لانے والی دو خوبرو لڑکیاں تھیں۔ ان کے تھرکتے جسموں کی ہر جنبش دل دھڑکا دینے والی تھی۔ تہاں اس کا یا پلٹ پر حیران ہو رہا تھا۔ کہاں وہ زاہد شک کہ جسے زندہ رہنا بھی بار محسوس ہوتا تھا اور کہاں یہ رنگیلا جو شیا سالار جو اس ویران پڑاؤ میں ہر سالانِ عشرت جمع کئے بیٹھا تھا۔

مرغن کھانے کے بعد روہتاس نے ڈٹ کر شراب پی اور گاؤں گھٹنے کے سارے بائیں ہمار کر بیٹھ گیا۔ تاثرات سے لگتا تھا کہ وہ تہاں کی حیرت سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ کہنے لگا۔ ”تمہاری حیرت بجا ہے نوجوان۔ آتش کدے کے روہتاس اور اس پڑاؤ کے روہتاس میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ جانتے ہو یہ فرق کیوں ہے؟ یہ فرق اس لیے ہے کہ آتش کدے میں، میں ایک کمزور انسان تھا۔ کمزوری اور مجبوری سے انسان میں قناعت، سادگی اور صبر و شکر کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ وہ کنویں کے اندر سے نظر آنے والے آسمان کو کائنات سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ دنیا کی رنگینیوں و لذتوں سے منہ موڑتا ہے اور پارسیا کا چولا پن کر بیٹھ رہتا ہے لیکن طاقت انسان کو بیٹھا سکھاتی ہے۔ وہ فواش کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتا ہے۔ محرومیوں سے نبرد آزما ہوتا ہے اور اس دنیا میں ہی وہ سب خوشیاں حاصل کر لیتا ہے جس کے وعدے دیوتاؤں نے اگلی دنیا کے لیے کر رکھے ہیں۔“

تہاں نے کہا۔ ”محترم! میں آپ کی تمام باتیں سمجھ نہیں پا رہا لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ جیسی کہ کمزوری کا نام دینا کسی طور درست نہیں۔ دنیا میں بے شمار ایسے طاقتور اور اختیار لوگ گزرے ہیں جو نیک نام تھے اور انہوں نے ہر آسائش پر دسترس رکھتے ہوئے

اپنی خواہشوں کو محدود رکھا۔“

روہتاس نے بلوری پیالے سے شراب کا ایک جرہ لیا اور بولا۔ ”میں انہیں

بد نصیب لوگ سمجھتا ہوں۔ اگر تم ان کی زندگیوں کو قابلِ عقید سمجھ رہے ہو تو یاد رکھو ان کی زندگیاں ہر مرتبہ نہیں پر سکون تھیں۔ ہر مرتبہ اور ہر سکون زندگی میں بہت فرق ہوتا ہے میرے دوست۔

تابان نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ”جب آپ ہیلی کارٹس کے آتش کدے سے روانہ ہوئے تو زندگی سے بیزار تھے۔ مجھے خدشہ تھا کہ میں آپ کو پھر کبھی نہ دیکھ سکوں گا لیکن آج نہ صرف آپ کو سلامت دیکھ رہا ہوں بلکہ۔۔۔۔۔۔“

”یہ سب تقدیر کے کھیل ہیں۔“ روہتاس نے اس کی بات کاٹی۔ ”میں ہیلی کارٹس کے آتش کدے سے مرنے کے لیے ہی نکلتا تھا لیکن بہت جلد اس نتیجے پر پہنچا کہ موت ان لوگوں کو آتی ہے جو زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ جو موت کی طرف بڑھتے ہیں موت ان سے فاصلہ رکھتی ہے۔ میں موت کا متلاشی تھا۔ میرے ہاتھ میں عیاں تلوار تھی۔ اس رات مقبوضہ شہر میں داخل ہوتے ہی میں نے یونانی سپاہیوں کے ایک جتھے پر دھاوا بول دیا۔ وہ ایک خیمے کے گرد بیٹھے قوہ بی رہے تھے۔ ان میں سے پانچ افراد کے لیے قوہ کی پیاپیاں آخری ثابت ہوئیں۔ میری تلوار نے ان کو خاک و خون میں ڈبو دیا اور باقی بھاگ کھڑے ہوئے۔ مجھے موت کے حصول میں ناکام ہوئی لیکن میں ناکامی سے دل برداشتہ ہونے والا نہیں تھا۔ اس شب میں نے ہیلی کارٹس میں کم از کم چھ مقامات پر شب خون مارا لیکن تم حیران ہو گے کہ اس جنگ و جدل میں میرے جسم پر صرف دو قابلِ ذکر زخم آئے۔“

روہتاس نے بازو سے آستین اٹھا کر تابان کو دو زخم دکھائے اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”یقین کرو اس شب میں نے دو درجن سے زائد سپاہیوں کو ہلاک کیا۔۔۔۔۔۔ میری تلوار خون آلود تھی، لباس خون آلود تھا، میرے سر پر بھی خون سوار ہو چکا تھا۔ زندگی میں پہلی بار مجھے معلوم ہوا تھا کہ جب ہاتھ میں پکڑی ہوئی تیز دھار تلوار دشمن کے گوشت میں اترتی ہے تو کیسی راحت نصیب ہوتی ہے۔ اس شب میں آگے بڑھ بڑھ کر موت سے بغل گیر ہونا چاہتا تھا لیکن وہ کسی ناکثہ دوشیزہ کی طرح مجھ سے بدن چرا رہی تھی۔ میری پانوں کے سائے سے بدک رہی تھی۔ مجھ پر ایک نشہ ساطاری ہوتا چلا جا رہا تھا۔ یہ کشت و خون کا نشہ تھا۔۔۔۔۔۔ اس رات کے بعد کئی راتیں ایسی آئیں جب میں تلوار بدست اپنی موت کی تلاش میں نکلتا اور اپنے پاؤں پر چل کر واپس آیا۔ ہیلی کارٹس سے ایک منزل کے فاصلے پر جو یونانی مقدونی فوج خیمہ زن تھی اس پر میری دہشت سوار ہوتی رہی تھی۔ سپاہی ایک ایک ایسی پرچھائیں سے خوف زدہ تھے جو اچانک ان پر چھینٹی تھی اور

ایسی دوا لگی سے نبرد آزما ہوتی تھی کہ وہ مہموت ہو کر رہ جاتے تھے۔ ایک روز میری ان کارروائیوں کی اطلاع شہنشاہ ایران دارا کے ایک معتد سلاار راسپ تک جا پہنچی۔ اس نے ایک دستہ بھیجا جو مجھے تلاش کر کے راسپ کے پاس اسوں شہر میں لے گیا۔ راسپ نے بعد اصرار مجھے پانچ صدی سلاار کا منصب بخش دیا اور کہا کہ اس وقت مملکت ایران کو میرے جیسے جری بازوؤں کی ضرورت ہے۔“

روہتاس نے سلسلہ کلام منقطع کر کے مقدمہ لگایا۔۔۔۔۔۔ پھر قریب کھڑی خدمتگار لڑکی کو بغل میں دبوچ کر بولا۔ ”کیا دو ماہ پہلے کوئی تصور کر سکتا تھا کہ میری توصیف میں ایسے کلمات کے جائیں گے۔ یہ سب تقدیر کا الٹ پھیر ہے۔ اب میں پانچ ہزاری سوار ہوں۔ دنیا کی ہر نعمت اور آسائش مجھے میرے۔ میں جانتا ہوں میری زندگی اب طویل نہیں ہوگی لیکن جتنی بھی ہوگی خوب مزے کی ہوگی۔“

تابان نے کہا۔ ”کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اس دیرانے میں آپ کیا کر رہے ہیں؟“ روہتاس نے خدمت گار لڑکی کے ہاتھ سے جام لیتے ہوئے کہا۔ ”تم دشمن فوج کے سپاہی ہو لیکن میرے دل میں تمہارا مقام دوست کا ہے۔ میں تمہیں بتانے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا۔ ہمیں معلوم ہے کہ سکندر بہت جلد دمشق کی طرف بڑھنے والا ہے اور جسے کی تیاری کے سلسلے میں اس کے طلایہ گرد سوار علاقے میں گھوم رہے ہیں۔ انہی کی پکڑ دھکڑ کے لیے اس دیران علاقے میں یہ چوکی قائم کی گئی ہے۔“

تابان نے کہا۔ ”تو کیا ہم بھی خود کو قیدی سمجھیں؟“

”نہیں۔“ روہتاس نے اعتماد کے ساتھ کہا۔ ”میرا دل گواہی دیتا ہے کہ تم اس وقت کسی عسکری مہم پر نہیں ہو۔ کوئی نئی معاملہ ہے جو تمہیں اس دشت میں کھینچ لایا ہے۔ یہ میرے دل کی گواہی ہے اور میں دل کی گواہی کو کبھی رد نہیں کرتا۔“

تابان نے کہا۔ ”آپ کے دل کی آواز معتبر ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ میری یہاں موجودگی کے کوئی فونی مقاصد نہیں ہیں۔۔۔۔۔۔“

روہتاس نے کہا۔ ”مجھے یقین ہے کہ تم مجھ سے غلط بیانی نہیں کرو گے، لیکن کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم کس مقصد سے یہاں آئے ہو؟“

تابان نے بے خیالی میں اپنی نگاہیں خدمتگار لڑکی کے چہرے پر جمائیں، اس کے گفتگو رخصاروں پر موی ٹھنوں کو روشنی منعکس ہو رہی تھی۔ وہ روہتاس کے شانے سے لگی سکری سمنی خاموش بیٹھی تھی۔ تابان ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ”میں ایک لڑکی

KHAN STATIONERS & 321 تہان
GENERAL STORE
Shop F1890, Dhabra Bazar,
Nishtar Road, Rawalpindi

328527 KHAN STATIONERS & LIBRARY
Dhabra Bazar, Rawalpindi
Cell: 0345-504834 0345-504859
Prop: Ali Khan

سے محبت کرتا ہوں۔ مجھے ہر صورت اس تک پہنچنا ہے۔ اس کی زندگی سخت خطرے میں ہے۔"

روہتاس نے مسکراتی نظروں سے تہان کو دیکھا اور بولا۔ "تمہاری حیثیت یہاں مہمان کی ہے جب چاہو اور جہاں چاہو جا سکتے ہو۔ جب تک میدان کارزار گرم نہیں ہوتا اور جنگ کا ہنگل نہیں بجتا تم مجھے اپنا دوست و خیر خواہ سمجھ سکتے ہو۔"

روہتاس کی فراہمی اور صاف گوئی نے تہان کو متاثر کیا۔ وہ بولا۔ "میں آپ کا قدر دان ہوں اور یہ دعا کرتا ہوں کہ میدان جنگ میں بھی ہمارا آسان سنا ہو۔"

روہتاس کی آنکھوں میں شراب کی سرخی تیر رہی تھی۔ وہ پہلو میں بیٹھی ہوئی دوشیزہ کو عجیب بے قراری سے دیکھ رہا تھا۔ تہان سے بولا۔ "تم جب چاہو دمشق روانہ ہو سکتے ہو لیکن بہتر یہی ہے کہ آج کی رات آرام کر لو۔ موسم کے آثار اچھے نہیں ہیں۔ میرا مطلب ہے طوفان باد و باران کا خطرہ ہے۔"

تہان نے جھک کر خیمے کے جالی دار روزن سے باہر جھانکا۔ مطلع بالکل صاف تھا۔ چاند ستارے آپ و تاب سے روشن تھے۔ اس نے کہا۔ "محترم سالار! میں اس مہمان نوازی کے لیے شکر گزار ہوں۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ میں جلد از جلد روانہ ہونا چاہوں گا۔"

روہتاس نے کہا۔ "اگر کسی طرح کی مدد کی ضرورت ہو تو بلا تکلف کہو۔ عسکری معاملات سے ہمت کر میں ہر خدمت کے لیے حاضر ہوں۔"

تہان نے ایک بار پھر شکریہ ادا کیا۔ وہ اٹھنا چاہتا تھا لیکن ایک سوال بار بار اس کے ذہن میں گولیا جاتا تھا۔ آخر اس سے رہا نہیں گیا۔ کہنے لگا۔ "محترم روہتاس! آپ کو یاد ہے آپ نے مجھ سے ایک انتہائی حسین چہرے کا ذکر کیا تھا اور کہا تھا کہ اس چہرے نے آپ کی زندگی بھر کی ریاضتوں پر پانی پھیر دیا ہے۔ آپ اسی حسین و جمیل نسوانی چہرے کے بحر میں گرفتار ہو گئے تھے اور اس "گرفتاری" کو اپنی بہت بڑی شکست تصور کر رہے تھے۔ درحقیقت یہی احساسِ پشیمانی تھا جو آپ کو اپنی جان لینے پر اکسارہا تھا۔ آپ اپنے سرے زینت کا بوجھ اتارنے کے لیے بے تاب نظر آ رہے تھے لیکن آج میں آپ کو ایک بالکل مختلف روپ میں دیکھ رہا ہوں۔ اس حسین چہرے کا تم آپ کے قرب و جوار میں نظر نہیں آتا اس کی جگہ دنیاوی لذتوں کے چمکے نظر آ رہے ہیں۔ کیا میں یہ سمجھوں کہ وہ چہرہ اور

اس سے محرومی کا کرب آپ کی زندگی سے نکل چکا ہے۔ روہتاس غور سے تہان کی بات سن رہا تھا۔ تہان پہ ہوا تو وہ اپنا سر اٹھاتے ہیں۔ وہ بولا۔ "ہاں میرے دوست۔ وہ چہرہ میری زندگی سے نکل چکا ہے لیکن وہ خود سے نہیں نکلا میں نے اسے زبردستی نکالا ہے اور میں ایسا صرف اس لیے کر سکا ہوں کہ میں پہلی کارنیں کے سب سے بڑے آتش کدے کا زندانِ اعظم ہوں۔ میں نے ایک عمر کڑی ریاضتوں کی نذر کر کے اور نفس کشی کے خار زراوں سے ڈر کر کچھ مادیاتی قوتیں حاصل کر رکھی ہیں۔ ان قوتوں ہی کے سبب میں اپنے سرکش جذبے کا رخ موڑنے میں کامیاب ہوا ہوں لیکن جس طرح طوفانی دھاروں کا رخ تو موڑا جاسکتا ہے انہیں اپنی سمت میں نہیں چلایا جاسکتا اس طرح میں بھی دوبارہ نیکی و پارسائی کی راہیں داخل نہیں ہو سکتا۔"

تہان نے اچھے ہوئے لمحے میں کہا۔ "اگر مجھے صاف گوئی کی اجازت ہے تو میں کہوں گا کہ مجھے آپ کی باتوں کی سمجھ نہیں آ رہی۔"

روہتاس نے قدح میں سے چند گھونٹ نشہ آور مشروب کے لیے اور بولا۔ "دیکھو دوست! میں سادہ یا غیب دانی کا دعویٰ یا رخصت اور نہ ہی دعویٰ کرتا ہوں کہ میں کسی غیر انسانی صلاحیت کا مالک ہوں۔ میرا دعویٰ صرف یہ ہے کہ پرسوں کی ریاضت اور نفس کشی نے میرے اندر کچھ روحانی طاقتیں بیدار کر دی ہیں۔ یہی نگاہ معاملات اور حالات کی تہ تک پہنچتی ہے" میں ان پر بے پناہ غور و فکر کرتا ہوں اور بعض اوقات کوئی واقعہ رونما ہونے سے پیشتر ہی میرا ذہن اس کی پیش گوئی کر دیتا ہے۔ اور یہ پیش گوئی کبھی غلط ثابت نہیں ہوتی پھر اس پیش گوئی کی روشنی میں میں آمد، حالات کا سامنا کرنے کی تیاری کرتا ہوں اور اپنی مضبوط قوتِ ارادی کے سبب خود کو صورتِ حال کے مطابق ڈھال لیتا ہوں۔ وہ حسین و جمیل چہرہ جس کا تم ذکر کر رہے ہو اس وقت دمشق میں ہی ہے۔ وہ ایک زندہ دیوی ہے جو سرزمینِ دمشق کے ایک قدیم ترین معبد میں بھی ہوئی ہے۔ میں اس دیوی کو حاصل کرنے کی کوشش کر سکتا تھا لیکن مستقبل کے آئینے میں میں دیکھ رہا تھا کہ اس کو ہر نایاب کے حصول کی راہ میں ان گنت رکاوٹیں ہیں۔ برسوں کی تربیتیں۔ زخموں کے انبار ہیں اور وہی ریاضتیں ہیں جو خون جگر پیچتی ہیں، تم دل کھاتی ہیں اور اہر تیل کی طرح زندگی کی ہر کوئیل کو ڈھانچتی چلی جاتی ہیں۔ میں اس حسین بے مثال کو حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن میرے پاس اتنا خون جگر نہیں تھا کہ عشق کے عفریت کو پلا سکتا اور نہ اتنی زندگی تھی کہ اس حسن کی دیوی پر مرثیے کاغذ اور کرسک۔ لہذا میں نے اپنی تھوڑی

روز سے پہلے اس فوجی چوکی سے روانہ نہیں ہو سکے۔

تابان کے لیے اس بات میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ روہتاس ماراشی کی ذکر کر رہا ہے۔ ماراشو درمیں تھی اور جس کی پوجا جسکی عظیم دیوی کی طرح کی جا رہی تھی۔ روہتاس بتا رہا تھا کہ اس دیوی کے حصول میں ان گنت رکاوٹیں ہیں۔ اس کی تمنا خون جگر کی قربانی مانگتی ہے اور اس کا عشق جان کنی کے مسلسل عذاب کے سوا اور کچھ نہیں۔ نہ جانے کیوں یہ باتیں سن کر تابان کی رگ و پے میں سنسنی سی پھیل گئی۔ ایک انگ سی اس کے سینے میں لہرس لینے لگی، ایک مستی سی دل و دماغ پر چھانے لگی۔ اپنے بے مثال و یکسا محبوب کی راہ میں اذیتیں سننے اور کرب جھیلنے کا تصور اس کے لیے اتنا دلکش تھا کہ وہ جھوم کر رہ گیا۔ وہ دل ہی دل میں پکارا۔ ”تیری زبان مبارک ہو اترواں! کاش مجھ پر وہ سب کچھ بیٹے جو تیری مستقبل میں آنکھ نے دیکھا ہے۔ ماراشی کا خطر میرا جسم جان لیوا اذیتیں سے۔ میں اپنے ہی لہو میں تیر کر اس کے قدموں تک پہنچوں اور وہ اپنے غلام کو ایسی دگرگوں حالت میں دیکھے کہ اس پر مہربان ہوئے بغیر وہ ہی نہ سکے۔“

تباہ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ مگر ابھی وہ روپاس سے کہنے کے لیے ابوابی کلمات مرتب ہی کر رہا تھا کہ اس کی نگاہ خیمے کے دروازے سے باہر گئی۔ وہ یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ آسمان پر تاروں کی قدیمیں تیزی سے بچھ رہی ہیں۔ ایک تند و تیز آمدنی افق کو ڈھا پتی چلی آرہی تھی..... روپاس کی پیش گوئی تباہ کے کانوں میں گونجنے لگی۔ یہ پیش گوئی روپاس نے اس وقت کی تھی جب فلک پر باد و باران کا شائبہ تک نہیں تھا۔ روپاس ٹیکسی نظروں سے تباہ کے چہرے کی حیرت پڑھ رہا تھا۔ آہستگی سے ہوا۔ ”میرا خیال ہے یہ طوفان باد و باران بست زور پکڑے گا۔ تم تین روز سے میشر میاں سے روانہ نہیں ہو سکو گے۔“

☆ ~~~~~ ☆ ~~~~~ ☆

روہتاس کا کما بالکل درست ثابت ہوا۔ شب بھر شدید بارش اور شمالی ہوائی ہواؤں نے بھی اودھم مچائے رکھا۔ عمودی پہاڑوں سے نکلنے والا واحد راستہ توڑے گرنے سے بند ہو گیا۔ اگلی شب تابان نے فیصلہ کیا کہ وہ ایک طویل چکر کاٹ کر شمال مشرق کی طرف سے نکل جائیں گے لیکن اسی شب ہوشمند کو تیز بخار نے آیا اور وہ پورے دو روز نیم بے ہوش پڑا رہا۔ روہتاس کی یہ پیش گوئی بھی درست ثابت ہوئی تھی۔ وہ چار

محیط ہیں۔ جو کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں، سوتے ہیں نہ بے مقصد زبان کھولتے ہیں۔ وہ بوڑھے نیکی کے دیوتا مزد سے براہ راست ہم کلام ہوتے ہیں۔ وہ ہمہ وقت ایک پراسرار دھند میں چھپے رہتے ہیں اور اسی دھند کے اندر ضرورت مندوں کی حاجات سنتے ہیں۔ یہ اور ایسی ہی افسانوی باتیں تہاں نے اس آتش کدے کے بارے میں سیں اور اس مقام کو دیکھنے کی خواہش اس کے اندر شدید تر ہو گئی۔

ایک شب دمشق کی ایک مسافر سرائے میں بسر کرنے کے بعد وہ اس قدیم آتش کدے کی جانب چل دیے۔ یہ ایک حسین اتفاق تھا کہ نوروز کی بندش کے بعد آج ہی آتش کدے کے دروازے کھلتا تھا۔ وہ چلتے رہے، آخر ایک مخصوص مقام پر پہنچ کر انہوں نے عام لوگوں کی طرح سواری کے جانور چھوڑ دیئے، جوتے اتار دیئے اور ننگے پاؤں و ننگے سر آتش کدے کی طرف روانہ ہو گئے۔ گھنے درختوں کے اندر ایک بیل کھاتا نیم پختہ راستہ دور تک چلا گیا تھا۔ اس راستے کے آخر میں لکڑی کا ایک بیل جمیل مقام سے گزرتا تھا۔ جمیل کے فوراً بعد وہ پُرخطر ڈھلوان شروع ہو جاتی تھی جو اب تک نہ جانے کتنے آتش پرستوں کی بھینٹ لے چکی تھی۔ یہاں تہاں نے پتھروں اور چٹانوں پر جانبا انسانوں اور جانوروں کی اشکال کندہ دیکھیں۔ ان میں سے بعض مناظر دلچسپ تھے بعض خوفناک اور بعض شرمناک۔ آخر انہیں بھورے پتھر سے بنی ہوئی ایک وسیع و عریض عمارت کی جھلکیاں دکھائی دینے لگیں۔ اس عمارت کے بلند و بالا دروازوں کے سامنے منڈے ہوئے سروں اور گھروا پنھنوں والے لٹھے بردار محافظ کھڑے تھے۔ وہ اپنی تیز ٹیکھی نگاہوں سے ہر آنے جانے والے کو دیکھ رہے تھے۔ نہ جانے کیوں تہاں کو محسوس ہوا کہ اس عمارت میں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آچکا ہے۔ کوئی ایسا واقعہ جس کے زونما ہونے کے بعد ان در و دیوار سے ایک طرح کی کرنٹلی ٹپک رہی ہے اور یہاں کی گھران لگائیں برسے کی طرح ہر زائر کے بدن میں گھس رہی ہیں۔ تہاں اور ہوشمند زائرین کی ایک ٹولی میں شامل ہو کر یہ آسانی آتش کدے میں پہنچ گئے۔ ان دونوں کے خد و خال ایرانی تھے لہذا کسی کو شبہ تک نہیں ہوا۔ آتش کدے کے وسیع و عریض احاطے میں پجاریوں اور زائرین کا ہجوم تھا۔ احاطے کے وسط میں ایک بلند ستون پر آگ کا الاء روشن تھا۔ آتش پرست اس آگ کے نیچے مختلف مذہبی رسومات ادا کر رہے تھے۔ جالی بھی آتش پرست تھا اور ان تمام رسومات کے متعلق جانتا تھا۔ تہاں اور ہوشمند خاموشی سے اس کی تقلید کرنے لگے۔ فیروزی پتھر سے بنی ہوئی ایک طویل راہداری میں لوگ تیزی سے قدم

اٹھاتے اندرونی حصے میں جا رہے تھے۔ ان کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ کسی مقام پر بروقت پہنچنا چاہتے ہیں۔ شاید کوئی عبارت ہونے والی تھی۔ تہاں نے سرگوشیوں میں جالی سے پوچھا۔ جالی نے بتایا کہ جب سورج نصف النہار پر آئے گا اور سح زہن پر ہر پتہ کا سایہ مختصر ترین رہ جائے گا تو معبد کے عمر رسیدہ کاہن، معبد کے مرکزی ایوان میں عقیدت مندوں کو دیدار کا شرف بخشیں گے۔ ان کے ساتھ معبد کی سرکردہ دیوی بھی ہوگی۔

سرکردہ دیوی کا سن کر تہاں کا دل یکبارگی دھڑک اٹھا۔ جیسے پلٹیاں توڑ کر سینے سے باہر آ جائے گا۔ تو کیا وہ ابھی تھوڑی دیر بعد شہزادی مارشا کو دیکھ سکے گا؟ یہ سوال اس کے ذہن میں ابھرا اور سر تپا سنسنی کی تند و تیز لہر دوڑ گئی۔ اس نے جالی سے پوچھا۔

”تم جانتے ہو سرکردہ دیوی کون ہے؟“

”میں اس معبد میں پہلی مرتبہ آیا ہوں۔“ جالی نے جواب دیا۔

تہاں نے پوچھا۔ ”کیا ہر معبد میں اس طرح دیویاں لوگوں کے سامنے آتی ہیں؟“ جالی کا جواب نفی میں تھا۔ وہ بولا۔ ”بنیادی طور پر آتش پرستی میں دیوی دیوتاؤں کی پوجا نہیں ہوتی لیکن اب ہمارے اندر بت سے فرقت بن چکے ہیں۔ ہمارے پیشوائے اعلیٰ زرتشت نے مقدس کتاب کا تھا چھوڑی تھی۔ اب اس کتاب میں بت سی تبدیلیاں ہو چکی ہیں اور بعض فرقے آگ کے علاوہ بتوں اور اجرام فلکی کی پرستش بھی کرتے ہیں۔“ اچانک جالی کو سلسلہ کلام منقطع کرنا پڑا۔ طویل راہداری کی جانب سے گھنٹیوں کی مدہم آواز ابھری تھی۔ یہ آواز دھیمی ہونے کے باوجود اپنے اندر گونج رکھتی تھی اور یوں لگتا تھا معبد کے ہر پتھر سے پھوٹ رہی ہے۔ جالی نے کہا۔ ”جلدی چلے ورنہ پھر ایوان کے دروازے بند کر دیئے جائیں گے۔“ وہ تیزی تیزی سے راہداری میں پہنچے۔ اب لوگ بچنے فرش پر ننگے پاؤں بھاگنے لگے تھے، وہ بھی دوڑ پڑے۔ انہیں اپنے سامنے ایک بت بڑا محرابی دروازہ نظر آیا۔ یہ دروازہ اخروٹ کی لکڑی کا تھا اور اس پر بائیں دانت سے دیدہ زیب گلاباری کی کٹی تھی۔ وہ اس دروازے سے اندر گئے تو اپنے سامنے ایک وسیع و عریض ایوان پایا۔ اس کی بے ستون چھت جیسے آسمان سے بائیں کر رہی تھی۔ دیواروں سے رنگین روشنی پھوٹی تھی اور طائفانوں میں خوشبودار چراغ جل رہے تھے۔ ایوان کی مشرقی جانب ایک مستطیل حوض ایک دیوار سے دوسری دیوار تک چلا گیا تھا۔ اس حوض کے پانی میں پھول تیر رہے تھے اور رنگین پھولیاں تھیں۔ ایوان میں موجود ہر شخص نہایت خاموشی اور احترام سے حوض کے اس پار ہموار دیوار کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک ایوان

میں موجود روشنیوں گل ہو گئیں۔ فقط طاقتوروں میں مسکتے چراغوں کی مدہم روشنی باقی رہ گئی۔ یہ روشنی خوابناک تھی اور اس کے سبب ایوان کی قدیم دیواروں پر حاضرین کے سامنے نمودار ہو گئے تھے۔

ہوشمند نے کہا۔ ”کچھ ہونے والا ہے غالباً..... اس سیاہ دیوار کے اندر سے یا غالباً پیچھے سے کچھ برآمد ہو گا۔“ ان دنوں ہوشمند کا تکیہ کلام ”غالباً“ تھا۔ اس کے تکیہ کلام کی بڑی صفت یہی تھی کہ وہ وقتاً فوقتاً بدلتا رہتا تھا۔ جب سننے والے ایک لفظ سے مانوس ہونے لگتے تھے کوئی دوسرا لفظ اس کی زبان پر چڑھ جاتا تھا۔ روشنیوں گل ہوتے ہی گھنٹیوں کی آواز بھم گئی اور اس کے بعد ایک ایک ایوان کی سیاہ دیوار درمیان سے شق ہو گئی۔ ایک مہیب آواز کے ساتھ دیوار کے دونوں حصے زمین پر دوں کی طرح اطراف میں گم ہو گئے۔ تہا بن کو اپنے سامنے ایک بلند چوڑے دکھائی دیا۔ اس چوڑے کے ارد گرد گلابی دھند کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ دھند کے اندر سے ایک بارعب آواز ابھری۔

”روئے زمین کے تاریک غاروں اور نمناک گھاؤں میں زندگی اور نیکی کی جوت جگنے والے دیوتا رمزد کا شکر ادا کرو جس نے اپنے خاص بندوں کو دانائی کے خزانے سونپے ہیں۔“

اس آواز کو سننے ہی لوگ نجدے میں گر پڑے اور مناجات پڑھنے لگے۔ کتنی ہی دیر اسی عالم میں گزر گئی۔ تہا بن کے پہلو میں ہوشمند تھا۔ وہ نجدے میں گرا ہوا بے قراری سے پہلو بدل رہا تھا۔ تب ایک دوسری آواز ایوان میں ابھری اور بلند چھت سے ٹکرا کر دیر تک گونجتی رہی۔ یہ فارسی کی کوئی منظوم دعا تھی۔ تہا بن کو اس کا مضمون سمجھ میں نہیں آیا۔ تاہم آواز کے ابھرے ہی نجدے زائرین کی گریہ و زاری بھم گئی اور انہوں نے سر اٹھا کر چوڑے کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ وہاں لمبی سفید داڑھیوں اور منڈے ہوئے سروں والے چند بوڑھے براہمن تھے۔ ان کے جسموں پر زرد تار گہروا چنے تھے گلے میں عجیب و غریب مالا میں تھیں اور ان سب نے ایک ہی آسن بنا رکھا تھا۔ بوڑھوں کے عقب میں ایک زرنگار نشست پر معبد کی سب سے بڑی دیوی براہمن تھی۔ اسے دیکھ کر تہا بن کے دل کا دیا بجھ گیا اور سینہ کسی دیران مرد کی طرح اداس رہ گیا۔ وہ دیوی ”مارشا“ نہیں تھی۔ وہ کوئی نہایت حسین و جمیل ایرانی لڑکی تھی۔ اس کے چہرے کی رعنائیوں پر شاعر قہیدوں کے انبار لگا سکتے تھے اور مصور رنگوں کے دریا بہا سکتے تھے۔ لیکن وہ مارشا نہیں تھی۔ اس کا پرچہ بھی نہیں تھی۔ وہ کسی موتی کی طرح

ساکت و جامد بیٹھی تھی۔ اس کی پُرکشش نگاہیں دھند کے رنگین مرغلوں میں سے گزرتی ہوئی زائرین کے ہجوم کو دیکھ رہی تھیں۔ اپنے ہر مرد و زن کے چہرے کو جانچ رہی ہوں۔ پھر تہا بن کو محسوس ہوا کہ وہ اس کی طرف دیکھ رہی ہے، اس کی آنکھوں میں جھانک رہی ہے۔ شاید یہ اس کا وہم تھا۔ وہ کتنی ہی ابرہام اور یقین کے دھندلکے میں بھٹکتا رہا۔ پھر اچانک اسے اپنے کندھے پر ہاتھ کا دیاؤ محسوس ہوا۔ یہ ہوشمند تھا۔ سرگوشی میں بولا۔

”نہا بنیں نیچی رکھو۔ یوں بے پاکی سے دیکھنا مصیبت کا باعث بن سکتا ہے غالباً۔“

تہا بن نے اس کی ہدایت پر عمل کی ضرورت نہیں سمجھی اور اٹھا کر سے چوڑے کا ہاتھ لیتا رہا۔ آتش پرستوں نے چند روم ادا کیں۔ اس کے بعد دیوار پھر متحرک ہو کر بند ہو گئی۔ رنگین روشنیوں جگمگا انھیں اور گھنٹیوں کی صدا ایوان میں گونجنے لگی۔ ایوان کے محرابی دروازے کھول دیئے گئے تھے۔ لوگ جوق در جوق مختلف دروازوں سے گزرنے لگے۔ ایک دروازے پر خاص طور پر بہت ہجوم تھا۔ تہا بن ہوشمند اور جالی بھی اس کی طرف بڑھے۔ ایک بل کھاتی راہداری سے گزر کر وہ ایک کچے احاطے میں نکل آئے۔ یہاں پتھر کی بڑی بڑی سلوں کا فرش تھا۔ ایک طرف تھوڑے تھوڑے فاصلے پر تین قربان گاہیں بنی ہوئی تھیں۔ اس کے قریب ہی ایک پھانسی گھاٹ تھا۔ پھانسی گھاٹ پر ایک زخم خوردہ لاش جھول رہی تھی۔ لاش کی دونوں آنکھوں میں دو نیلے یوں بیست تھے کہ کھوپڑی توڑ کر عقب سے باہر نکل آئے تھے۔ لاش کے ہاتھ پاؤں کٹے ہوئے تھے اور چیت چاک تھا۔ دو مردار خور گدہ پھانسی گھاٹ کے چوٹی شہتیر پر بیٹھے تہک تہک کر بد نصیب شخص کے سر کو ٹھکور رہے تھے۔ کچھ گوشت خور پرندے قریبی درختوں پر بھی موجود تھے۔ تہا بن اور ہوشمند یہ دیکھ کر ششدر رہ گئے کہ یہ لاش کاہن خاتام کی ہے..... وہی خاتام جسے چند روز پہلے بوڈرکرت سمیت اسی پہاڑی سرائے میں چھوڑ آئے تھے۔ ان دونوں کے گھوڑے ابھی تک تہا بن اور ہوشمند کے پاس تھے۔ تہا بن کو یقین نہیں آیا کہ یہ خاتام ہے جو تہ صرف یہاں پہنچ چکا ہے بلکہ کسی سانے کا شکار ہو کر راسی عدم بھی ہو چکا ہے۔ ہوشمند کی فیرت زدہ نگاہیں کبھی تہا بن اور کبھی لاش کی طرف اٹھتی تھیں۔ وہ سرگوشی میں بولا۔

”غالباً تم بھی وہی دیکھ رہے ہو جن میں دیکھ رہا ہوں۔“

تہا بن نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر اس نے سرگوشی میں ایک قریب کھڑے شخص سے پوچھا۔ ”یہ کون ہے؟“ وہ نفی میں سر ہلانے لگا۔ تہا بن کی طرح وہ بھی لاعلم تھا لیکن

جب ہوشمند نے ایک دوسرے شخص سے پوچھا تو اس نے مطلوبہ معلومات فراہم کر دیں۔ اس نے کہا۔

”یہ طلایہ گرد (فونی جاسوس) ہے۔ پرسوں شام یہ اور اس کا ایک ساتھی آتش کدے کے ارد گرد منڈلا رہے تھے۔ محافطوں نے مشکوک جان کر انہیں لٹکارا تو بھاگ کھڑے ہوئے۔ کوشش بسیار کے بعد محافطوں نے اسے شدید زخمی حالت میں پکڑ لیا۔ بعد اس کا ساتھی بھاگنے میں کامیاب رہا۔ جرم ثابت ہونے پر اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے گئے اور آنکھوں میں نیزے گاڑ کر یہاں لٹکا دیا گیا۔ دوسرے شخص کی تلاش جاری ہے۔“

اب تہاں کی سمجھ میں یہ بات آ رہی تھی کہ آتش کدے کے گیر دوا پنوں والے چوکیدار اتنے چوکس کیوں نظر آ رہے ہیں۔ یقیناً انہیں مزید طلایہ گردوں کا خدشہ تھا۔ تہاں نے دیکھا تو مندمند چوکیدار لمبے لمبے ڈگ بھرتے یہاں وہاں چکرا رہے تھے۔ ان کی تیز نگاہیں ہر چہرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ہوشمند نے تہاں کے کان میں سرگوشی کی۔

”غالباً تم دیکھ ہی رہے ہو۔ یہاں غالباً بڑی کڑی نگرانی ہو رہی ہے۔ بہتر ہے کہ فی الحال یہاں سے نکل چلیں۔“

تہاں کے جواب دینے سے پہلے ہی ایک عجیب وضع کا اظہار بچنے لگا۔ اس آواز کے ساتھ ہی جھوم میں جنش پیدا ہوئی۔ جالی نے سرگوشی کی۔ ”عبادت اور زیارت کا وقت ختم ہوا۔ اب ہمیں واپس جانا ہو گا۔“

واپسی کا سن کر تہاں کے سینے میں گھونسا سا لگا۔ وہ کیسے واپس جاسکتا تھا۔ وہ ان در و دیوار سے..... اس مقام سے کیسے واپس جاسکتا تھا؟ زندگی میں پہلی بار تہاں کو احساس ہوا کہ محبوب سے وابستہ ہر شے محبوب ہو جاتی ہے۔ اس نے یہاں آکر شہزادی مارشا کا دیدار نہیں کیا تھا؟ اس کی آواز نہیں سنی تھی۔ اس کی جھلک تک نہیں دیکھی تھی۔ صرف اسے اتنا معلوم تھا کہ مارشا ان در و دیوار میں موجود ہے۔ اس گل بدن کی منک ان فضاؤں میں چکرا رہی ہے۔ اس آگاہی کے سبب یہ در و دیوار اور یہ فضاں اس کے لیے دنیا کی ہر متاع سے قیمتی ہو گئی تھیں..... اس نے گریزاں نظروں سے آتش کدے کے بیرونی دروازوں کی طرف دیکھا۔ ایک آواز بے اختیار اس کے ہونٹوں سے نکلی۔

”نہیں ہوشمند! میں واپس نہیں جاسکتا۔“

ہوشمند نے کڑی نظروں سے اسے گھورا۔ ”تباہ! غالباً یقیناً تمہارا دماغ خراب ہو گیا

ہے۔“

”یہی سمجھ لو۔“ تہاں نے جواب دیا۔ ”اگر تم جانا چاہتے ہو چلے جاؤ..... لیکن مجھے یہیں رہنا ہے۔“ عقیدت مند احاطے سے لٹکنا شروع ہو گئے تھے۔ ہوشمند نے اسے سمجھانے بجائے کی کوشش کی۔ ”دیکھو اتنے جلد باز مت بنو ایک جلد باز شخص کا انجام تم دیکھ ہی چکے ہو۔ کل ہم میں سے کسی ایک کی لاش بھی اسی چوبلی شہتیر سے جمبولکتی ہے ہمیں یہاں بہت بھونک بھونک کر قدم رکھنا ہو گا۔“ وہ تادیر تہاں سے سرکھپائی کرتا رہا لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ اسے خطرہ پیدا ہوا کہ تہاں کے ساتھ ساتھ وہ بھی پکڑا جائے گا اور دونوں بے بس ہو کر رہ جائیں گے۔ ایک گھبرائی ہوئی طیش آمیز نگاہ تہاں پر ڈال کر وہ بیرونی دروازے سے باہر نکل گیا۔ تہاں بڑے اطمینان سے پتھر کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ چکا تھا۔ ایک عجیب بے خودی سی اس پر طاری ہو رہی تھی۔ وہ ہر فکر سے آزاد تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد ایک محافط نے اسے اپنے وزنی لٹھ سے شوکا دیا۔ ”کیا بات ہے؟“ کیوں بیٹھے ہو یہاں؟“ وہ قاری میں ترش روئی سے بولا۔

تہاں نے کہا۔ ”میں بڑی دور سے اور بہت مشکلوں سے یہاں پہنچا ہوں اب اس دہلیز کو چھوڑ کر نہ جاؤں گا۔“

محافط نے آنکھیں نکالیں۔ ”کیا کہا تم نے!“ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنا لٹھ دونوں ہاتھوں میں بلند کر لیا۔ انداز ایسا ہی تھا کہ تہاں کا سر کھول دے گا۔ ایک دوسرا محافط لپک کر آگے آیا اور اس نے پہلے کو لٹھ چلانے سے روک دیا۔ ”کیا بات ہے؟“ اس نے ذرا تھکسانہ لہجے میں پوچھا۔

پہلا محافط بولا۔ ”کہتا ہے میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ میرے گلے بھی کر دو گے تو یہیں بیٹھا رہوں گا۔“ محافط نے چند الفاظ اپنی طرف سے بھی جوڑ دیئے تھے۔

دوسرے محافط نے تہاں سے پوچھا۔ ”کیا تم نے ایسا کہا ہے؟“

”ہاں..... کہا ہے۔“ تہاں نے جواب دیا۔ ”اس معبد سے باہر دنیا میرے لیے

ویران ہے۔ میں ایک ادنیٰ خدمتگار بن کر اس چار دیواری میں رہنا چاہتا ہوں۔“

”بکواس بند کرو۔“ نووارد محافط غرایا۔ ”اس معبد کی ”خدمت“ کوئی گری پڑی چیز

نہیں کہ اشعار ہر سوالی کو سوئپ دی جائے۔ اس اعزاز کو پانے کے لیے ایک عمر درکار ہوتی ہے اور کڑی آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے۔“

"میں ہر آزمائش کے لیے تیار ہوں۔" تباہان نے جواب دیا۔

"مجھے تو کوئی دیوانہ لگتا ہے۔" ایک محافظ نے تباہان کی ہٹ دھرمی پر تبصرہ کیا۔

"یہ یوں نہیں مانتے گد۔" پہلے محافظ نے غرا کر کہا اور لٹھ کھاکر زور سے تباہان کی

بیٹھ پر رسید کیا۔ تباہان کے ہونٹوں سے کراہ نکلی لیکن وہ اپنی جگہ جمنا بیٹھا رہا اس کی ثابت

قدی دیکھ کر محافظ ٹپٹس میں آ گئے۔ وہ سب تباہان پر پل پڑے اور ہر دستیاب شے سے

اسے پیٹنے لگے۔ احاطے میں کھلبلی مچ گئی۔ جو لوگ احاطے سے نکل چکے تھے وہ ہنگام

بھاگ کر واپس آئے گئے۔ محافظ ان پر برس پڑے اور لاشیوں سے انہیں باہر دھکیلتے

گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں تباہان بے سندھ ہو گیا۔ اس کے چہرے اور جسم کے کئی حصوں

سے خون بہہ رہا تھا۔ محافظوں نے اسے ٹانگوں سے پکڑ کر کسی غلیظ جانور کی طرح گھینٹنا

شروع کیا اور معبد سے باہر لایا۔ شاید وہ جھنجھلاہٹ کے زیر اثر اسے کسی کھائی ہی میں

دھکیل دیتے لیکن سردار محافظ نے انہیں منع کیا اور وہ اسے زندہ چھوڑ کر چلے گئے۔

تباہان بے ہوش تو نہیں تھا لیکن کچھ ایسا ہوش میں بھی نہیں تھا۔ اس کے سر پر لٹھ

کی چند شدید ضربیں آئی تھیں اور دماغ میں اب تک ستارے جھلما رہے تھے۔ لو کے

ڈانکے سے منہ ٹھنکنا ہو چکا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول کر اطراف کا جائزہ لیا۔ سورج کا

سرخ گولا دور مغربی پہاڑیوں کے عقب میں چھپ رہا تھا۔ اطراف میں درختوں اور

جھاڑیوں کے سائے طویل تھے۔ قریباً سو قدم دور اس پچھانی گھاٹ کا بالائی حصہ نظر آرہا تھا

جس پر تھوڑی دیر پہلے کاہن خاتم کی لاش جمول رہی تھی۔ اب وہاں کچھ نہیں تھا۔ تباہان

نے اپنی دھکتی گردن پر زور ڈال کر عقب میں دیکھا اور اسے معلوم ہوا کہ پچھانی گھاٹ

خالی کیوں ہے۔ خاتم کی لاش عام ملاحٹے کے بعد ان درختوں میں پھینک دی گئی تھی۔

اب مردار خور پرندے بڑے آزادی سے اسے فوج کھسوت رہے تھے۔ تباہان کے دیکھتے

ہی دیکھتے چند جنگلی کتے بھی ٹھیب سے نمودار ہوئے اور اس دعوت شراذ میں شریک ہو

گئے۔

تباہان آنکھیں نیم دوائے کج محویت سے اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ یہ وہی خاتم تھا

جسے صرف ایک ماہ پیشتر تباہان نے بڑی شان سے چلے کشی کرتے اور عقیدہ مندوں پر رعب

گاشتے دیکھا تھا۔ جب وہ اپنے ہاتھ اوپر اٹھاتا تھا تو کھلی آستینوں میں سے جلی ہوئی تڑاں

رسیدہ بانٹیں نمودار ہو کر عجب دہشت انگیز منظر پیش کرتی تھیں۔ اس دہشت ناک شخص

کا انجام جتنا اچانک تھا اتنا ہی عبرتناک بھی تھا۔ یقینی بات تھی کہ وہ اور بو زکرت، مارشا کی

جنتو میں اس معبد تک پہنچے تھے۔ اپنے یونانی خدو خال کی وجہ سے دوراً محافظوں کی نگاہ

میں آ گئے۔ انہیں طلباء پر گرد سمجھا گیا اور اسی جرم میں خاتم کو سزائے موت دے دی گئی۔

سورج غروب ہونے کے تھوڑی دیر بعد قرب وجوار میں اندھیرا اتر آیا اور معبد کی

بلند و بالا برجیوں اور پراسرار گنبدوں کے جھروکوں سے روشنی نظر آنے لگی۔ تباہان اٹھا

اور ایک تناور درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کا رخ معبد ہی کی طرف تھا۔ رخ بستہ

ہوا اس کے بدن کو چھیدی گزر رہی تھی اور زخموں سے اٹھنے والی لمبیں شدید تر ہو رہی

تھیں لیکن وہ اس سردی سے بچتا چاہتا تھا اور نہ اسے ان زخموں کے لیے مزہم درکار تھا۔

وہ ہواؤں میں مارشا کے بدن کی منک سونگہ رہا تھا اور بے خود ہوتا چلا جا رہا تھا۔

دیرے دیرے وقت کی رفتار اور حرکت اس کے لیے غیر اہم ہوتی جا رہی تھی۔ اسے

معلوم ہی نہیں ہوا کہ شب ڈھلی، کب دن نکل آیا اور کب اگلی شب کا اندھیرا پھر

ٹھیب و فراز کو ڈھانچے لگا۔ وہ عجب طرح کی خد اوڑھے اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ تیسرے

روز محافظوں نے آ کر اسے پھر مارا پینا اور اٹھا کر آتش کدے سے نصف کو س نیچے نم پتہ

راستے پر پھینک آئے۔ اس مرتبہ تباہان کو واقعی شدید چوٹیں آئی تھیں۔ اس کے لیے

اپنی ٹانگ کو حرکت دینا خاصا دشوار ہو رہا تھا۔ وہ پورے آٹھ پیرانی راستے کے کنارے

بھوکا پیاسا پڑا رہا۔ زخموں سے خون رستا رہا اور چوٹوں سے اس کے جسم پر چلتے رہے۔ آخر وہ

پھر اٹھا اور ہمت کر کے معبد کے سامنے پہنچ گیا۔ کوئی مقناطیسی کشش اسے ان دیواروں کی

طرف کھینچ رہی تھی۔ وہ چاہتا بھی تو واپس نہیں جاسکتا تھا۔ وہ چار یوم سے بھوکا تھا۔

رات ہوتے ہی اس پر نقاہت غالب آ گئی اور وہ معبد کے جھروکوں سے پھوٹی رنگین

روشنیوں کو دیکھتے دیکھتے خیند کی آغوش میں چلا گیا۔ خواب میں اس نے خود کو معبد پر یلغار

کرتے دیکھا۔ اس کے ساتھ سالار اعظم سکندر تھا، ہوشمند تھا اور سینکڑوں جنگجو سپاہی

تھے۔ وہ بلند معبد کی فصیل پر کندھے اوپر چڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے جسم پر تبرنگ کر

پھلوں کی طرح نیچے گر رہے تھے۔ پھر اچانک اس نے خود کو برف کے سمندر میں

دیکھا۔ "برف بدن" دیو نیکل چھلیاں اس پر جھپٹ رہی تھیں وہ ان سے بے سرسپیکار تھا اور

کورا کو صدا سمیں دے رہا تھا جو ابھی ابھی اس سمندر میں او جھل ہو گئی تھی۔ پھر اس نے

ایک زہ پوش جنگجو کو دیکھا۔ وہ ایک ایسے جانور پر بیٹھا تھا جس کا چہرہ عورت کا اور دھڑ

گھوڑے کا تھا۔ اس جنگجو کے جلو میں ایک لڈی دل لٹک رہا تھا۔ جنگجو پھر میرے اڑاتا

دریاؤں اور صحراؤں کو طے کرتا وہ کسی طرف بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ کسی شخص نے تباہان کو

کہ یہ شہشاہ ایران دارا ہے اور سکندر کی سپاہ کو تہ تیغ کرنے کے لیے جا رہا ہے۔

تہ جانے کب تک تہاں خوابوں کی اس بے ربط، نیم روشن دنیا میں گھومتا رہا
یہ ایک اس کی آنکھ کھل گئی۔ ایک بولا سا اس پر جھکا ہوا اسے جھنجھوڑ رہا تھا۔ تہاں کے
ذہن میں پہلا خیال یہ آیا کہ یہ ہوشمند ہے، جو اس کی خیریت دریافت کرنے کے لیے
چھپ چھپا کر یہاں تک پہنچا ہے لیکن جلد ہی اسے اپنا خیال ترک کرنا پڑا۔ اسے سنگتوں کی
مدہم ٹھنک سناٹی دے رہی تھی۔ اس پر جھکا ہوا یہو لاکسی عورت کا تھا۔ وہ جلدی سے اٹھ
کر بیٹھ گیا۔ آنکھیں سکوڑ کر غور سے اس نے دیکھا۔ اس کے سامنے ایک کینیز صورت
لڑکی کھڑی تھی۔ اس کے جسم پر معبد کا مخصوص گہرا لباس تھا اور کھلے ریشمی بال ہوئے
ہوئے ہوا میں لہرا رہے تھے۔

”کون ہو تم؟“ تہاں نے پوچھا۔

”آئیے میرے ساتھ آپ کو دیوی بلا رہی ہیں۔“ ایک ریلی آواز تہاں کے کانوں
میں پڑی اور اس کا دل شدت سے دھڑک اٹھا۔

”کون دیوی؟“ اس نے بے ساختہ پوچھا۔

”مجھے صرف آپ کو بلانے کا حکم ہے۔“ کینیز بولی۔ ”باقی سب کچھ آپ کو وہاں
جا کر معلوم ہوگا۔“

تہاں بلا ارادہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اس وقت اسے اپنی ٹانگ کی شدید چوٹ
بھی بھول گئی تھی۔ کینیز نے اپنے بازوؤں پر رکھا ہوا ایک تہ شدہ کھل کھولا اور تہاں کے
کندھوں پر ڈال دیا۔ ”آئیے میرے ساتھ۔“ اس نے دل پذیر آواز میں کہا اور تہاں کو
سہارا دینے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

”نہیں! میں چل سکتا ہوں۔“ تہاں بولا اور متوازن قدموں سے کینیز کے ساتھ ہو
لیا۔ کینیز اسے عبادت گاہ کے صدر دروازے کی طرف لے جانے کی بجائے ”دوسری سمت
لے کر گئی۔“ منقش تصویروں والی چند چٹانوں کے درمیان سے گزر کر وہ معبد کے پسلیوں میں
آگئے۔ یہاں پہنچ کر کینیز نے تہاں کے شانوں پر رکھا ہوا کھل اٹھا کر اس کا سر بھی ڈھانپ
دیا۔ وہ ایک چھوٹے سے دروازے میں سے گزر کر معبد کے احاطے میں آگئے۔ یہاں چند
محاذ موجود تھے لیکن مشعلوں کی روشنی میں کینیز کا چہرہ دیکھنے کے بعد انہوں نے کوئی تفرص
نہیں کیا۔ کینیز تہاں کو پچاسی گھاٹ کے عقب سے گزارتی ہوئی ایک تنگ و تاریک زینے
پر لے آئی۔ یہ زینہ بل کھاتا اوپر ہی اوپر اٹھتا چلا جا رہا تھا۔ تہاں کو لگا جیسے وہ کسی میار پر

جڑھ رہا ہے۔ آخر وہ ایک غلام گردش میں نکلے اور طویل فاصلہ طے کر کے اچانک ایک
نہایت آراستہ و پیراستہ کمرے میں پہنچ گئے۔ تہاں نے دیکھا، اس کے آلودہ پاؤں تھے دبیز
تالین تھے۔ پھت پر فائوس تھے اور دیواروں سے غیر مرمی روشنی پھرتی محسوس ہوتی تھی۔
کمرے میں سجاوٹ کے لیے سونے چاندی کے ظروف رکھے تھے اور ہیروں سے مرصع
پایوں والی نشستیں روشنی میں جگمگ رہی تھیں۔ یہ کمرانشت گاہ کے طور پر سجایا ہوا
تھا۔ تنگ تاریک بوسیدہ راستوں سے گزر کر دفعتاً اس آراستہ کمرے میں پہنچنا تہاں کو
ایسے ہی لگا جیسے کوئی ٹٹو سوار مسافر اچانک اڑن کھٹولے میں بیٹھ جائے۔ کمرے میں کئی
حسین و جمیل دوشیزائیں موجود تھیں ان کے چہرے شاداب اور ہونٹوں پر دلنشین
مسکراہٹیں تھیں۔ وہ سب معبد کے چند نمالہاس میں تھیں لیکن یہ لباس قیمتی کپڑے کا
تیار کردہ تھا اور اس پر حسب مراتب سنہری تاروں سے کام بھی لیا گیا تھا۔ تہاں کو یہاں
لانے والی دوشیزہ کا لباس بھی کاہلار تھا۔ گو ان دوشیزائوں کے چہرے بناؤ سنگھار سے محروم
تھے لیکن بیشتر صورتوں پر سادگی کا حسن ٹوٹ کر برس رہا تھا۔ انہوں نے تہاں کو ایک
آرام دہ نشست پر بٹھایا۔ اس کے بالائی جسم سے پھنپھرائے ہوئے آلودہ لباس اتار دیا گیا۔ جھکے
ہوئے نرم و گداز کپڑوں سے اس کے چہرے اور جسم سے میل پچھل ایسی ملائمت سے
صاف کی گئی کہ زخموں کو کوئی گزند نہیں پہنچتا اب اسے ایک نیا لباس پہنایا گیا اور بال وغیرہ
ستوار کر کسی کی خدمت میں حاضر کرنے کے لیے تیار کر دیا گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد تہاں ایک ایسے عالیشان کمرے میں کھڑا تھا جس کے ماحول پر
کسی رنگین خواب کا لہان ہوتا تھا۔ اس کمرے کی آرائش فشت گاہ کی آرائش سے کئی
گنا بڑھ کر تھی۔ گلابی رنگ کی ایک خوشبودار دھندلے کمرے میں پہلی ہوئی تھی۔ اسی طرح
کی دھند تہاں نے چار روز پہلے ایوان خاص کے پراسرار چہوڑے پر دیکھی تھی۔ یہ دھند
اتنی گہری نہیں تھی جتنی دور سے نظر آتی تھی۔ اس میں سانس لیتے ہوئے ایک طرح
فرحت کا احساس ہوتا تھا اور آنکھوں میں خوشگوار غمگنک اتر آتی تھی۔ تہاں نے بغور
دیکھا تو سامنے ایک زرنگار تخت پر کوئی بیٹھا دکھائی دیا۔ وہ کوئی حسین دوشیزہ تھی۔ دھند
کے لطیف مرغلوں میں وہ یوں ڈوب ابھر رہی تھی کہ ایک بل میں حقیقت اور دوسرے
میں وہم دکھائی دینے لگتی تھی۔ یہ وہی دیوی تھی جو چند روز پہلے ”دیدار عام“ کے لیے
زارین کے سامنے آئی تھی۔ اس کا حسن آنکھوں کو خیرہ کر دینے والا تھا۔ سر تپاؤ بخشی لے
ساتنے میں ڈھلی ہوئی، گل بدن، پری چہرہ، آہو چشم، وہ مصور کائنات کا حسین شاہکار دکھائی

دیتی تھی۔

”بیٹہ جاؤ اجنبی۔“ اس کے یا قوتی لبوں نے حرکت کی اور تباہان کی سماعت میں بیسے سینکڑوں جلتنگ بج اٹھے۔ وہ جھجکا ہوا جھکا اور قائلین پر دو زانو بیٹھ گیا۔ دیوی نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”پچھلی عبادت میں ہم نے تمہیں ایوان عام میں دیکھا تھا۔ تم سب سے نمایاں نظر آتے تھے، کیونکہ سر اٹھائے کھڑے تھے اور ہماری جانب دیکھ رہے تھے۔ ہمیں تمہاری یہ برأت مندی اچھی لگی۔ کون ہو تم۔۔۔۔۔۔ اور کہاں سے آئے ہو؟“

یہ سوال تباہان کے لیے خاصا کٹھن تھا۔ وہ اس معبد کی اہم ترین شخصیت کے دربرو کھڑا تھا۔ زبان کی ایک لغزش اسے سخت سے سخت پر لا سکتی تھی۔ ”کون ہو تم اور کہاں سے آئے ہو؟“ دیوی کے سوال کی بازگشت تباہان کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ سوال پوچھنے کے انداز سے عیاں تھا کہ تباہان کی ظاہری حالت اور حیثیت کو تسلیم نہیں کیا جا رہا۔ چند لمحے شدید تنذیب میں رہنے کے بعد تباہان نے سچ آمیز جھوٹ بولنے کا فیصلہ کیا۔ وہ بولا۔

”اے مقدس دیوی! میں یونان سے آیا ہوں۔ ایجنز کے جنگجو مجھے بچپن میں غلام بنا کر سمندر پار لے گئے تھے۔ ایک طویل عرصہ تک میں نے یونانیوں کا ظلم و ستم سہا ہے۔ میں نے ان سخت مرتبہ وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی آخر کوئی ایک برس پیشتر اپنی کوششوں میں کامیاب ہوا اور ایک بحری جہاز پر چھپ کر یہاں تک پہنچ گیا۔ اب شر شر و قریہ قریہ اپنے وارثوں کو ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔۔۔۔۔۔“

تباہان کی بات سننے کے بعد دیوی نے کہا۔ ”ہمارا بھی یہی خیال تھا کہ تم طویل عرصہ کسی کی غلامی میں رہے ہو۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے خدا مائیں جب تمہارا بدن صاف کر دی تھیں تو انہیں تمہاری گردن کے عقب میں طوق کا گہرا نشان نظر آیا تھا۔“

تباہان کے سینے سے اطمینان کی طویل سانس خارج ہوئی۔ خود کو یونانی غلام تسلیم کر کے وہ نہ صرف ایک بڑی الجھن سے بچ گیا تھا بلکہ دیوی کی نگاہوں میں اس کا اعتماد بھی بحال ہوا تھا۔

دیوی اپنی خوبصورت جادوئی آواز میں گویا ہوئی۔ ”ہمیں افسوس ہے کہ معبد کے خدمتگاروں نے تم سے ناروا سلوک کیا اور جنگلی جانوروں کا لقمہ بننے کے لیے دیرانے میں پھینک دیا۔ ذبے دار لوگوں کو قرار واقعی سزا دی جائے گی۔ ہم معبد کے لیے تمہاری

والہانہ عقیدت سے متاثر ہوئے ہیں۔ تم منظور نظر پجاری کی حیثیت سے اب معبد کے اسی حصے میں رہو گے۔ اپنے لیے تم جس قسم کی خدمت چاہو جن سکتے ہو لیکن فی الحال تمہیں آرام اور اچھی خوراک کی ضرورت ہے۔ ہم نے خادموں کو ہدایت کر دی ہے، وہ ہر طرح تمہارا خیال رکھیں گی۔“

دیوی دیوتاؤں پر تباہان کو یقین نہیں تھا۔ وہ پیشتر مذہبی رسومات کو خرافات جان کر ان پر ہزار بار لعنت بھیجتا تھا۔ تاہم اس وقت دیوی کی خوشعودگی اس کی ضرورت تھی۔ اس نے ہاتھ ناف پر باندھ کر سردیوی کے حضور جھکایا اور بولا۔

”غلام کی زبان اظہارِ شکر سے عاجز ہے۔ اس معذوری کے لیے اسے معاف کیا جائے۔“ دیوی کی مہربان آنکھوں سے کچھ اور ملامت جھانکنے لگی۔ تباہان نے لمبے میں عقیدتیں سمیٹ کر کہا۔ ”دیوتا گواہ ہیں“ میں اس قابل تمہیں تھا کہ آپ جیسی عظیم المرتبت دیوی مجھے خاک سے اٹھا کر اپنے قدموں میں جگہ دیتی اور اپنی پاک نگاہوں کو میرے چہرے کی دید سے آلودہ کرتی۔۔۔۔۔۔“

دیوی نے کہا۔ ”اس کے لیے تمہیں ہم سے زیادہ مہادیوی مارشا کا شکر گزار ہونا چاہیے۔“

مارشا کا نام تباہان کے کانوں میں سماعت شکن دھماکے کی طرح گونجا۔ سینے کے اندر سے ایک سرد لہرائی اور سنسنی بن کر پورے جسم میں دوڑ گئی۔ ”م۔۔۔۔۔۔ مارشا!“ اس کے ہونٹوں سے بے اختیار نکلا۔

”ہاں مہادیوی مارشا۔ انہی کی ہدایت پر تمہیں معبد کے اندر لایا گیا ہے۔ وہ تمہاری حالت زار دیکھ چکی تھیں اور تمہاری دیوبگنی چاہتی تھیں۔“

تباہان پر شادی مرگ کی کیفیت طاری تھی۔ ذہن میں تند تیز آندھیاں چل رہی تھیں۔ وہ جیسے خواب میں گویا ہوا۔ ”لیکن۔۔۔۔۔۔ مہادیوی نے مجھے کیسے دیکھا؟“

دیوی بولی۔ ”جو انسان سے بالاتر ہوتا ہے اس کی نگاہ بھی وہاں تک دیکھتی ہے جہاں تک انسان نہیں دیکھ سکتا۔“

”کیا۔۔۔۔۔۔ کیا میں مہادیوی کو دیکھ سکتا ہوں؟“ تباہان گھٹکیا۔

”ہاں لیکن۔۔۔۔۔۔ چھ چاندوں کے بعد۔ جب بہار کے آغاز میں سالانہ عبادت کے موقع پر مہادیوی عام لوگوں کے سامنے آئیں گی۔“

”کیا۔۔۔۔۔۔ اس سے پیشتر یہ ممکن نہیں۔“

”نہیں.....“ دیوی نے جواب دیا۔ ”صرف ایک صورت ہو سکتی ہے کسی خاص سبب سے مہادیوی تمہیں خود اپنے حضور طلب کر لیں۔“

”اے قاتلِ صدِ احترام دیوی! کیا میری درخواست کسی طور مہادیوی کے کانوں تک پہنچ سکتی ہے؟“

ایکایک زر نگار تخت پر بیٹھی اور گلابی مرغلوں میں ذوقی ابھرتی دیوی کے تیور بدل گئے۔ وہ ترش آواز میں بولی۔ ”ہم تمہاری آنکھوں میں نادانی کی چمک دیکھ رہے ہیں۔ تمہارے لمبے سے ایک پجاری کی بجائے ایک مرد کے لمبے کی بو آ رہی ہے۔ اپنی زبان کو حرکت دیتے ہوئے یہ مت بھولو کہ تم جس ہستی کے بارے میں بات کر رہے ہو وہ تمہارے تصورات سے بھی ارفع و اعلیٰ ہے وہ نہ صرف اس معبد میں محترم ترین ہے بلکہ دیوتاؤں کی مجلس میں بھی اسے ایک نمایاں مقام حاصل ہے.....“

تہاں کو دیوی کی پرجہج دھمکی سمجھ میں نہیں آئی لیکن دیوی کے چہرے کی جلالی کیفیت اس کے لیے ناقابلِ فہم نہیں تھی۔ درحقیقت تہاں کے دل کا چور پکڑا گیا تھا۔ دیوی نے جو رد عمل ظاہر کیا وہ درست تھا۔ شہزادی مارشا کے بارے میں بات کرتے ہوئے تہاں کے ذہن میں ایک مقدس دیوی کا نہیں ایک ایسی دو شیزہ کا تصور تھا جو اس کے لیے دوسرے زمین پر محبوب ترین تھی اور جس کی قربت کی خاطر وہ آگ اور خون کے سمندروں میں سے رواں دواں گزر سکتا تھا۔ شاید یہی جذبات اس کی آنکھوں سے بھی چھٹک گئے تھے۔ دیوی کی تلخ نواہی نے تہاں کو ہونٹ سینے پر مجبور کر دیا۔ اس نے صورت پر ندامت طاری کی اور سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ کمرے میں تھوڑی دیر ایک نہایت بو جھل خاموشی طاری رہی۔ ایسی خاموشی جس میں دھڑکن سنائی دے اور سانس کی آمد و رفت صدا بن جائے۔ یوں لگا جیسے کائنات میں ہر شے سہم گئی ہے۔ اگر کوئی چیز متحرک ہے تو وہ گلابی دھند کے خوشبودار مرغولے ہیں یا دیوی کی وہ مرمرس انگلیاں ہیں جنہیں وہ دھیرے دھیرے اپنی ایک انگشتی پر حرکت دے رہی ہے۔ تہاں کی پیشانی سے پسینہ پھوٹ نکلا۔ وہ ایک ہمار اور بے خوف شخص تھا لیکن جس ماحول میں آگیا تھا۔ یہاں انہیت اور اسراریت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ کچھ معلوم نہیں تھا کس لمحے کیا ہو جائے۔ کس غلطی کی سزا میں آنکھوں سے نیزے گزار دیئے جائیں اور کس بات پر خوش ہو کر دیوتاؤں کا مقرب بنا دیا جائے۔ چند لمبے کے جاں گسل انتظار کے بعد دیوی کی نفرتی گفتنیوں جیسی آواز ابھری۔ اس کا لہجہ ایک بار پھر نرم اور دھیمہ تھا۔ وہ گفتگو کا موضوع

بھی بدل چکی تھی۔ اس نے کہا۔

”باہر کی دنیا کا کچھ حال اپنی زبان سے سننا۔ کہا جاتا ہے کچھ لوگ سکندر کو دیوتاؤں کا درجہ دے رہے ہیں کیونکہ اس نے گورڈیم کے مندر میں کھڑی گاڑی کا جوا کھولا ہے؟“

تہاں نے کہا۔ ”اے مقدس دیوی! بے شک ایسا ہوا ہے۔ غلام کسی اور رائے کا انصار تو نہیں کر سکتا لیکن اتنا ضرور جانتا ہے کہ سکندر مقدونی تیزی سے پیش قدمی کر رہا ہے اور مفتوحہ علاقوں میں لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں وہ اب باب بلیشائے گزر نے والا ہے۔ اس کا مطلب ہے بہت جلد ایرانی سپاہ سے اس کا بڑا معرکہ ہونے والا ہے۔“

تہاں کو دیوی کے چہرے پر عجیب سا رنگ نظر آیا۔ بے حد حسین و جمیل اور بارعب ہونے کے باوجود اس گھڑی وہ تہاں کو ایک عام سی دو شیزہ لگی۔ جو تہاں سے اس چار دیواری کے باہر کے حالات پر چو رہی تھی اور مستقبل سے آگاہی کی خواہشمند نظر آتی تھی۔ وہ سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ پتہ نہیں یہ کون لڑی ہے جسے مذہب کے خود ساختہ آقاؤں نے زرتار لیس پنا کر اور بھاری بھر کم زبردات سے لاد کر دیوی کی مندر پر بٹھادیا ہے اور اس کی معصوم فطرت کے گرد عزت و احترام کی اونچی دیواریں چن دی ہیں۔ اس گھڑی تہاں کو دمشق کے اس عظیم معبد کی یہ عظیم دیوی قابلِ رحم نظر آئی۔ اپنے ماحول میں گھٹی ہوئی، سہمی ہوئی اور گمراہ عقیدوں کی گلابی دھند میں گھنچے بھنچے کر سانس لیتی ہوئی۔

دیوی نے تہاں سے پوچھا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا واقعی سکندر یونانی دیوتا زیوس کا بیٹا ہے؟“

تہاں نے کہا۔ ”آپ کو میرا خیال جان کر یقیناً مایوسی ہو گی، کیوں کہ میں دیوی دیوتاؤں کو مانتا ہی نہیں ہوں..... ہاں میں نے یونان اور ایران میں عام لوگوں کو یہ ضرور کہتے سنا ہے کہ سکندر اوتار ہے اور وہ ایک روز پوری دنیا پر حکمرانی کرے گا۔“

دیوی اب بڑے غور سے تہاں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے جیسے لمبے میں پوچھا۔ ”تم دیوی دیوتاؤں کو کیوں نہیں مانتے؟ کیا تمہیں دیوتاؤں کے مظاہر نظر نہیں آتے؟ کیا اس معبد میں جو کچھ تمہیں نظر آ رہا ہے وہ غیر معمولی نہیں؟ یہ نفرتی گھنٹیاں؟ یہ دیواروں سے پھوٹی ہوئی روشنی؟ یہ گلابی دھند؟ یہ دیواروں کا شن ہونا؟ یہ پراسرار خوشبوؤں کا چکرانا.....“

تہاں نے اطمینان سے کہا۔ ”اگر آپ مجھے معاف کریں تو میں انہیں شعبہ کے کموں گا۔ یہ مظاہر نہیں ہیں کیونکہ ان کے پیچھے انسانی ہاتھ کار فرما ہے۔“

کو دیکھنے کے بعد آپ کو نہ دیکھنے کا غذاب تو نہ سہاڑتا۔ کاش..... اے کاش میری زبان کو اتنی سکت ہو کہ میں آپ کے حسن کی تعریف کر سکوں۔ اس درد کا مجرا بیان کر سکوں ہو آپ کی من موافق صورت دیکھنے کے بعد میرے دل میں جاگ اٹھا ہے۔"

اس نے خوش گفتاری کے دریا بہا دیئے۔ حسن و عشق سے متعلق بہترین الفاظ کو فقرات میں موتوں کی طرح پردہ کر انگلیں دیوی کے سامنے پیش کر دیا۔ وہ متزلزل ہونے لگی۔ اس کی حسین آنکھوں میں اضطراب تھا۔ یہ آنکھیں گاہے گاہے بے قراری سے دائیں بائیں دیکھنے لگتی تھیں۔ وہ جھکے جھکے انداز میں سبک مرمر کے تخت پر بیٹھ گئی۔ دھیمی آواز میں بولی۔

"گفتگو کرتے ہوئے تمہارے لیے لازم ہے کہ زبان کو قابو میں رکھو۔ اس جگہ کی اہمیت اور ہماری حیثیت کو بچاؤ۔ ہم کوئی عام دو شیرو نہیں ہیں جو تم قصیدہ گوئی سے ہماری سوچوں کی طنائیں اپنے ہاتھ میں لے لو گے۔"

تابان بولا۔ "یہ قصیدہ گوئی نہیں۔ میرے دل کی صدا ہے۔ میں اس بات کو فراموش نہیں کر رہا کہ آپ یہاں ایک معتبر و مقدس ہستی ہیں لیکن آپ بھی یہ مت بھولیں کہ آپ انسان ہیں..... آپ کو دیوی کہہ کر جو عزت و احترام بخشا جا رہا ہے اس نے آپ کو نیکر تما کر دیا ہے..... پھاڑ کی سب سے اونچی چوٹی کی طرح جو عظمت کا نشان ہوتی ہے لیکن اکیلی ہوتی ہے۔"

انگلیں دیوی کے چہرے پر مدو جزر تھا۔ تابان کی باتیں اس کے دل پر اثر کر رہی تھیں۔ تابان نے حوصلہ پاکر اس کے ہاتھ تھام لئے۔ اپنے لمبے میں بے پناہ عاجزی سمیٹ کر بولا۔ "اپنے خول سے نکلے۔ سونے چاندی کی ان منقش دیواروں کو اپنے اطراف سے ہٹا دیجئے۔ کھلی فضا میں سانس لیجئے..... ان دیواروں سے باہر ابھی دنیا حسین ہے پھولوں پر بھنورے مٹلاتے ہیں، چشموں میں پانی گنگناتا ہے اور پرندے مسرت و شادمانی کے گیت گاتے ہیں....."

"خاموش ہو جاؤ مہمان۔" انگلیں نے بے قراری سے کہا۔ "تم یہاں کے دستور سے واقف نہیں۔ تمہیں معلوم نہیں یہاں بغاوت کرنے والوں سے کیا سلوک کیا جاتا ہے۔ دیوتاؤں کا احسان مانو کہ مقدس ارواح اس وقت معبد سے دور ہیں، ورنہ اب تک تم جل کر راکھ ہو گئے ہوتے یا آدم خور حیوانیوں سے بھرے ہوئے کسی غار میں پھینک دیئے گئے ہوتے۔"

تابان نے انگلیں کے ہاتھوں پر اپنی گرفت اور مستحکم کر دی۔ "مجھے مستقبل کے اندیشوں میں جھلما مت کرو دیوی۔ حال کی بات کرو۔ اس وقت کی بات کرو، بیت جانے والی صدیوں سے ہمارا کوئی واسطہ ہے نہ آنے والے زمانوں سے کوئی تعلق۔ جو کچھ ہے بس یہی ایک لمحہ ہے جو میری اور تمہاری مٹھی میں ہے۔"

تابان نے دیوی کو آپ کی بجائے تم کہہ کر مخاطب کر لیا۔ اس واضح گفتگونی نے اسے برہم کر دیا لیکن یہ برہمی اس کی زبان تک نہیں آ سکی۔ وہ کسمسا کر رہ گئی۔ تابان نے بے باکی سے اس کی آنکھوں میں جھانک۔ "مجھ سے دور مت جانا دیوی، تم دور جاتی ہو تو موت میرے ارد گرد مٹلانے لگتی ہے۔ میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔"

انگلیں نے شدید الجھن میں اپنا زیریں ہونٹ کا ٹکڑا دھیمی آواز میں بولی۔ "اس وقت میرا جانا ضروری ہے۔ میں پھر آؤں گی۔"

"کب؟" تابان نے بے تابی سے کہا۔

"معلوم نہیں۔" وہ بولی اور تابان پر ایک گمراہ نگاہ لگتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

☆-----☆-----☆

اس کے بعد وہ اکثر تابان کے پاس آنے لگی۔ کئی وقت تابان کی خلوت گاہ کا دروازہ بے آواز کھلتا اور دھندلے مرغولے فرش سے چھت تک ہر شے کو ڈھانچے لگتے۔ جب یہ دھند ایک خاص حد تک گہری ہو جاتی تو انگلیں دیوی خوابناک انداز میں تابان کے پاس آ بیٹھتی۔ وہ تابان کی زبان سے اپنے حسن کے قصیدے سن کر لطف اندوز ہوتی۔ تابان کی بے باک گفتگو اسے ایک ایسی تازگی کا احساس دلاتی جس کا کبھی اس نے تصور بھی نہ کیا تھا۔ اس کے اندر بھی عورت کی یہ ازلی خواہش موجزن تھی کہ اس کی مدح کی جائے اسے یہ باور کرایا جائے کہ وہ دنیا کی حسین ترین عورت ہے یا حسین ترین عورتوں میں سے ایک ہے۔ تابان اس کی یہ خواہش بہ احسن طریق پوری کرتا تھا۔ وہ بولتا اور وہ ایک ادائے دلربائی سے بیٹھی رہتی۔ گاہے گاہے اسے کوئی گاہے حوصلہ دیتی۔ جب تابان کا کوئی توصیفی فقرہ اس کے دل کو چھو تا تو اس کی آنکھوں میں غرور حسن کچھ اور نمایاں ہو جاتا۔

ایک شام تابان اسی طرح اس کے قدموں میں بنامح سرائی میں مصروف تھا کہ اچانک خلوت گاہ میں اندھیرا چھا گیا۔ وہ روشنی جو آئینہ دیواروں سے پھونتی تھی ایک دم ہی گم ہو گئی تھی۔ "انگلیں کہاں ہو تم؟" تابان نے پکار کر کہا۔ لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔

اس نے انگلیں کو چھونے کے لیے اِدھر اُدھر ہاتھ لہرائے لیکن صرف اس کے دامن کو چھو سکا۔ پھر یہ دامن بھی اس کے ہاتھ سے پھسل گیا۔
”اٹھ لیں!“ اس نے دوبارہ آواز بلند کی۔

ایک شدید دھکا اسے لگا اور وہ جیسے اڑتا ہوا ایک دیوار سے جا ٹکرایا۔ سر کے عقبی حصے میں شدید چوٹ آئی۔ وہ لڑکھڑا کر قالین پر گر گیا لیکن پھر فوراً سنبھل گیا۔ اس کے اندر کا تربیت یافتہ لڑکا لحوں میں بیدار ہو گیا تھا۔ ”کون ہے؟“ اس نے چلا کر پوچھا۔ تب اسے دوبارہ دھکیلا گیا۔ یہ وار پہلے سے بھی شدید تھا۔ ہوں لگا جیسے کئی آدمیوں نے یک وقت اسے دھکا دیا ہو۔ اس مرتبہ وہ ہنٹ رنگ پانی کے فوارے سے ٹکرایا اور اس کا بالائی حصہ توڑتے ہوئے نیچے گر گیا۔ چند لمحوں بعد کمر پھر روشنی سے بھر گیا۔ اب وہاں کوئی نہیں تھا۔ نہ انگلیں دیو کی نہ اسے دھکیلنے والا اور نہ وہ شخص جس نے روشنی کو اندھیرے میں اور پھر اندھیرے کو روشنی میں بدلا تھا۔ شکت فوارے کی منتشر چھوڑ قالین کو دور تک بھگو رہی تھی۔ کمرے میں رنگین دھند اب بھی موجود تھی لیکن مرغولے تحلیل ہوتے چلے جا رہے تھے۔

☆-----☆-----☆

اسی روز شام کو ایک حسین و جمیل کنیز تابان کی خلوت گاہ میں داخل ہوئی۔ ایسی خوش لباس اور آن بان والی عورت تابان نے اس معبد میں پہلی مرتبہ دیکھی تھی۔ وہ ہر لحاظ سے منفرد اور ممتاز نظر آتی تھی۔ اس نے اپنی دلنشین آواز میں تابان کو اطلاع دی کہ آج رات ٹھیک دوسرے پر اس کی ملاقات معبد کی سب سے اہم شخصیت سے ہوگی۔
”کون ہے وہ؟“ تابان نے بے ساختہ دریافت کیا۔

”مہادیوی!“ جواب ملا۔

تابان کے لیے یہ لمحہ شادی مرگ کا تھا۔ اسے لگا کہ وہ کوئی حسین خواب دیکھ رہا ہے۔ ابھی آنکھ کھلے گی اور ”بیداری“ کی کمان سے نکل کر ”حقیقت“ کا سنسنا تا تیر اس کے جگر سے پار ہو جائے گا۔ وہ سکتے کی کسی کیفیت میں خوش لباس و خوش اندام کنیز کی طرف دیکھتا چلا گیا۔ پھر بے پناہ کوشش سے اس نے ہونٹوں کو جنبش دی۔ ”کمال ہو گی یہ ملاقات؟“

”قصر نور میں۔“ مختصر جواب ملا۔ اس کے ساتھ ہی کنیز نے رخ پھیرا اور کمرے سے نکل گئی۔

اس کے جاتے ہی تابان کی خند نگار ”ڈیڑا نمیں“ بھرا مار کر اندر گھس آئی۔ ان کی آنکھوں میں مسرت کے علاوہ جرت کے جذبات تھے۔ وہ تابان کو یوں دیکھ رہی تھیں جیسے پہلی بار دیکھا ہو۔ تابان کو اس معبد میں لانے والی کنیز کا نام درمانہ تھا۔ اس نے تابان کو مبارکباد دی۔ اس کے بعد سب مبارک دینے لگیں۔

درمانہ نے کہا۔ ”مہادیوی مارٹالے آپ کو ملاقات کا شرف بخشا ہے اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ آج کے بعد آپ اس معبد میں ایک اہم بیماری کی حیثیت سے پچانے جائیں گے۔ ہو سکتا ہے آپ کو کاہن کا درجہ دے دیا جائے۔“

پھر درمانہ تابان کو مہادیوی کے حضور پیش ہونے کے آداب سمجھانے لگی۔ یہ بہت لمبی چوڑی روئیداز تھی۔ ایک ایک ریم اور دستور سے تابان کو روشناس کرایا گیا۔ قصر نور میں پہلا قدم کیسے رکھنا ہو گا۔ مہادیوی کے حضور کس انداز میں تعظیم پیش کرنا ہو گی؟ دوران گفتگو کیا القاب استعمال کرنا ہوں گے۔ نگاہ کمال رکھنا ہو گی یا ہاتھ کمال رکھنا ہوں گے۔ یہ ساری باتیں اس شخص کو سمجھانی پڑی تھیں جس نے آج تک کسی قہدے اور ضابطے کی پرواہ نہیں کی تھی۔ ”ابو ہر مغل میں اپنے ہی قہدے سے داخل ہو کر اپنے ہی انداز سے رخصت ہوا تھا لیکن آج وہ خود بھی ان قواعد و ضوابط کو دھیان سے سن رہا تھا۔ بات ہی کچھ ایسی تھی۔ وہ اپنی زندگی کا یہ انمول موقع کسی وجہ سے اور کسی قیمت پر ہاتھ سے کھوٹا نہیں چاہتا تھا۔

رات کا دوسرا پہر شروع ہونے میں ابھی کچھ وقت تھا جب دو کنیز تابان کے پاس پہنچیں۔ یہ قصر نور کی استانی خوش لباس اور عطریں کنیزیں تھیں۔ اس وقت تک تابان کو ایک سفید لباس پہنا کر تیار کیا جا چکا تھا اور تازہ پھولوں کا ایک نہایت خوبصورت دستہ سجاکر اس کے پاس رکھ دیا گیا تھا۔ دونوں کنیزوں کی معیت میں وہ قصر نور کی طرف روانہ ہوا۔ چند طویل راہداریوں سے گزر کر وہ ایک ایسے مقام پر پہنچا جہاں عمارت کی تعمیر میں صرف سفید پتھر استعمال کیا گیا تھا۔ یہاں ہر چیز سے ہلائی نفاست نکلتی تھی۔ راہداریوں میں بھی سفید رنگ کے بیش قیمت قالین بچھے تھے اور اطراف میں خوبصورت فانوس جگمگا رہے تھے۔ معبد کے اس حصے میں کنیزوں اور غلاموں کے لباس سفید تھے اور ان پر سفید چلیے دھاگوں سے قصر نور کے الفاظ کڑے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ کچھ مذہبی عبارات ایسی خوبصورتی سے تحریر کی گئی تھیں کہ انہوں نے دیدہ زیب پھول بوٹوں کی صورت اختیار کر لی تھی۔ یہاں کے ہاتھ میں جو گلدستہ تھما گیا تھا اس میں

کہ آپ کے جلوں کے سامنے معطل نہ ہوں۔ میری یادداشت کو اتنا یاد رہے کہ آپ کو روبرو دیکھ کر بھی میرا ساتھ دے۔ مجھے معاف کریں دیوی۔ اپنے کم نگاہ غلام کو اپنے بے باحسن کے صدقے معاف کریں۔

"ان زینوں سے نیچے اتر دو اور سیاہ دائرے سے باہر دو زاہد بیٹھو۔" تابان نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔

تھوڑی دیر ایوان میں ایک جان لیوا سکوت طاری رہا۔ تابان کو محسوس ہو رہا تھا وہ زمین اور آسمان کے درمیان معلق ہے۔ کشش ثقل اثر دکھائے گی تو وہ کہیں بھی جا گرے گا۔ کسی پہاڑ پر کسی سمندر میں کسی جنگل میں یا پتھروں اور زہریلے حشرات سے بھرے ہوئے کسی غار میں۔ وہ ایک گستاخی کر چکا تھا اور اس کی سزا کچھ بھی ہو سکتی تھی۔ آخر مارشاک کی آواز ایوان میں گونجی۔

"ہمیں معلوم ہوا تھا کہ تم اس معبد کے ایک ادنیٰ خادم بن کر یہاں رہنا چاہتے تھے لیکن ایک بیماری اور چند غلامین کی طرف سے تمہارے ساتھ ناروا سلوک ہوا اور تمہیں جسمانی اذیت پہنچا کر معبد سے باہر پھینک دیا گیا۔ ہم نے تمہیں بے چارگی کی حالت میں دیکھا تو اس معبد میں بلا لیا لیکن..... ہمیں معلوم نہیں تھا کہ تم ایسے اخلاقی دیوالیہ بن کا ثبوت دو گے۔ ہم تمہیں یہاں بلا کر شرمندہ ہیں۔"

تابان نے اپنے دل کی تمام چاہت اور لگن لمبے میں سمیٹنے ہوئے کہا۔ "اگر ایسا ہی ہے تو مجھے سزا سنائیے۔ مجھے یہاں کے سفاک ترین جلاؤں کے پردہ کر دیجئے۔ آپ کی دل شکنی کے بعد مجھے بھی اب زندہ رہنا قبول نہیں ہے..... لیکن..... آپ کو اپنے ہی صن سلوک کا واسطہ مجھے میری خطا ضرور بتا دیجئے۔"

"ہم بتانا ضروری نہیں سمجھتے۔ تم خود بھی جانتے ہو کہ یہاں آنے کے بعد تمہاری مصروفیات کیا رہی ہیں۔ یہ بات مت بھولو کہ اس معبد میں کچھ بھی ہماری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہے..... تم اب یہاں نہیں رہ سکتے۔ جتنی جلد ہو سکے یہاں سے نکل جاؤ۔"

تابان نے کہا۔ "مجھے کڑی سے کڑی سزا دیجئے لیکن ان در و پام سے جدا نہ کیجئے۔ اس چار دیواری سے باہر دنیا میرے لیے ایک لقمہ و دق ریگستان ہے۔" اس کی آواز میں ٹھہراؤ اور آنکھوں میں التجا تھی۔

"یہ فیصلہ اٹل ہے۔" مارشاک کی بارعب آواز گونجی۔ "تمہیں ہر صورت یہ معبد

چھوڑنا ہوگا لیکن آج شب تمہیں اس معبد میں رکنا ہماری مجبوری ہے۔ کل سورج طلوع ہونے کے فوراً بعد تم یہاں سے چلے جاؤ گے۔ اب تم جا سکتے ہو۔"

تابان نے کچھ کہنے کے لیے ہونٹ کھولے، لیکن اس وقت شرادی اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی اس نے ایک چھوٹا سا فرتی عصا کو ٹھوس شے برابر۔ جلتنگ کی آواز ابھری۔ تابان کے عقب میں ایوان کا دروازا ہوا اور دونوں عجیب اقلت جھنشی چوپایوں کی طرح چلے اندر داخل ہو گئے۔

"چلے معزز مہمان۔" ان میں سے ایک نے تابان سے کہا۔

تابان نے ایک نظر ان کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے بتا رہے تھے کہ یہ فیصلہ اٹل ہے اور اگر تابان نے تعمیل نہیں کی تو اس سے قہر کرانی جائے گی۔ اس نے ایک طویل سرد آہ کھینچی۔ ان زینوں کی طرف دیکھا جہاں تھوڑی دیر قبل اس کے جان و دل کی ملکہ جسم شباب و رعنائی کی ایک شان بے نیازی سے بیٹھی تھی..... اب وہاں سفید دھند کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ وہ خاموشی سے عجیب اقلت جھنشیوں کے ہمراہ ہو لیا۔

تابان کا خیال تھا کہ اسے واپس انگلیں کے قصص میں پہنچا دیا جائے گا جہاں شب گزارنے کے بعد صبح سویرے اسے معبد سے نکال دیا جائے گا لیکن اسے ایک خوشگوار حیرت کا سامنا ہوا جب تواری جھنشی اسے لے کر قصر نور ہی کے ایک آرام دہ کمرے میں پہنچ گئے۔ خوبصورت انداز میں سجا ہوا یہ کمرہ کسی شاہی محل کا حصہ لگتا تھا۔ قالین ایسا گداڑ کہ پاؤں دھنسن جائیں۔ فانوس اور ٹالپے ایسے خوبصورت کے نگاہیں دھنسن جائیں اور مسمری ایسی آرام دہ کہ لیٹنے والا سر ہٹا دھنسن جائے۔ ایک بھائی سی خوشبو نے ہر چیز کو لپیٹ میں لے رکھا تھا اس خوشبو جیسی لطیف اور مہکور کن ایک اور شے بھی اس جگہ موجود تھی۔

تابان کے ذہن پر مختلف خیالات کی یورش تھی۔ وہ اس وقت مکمل تھکی چاہتا تھا۔ اس نے اپنی حرکات و سکنات سے خدمت گار دہیز کو احساس دلایا کہ وہ اب آرام کرنا چاہتا ہے لہذا وہ خوابگاہ سے رخصت ہو جائے لیکن وہ بدستور اس کے سرہانے جی کھڑی رہی۔ آخر تابان کو اس سے تھکنے کا کتنا پڑا۔ وہ اٹا دلشیں آواز میں بولی۔

"آپ کے پاس موجود رہنے کا مجھے حکم ہے۔"

تابان نے کہا۔ "لیکن اب میں سونا چاہتا ہوں۔"

وہ بولی۔ "میری ذمہ داری یہی ہے کہ آپ کو مجھ خواب نہ ہونے دیا جائے۔"

"لیکن کیوں؟"

”اس لیے کہ آپ یہاں صرف آرام کر سکتے ہیں۔ سو نہیں سکتے۔“
”اس کی وجہ؟“

خادمہ چند لمحے متعذب میں رہی۔۔۔۔۔ پھر بولی۔ ”اس کی وجہ وہ گفتگو ہے جو آپ سوئے میں کرتے ہیں۔ قصر نور میں ایسی گفتگو کی گنجائش موجود نہیں ہے۔“
تایان پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ”گفتگو؟ کیسی گفتگو؟“ اس نے پوچھا۔

وہ بولی۔ ”شاید آپ ابھی تک بے خبر ہیں۔ آپ ہر رات مہادیوی کو پکارتے ہیں لیکن انہیں دیوی کہنے کی بجائے شہزادی کہتے ہیں اور اس کے ساتھ ان کا نام بھی لیتے ہیں یہ قصر نور ہے یہاں کوئی شخص مہادیوی یا پانچ مقدس ارواح کو ان کے نام سے پکارنے کا خیال بھی نہیں کر سکتا۔“

تایان سٹنا کر رہ گیا۔ یہ اطلاع تایان کے لیے بالکل نئی تھی۔ اسے کچھ علم نہیں تھا کہ اس کے دل کا چور اسے غافل پاکر رات کی تاریکی میں باہر نکلتا ہے اور اس کی محبت کا ڈھنڈورا پیٹنے لگتا ہے لیکن فوراً ہی اسے ایک خوشگوار احساس بھی ہوا۔ ایک مسرت بھری لہر اس کے رگ و پے میں دوڑنے لگی۔ اس کا مطلب تھا شہزادی مارشا اس کی بے قراریوں سے آگاہ تھی۔۔۔۔۔ اسے معلوم تھا کہ وہ کس مرض میں گرفتار ہے اور اس کی دوا کیا ہے۔۔۔۔۔ یہ کوئی معمولی چیز رشتہ نہیں تھی۔ تایان کو خود یہ بات کہتے ہوئے شاید ایک مدت لگ جاتی۔ معلوم نہیں کب تک وہ یوں اظہار محبت کا حوصلہ نہ کر پاتا لیکن اس کے جذبے کی شدت نے آپول آپ اس کی راہیں آسان کر دی تھیں۔ اس کے سینے میں موجزن سمندر نے اچھل کر ایک لہر کناروں سے باہر پھینک دی تھی۔ یہ لہر دور تک گئی تھی اور اب اس معبد میں بہت سے لوگوں کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ یہ دیوانہ کس کا ”دیوانہ“ ہے۔

تایان خوشی سے مجھوم اٹھا۔ اس کی رگ رگ میں مسرت ٹانچ اٹھی۔ وہ دیر تک اس خیال میں مست کمرے میں پکراتا رہا کہ شہزادی مارشا پر اس کی وحشوں کا راز کھل چکا ہے۔ اب واقعات کا بہاؤ اس کی سمجھ میں آ رہا تھا۔ اس کا یہ اندازہ درست نکلا تھا کہ شہزادی مارشا نہ صرف اسے دیکھتی رہی ہے بلکہ دیوی انگلیں کی طرف اس کا جھکاؤ بھی اس کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں رہا۔ اب تایان اس جاں افزاء خیال کو دل میں جگہ دے سکتا تھا کہ اسے قصر نور میں طلب کئے جانے کا سبب جذبہ رقابت ہے۔ یعنی شہزادی مارشا نے اپنے دیوانے کو کسی اور کی ”دیوانگی“ میں جھٹکا کر نہیں پرھمن نمودار کی تھی اور اسے

یہاں بلا بھیجا تھا۔

تایان حیرت کے دریا میں بہتا رہا اور اپنی گونگوں سوہن میں گھویا رہا۔ وہ سوچنے لگا یونانی افواج کے ساتھ مشرقی ساحلوں پر گھٹ کرے کرتے کرتے وہ کسی ظلم خانے میں آ نکلا ہے۔ وہ جو کچھ یہاں دیکھ چکا تھا اور دیکھ رہا تھا اب ایک واہی کی مانند تھا۔ اسرار کے بعد دوسرا اسرار سامنے آ رہا تھا۔ اس معبد کی شہزادوں کے اندر ہیج وار ہیج رابداروں اور ایوانوں میں ایسی رنگین دنیا آباد ہو گئی تھی تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ وہ اندھال ہو کر گرد از مسہری پر گر گیا اور سوچنے لگا۔ اگر وہاں معبد سے واہی گیا اور اس نے جا کر اپنے ساتھیوں کو یہاں کے حالات بتائے تو کیا وہ ان پر یقین کریں گے؟ اسے فائر اعقل تو نہیں سمجھا جائے گا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ شہزادی مارشا نے اسے یہاں صبح تک رکھنے کو اپنی مجبوری بتایا تھا۔ یہ کیا مجبوری تھی؟ اس نے یہ سوال سرہانے گھڑی خدمت گار دوشیزہ سے پوچھا تو وہ خاموش رہی۔ شاید اس کا قیاس تھا کہ تایان بھی خاموش ہو جائے گا لیکن وہ اتنی جلدی ہتھیار پھینکنے والا نہیں تھا۔ اس نے بار بار امرار کیا۔ یہاں تک کہ خادمہ ہراساں نظر آنے لگی۔ اس نے ہوشوں پر اٹھ کر رکھتے ہوئے کہا۔

”معزز مہمان! آپ یہاں دھسے مہے میں بات کریں۔ مقدس ارواح جو کچھ عرصے سے عبادت میں مصروف تھیں، معبد میں واہی آ چکی ہیں۔ ان کا ٹھکانہ اسی قصر نور میں ہے۔ مقدس ارواح رات بھر جاگتی ہیں، اسی سبب آپ کوئی اٹال قصر نور سے باہر نہیں نکلا جاسکتا۔“

تایان خدمتگار دوشیزہ سے ”ارواح“ کے بارے میں نفق سوال کرنے لگا۔ ارواح کہاں رہتی ہیں؟ وہ مہادیوی سے کب ملتی ہیں؟ کیا واقعی وہ ہزاروں سال سے زندہ ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ ان سوالوں نے خدمت گار دوشیزہ کو سخت پریشان کر دیا۔ وہ تایان سے بار بار خاموش رہنے کی التجا کر رہی تھی۔ آخر تایان نے اس کے حل پر رحم کیا اور خاموشی اختیار کرتے ہوئے بستر پر نیم دراز ہو گیا۔

نہ جانے شب کی وہ کون سی گھڑی تھی جب اس کے کمرے میں تعینات خادمہ اچانک اٹھ کر باہر نکل گئی۔ اس کے ہاتے کی کوئی اندر داخل ہوا۔ آنے والے کو دیکھ کر تایان کا دماغ ہلک سے اڑ گیا۔ ایک بار پھر ان پر شادی مرگ کی کیفیت طاری ہونے لگی۔ وہ شہزادی مارشا تھی۔ اس وقت بھی وہ مسند براق لبادے میں تھی تاہم یہ لباس پہلے لباس سے مختلف تھا۔ حسن اس کے بدن سے شعاعوں کی طرح پھٹ رہا تھا اور سب سے خوش

کن امر یہ تھا کہ اس وقت وہ دیوی کی بجائے ایک عام انسان نظر آتی تھی۔ نہ گھنٹیوں کی صدا اس کی ہمرکاب تھی اور نہ دھند کے مرغولے اسے گھیرے ہوئے تھے "وہ یوں آہستہ آہستہ اندر داخل ہوئی تھی جیسے روٹی کے ڈھیر پر کوئی دمکتا موتی بے آواز گر جائے۔ تاہم اپنی جگہ کھڑا ہو گیا۔ اس کا کوئی بیکل جسم حیرت اور مسرت کے طوفان میں تنکے کی طرح ڈول رہا تھا۔ رعب حسن نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ گھنٹوں کے بل گر جائے۔ شہزادی اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ اس نے سفید آنکھوں سے چہرہ اس طرح دھانپ رکھا تھا کہ نقاب سے اوپر صرف آنکھیں دکھائی دیتی تھیں۔ وہ بغیر کسی تمہید کے بولی۔

"ہم تم سے چند باتیں کرنا چاہتے ہیں غلام!"

تہاں نے محسوس کیا کہ اب شہزادی کے لہجے میں بناوٹ نہیں ہے۔ وہ مادیوی کے زینوں سے نیچے اتر کر شہزادی مارشا کے مقام پر آن کھڑی ہوئی ہے اور اب اسی حیثیت سے اس سے مخاطب ہے۔

تہاں نے کہا۔ "غلام ہمہ تن گوش ہے شہزادی۔"

اس نے پہلی بار شہزادی کو "شہزادی" کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ شہزادی نے اسے یہ لقب استعمال کرنے سے ٹوکا نہیں۔ اس کا مطلب تھا اس مقام پر ان کی گفتگو زینوں والے ایوان کی نسبت کہیں محفوظ ہے۔

شہزادی بولی۔ "تمہارا نام..... شاید تہاں ہے۔ تم نے مقدونوی حملے کے وقت ایجنٹر سے نکلنے میں ہماری مدد کی تھی۔ ہمیں تمہارا وہ احسان یاد تھا اسی لئے جب ہم نے تمہیں معبد سے باہر ذلت و خواری کی حالت میں دیکھا تو یہاں بلوا لیا۔ ہمیں معلوم نہیں تھا تم ایسے گرے ہوئے انسان ثابت ہو گے۔ انگلیں دیوی کے قصر میں تم جسے تخلیق سمجھتے تھے وہ تجلیہ نہیں تھا۔ تم انگلیں دیوی سے جو گفتگو کرتے تھے وہ ہمارے کانوں تک پہنچتی تھی۔ تمہاری چرب زبانی، قصیدہ گوئی، خوشامد سب کچھ ہمارے لیے طشت از بام تھا۔"

شہزادی مارشا کے "الزامات" نے تہاں کی روح میں طریہ نغے بکھیر دیے۔ شہزادی کے لیے میں جھٹکتی تھی اسے شد اور امرت سے شیریں محسوس ہوئی۔ یہ تکنیکی اس بات کی گواہ تھی کہ شہزادی اس کے بارے میں سوچتی ہے۔ ناراضگی کا سہی لیکن ایک تعلق ان دونوں کے درمیان موجود ہے۔

تہاں سراپا غرور و انکسار ہو کر بولا۔ "شہزادی معظمہ! غلام اپنا جرم تسلیم کرتا ہے۔ میں نے بے شک مدح سراہی کی ہے۔ بہت قصیدے پڑھے ہیں اور تعریفیں کی ہیں لیکن

دیوتا گواہ ہیں مخاطب وہ نہیں تھا جو سامنے تھا۔"

"تو کون تھا مخاطب؟" شہزادی نے پوچھا۔

"وہ جو سامنے نہیں تھا۔ جو اب جھل قالیگن سب کچھ بانٹا تھا۔ میرے سارے

قصیدے، میری ساری تعریفیں، میرا سارا خزانہ عقیدت اسی کے لیے تھا۔"

تہاں نے دیکھا شہزادی مارشا کی آنکھوں میں بے چینی نے کروت لی۔ اس کے مرمس ہاتھوں کی موٹی ٹمٹوں جیسی انگلیاں ایک دوسرے سے الجھنے لگیں۔ "کیا مطلب ہے تمہارا؟" اس نے پوچھا۔

"وہی مطلب ہے شہزادی، جو آپ مجھ رہی ہیں۔" تہاں نے عجب جرأت و ندان

سے جواب دیا۔ "غلام حاضر ہے، سر فرم ہے جو چاہے سزا دیجئے۔ اس جگہ زندہ دفن کرا

دیجئے۔ معبد کے گوشت خور پرندوں سے نچا دیجئے یا کلڑے کروا کر جنگل میں پھینکوا

دیجئے۔ جو چاہو وہ میں نے بیان کر دیا ہے شہزادی..... اب مجھے کسی انجام کی پرواہ

نہیں۔ موت اور موت سے پہلے کا ہر عذاب میرے سر آنکھوں پر۔ وہ سب تعریفیں آپ

کے لیے تھیں شہزادی..... وہ سارے غیر الفاظ آپ کے من کو بیان کرنے کی ادنیٰ

کوشش تھے، مجھے کہنے دیجئے شہزادی حاضر، کہ پھر شاید کچھ کہنے سننے کا موقع نہ

ملے..... کیا معلوم، آپ کی ساعت اور میرے نقط کے درمیان ہزار ہا فک بوس

دیواریں حائل ہو جائیں، میرے مقدر کی اندھی مجھے دھکیل کر آپ سے صدیوں کے

فاصلے پر لے جا چھینکے، آپ کے فیصلے کے حرے آپ کو اڑا کر لکشاؤں کی دنیا میں لے

جائیں..... لہذا مجھے کہنے دیجئے شہزادی۔ "ساری تعریفیں آپ کے لیے تھیں۔ لفظوں

کے وہ سارے نذرانے آپ کی نذر تھے..... میں آپ کا ریش ہوں، میں آپ کے

حسن کا گرفتار ہوں..... میں دیوانہ ہوں اور میری جسارت دیکھنے جس کے قدموں کی

خاک ہوں اس سے محبت کرتا ہوں۔ اسی کے عشق کا دم بھرتا ہوں۔ ہاں شہزادی! میں

عشق کرتا ہوں آپ سے۔ میں نے کہا تھا میں کہ گزرے زمانوں اور آنے والی صدیوں پر

میرا کوئی اختیار نہیں۔ جو کچھ بھی ہے یہی ہے۔ میں نے ان لمحوں میں جی لیا ہے

شہزادی۔ اب موت میرے لیے ایک کروت کے سوا اور کچھ نہیں۔ مجھے آپ ہی کی قسم

آپ مجھے حکم دیجئے میں اسی جگہ سانس روک کر خود کو ختم کر سکتا ہوں۔"

نہ جانے تہاں میں اتنی جرأت کہاں سے آگئی تھی کہ "ایک ہی سانس میں سب

کچھ کہہ گیا۔ ایک ہی جست میں آگ اور برف کے ساتھ سمندر پار گر گیا۔ شہزادی

پہرہ اردوں نے اسے عقب سے دبوچ لیا تھا..... اور پھر فوراً ہی وہ ہوش و حواس کو جیسا تھا۔ اسے شہزادی کا حسین سراپا یاد آیا۔ اس کے مرمرس پاؤں کا لمس اس کے بدن سے اٹھنے والی مہک وہ دیوانہ سا ہو گیا۔ کسی غیر مرئی طاقت نے اسے جھٹکنے سے اپنے پاؤں پر استادہ کر دیا۔ وہ کہاں تھا؟ معبد سے کتنے فاصلے پر تھا؟ اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی لیکن کچھ اندازہ نہیں ہوا۔ سورج دور مغرب میں ڈوب رہا تھا۔ تابان کو لگا کہ اگر سورج ڈوبنے سے پہلے پہلے اس نے اپنی محبوب کو دوبارہ نہ دیکھ لیا تو وہ بھی موت کے اندھیرے میں ڈوب جائے گا۔ وہ حرکت میں آیا اور دیوانہ وار ایک جانب بڑھنے لگا۔ ابھی چند قدم ہی چلا تھا کہ اسے کمر پر بوجھ سا محسوس ہوا۔ اس نے دیکھا ایک تلوار اس کی کمر سے بندھی ہوئی ہے اور ڈھال اس کے کندھے سے جھول رہی ہے۔ یہ تلوار اور ڈھال اس کی تو نہیں تھی۔ تو پھر کہاں سے آئی تھی؟ کیا یہ ہتھیار اسے قصر نور میں باندھے گئے تھے؟ کون تھا باندھنے والا؟ کیا..... کیا ایسا شہزادی مارشا کی ہدایت پر کیا گیا تھا۔ ایک ایک تابان کے اندر جیسے کوئی بند ٹوٹ گیا اور مسرت و شادمانی کا منہ زور دینا سینے کے دیران صحران کو سیراب کرنے کے لیے بہہ نکلا..... اگر یہ تلوار اس کی کمر سے شہزادی مارشا کی ہدایت پر باندھی گئی تھی تو کتنا خوبصورت، کتنا دلربا اشارہ تھا یہ..... تابان کا بی چاہا وہ اسی جگہ پر مرے۔ اس خوبصورت کنائے پر قربان ہو جائے..... اس نے تلوار نیام سے کھینچی اور آبدیدہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ اس کی چھٹی جس گواہی دینے لگی کہ شہزادی نے اس کے بے باک سوالات کا مجسم سا جواب اس تلوار کی صورت میں دیا ہے اس کی ساری خطائیں اور گستاخیاں معاف کر کے اس نے اسے میدان جنگ کا رستہ دکھایا ہے..... وہ اپنے دل میں پکار کر بولا۔

”اے شہزادی! اسے میرے جان و دل کی ملکہ۔ تیرے مرمرس ہاتھوں کی قسم میں اس تلوار کا حق ادا کروں گا۔ میں اس تلوار کو دشمن کا اٹا لو پلاؤں گا کہ ہزار برس اس کے لوہے کی سرخی برقرار رہے گی..... یہ میرا وعدہ ہے شہزادی“ تیرے ادنیٰ غلام کا وعدہ ہے۔“ اس نے تلوار کو بار بار بوسہ دیا۔ پھر ایک سمت کا تعین کر کے بھاگنے لگا۔ ابھی وہ سو پچاس قدم ہی دور گیا تھا کہ عقب سے اسے پکارا جانے لگا۔ وہ ٹھٹھکیا۔ یہ ہوشمند کی آواز تھی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ ہوشمند ایک اصیل جنگی گھوڑے پر سوار تیزی سے اس کی طرف چلا آ رہا تھا۔ جلد ہی گھوڑا تابان کے قریب پہنچ گیا۔ ہوشمند چھانگ لگا کر نیچے اترا پھر بھاگ کر اس سے لپٹ گیا۔ فرط جذبات میں دو بار بار تابان کی گردن کو بوسے

دے رہا تھا۔

”دیوتاؤں کا شکر ہے تمہیں ہوش آ گیا۔“ وہ آبدیدہ لمبے میں بولا۔ ”میں تمہارے لیے پانی ڈھونڈنے گیا تھا۔ واپس آ کر دیکھا تو تم غائب تھے۔“

”کیا مطلب؟“ تابان نے پوچھا۔

”بتانا ہوں سب کچھ بتانا ہوں۔ چلو آؤ میرے ساتھ۔ وہ سامنے دھوپ میں بیٹھے ہیں۔“

تابان ہوشمند کے ساتھ چلتا زردی مائل گھاٹی پر آ بیٹھا۔ قریب سے ایک خشک آب جو گزرتی تھی۔ جنگلی گھوڑا ہوشمند نے ایک درخت سے باندھ دیا تھا۔ تابان نے گھوڑے کے بارے پوچھا۔ ہوشمند نے جواب دیا۔ ”یہ تمہارے پاس ہی بندھا ہوا تھا۔“

”کس نے باندھا تھا؟“

”مجھے بھی اس بارے میں کچھ علم نہیں۔“

”یہ کون سی جگہ ہے؟“ تابان نے پوچھا۔

”اسے ”راسی کا جنگل“ کہتے ہیں۔ جس معبد میں تم پھنسنے گئے تھے وہ یہاں سے دو کوس جنوب کی طرف ہے۔“

”تم یہاں کیسے پہنچے؟“

”تم پہنچے ہو..... ہم نہیں پہنچے۔ ہم تو تھے ہی یہاں۔ میں اور جانی اس روز سے اسی ویرانے میں بھٹک رہے ہیں۔ تمہیں کھو کر کس دل سے واپس جاتے..... تمہاری فکر میں کتنی مرتبہ معبد کی طرف بھی گئے لیکن ”ہلات کے دن“ کے سوا وہاں پر نہ بھی پر نہیں مار سکتے۔ ہم دونوں روزانہ مختلف اطراف میں بھٹکنے کے لیے نکل جاتے تھے کہ شاید کہیں تمہارا سراغ ملے۔ آج میں تمہارا بار بار یہاں سے گزر رہا تھا کہ گھوڑے کی ہنہات سنائی دی۔ یہاں پہنچا تو تمہیں درخت کے نیچے بے سندہ پڑے پایا۔ لگتا تھا تم کسی دوا کے زیر اثر ہو۔ بہت کوشش کرتا رہا لیکن تمہیں ہوش نہیں آیا۔ میرے پاس تھوڑا سا پانی تھا وہ ختم ہو گیا۔ اب مزید پانی لینے کے لیے نکلا تھا۔ کافی دور جانا پڑا۔ واپس آیا تو تم ناپید تھے۔“

اب تابان کی سمجھ میں آیا کہ اس کے ارگرد کس کے قدموں کے نشان تھے۔

”جانی اب کہاں ہے؟“ اس نے ہوشمند سے پوچھا۔

”وہ اپنے ٹھکانے پر پہنچ گیا ہو گا اور میرے انتظار میں سوکھ رہا ہو گا غالباً..... چلو

اب اٹھ جاؤ۔ باقی باتیں وہیں جا کر ہوں گی ختم۔“

ہوشمند کے چہرے پر بھی دبا دبا جوش نظر آنے لگا۔ وہ بولا۔ "یونانی فوج یہاں سے صرف ایک پہر کے سفر پر ہے غالباً..... اسوں کے مقام پر زبردست رن چڑنے والا ہے۔ چھوٹی ٹھہر ہیں، وہ رہی ہیں، کسی بھی وقت بڑی لڑائی چھڑ سکتی ہے۔"

تاکان کے چہرے پر اضطرابی کیفیت نمودار ہو گئی۔ اس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر تلوار کے دستے پر گردش کر رہا تھا۔ وہ اٹھتا ہوا بولا۔ "چلو ہوشمند! جالی کی طرف چلیے ہیں۔ شاید ہمیں ابھی میدان جنگ کی طرف روانہ ہونا پڑے۔"

”کیوں کیا بات ہے؟“

"ہے ایک بات۔"

”ابو! غائب! تم بہت جلدی میں ہو، کہ اپنی روئیداد بھی غائب!..... لیکن غائب غائب!.....“ ہو شمنند گڑبڑا کر رہ گیا۔

تباہی نے اس کا بازو پکڑا اور کہنیتا ہوا گھوڑے تک لے آیا۔ چند ہی لمحے بعد ان کا گھوڑا ”راسی کے جنگل“ میں سرٹ بھاگا چلا جا رہا تھا۔

قریباً دو کوس فاصلے طے کر کے وہ ایک خشک ندی کے کنارے پہنچ گئے۔ یہاں لمبی گھاس تھی اور جھاڑیاں کثرت سے اگی ہوئی تھیں۔ ایک بلند درخت پر ہوشمند اور جالی نے چان سی تیار کر رکھی تھی۔ چان میں آندہ درخت کے لیے رسی کی ایک بیڑھی بھی جھول رہی تھی۔ چان تعمیر کرنے والا یقیناً ”بڑھی جالی“ ہی تھا۔ ہوشمند کے انداز سے عین مطابق وہ اس وقت ہوشمند کے انتظار میں سوکھ رہا تھا۔ اس نے ہوشمند کے ساتھ تابان کو بھی دیکھا تو جو نچکا رہ گیا۔

سورج غروب ہونے کے تھوڑی ہی دیر بعد آسمان ہوشمند اور جالی اسوس کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہ مقامی لباس میں تھے لہذا کسی کی نگاہ میں آنے کا کوئی خدشہ نہیں تھا۔ انہوں نے اسوس شہر کو جانے والے راستے پر زبردست سرگردمیاں دیکھیں۔ فوجی دستے اور

مسلمان رسد کشاں کشاں اسوس کی طرف جا رہا تھا۔ اسیرانی سپاہی بے حد بے اعتماد اور چاق و چوبند دکھائی دیتے تھے۔ تباہان ہوشمند اور جلالی ایک ہی گھوڑے پر سوار تھے۔ لہذا سفر سے روکی سے طے ہو رہا تھا۔ وہ شہر اسوس کو اپنی طرف اگلی جانب چھوڑتے ہوئے ساحل کی طرف نکل آئے اور ایک طویل پیرکٹ کر میونٹان افواج کے جھنڈوں تک پہنچ گئے۔ حد نگاہ تک عسکری سرگرمیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ یونانی و مقدونی سپاہیوں کے دھڑے بلند تھے اور وہ جلد از جلد دشمن سے ٹکر آزما ہو جانا چاہتے تھے۔

جلد ہی تابان اور ہوشمند سپہ سالارِ اٹھم کے تجربہ کار اور ستم ترین جرنیل پارمینو تک جا چنیے۔ پارمینو، تابان کو ذاتی طور پر پہانتا تھا اور گھر بی کسی کی جنگ میں اس کی ہونامزدی کا مشاہدہ اپنی آنکھوں سے کرچکا کاندہ اس مشاہدے کے بعد پارمینو کو یقین ہو گیا تھا کہ تابان کی بابت تین جنگجو سرداروں کو قتل کرنے کا جو واقعہ مشہور ہے وہ غلط نہیں ہوگا..... اس وقت تابان کو ڈوبرو وکیلو کرپارمینو کی بوڑھی آنکھوں میں پسندیدگی کی چمک نمودار ہوگئی۔

وہ گرم ہوشی سے بولا۔ ”تم کہاں تھے نوجوان؟“ ایسے موقعوں پر تمہارے جیسے شمشیر زنوں کو لشکر میں موجود ہونا چاہیے۔ مجھے سالار اعظم کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ تم اسے بتائے بغیر کہیں چلے گئے ہو۔“

تباہی لے کہہ: "محترم سردار! مجھے بھگنی طور پر جانا پڑ گیا تھا۔ سالار اعظم کے نائب محترم بطلموس اس سارے واقعے سے آگاہ ہیں۔ میں ان سے اجازت لے کر گیا تھا۔"

"بہر حال..... تم فوراً اپنے دستِ قیادتِ شہداد اور میرے اگلے حکم کا انتظار کرو۔ تمہارا دست اس وقت میری کمان میں ہے۔"

تابان نے سر تسلیم خم کیا اور کور فز بجاکر پارمینو کے نیچے سے باہر نکل آیا۔
تابان کا دست باندی پر متعین تھا۔ ریل سے میدان جنگ کا بیشتر حصہ ان کی نظروں
کے سامنے تھا۔ یہ میدان جنگ ایک واڈی کی مانند تھا جس میں شمال اور جنوب سے داخل
ہونے والے دونوں راستے بہت تنگ تھے۔ ایک راستے کے سرے پر شہر اسوس کی
روشنیاں ٹٹٹھا رہی تھیں جبکہ دوسرے راستے پر یونانی قوت اپنے پاؤں جما رہی تھی۔ دو
بڑی افواج کے مقابلے کے لیے اس میدان جنگ کی وسعت بہت کم تھی۔ خاص طور پر
ایرانی افواج کے لیے یہ میدان کسی طرح بھی ساگرا زمین تھا..... ان کی تعداد بہت
زیادہ تھی۔ تابان کو اس کے ساتھیوں نے بتایا کہ ایرانی قوتیں لاکھ سواروں اور بیس ہزار

پوری یونانی فوج شکست سے دوچار ہو گئی۔ تھریس اور سلی کے شاہ سواروں کو ہدایت کی گئی کہ وہ اس مقام پر یونانی فوج کو پیچھے نہ دے دیں اور اگر انہیں کمر کرمانی میں مقابلہ کرنا پڑے تو بھی کریں۔ اس مقام کی اہمیت ایرانیوں پر بھی واضح تھی لہذا وہ مسلسل اپنی قوت یہاں جمونک رہے تھے۔ تاہم اپنے دستے کے ساتھ شامل سمندر سے کوئی سو قدم کی دوری پر تعینات تھلہ شہر دشمن کی جانب سے آنے والے ہوا اس کے لیے ہالوں سے اٹھیلیاں کر رہی تھی۔ اس ہوا میں کسی کا لمس تھا، کسی کے سانسوں کی محک تھی۔ تاہم کو لگا جیسے ریشمی نقب کے اوپر سے جھانکتی ہوئی شہزادی کی آنکھیں اسے دیکھ رہی ہیں۔ تاہم کا حوصلہ اچھل کر بے کنار ہو گیا۔ اسے دشمن کے صف بستہ جنگجو چینیوں کی طرح دکھائی دیے۔ اسے لگا وہ انسانوں کے نہیں حشرات الارض کے مقابل کھڑا ہے۔

سامنے پھاڑ کی ڈھلوان پر تاہم کو یونانی فوج کے قب کا پرچم بردار نظر آ رہا تھا۔ یہ لمبے گھونگریالے ہالوں والا ایک دراز قد وجہ نوجوان تھلہ تاہم نے پہلے اس نوجوان کو نہیں دیکھا تھا (اس سے پہلے ایک یونانی پرچم بردار تھا اور تاہم اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ تاہم نے اپنا گھوڑا بڑھا کر سالار پارمینو کے قریب کیا اور الزام سے پوچھا۔

”محترم سالار! کیا قلب کا پرچم بردار بدل دیا گیا ہے؟“

”ہاں!“ پارمینو نے مختصر جواب دیا۔

”یہ نیا پرچم بردار کون ہے؟“

”اس کا نام فرال ہے۔ یہ تھیلی کا ایک بہادر جنگجو ہے۔ اس سے پہلے یہ ہٹلموس کی کمان میں تھا۔“

تاہم اس غیر متوقع تبدیلی پر حیران کھڑا تھا جب جی سردار یرغائے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ یہ وہ یرغائے تھلہ سمندر کے والد فیلقوس کا معتد سمجھا جاتا تھا اور جس نے پہلی بار پہلی کاربن میں بادشاہ کا سراغ لگایا تھا۔ اس کی یوزھی آنکھوں میں تاہم کے لیے محبت تھی۔ تاہم نے اس کا حال احوال دریافت کیا اور کچھ دیر باتیں کرنا رہا۔ یرغائے کہا۔

”اس نے پرچم بردار کا نام فرال روز ہے۔ آج کل سالار اعظم سمندر اس پر بہت بھروسہ کر رہا ہے۔ سنا ہے گرینی کس کی جنگ میں جب سمندر دریا کے کنارے گر گیا تھا فرال نے سمندر پر آنے والے تین ایسے وار اپنی ڈھال پر روکے تھے جن سے سمندر کا

پیادوں کے ساتھ میدان جنگ میں آئے ہیں۔ اس کے علاوہ ساتھ ہزار منتخب ایرانی تھیں ہزار تختواہ دار یونانی دریا کے دائیں کنارے پر تیار کھڑے ہیں۔ بلاشبہ یہ مرحوب کن اعداد و شمار تھے۔ ان اعداد و شمار کے مطابق ایرانی فوج متحدہ یونانی فوج سے تین چار گنا بڑی تھی۔ یہ مصدقہ اطلاعات بھی موجود تھیں کہ ایرانی فوج کے پاس آتش بازی کی زبردست قوت موجود ہے اور ایرانی سالار میدان جنگ کو یونانیوں کے لیے جہنم زار بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں لیکن میدان جنگ کا نقشہ دیکھتے ہوئے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ شہنشاہ ایران دارا نے اپنی فوج کو اس داوی میں لاکر اپنی عدوی برتری خود ہی ختم کر لی ہے۔ اب یہ امید بھی کی جاسکتی تھی کہ وہ اپنی آتش بازی کی قوت سے خاطر خواہ فائدہ نہ اٹھا سکے گا۔

وہ شب جنگ کی تیاریوں میں گزری۔ علی الصبح تاہم نے سمندر اور پارمینو کو دور ایک اونچی چٹان پر کھڑے پایا۔ دونوں سالار محویت سے میدان جنگ کا جائزہ لے رہے تھے۔ اندھیرے کی چادر چاک ہوتی ہی سب کچھ واضح ہو گیا تھا۔ اب دشمن کی صفیں اور مورچہ بندیوں پوری طرح یونانیوں کے سامنے تھیں۔ ہلال نما خلیج پر نظر ڈالتے ہی دور تک ایرانی لشکریوں کے جھنڈ اور ان کے پھر پھڑاتے پرچم دکھائی دیتے تھے۔ آہن پوش سواروں کی قطاریں، جنگی رتھیں اور چمکدار برہمنیوں کے ہلکورے لیتے سمندر۔ ایرانی فوج میں لڑنے کے لیے دور دراز علاقوں کے لوگ جمع تھے۔ اپنی شکل و صورت اور رنگ و ہنک کے سبب وہ علیحدہ علیحدہ پہچانے جاتے تھے۔ ان میں تختواہ دار یونانی جیٹی اور کروستان کے پیادے نمایاں نظر آ رہے تھے۔ پاس ہی صحرائی فوج کا ایک برق رفتار رسالہ اس انتظار میں کھڑا تھا کہ مقدونی فوج قدم بڑھائے تو وہ حملہ کر دے۔ میدان جنگ کے عقب میں بھی اسوس کے شہر تک ایشیائی فوج ہی نظر آ رہی تھی۔

سمندر کی ہدایت پر پارمینو کے دستے بلندی سے اترے اور ساحل کے ساتھ ساتھ صفیں باندھ لیں۔ اس چال کا اثر زائل کرنے کے لیے ایرانی گھڑسوار فوج کا ایک بڑا حصہ متحرک ہو کر پارمینو کے سامنے آ گیا۔ صاف طور پر محسوس ہو رہا تھا کہ اس مقام پر یونانیوں کے مقابلے میں ایرانیوں کا پلڑا ایک دم بھاری ہو گیا ہے۔ سمندر نے تھریس کے سواروں کو اپنے پاس سے ہٹا کر پارمینو کی کمان میں بھیج دیا۔ ساتھ ہی تاکید کر دی کہ ان کی نقل و حرکت دشمن سے خفیہ رہنی چاہئے۔ پھر علاقہ کرینٹ کے تیر انداز بھی وہیں بھیج دیے۔ سمندر کو معلوم تھا کہ اگر دوران جنگ ساحلی زمین سے پارمینو کے قدم اکھڑ گئے تو

جانبہ ہو، تقریباً ناممکن تھا۔ اس دن سکندر نے خوش ہو کر کہا تھا کہ وہ فرال کی تین ہزار خواہشات پوری کرے گا۔ یہ جو تم فرال کے ہاتھ میں قلب کا پرچم دیکھ رہے ہو یہ اسی واقعے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ دو ہفتے پہلے فرال نے سکندر سے خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ میدان جنگ میں "یونانی قلب" کا پرچم تھامنا چاہتا ہے۔ دو اور سالار بھی عرصے سے اس منصب کے خواہشمند تھے لیکن سکندر نے ان دونوں پر ترجیح دے کر فرال کو پرچم بردار بنایا ہے۔"

تاجان کو اب کچھ کچھ یاد آ رہا تھا کہ اس نے فرال نامی اس نوجوان کو پہلے بھی دیکھا ہوا ہے۔ گرینی کس کی جنگ کے نازک ترین لحظات تاجان کی نگاہوں میں گھومنے لگے۔ شاید برعنائے ٹھیک ہی بتایا تھا۔ جب سکندر دریا کے کنارے گرا تھا اور ایرانی سپاہی اس پر جھپٹے تھے تو یہ نوجوان آس پاس ہی موجود تھا۔ اس کی غیر معمولی طور پر مضبوط اور لمبی گردن سب سے جدا نظر آتی تھی۔

تاجان 'سردار برعنا کے پلوں میں گھڑا غور سے فرال کی حرکات و سکنات دیکھنے لگا۔ وہ ہر اعتبار سے ایک مضبوط اور دلیر جنگجو نظر آتا تھا۔ اب جنگ کا طبل بس بجتے ہی والا تھا۔ ایسے لمحوں میں تجربہ کار لشکریوں کے چہرے بھی اضطراب کی آماجگاہ بن جاتے ہیں لیکن فرال بڑے اطمینان سے اپنے دستے کے ارکان سے بات چیت میں مصروف تھا۔ گاہے گاہے وہ سکندر سے ضروری ہدایات بھی لے لیتا تھا۔ سکندر اور فرال سے تاجان کافی فاصلے پر تھا لہذا اس بات کا امکان نہیں تھا کہ سکندر تاجان کو دیکھ سکے گا۔ تاجان نے دمشق سے واپس آ کر ابھی تک سکندر کا سامنا نہیں کیا تھا اور ابھی کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا سالار اعظم اس سے خفا ہے وہ اس "ذوقی" کو میدان جنگ میں اپنی شجاعت اور ہنرمندی کے مظاہرے سے کم کرنا چاہتا تھا۔ جنگ میں فتح ہو جاتی تو سالار اعظم کا سامنا کرنا اور بھی آسان ہو جاتا کیونکہ ایسی صورت میں سالار اعظم کا مزاج خوشگوار ہوتا اور وہ تاجان کی اچانک غیر حاضری کو زیادہ اہمیت نہ دیتے اور عین ممکن تھا کہ باز پرس کی نوبت ہی نہ آتی۔

دور سے تاجان نے دیکھا کہ سکندر نے جنگ کی ابتدائی کارروائی کے طور پر اپنے چند گھڑسوار دستوں کو حرکت دی اور وہ منظم طریقے سے گھوڑے بھگاتے ان دھلوانوں کی طرف بڑھے جہاں ایرانی فوج کے دستے ٹولیوں کی صورت میں تنے کھڑے تھے۔ یہ ایرانی جنگی ترتیب میں نہیں تھے۔ لگتا تھا کہ وہ جنگ کی بجائے دھپ سینکنے کے لیے نکلے

ہوئے ہیں۔ سکندر کے پیچھے ہوئے گھڑسواروں نے ان پر حملہ کیا اور معمولی جھڑپوں کے بعد ان سے دھلوانیں خالی کر لیں۔ دھلوانیں خالی ہوتے ہی سکندر نے اپنی فوج کے بہترین حصے کو حرکت دی اور چند سو گزر آگے بھاگ گیا۔ اس کی یہ پیش قدمی بظاہر خیر اہم لیکن حقیقت میں دور رس نتائج کی حامل تھی۔

یہی وہ وقت تھا جب اصل جنگ کا آغاز ہوا۔ ایرانی فوج نے سب سے پہلے وہی قدم اٹھایا جس کا اندیشہ سکندر اور اس کے مژبوں کو کل سے پریشان کر رہا تھا۔ ہزاروں گھڑسواروں پر مشتمل بھاری ہتھیاروں والے ایرانی رسالے نے دریا میں اتر کر مل کر دیا۔ وہ بے پناہ تیزی کے ساتھ تھمسی و تھریس کے سواروں پر آگے۔ یہاں یونانی فوج کی قیادت پوڑھے مقدونی سالار پارمینو کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے بڑی دانشمندی سے صف بند کر رکھی تھی۔ ہر سپاہی اپنی جگہ چٹان کی طرح جم گیا۔ یونانی فوج کے ہر بھی بردار پیادے اپنی مخصوص حکمت عملی سے لڑ رہے تھے۔ ہر بھی برداروں کی کئی صفیں آگے پیچھے کھڑی تھیں۔ سب سے اگلی قطار کی برصیاں بھونکی اور ہلکی پھلکی تھیں۔ دوسری قطار کی برصیاں نسبتاً طویل اور وزنی تھیں۔ اسی طرح آخری قطار کی برصیاں قریباً ساڑھے پانچ گز طویل تھیں۔ یہ تمام قطاریں جب یکجا ہو کر سامنے آتی تھیں تو دشمن کے پسینے چھوٹ جاتے تھے۔..... لمحوں میں دریا کا پانی انسانی ذن سے سرخ ہو گیا۔ سر کی فصل کی طرح گرنے لگے اور ہتھیاروں کی جھکنا زخموں کی جگ و پکار سے ہم آہنگ ہو کر قیامت خیز ہو گئی۔ ایرانی گھڑسواروں کے لب ساحل آ جانے سے ایرانی لشکر کے ایک حصے میں خلا سا نمودار ہو گیا تھا۔ یہ خلا سکندر کی نگاہ میں تھا۔ وہ اپنے تند و تیز گھڑسوار دستوں کے ساتھ لڑائی میں کودنے کو بالکل تیار تھا۔ جو دھلوانیں اس نے ایرانی سپاہیوں سے خالی کر دلی تھیں اور جنہیں انہوں نے بغیر کسی خاص مزاحمت کے خالی بھی کر دیا تھا اس وقت سکندر کے لیے بے حد سودمند ثابت ہو سکتی تھیں۔

جب لب ساحل لڑائی جم کر ہونے لگی اور یونانی سپاہیوں نے ایرانی رسالے کے سامنے خم ٹھونک لیا تو سکندر نے اپنے ہزاروں گھڑسواروں کے ساتھ گھوڑوں کو اڑ لگائی اور اس خلا کی طرف بڑھا جسے وہ دیر سے لپائی لگا ہوں کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ یونانی رسالے کی رفتار بے حد تباہ کن تھی اور اس کا سبب وہ دھلوان تھیں جس پر سکندر کے گھوڑے فرارے بھرتے ہوئے جا رہے تھے۔ جب سکندر ایرانی فوج سے ٹکرایا تو اس کے زورہ پوش سواروں کی ہراول صفیں کئی سو قدم تک ایرانی لشکر کو چیرتی اور ادھیڑتی چلی

Handwritten signature or mark.

گئیں۔ ان کی حیثیت پہاڑ کے ایک ایسے حصے کی تھی جو شدید بارشوں سے منہم ہو کر اچانک ٹپٹی بستیوں پر جا پڑے۔ ایرانی فوج میں دور تک گھسنے کے بعد یونانی فوج نے اچانک رخ پھیرا اور بائیں پسلو سے ایرانیوں پر شدید ترین حملہ کر دیا۔ یہ فیصلہ کن معرکہ تھا۔ سکندر کی ولولہ انگیز قیادت اس کے جابجاؤں میں ایک نئی روح پھونک رہی تھی اور یہ روح غیر محسوس طور پر پورے لشکر میں سرایت کر چکی تھی۔ فتح سے پہلے ہی انہیں یقین ہو رہا تھا کہ وہ فتح مند ہوں گے۔ خون کے اچھلتے فواروں، کٹے سروں اور بھڑکتے اشوں کے درمیان یونانی آگے ہی آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ عقب میں موجودہ پیادہ فوج تک جا پہنچے۔

دوسری طرف ساحل کے ہموار میدان میں لڑائی اپنے غروب پر تھی۔ پارمینو جاننا تھا کہ اگر اس مقام سے یونانی فوج پیچھے ہٹ گئی تو دیرری سے آگے بڑھتا ہوا سکندر گہر کر رہ جائے گا۔ وہ اپنے سرداروں اور ہوانوں سے بار بار ایک ہی بات کہہ رہا تھا۔ ”ہر شخص اپنی جگہ ایک قلعہ کی طرح جم جائے۔ ہم نے یہاں دشمن کا راستہ روک لیا تو سمجھو نصف فتح حاصل کر لی۔“ ایرانی رسالے کا حملہ بے حد شدید تھا۔ کتابان اور اس کے ساتھیوں کی ڈھالیں خزاں دیدہ پتوں کی مانند لرز رہی تھیں۔ وہ قدم قدم پیچھے ہٹ رہے تھے اور ہر قدم پر مزاحمت کر رہے تھے۔ آخر کتابان نے خود کو گھٹنوں گھٹنوں پانی میں پایا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کے سپاہی چند قدم مزید پیچھے ہٹے تو دریا کا بھاؤ ان کے پاؤں اکھاڑ دے گا۔ قریباً دس ایرانی حملہ آوروں کی ایک ٹولی خطرناک حد تک آگے آچکی تھی۔ کتابان کے دل نے گواہی دی کہ حملے کی شدت کو کم کرنے کی لیے اس ٹولی کو روکنا ہو گا۔ اس نے پارمینو کی طرف اجازت طلب نگاہوں سے دیکھا پھر دو جانباز سپاہیوں کے ساتھ پانی میں غوطہ زن ہو گیا۔ غوطہ زن ہونے سے پہلے ان تینوں نے ڈھالیں اور خود وغیرہ جسموں سے علیحدہ کر دیئے تھے۔ اب ان کے ہاتھوں میں تیز دھار فنجے تھے۔ زیر آب تیرتے ہوئے وہ تینوں اس ٹولی کے قریب پہنچ گئے اور ایک نکتہ حملہ کر کے کم از کم پانچ ایرانیوں کو قتل کر ڈالا۔ باقی خود فرود ہو کر ادھر ادھر بکھر گئے۔ انہیں پتہ ہی نہیں چلا تھا کہ اچانک کیا افتاد آن پڑی ہے۔ اس کامیابی سے کتابان اور اس کے ساتھیوں کے حوصلے بلند ہوئے۔ انہوں نے پانی کے نیچے ہی نیچے تیر کر ایرانی سپاہیوں پر چند اور جان لیوا حملے کئے۔ ایرانی حملے کی شدت ذرا کم ہوئی تو پارمینو نے اس مصلحت سے فائدہ اٹھا کر بھرپور جوابی بلر بول دیا اور دریا کے مین وسط میں قدم جمائے۔

قریباً ایک وقت تھا جب میدان جنگ کے مرکز میں جنگ کا فیصلہ ہو گیا۔ سکندر کے طوفانی دستوں نے زبردست آنگ اور تال میل کے ساتھ ایرانیوں پر فیصلہ کن ضرب لگائی۔ ہزاروں آزمودہ کار لشکر کی فرد واحد کی طرح دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ ان کے مقابلے میں ایرانی کسی خاص نظم و ضبط اور مزاحمت کا مظاہرہ نہ کر سکے۔ زبردست دباؤ کے سامنے وہ منتشر ہونا شروع ہوئے۔ شاہ ایران دارا اپنے رتھ میں سوار تھا اس کی بہترین فوج کا بڑا حصہ ابھی تک محفوظ تھا وہ اس وقت تدبیر اور حوصلہ مندی کا ثبوت دیتا تھا شاید یونانیوں کو اتنی جلدی یہ تاریخی فتح نصیب نہ ہوتی..... لیکن بڑھتے ہوئے دباؤ کے سامنے دارا کے انصاف اچانک پکنا پھور ہو گئے..... اس نے رتھ بان کو رتھ موڑنے کا حکم دیا اور میدان جنگ سے بھاگ نکلا۔ اسے بھاگتے دیکھ کر افواج کے زیر و زبر حوصلے دفعتاً سمار ہو گئے۔ ایک ایک بھگدڑ مچ گئی۔ اس بھگدڑ میں دارا کا رتھ بھی پھینس گیا۔ اس نے گہرا کر رتھ سے چھلانگ لگی اور ایک گھوڑے پر سوار ہو کر بھاگ نکلا۔ ذرا سی دیر بعد اپنے بادشاہ کے نقش قدم پر پلٹی ہوئی ایرانی فوج وادی کے تنگ راستے میں پھنس کر رہ گئی۔ سکندر کے لشکر کی خون آشام عفریتوں کی طرہ ان کے تعاقب میں تھے۔ تنگ درے میں ایرانی فوج کا زبردست جانی نقصان ہوا۔ تیسرا نیزے اس پھنسی ہوئی فوج پر موسلا دھار بارش کی طرح برسے۔ یونانی تلواروں نے انہیں گاجر مولیٰ کی طرح کاٹا اور لہجوں میں کشتوں کے پٹے لگ گئے۔ سکندر نے اپنے گھڑ سوار دستوں کو بھاگتے دشمن کے تعاقب کا حکم دیا۔ پارمینو نے بھی اپنے کچھ دستوں کو اس تعاقب میں شریک کر دیا۔ ان میں کتابان کا دستہ بھی شامل تھا۔

اوپنی چیچی گھائیوں اور تیر ہموار میدانوں میں یہ ایک پُر ہوش تعاقب تھا۔ کتابان اپنے آگے سینکڑوں بیگلوں سے سپاہیوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ جان بچانے کے لیے پورا زور لگا رہے تھے۔ انہیں نیزوں میں پرہا اور تیروں سے چھلنی کر کے گھوڑوں کے روندا جان بگ کا حصہ تھا اور سنسنی خیز تجربہ بھی۔ شہزادی مارشاکی دی ہوئی تلوار کتابان کے ہاتھ میں تھی اور وہ اس تلوار کو انسانی خون سے سیراب کر رہا تھا۔ ایک عجیب وحشت سی اس پر طاری تھی۔ دشمن کے گوشت میں دھنسی ہوئی تلوار اس کے بازو کو عجیب فرحت بخش رہی تھی۔ سکندر کا حکم تھا کہ تعاقب اس وقت تک جاری رکھا جائے جب تک ایرانی تباہ و برباد ہو کر منتشر نہیں ہو جاتے۔ لہذا یہ ایک طویل سفر ثابت ہوا۔ پہاڑی بھول ملیوں میں، جنگلوں میں، دشوار راستوں پر ہر جگہ غنیم کا پیچھے کر کے اسے نیست و نابود کیا گیا۔

چاہتا تھا لیکن سکندر کے ارد گرد بہت بھیڑ تھی اور کوشش کے باوجود اسے شامی خیمے میں پارہیلی کا موقعہ نہیں مل سکا۔ سکندر سے ملاقات کے خواہشمند افراد کی ایک لمبی قطار خیمے سے باہر موجود تھی۔ تہاں کچھ دیر اس قطار میں بیٹھا رہا لیکن جب قطار کی طوالت میں کوئی خاص کمی واقع نہیں ہوئی تو اٹھ کر واپس آگیا لڑائی میں ہوشیار زخمی ہو گیا تھا۔ یہ زخم ظاہری نہیں اندرونی تھا۔ اس کی گردن کا پٹھان اکثر چڑھ جاتا تھا پھر چڑھ گیا تھا اور وہ بڑی مشکل سے دائیں یا میں دیکھ سکتا تھا۔ اس نے تہاں کو بتایا کہ سالار اعظم نے پتھلی کے کچھ دستوں کو دمشق روانہ کیا ہے۔ ان دستوں کی قیادت جہانگیر پارمینو کے پرد ہے۔ دراصل سکندر کو معلوم ہوا تھا کہ وہ مشن میں دارا کا خاصا برا خزانہ موجود ہے۔ اس کے علاوہ نوکر چاکر ہیں اور نادر اشیاء کے ذخیرے ہیں۔ سالار پارمینو انی چیزوں کو تحویل میں لینے کیا تھا۔ تہاں کے اضطراب میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اگر اسے بھائی ہوئی فوج کے تعاقب میں نہ بھیجا جاتا تو اس وقت وہ بھی پارمینو کے ساتھ دمشق میں ہوتا اور شہزادی مارشا کو اپنے ہاتھوں سے رہائی دلاتا۔

تہاں اپنے خیمے میں پہنچا تو کئی سردار اور ہائی اس کے پاس آ بیٹھے۔ ان میں سے بیشتر ایسے تھے جو اسے میدان جنگ میں انتہائی بے ہنگامی سے لڑتے دیکھ چکے تھے۔ وہ اس کی تقریضیں کرنے لگے۔ اس کے لیے تو مینعی جملہ کئے گئے۔ یہ سب کچھ بے انتہا خلوص سے کہا جا رہا تھا لیکن نہ جانے کیوں تہاں کو ہالک رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا جب وہ ی موجود نہیں جس کے لیے یہ سب کچھ کیا تھا تو پھر کیا حاصل ان تقریظوں سے۔ وہ حسین لب اس کی نگاہوں سے اوجھل ہیں اب ہزار باب بھی اس کی مدد میں متحرک ہو جائیں تو کیا فرق پڑتا ہے۔ اس نے جلد از جلد اپنے ہاتھوں سے چھٹکارا حاصل کر لیا اور خیمے کے پھونکنے پر چٹ لٹ کر چمت کو گھوڑے لگ کر گڑھی اس کے اضطراب میں اضافہ ہو رہا تھا۔ مارشا کا تصور لمحہ بہ لمحہ اس کی نگاہ میں تھا نصف شب تک اس نے سینکڑوں ہی کروٹیں بدل ڈالیں۔ آخر ہوشمند کو اٹھ کر مشعل دان روشن کرنا پڑا۔ وہ تہاں کو گھورتے ہوئے بولا۔

”تہاں!..... سو جانا تمہارے بس میں نہیں ہے!“

”ہاں۔“ تہاں نے صاف گوئی سے کہا۔ اس کا لہجہ کھویا کھویا سا تھا۔

”اور سکندر سے ملاقات بھی ممکن نہیں!“

”ہاں۔“ تہاں نے مختصر جواب دیا۔

شرقی افواج کو ایسے سخت تعاقب سے پہلی مرتبہ پالا پڑا تھا لہذا وہ بری طرح پٹ رہی تھیں۔ ان کا نظم و ضبط پارہ پارہ ہو چکا تھا اور اب وہ خود پارہ پارہ ہو رہے تھے۔

تہاں کو پیچھے کا بھی خیال تھا۔ اس کا دھیان رہ رہ کر دمشق کی طرف جا رہا تھا۔ معلوم نہیں وہاں کیا صورت حال پیش آئی تھی۔ معبد پر قبضہ ہوا تھا یا نہیں؟ وہ جلد از جلد وہاں پہنچنا چاہتا تھا لیکن سکندر کی مزید ناراضگی مول لینا بھی مناسب نہیں تھا۔ وہ چاہتا تھا اسے جو فرائض سوئے گئے ہیں بہ احسن طریق انجام دے۔ قریباً تین روز تعاقب کی سنسنی خیزی اور بھاگ دوڑ میں گزر گئے۔ تہاں اپنے دستے کے ساتھ ایک ساحلی جنگل میں دور تک نکل گیا تھا۔ وہاں سے واپس آتے ہوئے اسے ڈیڑھ دن مزید لگ گیا۔ وہ واپس اسوس پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ جنگ کے بعد کے ضروری امور انجام دیے جا چکے ہیں۔ زخمی شفا خانوں کو پہنچ چکے ہیں، سرنے والے یونانیوں و مقدونیوں کی آخری رسوم ادا ہو چکی ہیں اور ان کی جگہ نئی تقریریں بھی عمل میں آ چکی ہیں۔ اب متحدہ یونانی فوج جشن فتح منارہی تھی۔ دارا کی شای خیمہ گاہ فاتح سالاروں کے قبضے میں تھی۔ یہ ایک شاندار خیمہ گاہ تھی۔ شامیانوں میں رنگین فانوسوں کے اندر چراغ جھلما رہے تھے۔ فرش پر اعلیٰ درجے کے قائلین تھے۔ یہاں تہاں نے سبک سلیمانی کے چھوٹے چھوٹے حوض دیکھے جن میں خوشبودار پانی بھرا تھا۔ حوضوں کے کنارے چاندی کے آفتابے تھے اور منقش طلائی ڈبوں میں ایشیا رکھا تھا۔ پوری خواب گاہ میں پکوانوں کی مکھ تھی اور نشہ آور مشروب کے جام پکے رہے تھے۔

نیمیں ایک جگہ تہاں کو خوبصورت ڈھال اور بہت مضبوط کمان رکھی نظر آئی۔ اسے بتایا گیا کہ یہ شہنشاہ ایران کے ہتھیار ہیں اور نمائش کے لیے رکھے ہیں۔ معلوم ہوا کہ دارا یہ اشیاء رتھ میں ہی چھوڑ بھاگ تھا۔ شامی خواتین بھی اب یونانیوں کے قبضے میں تھیں ان خواتین میں دارا کی والدہ اور حسین ملکہ سرفیڑا بھی تھیں۔ اس کے علاوہ دارا کی دو بیٹیاں اور ایک شیر خوار بچہ بھی قیدیوں میں شامل تھے۔ سکندر نے ان معزز خواتین سے احترام کا سلوک کیا تھا اور اپنے پیانیوں کو بھی ہدایت کی تھی کہ وہ ایرانی خواتین سے دور رہیں۔ کچھ سردار جو اس جشن فتح کو ہر طرح ”مکمل“ کرنا چاہتے تھے سکندر کے اس فیصلے پر ناخوش تھے لیکن سردار کے حکم سے سرتابی کی انہیں جرأت نہیں تھی۔ سکندر نے خیر گلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس جشن میں اسوس کے شہروں کو بھی شامل کر لیا تھا اور ان کے لیے خراج میں کئی رعایتوں کا اعلان کیا تھا۔ تہاں اب سکندر سے ملنا سے

”پھر کیسے گزرے گی یہ پہاڑی رات؟“

”مجھے خود معلوم نہیں۔“ تباہ نے کہا۔

”تو اٹھو پھر۔“ ہوشمند اپنے مخصوص جوشیلے انداز میں بولا۔ ”گھوڑا سنبھالو۔ دمشق چلتے ہیں۔ یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے شہر۔ کوشش کریں تو کل کسی وقت وہاں پہنچ سکتے ہیں۔“

ہوشمند نے جیسے تباہ کی بات کسی تھی۔ اس کے سگتے سینے میں ٹھنڈک سی اتر گئی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔

☆-----☆-----☆

رات پچھلے پر ہوشمند اور تباہ پڑاؤ سے نکلے اور مشرقی رخ پر دمشق کی طرف روانہ ہو گئے۔ انہوں نے یہ سفر خاصی تیز رفتاری سے طے کیا اور اگلے روز دمشق پہنچ گئے۔ اس وقت رات ہو چکی تھی۔ عظیم الشان شہر کے گلی کوچوں میں روشنیوں غمازی تھی۔ سڑکوں اور راستوں پر ابھی گماگماہی تھی لیکن ایک طرح کی سوگوار سنجیدگی ہر شخص کے چہرے سے چپکی ہوئی تھی۔ ظاہر ہے اس سنجیدگی کا سوگوار کا تعلق ایرانی فوج کی عبرت ناک شکست سے تھا۔ تباہ اور ہوشمند کو جگہ جگہ یونانی سپاہیوں کی ٹولیاں نظر آئیں۔ یہ زرد پوش مسلح سپاہی چوراہوں اور شہر کی اہم عمارتوں پر پہرہ دے رہے تھے۔ تباہ اور ہوشمند بھی در دیاں پسے ہوئے تھے لہذا کئی سپاہیوں نے ان دونوں کو پہچانا اور نرجوش انداز میں ہاتھ بلائے۔ تباہ جانتا تھا سالار پارمینو اس وقت شاہی محل میں ہوں گے لیکن وہ پارمینو سے بھی پہلے شہزادی سے ملنا چاہتا تھا۔ وہ دونوں گھوڑے دوڑاتے شہر کے بچوں سچ سے گزرے اور دوسری طرف نکل گئے۔ مضافات سے آگے ”راسی“ کا وسیع جنگل تھا۔ یہیں ایک بلند ٹیلے پر وہ معبد تھا جہاں تباہ کی ہفتے ایک انجانی دنیا کے بحر میں گمن رہا تھا۔ تباہ نے راستے میں کئی یونانی و مقدونی سپاہیوں سے معبد کے بارے پوچھا لیکن کوئی بھی معلومات افزا جواب نہیں دے سکا۔ آخر وہ دونوں جنگل سے گزر کر اس پرخطر و حلوان کے دامن میں پہنچ گئے جہاں گھوڑے پر سفر جاری رکھنا ناممکن تھا۔ دفعتاً تباہ کی نگاہیں بلندی کی طرف اٹھ گئیں۔ اس نے و حلوان کے اس پار دھوئیں کے گمرے مرفوعے دیکھے۔ چاندنی رات میں یہ سیاہ دھواں اوپر ہی اوپر اٹھتا چلا جا رہا تھا۔ جس جگہ وہ کھڑے تھے وہاں بھی دھوئیں کے اثرات صاف محسوس کئے جاسکتے تھے۔ تباہ کو احساس ہوا کہ معبد میں کوئی گڑبڑ ہو چکی ہے۔ وہ ہوشمند کے ساتھ حتی الامکان تیز

رفتار سے و حلوان طے کرنے لگا۔ آخر بلندی سے معبد کے در و دیوار ابھر کر ان کے سامنے آ گئے۔ تباہ ششدر رہ گیا۔ اس قدیم اور عظیم الشان معبد کی اینٹ سے اینٹ بج چکی تھی۔ بیرونی دیواریں کئی جگہ سے مسمار تھیں اور اندر محض مقامات سے شعلے اٹھ رہے تھے۔ تباہ کو جگہ جگہ کانٹوں پھاریوں اور کنیزوں کی لاشیں بھی دکھائی دیں۔ یونانی فوج کے قریباً تین سو مسلح سپاہی یہاں موجود تھے۔ لگتا تھا معبد کا تخت و تاراج ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ شاید یہ آج صبح دوپہر کا واقعہ تھا۔ تباہ اور ہوشمند یونانی سپاہیوں کے پاس پہنچ گئے۔ ان میں سے کئی سپاہی تباہ کو بطور یک بڑی سردار پہچان گئے۔ وہ اس کے گرد جمع ہو گئے۔

تباہ نے پوچھا۔ ”یہاں حملہ کیا ہوا؟“

”آج دوپہر۔“ ایک صدی یونانی سوار نے ادب سے جواب دیا۔

”کس نے حکم دیا تھا؟“

سپاہیوں نے فحش کے ایک سردار کا نام بتایا اور یہ بھی بتایا کہ محترم سالار پارمینو سے اس حملے کی قاعدہ و اجازت لی گئی تھی۔ (اسکندر کی افواج جہاں گاہوں اور مندروں سے اکثر کترا کر گزر جاتی تھیں تاہم کبھی کبھی جنگی نقطہ نظر سے ان عبادت گاہوں میں داخل ہونا ضروری ہو جاتا تھا)۔ تباہ کے انتشار پر ایک صدی سردار نے بتایا۔

”تین روز پہلے جب متحدہ یونانی فوج پارمینو کی زیر کمان دمشق میں داخل ہوئی تو تین ایرانی سردار بھاگ کر اس معبد میں آچھپے۔ یہ تینوں سردار جنگی مجرم تھے اور سالار پارمینو کو ہر صورت میں مطلوب تھے۔ ان سرداروں نے کچھ عرصہ پہلے بحیرہ استیخس سے ایک تجارتی کشتی اغوا کی تھی۔ کشتی میں موجود بے ضرر شہروں کو قیدی بنایا تھا اور پانچ خواتین کی عصمت دری کر کے ان کی لاشیں یونانی ساحل پر پھینک دی تھیں۔ یہاں پہنچ کر جب یونانی سپاہیوں نے معبد کے منتظمین سے مفروضہ سرداروں کو طلب کیا تو معبد کے دروازے بند کر دیے گئے اور سپاہیوں پر تیر زنی و خشونت پائی گئی۔ معبد کے کانٹوں کو پر امن طریقے سے راہ راست پر لانے کی کوشش کی جاتی رہی لیکن دو دنوں میں ایک مرتبہ بھی انہوں نے کوئی ڈھنگ کا جواب نہیں دیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ایرانی سپاہ کو شکست فاش ہو چکی ہے اور اب اس معبد سمیت پورا و دمشق یونانی فوج کے رحم و کرم پر ہے وہ اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہے اور سپاہیوں کو اپنے ”پانچ مقدس کانٹوں“ کا نام لے لے کر ڈراتے رہے۔ پارمینو نے انہیں آج دوپہر تک کی صلت دے رکھی تھی یہ

مہلت ختم ہو گئی تو معبد پر بلر بول دیا گیا۔ اس محلے میں دو ایک ہزاری دستوں نے حصہ لیا۔ معبد کے اندر سے غیر متوقع طور پر زبردست مزاحمت کی گئی۔ مردوں کے ساتھ ساتھ معبد کی بیشتر عورتوں نے بھی اس لڑائی میں حصہ لیا۔ تاہم یونانی فوج کے تربیت یافتہ دستہ دروازے توڑ کر اندر گھس گئے۔ زبردست لڑائی کے بعد معبد پر قبضہ کر لیا گیا اور مطلوبہ افراد پکڑ لئے گئے۔

ایک صدی سردار نے بتایا کہ اس لڑائی میں یونانی فوج کا زبردست نقصان ہوا ہے۔ معبد کی خفیہ کمین گاہوں سے زبردست تیر اندازی کی گئی جس سے کم و بیش چار صد یونانی فوجی ہلاک ہوئے۔ اس کے بعد معبد کی چھت کے پڑا سرا سوراخوں سے زہریلے حشرات الارض کی بارش کر دی گئی۔ مٹی کی بانڈیوں میں سانپ، بچھو اور دیگر موذی کڑے بھر کر لشکر پر بھیجے گئے۔ اس سے لشکریوں میں ہراس پھیل گیا اور کئی افراد ڈسے بھی گئے۔ سارا کے حکم پر معبد کو چاروں طرف سے آگ لگا دی گئی تاکہ حشرات کی یہ فوج اندر ہی جل کر بھسم ہو جائے۔ تاہاں کو بتایا گیا کہ معبد سے کم و بیش پچاس عورتوں اور بیس بچاریوں کو گرفتار کیا گیا ہے۔ دو صد محافظ اس کے علاوہ ہیں۔ عورتوں میں چند ایسی عورتیں بھی تھیں جنہیں دیویوں کا جانا تھا اور وہ خاص لباس پہنے ہوئے تھیں۔ تاہاں کی تمام تر پریشانیوں مارشا کے لیے تھیں۔ اسے کچھ معلوم نہیں ہو سکا کہ مارشا زندہ سلامت یہاں سے نکل سکی تھی یا نہیں اور اگر نکلی تھی تو اب کہاں تھی۔ وہاں موجود سپاہیوں نے بتایا کہ گرفتار شدہ عورتوں اور مردوں کو دوسری دمشق کی طرف روانہ کر دیا گیا تھا۔

تاہاں نے دو مشعل برادروں کو ساتھ لیا اور معبد کے ایوان عام کی طرف بڑھا اندر داخل ہوتے ہی بائیں جانب اسے ایک مسمار دیوار نظر آئی۔ اس دیوار کی دوسری جانب پچاسی گھاٹ نظر آ رہا تھا۔ وہی پچاسی گھاٹ جہاں کچھ روز پہلے کابن ختام کی لاش جمہولتی نظر آئی تھی آج وہاں کچھ اور لاشیں جمہول رہی تھیں۔ یہ منظر دیکھ کر تاہاں کا لبو رگوں میں مٹنے لگا۔ اس نے ایک مشعل برادر کے ہاتھ سے مشعل لے کر بلند کی اور پچاسی گھاٹ کے قریب پہنچ گیا۔ اب اسے پچاسی پانے والوں کی صورتیں صاف نظر آ رہی تھیں۔ یہی وہی پانچ مقدس بوڑھے تھے جن کی نسبت اس معبد میں اور معبد سے باہر دور تک طاری تھی۔ ایک خلقت کو انہوں نے اپنے حرم میں گرفتار کر رکھا تھا اور ایک زمانہ ان کی شعبہ بازیوں سے مہموت تھا۔ وہ خود کو مقدس ارواح کہلاتے تھے اور اس معبد میں سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ آج وہ اپنے ہی قائم کردہ پچاسی گھاٹ پر عبرت نگاہ بنے

جمہول رہے تھے۔ ان کے گلے میں ابھی تک رنگ رنگی مالا میں موجود تھیں۔ زرد تار گہرا چنے ہوا میں پڑ پڑا رہے تھے۔ پھولے ہوئے پھینٹ کچی ہوئی گردنیں، کسی کی آنکھیں حلقوں سے ابل رہی تھیں اور کسی کی زبان ٹھوڑی پر لٹکی ہوئی تھی۔ تاہاں آگے بڑھتا بڑھتا شدہ ایوان عام کے مختلف حصے نظر آئے۔ رکتھین پھلیوں والے ایوان میں کئی لاشیں تیر رہی تھیں اور ان میں سے اکثر یونانی سپاہیوں کی تھیں۔ لگتا تھا ان پر تیروں کی بارش کی گئی ہے۔ تالاب کو پار کر کے تاہاں اس چپوترے پر چڑھ گیا جہاں اس نے سیٹلی بار "مقدس ارواح" کا دیدار کیا تھا۔ چپوترے کے اطراف میں دو دیواریں مسمار ہو چکی تھیں اور لمبے سنگ رہا تھا۔ یہاں چھت میں بھی ایک بہت بڑا شکاف نظر آیا۔ مشعل برادروں نے بتایا کہ اسی شکاف سے گزر کر مقدونوی جانپازوں نے معبد کے تیر اندازوں پر قہار پلایا تھا۔ یہاں تاہاں کو دیواروں میں خفیہ سوراخ نظر آئے۔ انہی سوراخوں سے گلابی دھند نکل کر چپوترے کا احاطہ کر لیتی تھی۔ اس کے علاوہ تاہاں نے تانبے اور پیتل کی بھجھوٹی چھوٹی گھنٹیاں دیکھیں۔ یہ گھنٹیاں دیواروں کے اندر پوٹ شدہ خانوں میں چن دی گئی تھیں اور انہیں ڈوروں کے ذریعے حرکت دے کر پڑا سرا پر آواز پیدا کی جاتی تھی۔

معبد کے مختلف چھتے اور سنگتے ہوئے حصوں سے گزر کر تاہاں بالائی منزلوں پر آ گیا۔ یہاں بھی دوپہر کو ہونے والی شدید لڑائی کے آثار ہو رہے تھے۔ تاہاں کو یہاں چند بہت بڑے شیزاؤں کی لاشیں بھی دکھائی دیں۔ یہ ان عورتوں کی لاشیں تھیں جنہوں نے کبھی کسی جنگ میں حصہ نہیں لیا لیکن ہر زمانے اور ہر خطے میں وہ جنگ کی بحیثیت چڑھی ہیں۔ ہنشن فتح ہو یا شکست کی سوگوار۔ انہیں ہر موقع پر تختہ مشق بنایا گیا ہے، جنگ نے ان کی گودیں اجاڑی ہیں، سہاگ چھینے ہیں، بے آسرا کیا ہے اور مورد الزام بھی انہی کو ٹھہرایا ہے۔ یہ عورتیں بھی جنگ کی پہچان خیزی کا شکار ہوئی تھیں۔ اپنے بے پناہ جانی نقصان سے شہنائے ہوئے یونانی سپاہی ان عورتوں پر پل پڑے تھے۔ یقیناً اگر مخالف فریق بھی کسی موقع پر ایسی صورت حال سے دوچار ہوتا تو یہی کر کہ یہ نصاب جنگ تھا، یہی کستہ زانوؤں سے رانج دستور تھا۔ تاہاں آگے بڑھا تو اس قصر کے در و دیوار نظر آئے جہاں دیوی آئیں رہتی تھیں۔ نہ آج گلابی دھند کے مرغولے تھے نہ گھنٹیوں کی صدا، نہ دیواروں سے پتہ پتہ روشنائیں۔ یہ سب کچھ برباد ہو چکا تھا۔ جیسے وہ پانچ بوڑھے نہیں تھے، پانچ سحر تھے جن کے مرتے ہی جادو گمراہی ناپید ہو گئی تھی۔ قصر انہیں میں تاہاں کو ملازم خاص دروازہ کی لاش نظر آئی۔ وہ ایک بالکونی سے گر کر مر گئی تھی۔ اب معلوم نہیں اسے چھینکا گیا تھا یا

اس نے چلاٹنگ لگائی تھی۔ تہاں اس پر اپنی سی نگاہ ڈالتا ہوا قصر نور کی طرف بڑھ گیا۔ یہ اس وسیع و عریض عمارت کا اہم ترین حصہ تھا۔ معبد کے سرکردہ افراد بھی یہاں قدم رکھنے کی جرات نہیں کر سکتے تھے لیکن آج یہ قصر نور تباہی و بربادی کی تصویر تھا۔ یوں لگتا تھا یہاں جنگی گھوڑوں کا غول بیابانی پکراتا رہا ہے۔ در و دیوار پر خون کے چھینٹے تھے اور بلند دیوار آہنی دروازے کو نکلے ہوئے تھے یا سبک رہے تھے۔ تہاں دیوانوں کی طرح قصر نور میں پکراتا رہا اور شرمادی مارشا کو آوازیں دیتا رہا لیکن قصر نور، قصر ظلمات بنا ہوا تھا، یہاں خاموشی تھی، ادھ جلی لاشیں تھیں یا دھواں تھا۔ ہر لاش کا چہرہ دیکھنے سے پہلے تہاں کو درد و کرب کے لامتناہی صحرا سے گزرنا پڑا تھا۔ اگر مارشا کو کچھ ہو گیا.....؟ اس سے آگے اس کی سوچ کام نہیں کرتی تھی۔ یوں لگتا تھا دماغ اور جسم کا رشتہ منقطع ہو گیا ہے۔ مشعل بردار تہاں کے ساتھ ساتھ تھے۔ در و دیوار کی ہیبت ناک خاموشی نے انہیں سہارا دیا تھا۔ شاید وہ سوچ رہے تھے کہ ابھی کسی سلگتے دروازے کے عقب سے پانچوں مقدس بوڑھوں کی روحمیں برآمد ہوں گی یا کوئی مقتول دیوی خون میں نہائی ہوئی اور سر کے پوچھ سے آزاد، چم سے ان کے سامنے آجائے گی۔

”واپس چلیں؟“ ایک مشعل بردار نے قصر کے خونچکاں در و دیوار کو گھورتے ہوئے کہا۔

”ہاں چلو۔“ تہاں نے جواب دیا۔

دونوں مشعل بردار مزے اور تیز قدموں سے سرنگ نما راہداری کی طرف چل دیے۔ یہی وقت تھا جب سلگتے لمبے کے عقب سے ایک لرزہ خیز چنگھاڑ بلند ہوئی اور ایک سایہ سا مشعل برداروں پر چھٹا۔ تہاں نے ایک مشعل بردار کو اچھل کر دیوار سے ٹکراتے اور پھر انگاروں کے ایک ڈھیر پر گرے دیکھا۔ دوسرا مشعل بردار مشعل پھینک کر دیوانوں کی طرح چلتا ہوا سرنگ نما راہداری کی طرف بھاگا۔ تہاں نے حملہ آور کو غور سے دیکھا اور لرز گیا۔ یہ جڑواں جیشتھے تھے، وہی چار ٹانگوں اور چار ہاتھوں والی ”استثنائی طاقتور بلا“ جو قصر نور میں کسی آسیب کی طرح چھکراتی تھی اور ہر شے کو اپنی تیز چمکی لگا ہوں کی زد میں رکھتی تھی۔ توامی جیشتھی تیزی سے آگے بڑھے۔ شاید وہ تہاں کو اپنے آہنی بازوؤں میں بھینچ کر مار دینا چاہتے تھے لیکن تہاں پوری طرح ہوشیار تھا۔ وہ ان بازوؤں کی حیوانی قوت سے بھی آگاہ تھا، اسے معلوم تھا کہ ایک بار وہ اس جگہ میں آگیا تو جیتے ہی نکل نہیں سکے گا۔ اس نے تیزی سے پلو بدل کر خود کو جیوں کی زد سے بچایا اور مشعل کا بھرپور

دار ایک جیشتھی کے چہرے پر کیا۔ وہ در سے چینگ۔ دوسرے جیشتھے نے لپک کر تہاں کی کلائی پکڑ لی۔ تہاں اس وقت تک مشعل پھینک کر اپنا ہاتھ تلووار کے دتے کی طرف بڑھا تھا۔ اس نے تلووار نکالی اور اس سے پشترکہ مشعل کی ضرب سننے والا جیشتھی اس کی گردن کا دھج لیتا، تلووار پوری فٹ سے اس کے سینے میں گھونپ دی۔ یہ ایک نہایت زور دار اور مہارت دار تھا۔ تلووار تہاں جیشتھی کی زبردستی پھیلنے سے داخل ہوئی اور پشت کی جانب نکل آئی۔ جیشتھی نے دہشت ناک نظروں سے تہاں کو دیکھا پھر اپنے سینے کی جانب لپک کر اس کے دونوں ہاتھ خود بخود تلووار کے دتے پر آ گئے۔ ایک وحشیانہ جھٹکے سے اس نے تلووار سینے سے برآمد کی اور بے پناہ زور سے اس کا رخ تہاں کی گردن کی طرف موڑنے لگا۔ دوسرے جیشتھی نے تہاں کی کلائی چھوڑ کر اس کی گردن کا دھج لیا اور پوری قوت سے دھانے لگا۔ تہاں کو موت آنکھوں کے روبرو دکھائی دی۔ اس سے پہلے بھی اس کی گردن ایک توامی جیشتھی کی زو میں آ چکی تھی، دباؤ ایسا بے پناہ تھا کہ وہ چند لمحوں سے زیادہ ہوش میں نہیں رہ سکا تھا۔ اب ایک بار پھر اسے ویسے ہی دباؤ کا سامنا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ تلووار بدست جیشتھی سے برسر پیکار تھے۔ وہ اپنی گردن پر بے پناہ دباؤ کم کرنے کے لیے معمولی سی کوشش بھی نہیں کر سکتا تھا۔ زخمی جیشتھی کے سینے سے خون کا فوارہ ابل رہا تھا مگر اس کی طاقت میں زہر کی بھرکی واقع نہیں ہوئی تھی۔ وہ تہاں کی تلووار موڑ کر اس کے جسم میں داخل کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا تھا..... لیکن پھر یکایک اس کی ہمت جواب دے گئی۔ اس کے دونوں ہاتھ تہاں کے ہاتھوں سے علیحدہ ہو کر نیچے گر گئے اور سر ایک جانب ڈھلک گیا۔ وہ مرچکا تھا۔ تہاں کی گردن دبانے والے جیشتھی نے چونک کر اپنے توامی کی طرف دیکھا۔ وہ مرچکا تھا اور ایک بار بوجھ کی طرح اس کے جسم سے پیوست تھا۔ جیشتھی کی آنکھیں پٹی رہ گئیں۔ اس کے جسم کا ایک حصہ مرچکا تھا اور اپنا بوجھ سارے سے ہاتھ تھا۔ اس کی صورت حال کا شکار ہو کر جیشتھی کی توجہ چند سائنٹوں کے لیے تہاں کی طرف سے متعطف ہوئی۔ تہاں جیسے جگہ کے لیے یہ مہلت بہت تھی۔ اس نے اپنی ٹانگ کی ایک نہایت شدید ضرب جیشتھی کی پیٹ میں رسید کی۔ وہ لڑکھایا اور اپنے مردہ حصے کے پوچھ کو متبھانے کی کوشش میں چاروں شانے چت کر۔

یہ عجیب صورت حال تھی۔ وہ جڑواں جسم جو زندگی بھر اس کی قوت میں بے پناہ اضافے کا سبب رہا تھا اب اس کے لیے وہاں جان بنا ہوا تھا۔ زندہ جیشتھی نے بے حد جھلاہٹ کے عالم میں اپنے مردہ حصے کی طرف دیکھا..... پھر ایک وحشیانہ چنگھاڑ کے

ساتھ اٹھ بیٹھا۔ بے جان حبشی اس کے ساتھ بھول رہا تھا۔ یہ ایک دہشت ناک منظر تھا۔ تباہان کو اب حبشی کے ہاتھ میں ایک تیز کنار نظر آئی۔ یہ کنار اس نے فرش پر پڑے ہوئے اٹھائی تھی۔ کنار کے لوہے کا سبزی مائل رنگ بتا رہا تھا کہ وہ زہر میں بھیجی ہوئی ہے۔ اس کنار کا ایک چرکہ بھی کسی شخص کی موت کا باعث بن سکتا تھا۔ تباہان پوری طرح چوکس ہو گیا۔ کنار کے پسٹے دو وار اس نے اپنی تلوار پر روکے، پھر تیزی سے پسٹو پھینک دیا۔ حبشی اپنی بھونک میں ایک طرف بھاگا اور مردہ حبشی کے سبب لڑکھڑا کر اونٹھ سے منہ کر گیا۔ تباہان نے تلوار کو فنجری طرح دونوں ہاتھوں میں تھما اور سر سے بلند کر کے حبشی کی پشت میں گھونپ دیا۔ حبشی جان کنی کے عالم میں ترپنے لگا۔ یہی وہ وقت تھا جب تباہان کو اپنی پنڈلی پر سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے جھک کر دیکھا اور لرز گیا ایک سانپ اس کی ٹانگ سے لپٹا ہوا تھا۔ اس کی دو شاخہ زبان تیزی سے حرکت کر رہی تھی اور وہ اپنا منہ ملک زہر کسی بھی وقت تباہان کے جسم میں اتار سکتا تھا۔ یہ علاقے میں پایا جانے والا خطرناک ترین سانپ تھا اور اس کا کاٹا دوسرا سانس نہیں لیتا تھا۔ تباہان اپنی جگہ بے حرکت کھڑا رہا۔ پنڈلی پر حرکت کرتے ہوئے جب 'سانپ' نے اپنا ایک بل کھولا تو تباہان نے پھرتی سے اسے پکڑا اور فرش پر پھینچ مارا۔ تواری حبشی آخری ہنگی لے کر ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ تباہان نے اس کی پشت سے خون آلود تلوار کھینچی اور اپنے مشعل بردار ساتھی کی طرف مڑا۔ اسے ایک حبشی نے اٹھا کر دیوار سے دے مارا تھا۔ یہ ضرب مشعل بردار کے لیے جان لیوا ثابت ہوئی تھی۔ تباہان نے جھک کر دیکھا مشعل کی روشنی میں بد نصیب شخص کا سر دو حصوں میں منقسم نظر آیا۔ انگاروں پر گرنے سے اس کا سینہ جھلس گیا تھا۔ اب وہ دنیا کے ہر غم سے آزاد پڑا تھا اور تین خاکسری پچھو اس کے پاؤں پر دیک رہے تھے۔ تباہان نے انفسوس میں سر ہلایا اور مشعل کی روشنی میں سرنگ نما راستے کی طرف بڑھنے لگا۔ خون آلود تلوار بدستور اس کے ہاتھ میں تھی۔

☆-----☆-----☆

معبد سے تباہان کو مایوسی کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوا۔ وہ ہوشمند کے ساتھ واپس دمشق پہنچا اور سیدھا شاہی محل کا رخ کیا۔ یہ رات کا آخری پہر تھا۔ اس وقت سالار پارمینو سے ملاقات ناممکن تھی۔ دن چڑھے تک وہ دونوں محل کے دروازے پر موجود رہے۔ آخر تباہان نے چوبداروں کے ذریعے اپنا پیغام اندر پہنچایا۔ سالار پارمینو نے اسے فوراً بلا لیا۔ شاہی محل کی شان و شوکت مرعوب کن تھی۔ یہاں کا ذرہ ذرہ شہشاہ

ایران کے کروڑوں کا گواہ تھا لیکن اب یہ سب کچھ متحدہ یونین کے قدموں کی خاک تھا۔ سالار پارمینو نے ایک مالیشان نشست گاہ میں تباہان سے ملاقات کی۔ وہ گاؤں تکٹے سے نیک لگائے بیٹھا تھا اور خدنگار 'ہیڑائیں' اطراف میں موجود تھیں۔ پارمینو نے تباہان کو یہ خوشخبری سنائی کہ معبد سے گزارہ ہونے والی خواتین میں انتہائی شہزادی مارشا بھی موجود تھی۔ اسے بڑے احزام کے ساتھ اسوس روانہ کر دیا گیا ہے، جہاں ابھی سکندر کچھ روز قیام کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ یہ اطلاع سننے کے بعد تباہان کے لیے ایک پل بھی دمشق میں رکنا ممکن نہیں تھا۔ اس نے افرو تفری میں سالار پارمینو سے اجازت طلب کی اور ہوشمند کے ساتھ شاہی محل سے باہر آ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ دونوں گھوڑوں پر سوار اسوس جانے والے رات پراڑے جا رہے تھے۔

اسوس واپس پہنچ کر تباہان کو پتہ چلا کہ سالار اعظم سکندر شکار پر نکلے ہوئے ہیں اور شہزادی مارشا اس وقت سردار فرمال کی تحویل میں ہیں۔ وہ انہیں دمشق سے لے کر یہاں پہنچے ہیں۔ سردار فرمال کا نام سن کر تباہان چونکا۔ اس کی نگاہوں میں وہی خود بخود چاق و چوبند نوجوان گھوم گیا جو جنگب اسوس سے قبل یونانی قلب کا پرچم تھا۔ نظر آیا تھا اور جس کے بارے میں سردار فرمال نے بتایا تھا کہ وہ سالار اعظم کا خاص قرب حاصل کر رہا ہے۔ ایک واقف حال سردار نے تباہان کو یہ بتا کر مزید پریشان کر دیا کہ شہزادی مارشا اس وقت فرمال کی ذاتی تحویل میں ہے اور سکندر کی اجازت سے فرمال نے اسے اپنے خیمے میں رکھا ہوا ہے۔

تباہان کے تن بدن میں آگ سی بھڑک اٹھی۔ وہ اتنی وقت پڑاؤ کے اس سے کی جانب بڑھا جہاں تھسلی کے جگہوں کے خیمے تھے۔ فرمال کا خیمہ بھی وہیں تھا۔ وہ راستے کو پاؤں تلے روندتا، راگھروں سے ٹکراتا، تندہ گولے کی مانند فرمال کے خیمے کی طرف بڑھا ہی چلا جا رہا تھا۔ ہوشمند ہانپا ہوا اس کے پیچھے آ رہا تھا۔ تباہان کے ساتھ رہنے کے لیے اسے کبھی کبھی ہانکنا بھی پڑ رہا تھا۔ آخر وہ دونوں سردار فرمال روز کی خیمہ گاہ کے سامنے پہنچ گئے۔ یہ ساتھ ساتھ لے ہوئے تین خیمے تھے۔ یہاں بالکل قریب قریب چار ایک ہی خیمے جھڑے لہرا رہے تھے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ یہ پرچم بردار کی خیمہ گاہ ہے۔ ان شاندار خیموں کے باہر دو مسلح محافظ چوکس کھڑے تھے۔ تباہان دنگتا ہوا ان محافظوں تک پہنچ جانا چاہتا تھا کہ ایک جانب سے سردار فرمال نمودار ہوا۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ وہ غالباً تباہان کا مقابلہ کرتے ہوئے یہاں تک پہنچا تھا۔ اس نے تباہان کی

آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔
 ”نہیں تایان..... اس وقت تمہیں سردار فرال سے کوئی جھگڑا مول نہیں لیتا چاہئے۔ شہزادی مارشا اس کی تحویل میں ہے اور سکندر پڑاؤ سے باہر ہے۔“
 ”لیکن میں کوئی جھگڑا کرنے نہیں جا رہا..... میں تو صرف شہزادی سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”تمہاری یہی خواہش جھگڑے کا باعث بن سکتی ہے۔“ سردار یرغانے کہا۔
 ”کیا مطلب؟“ تایان کے سینے میں کلبلا تے ہوئے اندیشے لحوں میں پل کر جوان ہو گئے۔
 سردار یرغانے اس کا کندھا تھپ تھپایا۔ ”آؤ..... میرے ساتھ میں تمہیں بتاتا ہوں سب کچھ۔“

”لیکن شہزادی مارشا.....“ تایان نے خیموں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”شہزادی مارشا یہاں بالکل محفوظ ہے۔ آؤ میرے ساتھ..... فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔“

عمر رسیدہ سردار یرغانے کو سمجھا بھجا کر وہاں سے اپنے خیمے میں لے آیا۔ ہوشمند بھی ساتھ تھا۔ تایان کی طرح اس کی آنکھوں میں بھی تشویش کے گہرے سائے تھے۔
 سردار یرغانے ان دونوں کی مشروب سے تواضع کی۔ پھر ٹھہرے ہوئے لمبے میں بولا۔
 ”میں تمہارا خیر خواہ ہوں اور دیوتاؤں نے چاہا تو آئندہ بھی رہوں گا۔ یہی سبب ہے کہ میں تمہیں ساری صورت حال سے آگاہ کر دیتا چاہتا ہوں..... کل شام فرال اپنے ساتھ مارشا کو لے کر سکندر سے ملنے آیا تھا۔ پھر مارشا تو جلد ہی واپس چلی گئی تھی لیکن فرال دیر تک سکندر کے خیمے میں موجود رہا تھا۔ مجھے شبہ ہے کہ فرال نے سکندر سے مارشا کے بارے میں بات کی ہے لیکن تمہیں زیادہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اگر ایسا ہوا بھی ہے تو فرال کو اپنے مقصد میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ میں نے اسے سکندر کے خیمے سے نکلنے دیکھا تھا۔ وہ خلاف معمول بہت خاموش اور سنجیدہ نظر آ رہا تھا..... میں سکندر سے اس بارے میں پوچھنا چاہتا تھا لیکن صبح سویرے وہ شکار کے لیے نکل گیا۔ میرا خیال ہے شام سے پہلے وہ واپس آ جائے گا اس کے بعد ساری بات صاف ہو جائے گی۔“

شام تک کا وقت تایان نے شدید بے قراری کے عالم میں گزارا۔ اس کی زندگی

اس کی کائنات چند سو قدم کے فاصلے پر ایک تہجے میں موجود تھی اور وہ اس سے مل نہیں سکتا تھا۔ وہ کسی اور کی تحویل میں تھی۔ اس کے حسن کو کوئی دوسرا تجربی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ شاید سردار یرغانے کے سر ہانے مہر نہ ہوتا تو وہ دندنا ہوا تھیلی کے پڑاؤ میں کھس جاتا اور پرچم بردار سردار کے خیمے ہال کر کے شہزادی مارشا کے روبرو پہنچ جاتا۔

سکندر اپنے شکاری قافلہ کے ساتھ شام سے کچھ دیر بعد پڑاؤ میں پہنچا۔ ایک چنگڑا شکار کئے ہوئے جانوروں اور پرندوں سے لدا ہوا قافلہ چنگڑے کے ساتھ ساتھ دو مقدونوی سوار محافظوں کی طرح چلے آ رہے تھے۔ ان میں سے ایک سردار کا تعلق سکندر کے ذاتی محافظ دستے سے تھا۔ اس نے تایان کو دیکھا تو چیخاٹا دگا کر گھوڑے سے نیچے اتر آیا۔
 ”تایان..... کہاں تھے تم؟“ اس نے تایان کو کندھوں سے تھام کر بے تکلفی سے سوال کیا۔

”کیوں کیا بات ہے؟“ تایان نے دریافت کیا۔
 ”تمہیں سالار اعظم یاد کر رہے تھے۔ آج صبح ہی انہوں نے مجھ سے کہا ہے کہ تمہیں ڈھونڈا جائے اور فوراً ان کے پاس لایا جائے۔“
 ”لیکن میں تو یہیں موجود تھا۔ نہ صرف جنگ میں حصہ لیا ہے بلکہ دو روز تک بھاگنے والی ایرانی فوج کے تعاقب میں بھی شریک رہا ہوں۔ جنگ کے بعد میں نے سالار اعظم سے ملنے کی بہت کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ کیا سالار پارمینو نے سالار اعظم سے میرا ذکر نہیں کیا؟“

”شاید وہ بھی بھول گئے ہوں کیونکہ انہیں بہت جگت میں عازم دمشق ہونا پڑا تھا۔ بہر طور اب تم فوراً سالار اعظم کے خیمے میں پہنچو..... بلکہ میرے ساتھ ہی چلے آؤ۔ میں ابھی تمہیں سالار کے سامنے پیش کرتا ہوں۔“

کچھ ہی دیر بعد تایان سکندر کے شاندار خیمے میں موجود تھا۔ یہ خیمہ گاہ چند روز پہلے تک دارا کی ملکیت تھی لیکن اب اس کی برائے پر سکندر کو تصرف حاصل تھا۔ سکندر چاہتا تو وہ دنیا کا ہر سامان عشرت اس خیمہ گاہ میں جمع کر سکتا تھا لیکن وہ فطرتاً قناعت پسند شخص تھا بلکہ کبھی کبھی تو اس پر رہبانیت کی لاری ہونے لگتی تھی۔ لذیذ غذاؤں، مطر عورتوں اور سیم و زر کی بتات اسے قطعی مہل نہیں کر پاتی تھی۔ دمشق سے ملنے والے سونے اور جواہرات کے ذخیروں کو وہ جوں کا توں یونان بھیجے گا اور وہ رکھتا تھا۔ تایان خیمے

میں پہنچا تو سکندر حسبِ عادت ہاتھ پشت پر باندھے چل قدمی کر رہا تھا۔ پہلی ہی نظر میں وہ تابان کو از حد پریشان نظر آیا۔ تابان نے جبکہ کر تعظیم پیش کی اور منسوب کھڑا ہو گیا۔ تابان کا خیال تھا کہ وہ اس سے بلا اجازت دمشق جانے کے بارے میں باز پرس کرے گا یا جنگِ اسوس کے حوالے سے اس کی کارکردگی سننا چاہے گا لیکن سکندر نے ان میں سے کوئی موضوع نہیں چھیڑا۔ وہ کچھ دیر گہری نظروں سے تابان کی سمت دیکھتا رہا پھر صبرِ لیجے میں بولا۔

”تابان، ہم کل سے ایک سخت الجھن میں گرفتار ہیں۔ شاید تم ہماری کچھ مدد کر سکو۔“

تابان نے اعباری سے کہا۔ ”اگر آپ نے غلام کو کسی مشورے کے قابل سمجھا ہے تو یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے۔“

سکندر نے گہری سانس بھر کر کہا۔ ”سردار تابان! ہم نے ایک شخص سے قول کر رکھا ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب گرینی کس کی لڑائی ہوئی تھی اور دورانِ جنگ ہم زخمی ہو کر گھوڑے سے گر پڑے تھے۔ اس شخص نے جان پر کھیل کر ہماری حفاظت کی تھی۔ ہم نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اس کی تین جائز خواہشات پوری کریں گے اور دل میں زیوس دیوتا کی قسم کھائی تھی کہ اپنے عہد پر قائم رہیں گے۔ اب یہی قسم ہمارے گلے کا پھندا بنی ہوئی ہے اور ہر لحظہ ہمیں اپنا دم گھٹنا محسوس ہوتا ہے۔“

تابان نے نظریں جھکا کر بولے کہا۔ ”غلام کو حکم دیجئے۔ وہ اپنی جان بھی آپ کے قدموں میں بچھا دے گا۔“

سکندر نے طمانی جام میں سے نشہ آور مشروب کا ایک چھوٹا سا گھونٹ بھرا اور نیچے کے دور افتادہ حصے کو گمشدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ہمارا قیاس ہے کہ تمہیں شترادی مارشا کے متعلق پتہ چل گیا ہو گا۔ اسے دمشق کے ایک معبد سے برآمد کر لیا گیا ہے اور وہ اس وقت پڑاؤ ہی میں موجود ہے۔“

تابان نے کہا۔ ”ہاں۔ سالارِ اعظم! میں جانتا ہوں۔“

سکندر بولا۔ ”شترادی مارشا کل ایک فوجی سالار کے ساتھ ہمارے خیمے میں آئی تھی۔ یہ وہی سالار ہے جو شترادی کو معبد سے چھڑا کر لایا ہے۔ اس کا نام فرمال روز ہے اور اس کا تعلق جھلی کے دستوں سے ہے۔“

تابان نے کہا۔ ”میرا خیال ہے آپ اسی سالار کی بات کر رہے ہیں جو قلب کا پریم

بردار بھی ہے۔“

سکندر نے اثبات میں جواب دیا اور کہا۔ ”تم نے درست پہچانا ہے۔ لیکن فرمال کے بارے میں ایک بات شاید تمہیں معلوم نہ ہو۔۔۔۔۔۔ یہی وہ سالار ہے جسے ہم نے جنگِ گرینی کس کے بعد قول دیا تھا۔ قول دیتے وقت ہمیں لگتا تھا کہ کسی وقت یہ ہمارے لیے اتنی بڑی مشکل کا باعث بن جائے گا۔“

تابان سب کچھ سمجھ رہا تھا اور خاموش تھا۔ اس کی ہالیہ نظریں سکندر کے چہرے کی جانب اٹھی ہوئی تھیں۔ سکندر نے خیمے کے روزن پر ٹاپن گاڑے ہوئے کہا۔ ”کل فرمال روز نے ہم سے شترادی مارشا کا ہاتھ مانگا تھا۔۔۔۔۔۔ ہم نے اسے بتایا کہ شترادی مارشا کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں۔ شترادی ہمارے ایک وفادار سردار کی آرزو ہے اور وہ اس کی خاطر عرصے سے سرگرداں ہے۔ فرمال روز نے ہمارے سامنے کھٹے ٹیک دیئے اور بولا کہ اب وہ شترادی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس نے ہمیں ہمارا قول یاد دلایا اور اس قول کے صدقے سے شترادی کا ہاتھ مانگا۔“ سکندر نے ایک لمحے کے لیے رک کر تابان کا چہرہ دیکھا اور نیم دلی سے مسکرا کر بولا۔ ”لیکن تمہیں زیادہ فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم نے فرمال روز کی کسی درخواست کا جواب ابھی تک نہیں دیا۔ ہم نے اسے یہ کہہ کر واپس بھیج دیا تھا کہ یہ معاملہ اتنا سلا نہیں جتنا وہ سمجھ رہا ہے۔ اب ہم نے تمہیں اسی لیے طلب کیا ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں تمہارا مشورہ درکار ہے۔ دئے تاکوا ہیں ہم شترادی مارشا کو تم سے منسوب دیکھنا چاہتے ہیں کیونکہ تم نے اس کے لیے تکالیف سہی ہیں اور صبر آزما انتظار کیا ہے لیکن ہمیں اس قول سے جان چھڑانے کا کوئی راستہ نہیں منبجہ رہا۔“

تابان بیکر خاموش تھا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس موقع پر اسے کیا کہنا چاہئے اور کچھ کہنا بھی چاہئے! نہیں۔ اس کے سینے میں آگ دھک رہی تھی اور وہ رہ رہ کر فرمال کا حسین و جمیل چہرہ نگاہوں میں گھومنے لگتا تھا۔ یہ چودہ دن سے ایک پھانس بن کر اس کے سینے میں جھکا ہوا تھا۔۔۔۔۔۔ وہ رو کر ایک خیال اس کے دل میں ابھرتا تھا اور پورے جسم میں کرب کا زہر بھرتا تھا۔ کہیں شترادی مارشا بھی تو اس وجہ سے سالار کی شخصیت میں نہیں الجھ گئی تھی؟ فرمال اسے اپنے ہمراہ سکندر کے پاس کیوں لایا تھا۔ کیا وہ سکندر پر شترادی کی آمادگی ظاہر کرنا چاہتا تھا۔ ان گنت وسوسے اسے گھیرے میں لے رہے تھے۔ دفعتاً شاہی چوہدار نے خیمے میں آنے کی اجازت طلب کی۔ سکندر نے تابان کے

مضطرب چہرے سے نگاہیں ہٹا کر دروازے کی طرف دیکھا اور چوہدار کو اجازت مرحمت کی۔ اندر آ کر چوہدار نے کہا۔

”عزت ماپ‘ سالارِ اعظم‘ شاہِ مقدونیہ! تحصیل کے سردار فرال روزِ باریابی کی اجازت چاہتے ہیں۔“

سکندر کے چہرے پر بیزاری کے آثار نمودار ہوئے، پھر یہ بیزاری غصے میں ڈھل گئی۔ وہ تلخ لہجے میں بولا۔ "اس سے کہا جائے کہ ہم مصروف ہیں۔ اگر ہمیں اس کی ضرورت ہوگی تو خود طلب کریں گے۔" چوہدار جلدی سے واپس گھومنا۔ "اور سنو۔" سکندر کی جھکمانہ آواز گونجی۔ "سرदार سے کہو کہ ہم اس بے وقت کی مداخلت سے خفا ہوئے ہیں۔"

چو بدار کانپٹا ہوا باہر نکل گیا۔

سکندر کا مزاج اچانک ہی برہم ہو گیا تھا۔ وہ کچھ دیر منہ میں بڑبڑاتا رہا پھر نشہ آور مشروب کے بڑے بڑے گھونٹ لینے لگا۔ اب وہ تابان کی طرف سے بھی لاتعلقی سا ہو گیا تھا۔ تابان اپنی جگہ خاموش کھڑا تھا۔ پتھر کی طرح ساکت و جامد۔ اس کی نگاہیں اپنے سائے پر مرکوز تھیں۔ سکندر نے تنگی تھکی سی آواز میں کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ میں تم سے بعد میں بات کروں گا۔ اب تم جا سکتے ہو۔“

تاہم تعلیمات پیش کر کے خیمے سے باہر نکل آیا۔ اس کے پاؤں منوں وزنی تھے۔ معلوم نہیں کاتبِ تقدیر نے اس کے لیے کیا لکھ رکھا تھا۔ پہلے منزل اس کی نگاہوں سے اوجھل تھی۔ اب منزل سامنے تھی اور اس میں قدم بڑھانے کی سکت نہیں رہی تھی۔ شاہوں کے شاہ سکندر نے دیوتاؤں کے دیوتاؤں کی قسم کھائی تھی اور یہ قسم تاہان کے پاؤں کی زنجیر بنی جا رہی تھی۔

اپنے خیمے میں پہنچ کر تابان بستر پر بے سُدھ لیٹ گیا۔ اس کے سینے میں جیسے کوئی دھکتا ہوا انگارہ رکھا گیا تھا۔ شہزادی مارشا کے لیے اس نے کیا کیا مصائب نہیں جھیلے تھے اور اب جب وہ اس کے قریب پہنچ چکا تھا ایک بلند و بالا دیوار ان کے درمیان حائل ہو گئی تھی۔ پورے دو دن تابان نے سخت کرب کے عالم میں گزاری۔ وہ خیمے سے باہر گیا اور نہ کسی کو خیمے میں آنے دیا۔ شمع ان بجھے رہے اور وہ بھوکا پیاسا اپنی سوچوں کے جنم میں جلا رہا۔ تیسرے روز اسے خیمے کے دروازے پر کورا کا چہرہ نظر آیا۔ غائبانہ پیریدار کو زبردستی راستے سے ہٹا کر اندر چلی آئی تھی۔ کوئی اور ہوتا تو تابان اس پر پھٹ پڑتا لیکن

کورہ کے سامنے زبان کھولنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ کیونکہ یہی احترام آمیزانیت تھی اسے کورہ سے۔ کورہ نے ان کے قریب پہنچ کر اپنی جھٹکیاں اس کے اٹھنے والوں میں پھیریں۔

”سباہان! یہ کیا حالت بتاؤ ہے تم نے؟“

تاجان نے بے ساختہ لہذا سراس کی آغوش میں پھینک دیا اور اپنے آنسو روکنے کی جدوجہد کرنے لگا لیکن دریا تو کدوں سے بہ نکلا تھا اب ریت کے بند کو نہ بچا سکتا تھا۔ کورا کی آغوش تر ہونے لگی۔ ایک جری سردار رو رہا تھا اس میں جیرانی کی بات نہیں تھی۔ تناور درخت روتے جیسے پہاڑ روتے ہیں 'یساں تک کہ آسمان بھی روتا ہے۔ نہ جانے کیوں تاجان کو محسوس ہو رہا تھا کہ ماہ و سال اٹھ لڑموں چلتے بہت پیچھے نکل گئے ہیں۔ ابھی وہ غلام نہیں بننا' ابھی اسے بہن بھائیوں اور والدین سے جدا نہیں کیا گیا ابھی وہ اپنے ہی گھر کے ایک نیم تاریک کمرے میں بیٹھا ایک مہمان آغوش میں سر رکنے سو رہا ہے۔ یہ کس کی آغوش ہے؟ شاید اس کی ماں کی۔ شاید بنی بہن کی 'یا پھر کسی اور مہمان ہستی کی۔ بہت دیر کورا کی آغوش میں سر پھپھارے رکھنے سے اس کے کھولتے ہوئے دماغ کا رجب حرارت کچھ کم ہو گیا۔ اس نے نیم تیرکی میں کورا کی طرف دیکھا 'اس کی حسین غمزہ آنکھیں تاجان پر لگی تھیں۔ تاجان کو یاد آیا کہ ابھی تو اسے کورا سے معافی بھی مانگا ہے۔ اس نے کورا کو بہت دکھ دیا تھا۔ اس کی مخلص ذات کو کسی طرح کے شکوک کا نشانہ بنایا تھا۔ یہاں تک کہ اس پر اپنی جان لینے کا شبہ بھی کیا تھا۔ تاجان کو یاد آیا کہ کس طرح وہ سانپ لے کر اس کے خیمے کے سامنے منڈلاتی رہی تھی اور پھر نیپ کی طرف بھاگ گئی تھی۔ نشیب میں جا کر تاجان نے اس سے تاردا سلوک کیا اور اس کے معصوم دل پر خنجر کے لگائے تھے۔ بعد ازاں کورا نے اسے جھوٹ اور سچ کے چہرے دکھائے اور وہادشا کی طلب میں دیوانہ ہو کر کاہن غلام کے تعاقب میں نکل پڑا۔ اسے کورا سے معافی طلب کرنے کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا..... آج کئی ماہ بعد کورا پھر اس کے سامنے آئی تھی۔ اسی مہمان اور شفیق روپ میں! جو ہمیشہ تاجان کے زخموں پر مرہم رکھتا تھا۔ تاجان اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر کھولی نگاہوں سے کورا کا رُشباب چہرہ دیکھتا رہا 'پھر نرم آواز میں بولا۔

”کورا! میں نے تمہارے ساتھ بہت نا انصافی کی ہے۔ بہت توہین کی ہے
تمہاری.....“

ساری.....
 کورائے اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”کچھ مت کو تاہان‘ کچھ بھی مت کہو‘

جہاں دل کی بات دل سمجھتا ہو! وہاں الفاظ کی ضرورت نہیں رہتی..... مجھے تم سے کوئی شکوہ نہیں۔ کوئی مال نہیں ہے میرے دل میں۔“

تہاں نے اپنے ہونٹوں سے اس کے ہاتھ ہٹانا چاہے، وہ عاجزی سے بولی۔ ”نہیں تہاں، پہلے وعدہ کرو تم رسمی لفظوں سے میری سماعت کو مجروح نہیں کرو گے۔ کچھ نہیں کہو گے۔“

تہاں نے نگاہیں جھکا لیں۔ کورانے اس کے ہونٹوں سے ہاتھ ہٹایا اور بے اختیار اس کا سر تھام کر اپنے کندھے سے لگایا۔ کتنی ہی دیر وہ اسی طرح تم صم بیٹھی رہی۔ آنسو اس کے رخسار پر ڈھلک رہے تھے۔ آخر وہ گلو گلو آواز میں بولی۔ ”تہاں! کل سردار پارمینو مجھ سے ملے تھے۔“ تہاں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”وہ تو دمشق میں تھے۔“

”وہاں سے وہ لوٹ آئے ہیں۔“

”لیکن..... لیکن وہ تم سے کیوں ملے؟“

”یہی بات تو میں تمہیں بتانے جا رہی ہوں۔ سالار پارمینو کو معلوم ہوا ہے کہ تم میری بات بہت مانتے ہو۔ انہوں نے مجھ سے کہا ہے کہ میں تمہیں سمجھاؤں..... وہ کہتے ہیں کہ یوں کھانا پینا چھوڑ کر بند خیمے میں بیٹھ رہنا دو نشہ مندی نہیں ہے۔ آنکھیں بند کر لینے سے معاملات الجھتے ہیں سلیمتے نہیں۔ وہ تمہاری جانب سے بہت فکر مند ہیں۔ انہوں نے مجھے حکم دیا ہے کہ جیسے بھی ہو میں تمہیں کھانا کھلاؤں۔“ پھر کورانے دروازے کی طرف رخ پھیر کر آواز دی۔ پردہ اٹھا اور دو خدام ہاتھوں میں خوان لئے اندر آئے۔ خیرہ گرما گرم کھانوں کی مک سے بھر گیا۔ بجے ہوئے گوشت کے پارچے سبزی طے مصالحے دار چاول، کباب اور کچلے۔ دوسرے خوان میں مختلف اقسام کے میوہ جات تھے۔ تہاں کا پیٹ خالی تھا لیکن دل بھرا ہوا تھا۔ غم سے معمور اور اداسی سے لبریز۔ اس نے کھانے کی طرف آنکھ بھی نہیں اٹھائی۔ کورا اسے چند لقمے لینے کے لیے مجبور کرنے لگی۔ تہاں نے واضح الفاظ میں معذرت کر لی۔ اسی دوران سالار پارمینو ہنسی نفیس خیمے میں پہنچ گئے۔ انہیں دیکھ کر تہاں اور کورا احترام سے کھڑے ہو گئے۔ پارمینو کے جھریوں بھرے چہرے پر ملامت کے آثار تھے۔ انہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کورا کو اشارہ کیا۔ وہ خیمے سے باہر نکل گئی۔ پارمینو کی ہدایت پر خدام نے خوان اٹھا کر ایک جانب رکھ دیئے اور باہر چلے گئے۔ پارمینو نے لمبی چوڑی تمسید نہیں باندھی اور جلد ہی اصل موضوع پر آ گئے۔ انہوں

نے تہاں سے کہا۔

”سالار اعظم چند روز سے بہت پریشان ہیں تہاں! ان کی الجھن صرف ایک شخص کی نہیں پوری یونانی فوج کی الجھن ہے۔ ہم اس وقت حالت جنگ میں ہیں اور اگر سالار اعظم اپنے فرائض صحیح طور پر انجام نہ دے سکے تو اس کے نتائج تباہ کن ہوں گے۔ لہذا ہمارا فرض ہے کہ انہیں ہر قسم کے تنکڑے سے آزاد رکھیں۔ سالار اعظم نے زیوس پادشاہ کی قسم کھا کر جو قول کر رکھا ہے وہ ان کے لیے شدید الجھن کا باعث بنا ہوا ہے..... انہیں اگر اس الجھن سے کوئی نکال سکتا ہے تو وہ تم ہو..... سالار اعظم کی عمر میرے بیٹوں سے بھی کم ہے، میں ان کی طبع اچھی طرح جانتا ہوں اگر انہیں اپنے قول سے پھرتا پڑا تو یہ ان کے لیے زبردست روحانی دھچکے کا باعث بنے گا.....“

تہاں نے دبے لفظوں میں کہا۔ ”محترم سالار“ آپ کا کہا سر آنکھوں پر لیکن آپ یہ باتیں فرماں روز سے بھی تو کہہ سکتے ہیں..... فرماں ایک وجہ سے بڑے کشش شخص ہے۔ اسے حسن و شباب کی کمی کبھی رہی ہے اور نہ رہے گی لیکن میری زندگی میں شہزادی مارشا کے بعد اور کچھ نہیں ہے..... وہ میری محبت ہوتی تو میں اسے سالار اعظم کے فرمان پر قربان کر دیتا لیکن وہ تو میری کائنات ہے اور کائنات کی حدود سے انسان مر کر بھی نہیں نکل سکتا۔ مجھ سے وہ چیز مت طلب کیجئے جو میں نہیں دے سکتا.....“

سالار پارمینو تادیر تہاں کے پاس بیٹھے رہے۔ بظاہر وہ مختلف موضوعات پر گفتگو کر رہے تھے لیکن گھما پھرا کر بات شہزادی مارشا کی طرف ہی لے آتے تھے۔ ان کے بزرگانہ لمبے میں تہاں کے لیے پند و نصائح کے انبار تھے لیکن تہاں کے لیے یہ سب بے اثر تھا..... پارمینو ہی کی زبانی تہاں کو معلوم ہوا کہ شہزادی مارشا اب فرماں کے خیمے میں نہیں ہے۔ سکندر کے حکم پر اسے خواتین کے پڑاؤ میں پھانسا دیا گیا ہے اور حتی فیصلہ ہونے تک وہ وہیں رہے گی۔

دو تین روز اسی غمگین میں گزر گئے۔ پھر ایک دن صبح سویرے تہاں کو سالار پارمینو کی طرف سے حکم ملا کہ وہ کچھ ایرانی قیدیوں کو لے کر تفریح گاہ میں پہنچے۔ یہ تفریح گاہ فوج کے پڑاؤ سے چند کوس دور ایک جھیل کے کنارے ہموار میدان میں بنائی گئی تھی۔ یہاں ہر روز اولہک کی طرز پر کھیل ہوتے تھے۔ سرگرمی میں بازی گر کرتب دکھاتے تھے، پتلیوں کے تماشے ہوتے تھے، ڈرامے اسٹیج کئے جاتے تھے اور نشہ بازی کی جاتی تھی۔ بیس ایک اسٹیڈیم نما جگہ پر مجرم قیدیوں کو سزائے موت دی جاتی تھی۔ اس سزا کا

نظارہ بھی کسی دلچسپ تفریح سے کم نہیں تھا۔ روتے بلکتے اور رحم کی بیہک مانتے مرد و زن کو بھوکے دندانوں کے آگے پیھیکے دیا جاتا تھا۔ وہ انھیں چیر بھاڑ کر اپنی غذا بناتے تھے اور پٹووش قہقہاں مچا جیچ کر آسمان سربراہاں لیتے تھے۔

تباہان کو جو قیدی تفریح گاہ میں پہنچانے کا حکم دیا گیا تھا وہ بھی ایسے ہی بد نصیب افراد تھے انہیں ایک بند گھوڑا گاڑی میں سوار کرا کے تباہان کے حوالے کر دیا گیا اور تباہان انہیں لے کر جھیل کی طرف روانہ ہو گیا۔ گھوڑا گاڑی میں دس کے قریب مرد اور چار عورتیں تھیں۔ وہ اپنے انجام سے بے خبر تھے۔ شاید ان کا خیال تھا کہ انہیں ایک ہندی خانے سے دوسرے میں منتقل کیا جا رہا ہے..... تفریح گاہ میں پہنچ کر انہیں اسٹیڈیم نما جگہ پر اتارا گیا تو وہ صورت حال سے باخبر ہو گئے۔ اسٹیڈیم کے وسط میں پڑے ہوئے خونخوار درندوں کے آہنی پنجے انہیں سب کچھ سمجھا رہے تھے..... پہلے قیدیوں کے رنگ زرد ہوئے پھر وہ رونے چلانے لگے۔ وہ تباہان کے قدموں میں گر کر اس سے رحم کی ہیک مانتے لگے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ ان کی زندگی اور موت کی ڈور کہیں اور سے ہلائی جا رہی ہے۔ جس کے قدموں میں وہ گزرنا رہے ہیں اس کی حیثیت صرف ایک کارندے کی سی ہے۔

اسٹیڈیم میں سینکڑوں کی تعداد میں تماشاخی جمع ہو چکے تھے۔ یہ سب کے سب متحدہ جمیعت کے فوجی اور ان کے اہلی خانہ تھے۔ پارمیٹو بھی یہیں موجود تھا۔ ماس نے تباہ کو اپنے قریب بیٹھنے کے لیے جگہ دی اور ملامت سے گفتگو کرتا رہا۔ توڑی ہی دیر بعد انسانیت سوز مظاہرے کی شروعات ہو گئی۔ رواج کے مطابق قیدیوں کو سفید لباس پہنائے گئے تھے تاکہ خون کی سرفی نمایاں طور پر نظر آ سکے۔ سپاہیوں نے طویل رسیوں کی مدد سے آہنی پنجروں کے در کھول دیئے۔ بھوکے شیر دھاڑتے ہوئے نکلے اور قیدیوں پر پل پڑے۔ یہ گل پانچ قیدی تھے۔ ان میں سے ایک عورت تھی جو غش کھا کر گر چلی تھی۔ وہ فوراً درندوں کا لقمہ بنی۔ باقی قیدی چیخ رہے تھے اور بھاگ رہے تھے۔ ان میں سے ایک تو آنا جسم والا قیدی آہنی جنگلے پر چڑھ گیا لیکن اس جنگلے کو پار کر آنا اتنا ہی مشکل تھا جتنا کسی کے لیے موت کی سرحد پار کر کے زندگی کی طرف واپس آ جانا۔ کچے بعد دیگرے سارے قیدی اپنے انجام کو پہنچے۔ ایک ایک کر کے ان کی آؤد بکا دم توڑ گئی اور ان کے پارچے درندوں میں چھینا چھینا کا باعث بنے گئے۔ پھر یہ جھینا جھینا بھی ختم ہو گئی۔ آہنی جنگلے کے اندر خون آلود دھیموں اور گرد آلود انسانی چھتھڑوں کے سوا اور کچھ باقی نہ رہ گیا۔ خون آلود

بچوں والے درندے بے قراری سے آپنی جھنگ کے قریب ٹھلنے لگے۔ اب انہیں مزید قیدیوں کا انتظار تھا۔

پانچ پانچ کی ٹکڑیوں میں چار مرتبہ قیدیوں کو اندر بھیجا گیا اور ان کی لڑزہ خیز موت کا تماشا دیکھا گیا۔ اب دوپہر ہو چکی تھی۔ پارمیٹو بیان کو اپنے ساتھ لے کر تفتیش گاہ کے وسطی حصے میں آ گیا۔ یہاں ایک وسیع حمام بنایا گیا تھا۔ اس حمام میں بھاپ دینے والے پتھر تھے اور سنگ سلیمانی کا ایک بڑا حوض تھا۔ اس حوض میں ہر وقت نیم گرم پانی موجود رہتا تھا۔ فوج کے صرف اعلیٰ ترین عہدیدار ہی اس حمام کو استعمال کر سکتے تھے۔ یہاں پہلی مرتبہ حمام میں داخل ہو رہا تھا وہ اندرونی مناظر کو کچھ حیران ہوا۔ سخت سردی کے باوجود حمام کا اندرونی درجہ حرارت خوشگوار تھا۔ سنگ سلیمانی کی حوض میں بھاپ دیتا ہی تھا۔ حوض کے ارد گرد شفاف فرش پر بڑے بڑے مستطیلی پتھر رکھے تھے۔ ان پتھروں کو آگ پر گرم کیا گیا تھا۔ چاندی کے چھوٹے چھوٹے نلوں سے ان پتھروں پر پانی کی پھواری گرتی تھی اور بھاپ پیدا ہو کر حمام میں پکھرانے لگتی تھی۔ غسل میں مدد دینے کے لیے وہاں چاق و چوبند خادم اور خوش رو خدام میں موجود تھیں۔ ایک بھیڑی بھیڑی سی خوشبو پورے باحول میں رچی رہی تھی۔

اس حمام میں غسل کے بعد تباہان کو عجیب سی تازگی کا احساس ہوا۔ اسے محسوس ہوا کہ بھوک لگ رہی ہے۔ پارمینو نے اپنے ساتھ اسے شاندار کھانا کھلایا۔ کھانے کے بعد وہ اسے کھیل تماشے کی ایک خصوصی محفل میں لے آیا۔ یہاں بازی گری کے تمام بے حسین و جمیل ایرانی لڑکیاں اپنے بیجان خیز جسمانی خطوط کی نمائش میں مصروف تھیں۔ بازی گری حسیناؤں کا یہ طائفہ دمشق سے لایا گیا تھا اور ان میں چند بے انتہا خوبصورت چہرے موجود تھے۔ نصف شب کے بعد یہ تماشہ ختم ہوا تو پارمینو کے حکم پر دو انتہائی جاذب نظر لڑکیاں تباہان کے ساتھ کر دی گئیں۔ پارمینو نے تباہان سے کہا کہ وہ چند دن یہیں قیام کرے تاکہ اسے تفریح میسر ہو اور ذہن پر چھائے ہوئے تفکرات کم ہو سکیں۔ جمیل کے کنارے لکڑی کے ایک خوبصورت دو منزلہ مکان میں تباہان کو رہائش فراہم کی گئی۔ اس مکان سے چالیس پچاس قدم کے فاصلے پر پارمینو کی اپنی رہائش تھی۔ پارمینو نے تباہان کو بتایا کہ وہ بھی چند دن یہاں آرام کرنا چاہتا ہے۔

لیکن تابان کا غم ایسا نہیں تھا کہ کھلونوں سے بھل نکل اس کے سینے میں شعلے نہیں تھے

جو پانی سے بچھ جاتے اس کے سینے میں لاوا تھا جو پانی کو بھاپ بنا کر اڑا دیتا ہے۔ اس نے ایرانی دو شیراؤں کے زہد شکن حسن کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ نہ ہی دیگر تقریحات میں اسے کوئی دلچسپی محسوس ہوئی۔ وہ پورے دو روز قفر و گدگد میں رہا اور ہوا کی زد میں آئے ہوئے خشک پتے کی مانند اُدھر اُدھر اڑتا پھرا۔ تیسرے دن کی بات ہے، وہ ایک جگہ دھوپ میں بیٹھا تھا۔ اس کی خالی نگاہیں سامنے اسٹینڈیم میں جمی ہوئی تھیں جہاں کھلاڑی ایک طویل بانس کی مدد سے اونچی اونچی رکاوٹیں پھیلاتے ہیں مصروف تھے۔ تاہاں خود بھی ایسی چھلانگ کا ماہر تھا۔ اسے یاد آیا کہ وہ غارس زئوب کے قید خانے سے بھی اپنی اسی مہارت کے سبب نکل سکا تھا۔ تاہم غارس زئوب کے قید خانے سے رہائی اس کے لیے عرقید کا سبب بن گئی تھی۔ وہ مارشا کے تیر ہدف حسن سے گھاگل ہوا تھا اور اپنی کائی ہوئی زنجیریں خود اپنے ہاتھوں سے پھینکے پر مجبور ہو گیا تھا۔ دفعتاً تاہاں کو اپنے خیالوں سے چوٹنا پڑا۔ اس کی نگاہ ہوشمند پر پڑی تھی۔ وہ کوئی سو قدم کی دوری پر کھڑا اُدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اس کی گردن کا چھٹا ابھی تک ”اترا“ نہیں تھا لہذا اس کا دائیں بائیں دیکھنے کا انداز عجیب مضطرب خیز تھا۔ گردن گھمانے کی بجائے وہ پورا گھومتا تھا اور اوپر نیچے دیکھنے میں سخت اذیت محسوس کرتا تھا۔ تاہاں کو فوراً خیال گزرا کہ ہوشمند اسے تلاش کر رہا ہے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور ہوشمند کے پاس پہنچ گیا۔ تاہاں کو دیکھ کر ہوشمند کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ اس نے گہری سانس بھر کر کہا۔

”غالباً میری کوئی نیکی کام آگئی ہے، ورنہ تمہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر میری گردن کا بھڑکا ہو جاتا تھا۔“

”کیوں خیریت ہے؟“ تاہاں نے عام سے لہجے میں پوچھا۔

ہوشمند کے چہرے پر ایک دم سنجیدگی غالب آگئی۔ وہ بولا۔ ”غالباً تم نے دماغ سے کام لیتا چھوڑ دیا ہے۔ خیریت ہو تو یوں اُکڑی ہوئی گردن کے ساتھ تمہیں ڈھونڈنے کیوں نکل کھڑا ہوتا۔ میرے بھائی خیریت نہیں ہے غالب۔ میں نے آج صبح پڑاؤ میں ایک شخص کو دیکھا ہے اور اسے دیکھ کر سیدھا تمہاری طرف دوڑ آیا ہوں غالب۔“

”کس کو دیکھ لیا ہے؟“ تاہاں نے پوچھا۔

ہوشمند نے جواب دینے کی بجائے انا سوال کیا۔ ”سردار شلال کے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟ میرا مطلب ہے آخری بار تم اسے کب ملے تھے..... غالباً؟“

تاہاں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”ملا تو اسی وقت تھا جب کورا کو اس کے

چنگل سے چھڑایا تھا اور اسے پکڑ کر سالار اعظم کے حوالے کر دیا تھا۔“

ہوشمند بولا۔ ”اس کے بعد شلال کے ساتھ کیا ہوا؟ تمہیں کچھ معلوم ہے؟“

”ہاں..... دمشق سے روانہ ہونے سے چند روز پہلے میں نے سردار بطیموس سے معلوم کیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ شلال کی جان بخشی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کی موت کا فیصلہ اٹل ہے۔ چند روز تک اسے کسی عبرت ناک طریقے سے سزائے موت دے دی جائے گی۔“

”یعنی تمہارا خیال ہے کہ شلال اس وقت تک کیفر کردار کو پہنچ چکا ہے؟“

”یقیناً ایسا ہی ہونا چاہئے کیونکہ وہ ایک باغی اور مفرور قاتل تھا۔“

ہوشمند نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔ ”میں اس باغی اور مفرور قاتل کو ابھی زندہ سلامت دیکھ کر آیا ہوں۔ وہ سالار اعظم کی ہدایت پر دمشق گیا ہوا تھا، وہاں کے آہن گروں سے جنگی گھوڑوں کی دس ہزار ٹعلیں بیوا کر لایا ہے.....“

”کیا کہہ رہے ہو؟“ تاہاں کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

”غالباً میں فارسی ہی بول رہا ہوں..... اور غالباً تمہارے کان بھی بہرے نہیں ہیں، اور نہ ہی غالباً میری نگاہ کمزور ہے..... تمہارا اور کورا کا خطرناک ترین دشمن اس وقت زندہ سلامت پڑاؤ میں موجود ہے۔“

”کیے ہو گیا؟“ تاہاں کی بے پناہ حیرت برقرار تھی۔

”تاہاں! یہ غالباً کوئی بہت گہری سازش ہے۔ مجھے جو سب سے اہم بات معلوم ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ سالار اعظم سکندر سے شلال کی جان بخشی کروانے والا وہی قبیل سردار فرال روز ہے۔ سکندر نے اسے موقع دیا تھا کہ وہ تین بار اپنی بات منوا سکتا ہے۔ اس نے سکندر سے جو پہلی درخواست کی وہ شلال ہی کے بارے میں تھی۔ اس کی کوشش سے شلال جو موت کے منہ میں پہنچ چکا تھا واپس پلٹ آیا اور اب وہ بڑے مطمئن سے لشکر میں دندنا رہا ہے..... مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ سردار شلال اور فرال روز میں پرانی شناسائی ہے۔ جنگ کائی روینا کے موقع پر وہ دونوں ایک ہی دستے میں تھے اور اس سے پہلے غالباً ایٹنز میں بھی انہوں نے کافی وقت ایک ساتھ گزارا ہے۔“

تاہاں کے ذہن میں چنگاریاں سی پھوٹ رہی تھیں۔ ہوشمند نے جس سازش کا تانا بانا اس کے سامنے بکھیرا تھا وہ اب کچھ کچھ تاہاں کی سمجھ میں آ رہی تھی..... اس کا مطلب تھا کہ شہزادی مارشا سے اس کی دوری کوئی اتفاق واقعہ نہیں تھا۔ یہ ایک سوچی

مجھے سازش کا حصہ تھا۔ یہ دشمنی کی وہ امیر نیل تھی جو ایک نسخی کو نیل سے پروان چڑھی تھی اور اب ہر شے کو اپنی لٹ میں لے رہی تھی۔ اس کا جسم بولا کبھی کی زد میں آ گیا۔ آنکھوں میں وہی برق کوئٹے لگی جو اسے انسانیت سے دور اور حیوانیت سے قریب تر لے آتی تھی۔ ہوشمند بغور اس کے چہرے کا اتار چڑھاؤ دیکھ رہا تھا۔ اس نے تباہان کا بازو تھام لیا۔ تباہان نے ایک جھٹکے سے بازو چھڑایا اور تیزی سے سالار پارمینو کے مکان کی طرف بڑھا۔ وہ سالار پارمینو سے کیا کہے گا اور اس کے بعد کیا کرے گا؟ اسے کچھ معلوم نہیں تھا، بس اتنا معلوم تھا کہ آج سردار شلال زندہ رہے گا اور نہ وہ سکندر کا چیتا فرال روز جس نے ششادی پر شا کے چہرے پر میلی نگاہ ڈالی تھی اور اس کے سراپا کو اپنی بنا پاک سوچوں کے جال میں جکڑا تھا۔

جونہی وہ جھیل کے کنارے پہنچا اس نے سالار پارمینو کو دیکھا۔ وہ اپنے تین گھڑ سواروں کے ساتھ بڑی تیزی سے پڑاؤ کی طرف جا رہا تھا۔ تباہان اس سے کافی فاصلے پر تھا پھر بھی پارمینو کے چہرے پر چھائی ہوئی پریشانی اور بدحواسی اس سے چھپی نہ رہ سکی۔ تباہان کی چھٹی جس نے پکار کر کہا کہ یونانی فوج کے پڑاؤ میں یقیناً کوئی انہونی ہو چکی ہے۔ وہ چند لمحوں اپنی جگہ متذبذب کھڑا رہا پھر اس نے قریب کھڑے ایک گھوڑے کی راہیں کھولیں اور چھانگ لگا کر اس پر سوار ہو گیا۔ جونہی ایز لگی گھوڑا تیزی سے آگے بڑھا۔ ہوشمند زور زور سے چلانے لگا۔ ”تاہو! رک جاؤ! رک جاؤ! رک جاؤ۔“

تباہان نے پکار کر کہا۔ ”میرے پیچھے آؤ ہوشمند۔“

”لیکن میرا گھوڑا۔“ ہوشمند نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

پارمینو اور اس کے ساتھی بہت تیز رفتاری سے جا رہے تھے۔ تباہان مشکل ان کا تعاقب کر رہا تھا۔ جھیل سے قریباً دس اسٹیم آگے آ کر پارمینو دریا کی جانب مڑ گیا۔ تباہان نے بھی اپنے گھوڑے کا رخ دریا کی طرف پھیر دیا۔ جلد ہی انہیں دریا کا چمکتا و مکنا شفاف پانی دکھائی دینے لگا۔ تباہان نے دیکھا دریا کے کنارے گھنے درختوں میں چھوٹا سا مجمع نظر آ رہا ہے۔ چند فوجی گھوڑا گاڑیاں کھڑی تھیں اور مسلح سپریدار تلواریں عریاں کئے یہاں وہاں گھوم رہے تھے۔ تباہان نے پہلے تو گھوڑا روک لینے کا سوچا لیکن پھر ارادہ بدل کر پارمینو وغیرہ کے ساتھ ہی موقع پر پہنچ گیا۔ یہاں ایک لرزہ خیز نظارہ ان کا منظر تھا۔ دریا کے تین کنارے زمین پر چند لاشیں پڑی تھیں۔ لاشوں کو چادروں سے ڈھانپ دیا گیا تھا چادروں پر خون کے بڑے بڑے دھبے تھے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ مرنے والوں کو تیز

دھار آلوں سے قتل کیا گیا ہے۔ قریبی درختوں پر مرنے والوں کے لباس اسی طرح لٹکے ہوئے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ بد نصیب افراد دریا میں نہانے کے لیے اترے ہوئے تھے وہ قلعی غیر مسلح تھے۔ لہذا جب گھڑ سوار حملہ آور ان پر بچھڑے تو وہ لقمہ تر ثابت ہوئے۔ ابھی دریا میں مزید لاشوں کی تلاش جاری تھی۔ یونانی فوج کے تربیت یافتہ غوطہ خور یہاں وہاں ہاتھ پاؤں چلا رہے تھے۔

سالار پارمینو گھوڑے سے اتر کر تیزی سے لاشوں کی جانب گیا۔ اس نے قریب کھڑے شخص سے چند باتیں کیں، پھر جھک کر ایک لاش کے چہرے سے کپڑا ہٹا دیا۔ چہرہ سامنے آیا تو تباہان بری طرح چونک گیا۔ وہ لاش سے قریباً تین قدم کے فاصلے پر تھا لیکن اسے اپنی نگاہ پر پورا بھروسہ تھا۔ مرنے والا فرال روزی تھا۔ اس کی پیشانی پر تلوار کا ایک گہرا گھاؤ نظر آ رہا تھا اور خون اس کے پیچھے بالوں کے نیچے سے بہتا ہوا رخساروں اور گردن پر جم گیا تھا۔ تباہان حیران کھڑا ہو گیا۔ فرال جو چند دن پہلے تک زندگی کی انگلیوں سے بھرپور ایک جوشیلا نوجوان تھا اس وقت اپنے ہی خون میں نہلیا ہوا فرش خاک پر بے سندھ پڑا تھا۔ فرال پر اور اس کے ساتھیوں پر کیا سانحہ گزرا تھا؟ فوری طور پر تباہان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اس نے دیکھا کہ فوج کے ماہر کھوجی سونے سے شہادتیں ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کچھ لوگوں سے پوچھ گچھ بھی کی جا رہی تھی۔ یہ زیادہ تر مقامی افراد دعویٰ اور عجیبے وغیرہ تھے اور واردات کے بعد یہاں جمع ہو گئے تھے۔ سالار پارمینو نے فرال کے بعد دوسری لاشوں کے چہرے بھی دیکھے۔ وہ کچھ دیر کھوجیوں سے اس بارے میں گفتگو کرتا رہا پھر اپنے تیز رفتار گھوڑے پر بیٹھ کر موقع سے روانہ ہو گیا۔ اس کا بھروسہ بھرا چہرہ غم آمیز فکر میں ڈوبا ہوا تھا۔ تباہان نجوم کے درمیان کھڑا تھا لہذا پارمینو کی نگاہ اس پر نہیں پڑ سکی تھی۔ ایک طرح سے یہ بہتری ہوا تھا۔ پارمینو کی روانگی کے بعد تباہان لوگوں میں راستہ بناتا ہوا لاشوں کی جانب بڑھا۔ اس نے فرال روز کا چہرہ قریب سے دیکھا۔ زخم تازہ تھا۔ لگتا تھا اس واقعے کو زیادہ دیر نہیں گزری۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تک تباہان کے تصور میں یہ چہرہ انگارے کی طرح دھبہ رہا تھا۔ وہ اس انگارے کو اپنے فحش کی لہروں میں بہا لے جانا چاہتا تھا لیکن اب اس چہرے کو دیکھ کر اس کے دل پر مرنی سی پھار رہی تھی۔ زندگی کی بے ثباتی کا احساس بے حد شدت سے ہو رہا تھا۔ اس دوران ہوشمند بھی اس کا پیچھا کرتے ہوئے موقع پر پہنچ گیا۔ فرال کی لاش دیکھ کر اسے بھی زبردست دھچکا لگا۔ تباہان نے موقع پر موجود ایک شخص سے واقعے کی تفصیل پوچھی۔ یہ

تہاں اپنی زندگی کے سب سے بڑے لمحے کا شکار ہو چکا ہوتا۔۔۔۔۔ وہ اس تفریق کا، جس میں بیضا جمیل کے اندر تیرتی لٹخوں کو دیکھتا رہتا اور یہاں اسوس میں شیزادی مارش کسی کی لمبن بن جاتی۔ اس کے سینے میں غضب کا سمندر بلکھوے لینے لگا۔ ان لمحوں میں فرال روز، شلال پارمینو سکندر۔۔۔۔۔ سب اسے ایک صف میں کھڑے نظر آئے۔ سب اس کے دشمن تھے۔ اس کے خلاف ہونے والی ایکہ مازش کے حصے دار تھے۔ تہاں نے ایک آخری نگاہ فرال روز کی لاش پر ڈالی اور تنہا اپنے گھوڑے کی طرف بڑھ آیا۔۔۔۔۔ اب وہ جلد از جلد سالار اعظم سکندر تک پہنچنا چاہتا تھا تاکہ اس کے سامنے سرپا احتجاج بن کر پوچھ سکے کہ اسے جرم وفاداری کی اتنی بڑی سزا کیوں دی جا رہی تھی؟ وہ آندھی اور طوفان کی طرح پڑاؤ کی جانب روانہ ہوا لیکن توڑی ہی دو گریا تھا کہ ایک گھڑسوار نے اس کا راستہ روک لیا۔ عمر سیدہ گھڑسوار کے چہرے پر راستوں کی گرد تھی۔ اس کی گھٹی بھنویں سفید ہو رہی تھیں اور زرد آنکھیں تپان کے چہرے پر گڑی تھیں۔ اسے پہچاننے میں تباہی کو زیادہ دیر نہیں لگی، وہ رو بہتاس تھا۔ سب سے پہلے وہ تاپان کو ایک کان کے روپ میں ملا تھا، پھر تہاں نے اسے ایک ایسے سالار کے روپ میں دیکھا تھا جو زندگی کے صحیح سے مسرتوں کا شمع نچوڑ رہا تھا۔ اس کے بدن پر جنگ کا لباس تھا اور ہاتھوں میں ساغر و میلا۔۔۔۔۔ اور آج وہ تباہی کو ایک چرواہے کے ہمیں میں نظر آ رہا تھا۔ دفعتاً تہاں کو احساس ہوا کہ رو بہتاس چرواہے کے ہمیں میں کلانی دیر سے اس کے تعاقب میں ہے۔

روہتاس نے پوچھا۔ ”کہاں جا رہے ہو؟“

تایان بولا۔ ”ایک ضروری کام ہے۔“

روہاس بولا۔ ”مت جاؤ اس ضروری کم سے۔ وہاں تمہاری جان کے لیے خطرہ ہے۔“

تاہم چونک گیا۔ روہاس کا انداز کہہ رہا تھا کہ وہ صورت حال کے متعلق بہت کچھ جانتا ہے۔

تابان بولا۔ ”آپ کو کیا معلوم“ میں کہاں جا رہا ہوں؟“

روہتاس نے جواب دیا۔ ”مجھے معلوم ہے اور وہ بھی معلوم ہے جو تم نہیں جانتے..... آؤ میرے ساتھ۔ میں تمہیں بتاتا ہوں سکندر کے دربار میں تمہارے ساتھ

کیا پیش آ سکتا ہے۔"

روپاس کے لب و لہجہ میں نہ جانے کیا بات تھی کہ آبان نے اس کے سامنے خود

مخلص تاجان کو بطور یک ہزاری سردار اچھی طرح پہچانتا تھا۔ اس نے تاجان کو صورت حال سے آگاہ کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ اس نے انکشاف کیا کہ آج سردار فرال روز کی شادی تھی۔ بعد از شام ان کی رسم عروسی ادا ہونے والی تھی۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ دریا پر غسل کے لیے آئے ہوئے تھے کہ شقی القلوب قاتلوں کی تلواروں کا نشانہ بنے۔

تایان نے بے ساختہ پوچھا۔ ”کس سے ہو رہی تھی سردار کی شادی؟“

”وہ اتھرنکی کوئی شہزادی ہے۔“ اس شخص نے جواب دیا۔ ”تھوڑے ہی دن پہلے سردار فرال اسے دمشق کے کسی آتش کدے سے آزاد کرا کے لائے تھے۔“

تباہی کا دماغ سننا تھا..... ”تو کیا اس سے دھوکا کیا جا رہا تھا؟“ یہ سوال سننا تے تیر کی طرح اس کے دل میں پچھت ہو گیا..... اس کا مطلب تھا سالار پارمینو اسے یہاں بھلانے میں مصروف تھا اور وہاں بڑاؤ میں شہزادی مارشا کو فرال روز کی سچ پر بھٹایا جا رہا تھا۔ کتنا بڑا قریب تھا یہ۔ کیا سالار اعظم سکندر بھی اس قریب میں شامل تھا؟ یہ سوال تباہی کے لیے سب سے اذیت ناک تھا۔ موقع پر موجود لوگوں سے تباہی کو پتہ چلا کہ حملہ آور اپنے حملے سے کسی عبارت گاہ کے خدام نظر آتے تھے۔ انہوں نے ایک جیسے گھیرا لباس پہن رکھے تھے اور چوڑی پر اسی رنگ کے کھنڈ تھے۔ فرال روز اور اس کے ساتھیوں کو مارنے کے بعد وہ کافی دیر موقع واردات پر اپنی گھواریں لہراتے رہے اور غصہ زنی کرتے رہے۔ ایک شخص بار بار چلا رہا تھا۔ ”ہمارے دیوی دیوتاؤں کی بے حرمتی کرنے والے اسی طرح خاک و خون میں لوٹیں گے۔ جو ہمارا مجرم ہو گا ہم اسے یونانی لشکر کے اندر سے بھی کھینچ لائیں گے۔“

تباہی کا دھیان فوراً دمشق کے معبد اور "پانچ مقدس ارواح" کے پیروکاروں کی طرف گیا۔ آج سے چند روز پہلے تک مارشالوں "مہادیوی" کی حیثیت سے موجود تھی۔ اس کے تصور کی پرستش ہوتی تھی اور اس کے قدموں میں چینیں جھکتی تھیں۔ آج وہی مارشال ایک فوجی سالار کی بیوی بنائی جا رہی تھی۔ یقیناً مقدس ارواح کے پیروکاروں کو یہ صورت حال قبول نہیں ہوئی تھی۔ انہوں نے گھات لگا کر حملہ کیا تھا اور اس شخص کو دردناک موت سے دوچار کر دیا تھا جو "مہادیوی" کا شوہر بننے جا رہا تھا۔

تاہم اسے قسمت کی یاد دہانی ہی کہہ سکتا تھا۔ اس کے ایک دشمن نے اس کے دوسرے دشمن کا خاتمہ کر ڈالا تھا۔ اگر ان دونوں دشمنوں کا کھڑا نہ ہوتا تو یقیناً اب تک

یہ کہتے ہوئے وہ تیزی کے ساتھ خیمے سے باہر نکل گیا۔ ذرا سی دیر بعد اس کا گھوڑا برق رفتاری سے یونانی فوج کے عظیم الشان پڑاؤ کی طرف جا رہا تھا۔

وہ پڑاؤ میں داخل ہوا تو شام گرمی ہو چکی تھی۔ خیموں میں اور خیموں سے باہر راستوں پر تاجدار نگاہ مشعلیں روشن تھیں۔ پڑاؤ کو گرد و غبار سے محفوظ رکھنے کے لیے راستوں پر چاول کی چھال بچھائی گئی تھی۔ سپریداروں کے لیے جگہ جگہ ٹکڑی کی پانی میں تعمیر کی گئی تھیں اور ان پانیوں کے نیچے سپاہیوں کی لولیاں آگ دہکاتے بیٹھی تھیں۔ تہان کو اندازہ ہوا کہ پڑاؤ میں ایک طرح کی سراسیمگی پائی جاتی ہے اور ہر جگہ گفتگو کا موضوع فرال روز اور اس کے ساتھیوں کا وحشیانہ قتل ہی ہے۔ تہان مختلف راستوں پر گھوڑا بھگاتا پڑاؤ کے مرکز میں آگیا اور یہاں سے شاہی خیمہ گاہ کی طرف چلا آیا۔ خیمہ گاہ اور ارد گرد کے علاقے میں غیر مانوس سی خاموشی نظر آ رہی تھی۔ تہان کو سپریداروں سے معلوم ہوا کہ پچھ برادر سردار فرال روز اور دیگر مقتول افراد کی آخری رسوم ادا کی جا رہی ہیں۔ سالار اعظم سمیت بیشتر سالار اور کماندار انہی رسوم میں شرکت کے لیے گئے ہیں۔ تہان کا دھیان فوراً شہزادی مارشا کی طرف چلا گیا۔ اس سے ملنے کے لیے یہ موقع بہت مناسب تھا۔ وہ اپنے گھوڑے کا رخ موڑ کر شاہی خیمہ گاہ کے عقب میں آیا۔ ایک طویلے میں گھوڑا باندھنے کے بعد وہ پیدل ہی ان خیموں کی سمت روانہ ہو گیا جہاں لشکر کے ساتھ آنے والی خواتین قیام رکھتی تھیں۔ آج یہاں بھی خال خالی ہی سپریدار نظر آتے تھے۔ تہان نے گہری تیرگی کا فائدہ اٹھایا اور ایک سپریدار کی نگاہ بچا کر عقبی جانب سے خواتین کی خیمہ گاہ میں داخل ہو گیا۔ وہ کورا کا خیمہ پہچانتا تھا۔ اس وقت گورای مارشا سے ملنے کے لیے اس کی امداد کر سکتی تھی۔ خیمے کے پاس ایک خاتون محافظ ٹھل رہی تھی۔ تہان ایک اوٹ سے اس کی حرکات و سکنات دیکھتا رہا۔ جو خنی محافظ عورت نے اس کی طرف سے رخ پھیرا وہ لپکا اور خیمے کی ڈوری قطع کر کے اندر گھس گیا۔ چند لمحوں کے لیے اس کی آنکھیں چندھیا کر رہ گئیں..... جیسے اسے گھٹا ٹوپ تاریکی سے نکال کر اچانک سینکڑوں فانوسوں کی روشنی میں لاکھڑا کیا گیا ہو۔ اسے اپنی نگاہوں پر اعتبار نہیں آیا۔ سامنے ایک آرام دہ بستر شہزادی مارشا بیٹھی تھی۔ اس کے کھلے ریشی بال اس کے ہاتھوں میں تھے اور وہ انہیں جوڑے کی صورت لپیٹنے کے لیے بل دے رہی تھی۔ حسین چہرے کی سوگوار کی اور لباس کی سادگی نے اس کے سراپا کو محبوبیت کے کمال پر پہنچا دیا تھا۔ تہان نے اسے دیکھا اور دیکھا رہ گیا۔ اس کی جگہ کوئی بھی ہوتا اپنی پلکوں کو جنبش نہ دے

سکے۔ شہزادی تڑپ کر اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی۔ اس نے قریبی دیوار سے اوڑھنی کھینچی اور سینہ ڈھانپ لیا۔ لمبے بال اس کے سر سرے ہاتھوں سے چھوٹ کر پشت پر بھونکنے لگے تھے۔

”تم یہاں؟“ اس کے ہونٹوں سے حقیر آواز نکلی۔

اسنے میں دائیں جانب ایک ریشمی پردہ حشرک ہوا اور ایک کنیز باہر نکل آئی۔ تہان کو دیکھ کر وہ پہلے تو چوکی پھر جھک کر سلام کیا اور رہالہ نظروں سے شہزادی مارشا کی طرف دیکھنے لگی۔ شہزادی مارشا سوالیہ نظروں سے تہان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی جھیل سی آنکھوں میں تہان کے لیے شناسائی کی تھلک تھی اور روشنی کی ایک غیر مرئی کرن بھی جسے تہان فوری طور پر کوئی نام نہیں دے سکتا تھا۔ تہان نے لمبے میں عاجزی سمیٹنے ہوئے کہا۔

”شہزادی حضور! میں آپ سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔“ لہجہ عاجزانہ ہونے کے باوجود مستحکم اور پُر اعتماد تھا۔

شہزادی کی پیشانی پر الجھن کی شکن نظر آئی۔ پھر اس نے کنیز کی طرف دیکھ کر جیسے اس کی موجودگی میں تہان کے سوال کا جواب دینے میں دقت محسوس کر رہی ہو۔ تہان نے فوراً کنیز سے کہا۔

”تم تھوڑی دیر کے لیے باہر جاؤ اور اگر کوئی اس جانب آئے تو شہزادی حضور کو اطلاع دو۔“

کنیز نے شہزادی کا مدعا جاننے کے لیے اس کی طرف دیکھا اور اس کی خاموشی کو نیم رضا سمجھتے ہوئے باہر نکل گئی۔ تہان نے کافی جلدی کو جلدی سے گرہ دے دی۔ اب وہ دونوں اس خیمے میں تھا۔ حسن، عشق کے دروہو تھا۔ طالب اور مطلب کے درمیان تنہائی کے سوا اور کوئی چیز حائل نہیں تھی۔ اپنی آنکھوں میں قزاقوں کی پاس اور دار فکری لئے تہان مارشا کی طرف دیکھنے لگا۔ شہزادی مارشا بے ساختہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ شاید اسے وہ لمحے یاد آ گئے تھے جب قصر نور میں تہان ہوش و حواس کھو کر اس کے قدموں سے لپٹ گیا تھا۔ ایک دم ہی خیمے کی فضا میں ایک سنسنی سی دوڑنے لگی۔ خاموشی اپنی زبان میں بات کرنے لگی۔ تہان کے بند جوت مارشا کے کانوں سے ہرکلام ہونے لگے اور اس کی یاقوت بھری آنکھوں میں ایک حیا آہر برہمی تیرنے لگی۔ وہ مرتعش آواز میں بولی۔

"کیوں آئے ہو یہاں؟"

تباہان نے سب خدشات ہلائے طاق رکھتے ہوئے اپنی تلوار نیام سے نکالی اور بارشا کے قدموں میں رکھ دی۔ "شہزادی صاحبہ! یہ آپ ہی کی بخش ہوئی تلوار ہے اور دشمنوں کے ابو سے تر۔ صد افسوس کہ میں آپ کے حکم کی بجا آوری میں اپنی جان قربان نہیں کر سکا اور پھر آپ کے سامنے حاضر ہوں۔"

"آخر تم بار بار ہمارے سامنے کیوں آتے ہو؟ کیا چاہتے ہو ہم سے؟"

"میں کچھ نہیں چاہتا شہزادی۔ میں نے اپنی مرضی کو آپ کی مرضی میں گم کر دیا ہے۔ جو آپ چاہیں گی میں بھی وہی چاہوں گا۔ میں آپ کے حسین ہونٹوں سے نکلنے والی صدا ہوں شہزادی..... اور کچھ نہیں ہوں۔"

"ہم چاہتے ہیں کہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔ ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو۔ ہماری مشکلات میں اضافہ مت کرو۔"

"میں چلا جاتا ہوں شہزادی لیکن آپ کو دیوتاؤں کا واسطہ مجھے ایک تھنڈے دیتے۔ میں آپ کے سارے غم و آلام اپنے سینے میں سمیٹ کر لے جانا چاہتا ہوں..... مجھے اس سوغات سے محروم نہ کیجئے۔" شہزادی ایک قدم اور پیچھے ہٹ گئی۔ اس کے چہرے پر شدید الجھن کے آثار تھے۔ کبھی لگتا تھا وہ تباہان کو بری طرح ہڑک دے گی۔ ابھی اس کے چہرے پر ملاحت نظر آنے لگتی تھی۔ تباہان نے گریہ کے انداز میں کہا۔

"شہزادی! میں آپ کا غلام..... میں آپ کو خوش دیکھنا چاہتا ہوں لیکن میں دیکھ رہا ہوں یہاں آپ کو ہر سمت سے حوادث کے سائے گھیر رہے ہیں..... میرے ساتھ بیٹے

شہزادی..... اس حصار سے نکل چلئے۔ میں آپ کو اتنی دور لے جاؤں گا جہاں زمانے کی بے مہر آنکھ آپ کی گرد کو بھی نہ پاسکے گی۔ میں آپ کو کسی ایسے جزیرے پر لے جاؤں گا

جو روئے زمین پر بہشت کا نمونہ ہوگا۔ میں آپ کے قدموں میں دنیا بھر کی سرت ڈھیر کر دوں گا۔ پھر آپ کے سامنے دست بستہ کھڑا ہو جاؤں گا۔ اس وقت آپ مجھے جانے کا کہنے

گا۔ مجھے آپ ہی کی قسم میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کروں گا۔ آپ کی زندگی سے ہی نہیں اپنی زندگی سے بھی نکل جاؤں گا..... لیکن آپ کو اپنی شان کا واسطہ مجھے اس وقت

جانے کا نہ کہئے۔ میں آپ کو حوادث کے گرداب میں چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔"

تباہان کے والہانہ انداز میں عجب سی شدت تھی۔ شہزادی کا بابتادار سر اٹھا ڈمگا کر رہ گیا۔ وہ خود کو سنبھال کر اور اپنے لہجے میں بے پناہ سنجیدگی سمیٹ کر بولی۔ "تم ایک ایسے

راستے پر چل پڑے ہو غلام! جس کی کوئی منزل نہیں۔ تم ایک ایسی چیز کو چھونے کی کوشش کر رہے ہو جو تم سے قرون کے فاصلے پر ہے۔"

تباہان کو پہلی بار احساس ہوا کہ شہزادی اس کی شوریدہ سری اور وارفتگی کو موضوع گفتگو بنا رہی ہے۔ اس کے دل کی زمین پر زلزلے نمودار ہوئے اور سینے طوفانوں کی

آماجگاہ بن گیا۔ وہ پلکیں موند کر بولا۔ "شہزادی! میں دیوانہ ہوں اور دیوانے منزل پر پہنچنے کے لیے نہیں چلتے۔ وہ اس کو چھونے کی کوشش کرتے ہیں جو ان سے قرونوں کی فاصلے پر

ہوتی ہے۔ میری دیوانگی کو حتمت نہ دیجئے۔ پر مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ مجھے صرف یہ بتانیے کہ یہ دیوانہ اپنی زندگی ہارنے سے پہلے آپ کے کس کام آ سکتا ہے؟"

تباہان کے جذبات کی شدت نے شہزادی کی پیشانی عرق آلود کر دی تھی۔ وہ اپنے باطن میں بدن کے لیے سارا تلاش کرتی ہوئی سری پر بیٹھ گئی۔ "شاید تم واقعی دیوانے ہو۔

جس شخص نے ہمیں حاصل کرنے کی کوشش کی تھی اس کی کئی پہلی لاش ابھی باہر پڑی ہے اور تم اس کی جگہ لینے آئے کھڑے ہوئے۔ ہمیں ہمارے حصار سے لگانے کی

کوشش کرو گے تو حسرت ناک موت مرو گے۔ "مقدس ارواح" کے بیرو کار حسین زمین کی ساتویں تہ سے دھونڈ نکالیں گے اور عبرت نگاہ بنا کر دم لیں گے۔ ہمارے اور اپنے

حال پر رحم کرو اور یہاں سے چلے جاؤ۔"

"مقدس ارواح کا ظلم ٹوٹ چکا ہے شہزادی۔ وہ ساری جادو نگری بکھر چکی ہے۔ اب وہاں کچھ باقی نہیں ہے۔"

"تم کچھ نہیں جانتے غلام۔ تمہیں کچھ پتہ نہیں۔ خاموش رہو اور اپنی سوچوں کو اختیار میں رکھو۔ کسی لمحے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

ایکا ایک تباہان کا دل چاہا کہ وہ آگے بڑھے اور سب اندیشوں کو ہلائے خالق رکھ کر شہزادی کو ہاتھوں میں بھر لے۔ قرون کے فاصلے کو ایک جست میں پھیلا لگ کر اپنے جذبے

کی تمام حدت اس پر عیاں کر دے۔ اس کے بعد کچھ بھی ہو جاتا، کیسی قیامت بھی گزر جاتی، اسے کچھ پروا نہیں تھی۔ خوشی اور غم، مذہب اور انعام، زندگی اور موت.....

پھر سب اس کے لیے بے معنی الفاظ تھے۔ ذہن میں اچانک ابھرنے والے اس خیال کے تحت اس نے بالکل بے اختیار ہو کر اپنے قدموں کو شہزادی کی طرف جنبش دی۔ مگر پھر

اسے ٹھنک کر رکنا پڑا۔ خیمے سے باہر بھاگے قدموں کی آہستہ سائی دی تھی۔ خیمے کا پردہ اٹھا اور خوبصورت کینز باہنی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

”شہزادی حضور! سردار فرال کی آخری رسوم ادا ہو گئیں۔ لوگ واپس لوٹ رہے ہیں۔“

شہزادی کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمودار ہوئے۔ تاہاں نے کہا۔ ”آپ گھبراہٹ میں مت شہزادی۔ میں خیمے کو چاک کر کے عقبی سمت سے نکل جاتا ہوں۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔“ اس نے جھک کر شہزادی کے قدموں میں رکھی ہوئی خون آلود لموار اٹھائی اور تیزی سے خیمے کی عقبی دیوار کے پس پینچ گیا۔ بڑی صفائی سے اس نے خیمے کا کپڑا چاک کیا اور اپنے گزرنے کے لیے راستہ بنا لیا۔ راستے میں گزرنے سے پہلے اس نے الوداعی نظروں سے شہزادی کی طرف دیکھا۔ اس کا خیال تھا کہ شہزادی کی نگاہیں شعلہ فشاں ہوں گی۔ چند لمحے پیشتر اس سے جو عظیم مہمانت سرزد ہونے لگی تھی اس کے نتیجے میں شہزادی کا برہم ہونا یقینی تھا۔ مگر یہ دیکھ کر اس کا سینہ خوشگوار دھڑکتوں سے لبریز ہو گیا کہ اس کی نیت جاننے کے باوجود شہزادی کی آنکھوں میں شعلوں نے رقص نہیں کیا تھا۔ بس بالکی سی ناراضگی تھی جس میں شرم کا عنصر نمایاں تھا۔ تاہاں کا دل چاہا کہ ان لمحوں میں اسے موت آجائے یا کائنات کی گردش ختم جائے۔ وہ اپنی ناکردہ جسامت کے نشے میں یونہی ڈوبا رہے اور شہزادی اسے یونہی بے ضرر ناراضگی سے دیکھتی رہے۔ کتنی خوبصورت ناراضگی تھی۔ اس ناراضگی پر ہزاروں رضامندیاں اور خود پسند گیلیاں قریان کی جا سکتی تھیں۔ شہزادی نے اسے یوں رکے دیکھ کر تیزی سے کہا۔ ”جاؤ۔“ وہ ٹھک کر خیمے سے نکلا اور سرعت کے ساتھ تاریکی کا حصہ بن گیا۔

خیمے سے باہر نکل کر اسے خیال آیا کہ یہ تو کورا کا خیمہ تھا اور کورا کے ساتھ افشاوندہ مقیم تھی لیکن ان دونوں کی بجائے اس خیمے میں شہزادی مارشا سے ملاقات ہو گئی تھی۔ وہ دونوں کہیں تھیں۔ دفعتاً اس کا دھیان سردار شلال کی طرف چلا گیا اور اس کے ساتھ ہی اس کا جسم سنسناتا اٹھا۔ سردار شلال جو کورا کے لیے کسی خطرناک ورنڈے سے کم نہیں تھا، ایک بار پھر آزاد تھا اور اس پڑاؤ میں دندنا رہا تھا۔ وہ اپنے چہرے پر ایک ہمدردانہ خم بجائے پھر، تھا اور اس زخم کے عوض کورا کو بے عزت کر کے مار دینا اس کا مقصد حیات تھا۔ کسیں کورا اس وحشی کے ستم کا شکار تو نہیں ہو گئی؟ یہ سوال نیزے کی مانند تاہاں کے سینے میں لگا اور وہ کورا سے ملنے کے بے تاب ہو گیا۔ وہ خیمہ گاہ کے عقب سے طویل چکر کاٹ کر سامنے والی گزر گاہ پر آیا اور خیمہ گاہ کے پسیداروں سے کہا کہ اسے اپنی کنیزوں افشاوندہ اور کورا سے ملنا ہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ ان

دونوں کے سامنے خیمے میں موجود تھا۔ کورا کو زندہ ملامت دیکھ کر تاہاں کو دلی سکون ملا۔ افشاوندہ اپنے بچوں کے ساتھ خوش تھی۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے تاہاں کے لیے ایک کبیل اور صدری تیار کر رکھی تھی۔ کورا اور افشاوندہ کے تعلقات اب سبکی بنوں جیسے تھے۔ تاہاں کو دیکھ کر افشاوندہ کو کھانا پکانے کی فکر لاحق ہو گئی۔ تاہاں ایک عرصے بعد اس کے خیمے میں آیا تو وہ اس کے لیے اہتمام سے دسترخوان تیار چاہتی تھی لیکن تاہاں بہت جلدی میں تھا۔ اس نے افشاوندہ کو منع کر دیا۔ وہ کورا سے حال احوال پوچھ کر فوراً یہاں سے رخصت ہو جانا چاہتا تھا۔ کورا کی زبانی اسے پتہ چلا کہ ہزار ہزار پشتران کا خیمہ تبدیل کر دیا گیا تھا۔ کورا ابھی سردار شلال کی رہائی سے آگاہ ہو چکی تھی۔ اس کی حسین آنکھوں میں وہی سہا سہا تاثر تھا جو تاہاں کو پوری جان سے تڑپا دیا تھا۔ کورا نے تاہاں سے پوچھا کہ سردار شلال جب قاتل اور مجرم ثابت ہو چکا ہے تو سکندر کے مقربین میں کیوں شامل کیا ہے۔ کیا سلاوا عظیم سکندر عدل و انصاف کے تمام آداب بھول چکے ہیں؟ تاہاں اس سوال کا کیا جواب دیتا۔ وہ خود یہی جواب ڈھونڈنے کے لیے یہاں آیا تھا۔ اس کے تن بدن میں ایک آگ سلگ رہی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ آج ہی کسی طرح سکندر سے ملاقات ہو جائے۔

کورا اور افشاوندہ سے رخصت ہو کر اس نے شادی نیمہ گاہ کا رخ کیا۔ حسب توقع یہاں آج بھی ملاقاتوں کا جہوم تھا۔ صرف خاص خاص آدمیوں کو اندر جانے کی اجازت مل رہی تھی۔ تاہاں بھی امیدواروں میں شامل ہو کر بیٹھ گیا۔ ابھی اسے بیٹھے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ کندھے پر کسی کا ہاتھ آیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ عقب میں بوڑھا جشی سردار برعاکھڑا تھا۔ اس نے آنکھوں سے تاہاں کو پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ تاہاں اٹھ کر اس کے ساتھ چل دیا۔ خیموں کے درمیان سے گزر کر وہ پڑاؤ کے گنجان حصے سے باہر نکلے اور درختوں سے گھری ہوئی ایک ہموار جگہ پر آ گئے۔ یہاں گہری تاریکی تھی۔ تاہاں کو اندازہ ہوا کہ اس نے اپنا گھوڑا یہاں سے تھوڑے ہی فاصلے پر باندھ رکھا ہے۔

سردار برعاکھڑے کہا۔ ”تاہاں! میرا خیال ہے تمہیں اس وقت یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔“

”کیوں؟“ تاہاں کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

”گہماری گرفتاری عمل میں آ سکتی ہے۔“ برعاکھڑے جواب دیا۔ تاہاں اس جواب پر ششدر رہ گیا۔

وہ جنگی لباس اتارنے کے بعد ہوبو چرواہا نظر آتا تھا۔ روہتاس نے تباہ کو بتایا کہ وہ پچھلے ایک ہفتے سے اس بستی میں مقیم ہے۔ چرواہے اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتے ہیں اسے گرد و پیش کی خبریں لاکر دیتے ہیں اور ان میں سے کئی ایک تو اپنے مقبوضہ علاقوں کو یونانیوں سے آزاد کرانے کے لیے جنگی خدمات کے لیے بھی تیار ہو گئے ہیں۔۔۔۔۔۔ ابھی روہتاس اور تباہ بڑی باتیں کر رہے تھے کہ ہوشمند ایک مقامی شخص کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ مقامی شخص نے اسے سارا دے رکھا تھا۔ ہوشمند کی حالت سے صاف ظاہر تھا کہ اس نے مقامی لوگوں کی میزبانی سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔ ضرورت سے زیادہ کھا کر نشہ آور مشروب حلق تک بھر لیا ہے۔ اب اس کے قدم سنبھالنے نہ سنبھل رہے تھے۔ تباہ کے اشارے پر مقامی شخص نے اسے آئندہ ان کے قریب بسزیر لٹا دیا۔ وہ حالت خواب میں بیزبانے لگا اور اپنی گردن کے منھوس "منچے" کو سلواتیں سانے لگا جو جنگ کے کئی ہفتے بعد ابھی تک نہیں اترتا تھا۔

دفعتاً تباہ اور سردار روہتاس کو بری طرح چونکنا پڑا۔ چراگاہ کی شالی جانب سے چنچنے اور زور سے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ روہتاس نے اٹھ کر نشیب میں دیکھا جہاں چرواہوں کے آٹھ دس جھوپڑے قریب قریب واقع تھے۔ وہاں کئی مشعل بردار گھڑسوار دکھائی دے رہے تھے۔ پھر کچھ گھڑسوار اس خیمے کی طرف بڑھے جہاں تباہ روہتاس اور ہوشمند موجود تھے۔ پہلے تو تباہ اور روہتاس نے نوادر گھڑسواروں کو ڈاکو جانا لیکن جلد ہی انہیں اندازہ ہو گیا کہ وہ یونانی فوج کے سپاہی ہیں۔ تباہ اور روہتاس کے ہاتھ خود بخود اپنی تلواروں پر آگئے۔۔۔۔۔۔ وہ کسی بھی ہنگامی صورت حال کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کر رہے تھے۔۔۔۔۔۔ یونانی سپاہی دھمکتے ہوئے ان کے خیمے کے سامنے سے گزرے اور ایک نزدیکی خیمے میں داخل ہو گئے۔ یہ چراگاہ کے سب سے معمر گھڑیہ کا خیمہ تھا۔ تباہ نے جلدی سے اپنے خیمے کی مشعلیں بجھا ڈالیں۔ اب وہ گہری تاریکی میں دم سارے کھڑے تھے اور معمر گھڑیہ کے خیمے سے ابھرنے والی آوازیں سن رہے تھے۔ یونانی سپاہی گھڑیہ کو بری طرح ڈانٹ رہے تھے۔ وہ اس سے ان چند نقاب پوشوں کا پتہ پوچھ رہے تھے جنہوں نے دوپہر کے وقت دریا کے کنارے ایک اہم یونانی سردار کو قتل کر دیا تھا۔ یقیناً "یونانی سردار" سے ان کی مراد فرال روز تھی۔ وہ فرال روز کے قتل کی تفتیش پر نکلے ہوئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ بعد گیر و لباسوں والے نقاب پوش اس چراگاہ کے راستے فرار ہوئے ہیں اور چرواہوں نے یقیناً انہیں دیکھا ہو گا۔

معمر گھڑیہ بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار تھا اور حلیہ کہہ رہا تھا کہ اس نے نقاب پوشوں کو دیکھا ہے اور نہ ہی بستی کے کسی اور فرد کو ان کے بارے میں علم ہے۔۔۔۔۔۔ اس شخص کو دوران بستی کے مرد و زن گھڑسواروں کے گرد سے کھڑے تھے۔ کچھ دیر تفتیش کرنے کے بعد گھڑسوار واپس چل دیئے۔ تباہ اور سردار روہتاس نے سکھ کا سانس لیا۔ تاہم یہ "سکھ" دیرپا ثابت نہیں ہوا۔ گھڑسوار ابھی نشیب میں بھی نہ پہنچے تھے کہ انہیں اندھیرے میں سے کسی نے پتھر کھینچ مارا۔ غالباً یہ کسی بچے کا کام تھا۔ یونانی سپاہیوں کو برہم کرنے کے لیے یہ "حرکت" تیسرے طرف ثابت ہوئی۔ وہ غراتے ہوئے پلٹے اور ایک جھوپڑے میں گھس گئے۔ چند ہی لمحے بعد وہ بارہ تیرہ برس کے ایک لڑکے کو تھمتے ہوئے جھوپڑے سے باہر لے آئے۔ لڑکے کی جواں سال ماں لڑکے سے لپٹی ہوئی تھی اور رو رو کر یونانی سپہ سالار سے فریاد کر رہی تھی لیکن وہ اسے چھوڑنے کے لیے کسی صورت آمادہ نہیں تھے۔ دفعتاً انہوں نے لڑکے کو چھوڑ دیا اور اس کی ماں پر جھپٹ پڑے۔ وحشی جانوروں کی یلغار نے کمزور عورت کو چلانے پر مجبور کر دیا۔ وہ زمین پر گر پڑی اور خود کو بچانے کی کوشش کرنے لگی۔ طاقت کے نشے میں غور سپاہیوں نے اسے اٹھا کر گھوڑے پر لاد لیا اور ایک ایک کر گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ بستی کے معمر گھڑیہ نے آگے بڑھ کر کماندار کے گھوڑے کی لگام تھام لی۔

"نہیں سردار" رحم کرو۔ اتنی چھوٹی سی غلطی کی ہمیں اتنی بڑی سزا مت دو۔"

"ہٹ جاؤ۔" یونانی سردار دھاڑا۔ "ورنہ پوری بستی کو ہانگ کر لے جائیں گے۔"

ہٹ جاؤ۔" اس نے بوڑھے کو ہانگ کے ساتھ زور سے دھکیلا۔ وہ پیچھے نہیں ہٹا تو اس نے ہاتھ میں پکڑی تلوار دے کر اس کے پیٹ میں اتار دی۔ بوڑھے کے حلق سے ایک کراہ نکلی اور وہ دوہرا ہو کر زمین پر جاگرا۔ یہ ایک لرزہ خیز منظر تھا۔ کماندار نے خون آلود تلوار ہوا میں لہرائی اور چنگھاڑ کر بولا۔ "اور کسی کو شوق ہے اس عورت کو چھڑانے کا؟" جواب میں گہرا سناٹا پوری بستی میں لپک گیا۔ اس سانے میں بد نصیب عورت کی گھٹی گھٹی چیخوں کے سوا اور کوئی آواز نہیں تھی۔ تباہ نے یہ سب کچھ برداشت نہیں ہوا۔ ہوتا بھی کیسے۔ اس کی آنکھوں میں برسوں پرانا ہی منظر تازہ ہو گیا تھا جب ایسے ہی باوردی سپاہیوں نے ایک عورت سے اس کا بچہ چھیننے کی کوشش کی تھی۔ وہ عورت بھی اسی طرح روئی اور چلائی تھی۔ اسی طرح اس نے اپنے بچے کو بچانے کے لیے اپنی عزت اور جان داؤ پر لگائی تھی۔ اس وقت بھی ایسی ہی بیوہ دار مشعلوں کی روشنی میں کسی ایسے

تکوار اپنی سرزمین اور اپنے لوگوں کی حفاظت میں اٹھائے۔ ایرانی فوج میں شامل ہو جائے اور یونانی غاصبوں کے دانت کھٹے کرنے میں اپنا کردار ادا کرے۔ تباہان خاموشی سے یہ باتیں سنتا رہا۔ آخر میں جب روہتاس نے اس سے جواب طلب کیا تو تباہان کا لہجہ ہرجوش و خروش سے عاری تھا۔ اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

”سردار روہتاس! میرا دل میدان جنگ سے بھر گیا ہے۔ تکوار ایک بوجھ سا محسوس ہو رہی ہے مجھے۔“

روہتاس نے کہا۔ ”یہ سب اس لیے ہے کہ آج تک تم میدان جنگ میں غلامت میں کھڑے رہے ہو۔ تم نے جن لوگوں کے لیے قربانیاں دیں وہ قدر ناشناس ہیں۔ انہیں معلوم ہی نہیں کہ میرے اور پتھر میں کیا فرق ہوتا ہے۔“

”بات کچھ بھی ہو سردار..... لیکن اب مجھ سے کسی کے لیے تکوار نہ اٹھائی جائے گی۔ میرے اندر کوئی جذبہ مر گیا ہے۔ میں خود کو بالکل بے روح محسوس کر رہا ہوں..... میرا دل چاہتا ہے میدان جنگ اور کشت و خون کے ہنگاموں سے کہیں بہت دور نکل جاؤں..... لیکن اس سے پہلے میں ایک کام کرنا چاہتا ہوں۔“

”کیسا کام؟“ روہتاس نے پوچھا۔

”میں شہزادی مارشا اور کورا کو وہاں سے نکال لینا چاہتا ہوں۔ اس کے علاوہ افشاوند سے بھی ایک ملاقات ضروری ہے۔ تاکہ معلوم ہو سکے اس نے اپنے مستقبل کے بارے میں کیا سوچا۔“

تباہان کے لہجے میں رہتی ہوئی قوطیت نے روہتاس کو آزر دہ کیا۔ وہ ایک بار پھر نئے سرے سے تباہان کو سمجھانے کی کوشش کرنے لگا۔ تباہان پر ان پند و نصائح کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس کے چہرے پر بیزار اور تیز خیمہ کی ایک دبیر نقب چڑھ چکا تھا۔ وہ اب صرف اتنا چاہتا تھا کہ روہتاس کسی طرح اپنا کوئی آدمی یونانی پڑاؤ میں داخل کرے جو کہ مارشا اور کورا تک ایک اہم پیغام پہنچا سکے۔ ابھی تباہان اور روہتاس میں گفتگو جاری ہی تھی کہ ایک چروایا تیزی سے جموئیرے میں داخل ہوا۔ اس نے بتایا کہ ایک چادر پوش عورت دو بچوں کے ساتھ یہاں پہنچی ہے اور تباہان نامی شخص سے ملنا چاہتی ہے۔ تباہان چونک کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا دھیان فوراً افشاوند کی طرف گیا تھا۔ اس نے جموئیرے سے باہر نکل کر دیکھا۔ وہ افشاوند ہی تھی۔ اس نے آنکھوں کے سوا تمام جسم ایک سیاہ چادر میں چھپا رکھا تھا۔ دونوں بچے بھی اس کے ساتھ تھے۔ تباہان جلدی سے اسے خیمے میں لے

آیا..... اب ہوشمند بھی بیدار ہو گیا تھا اور جمائی سے یہ سارے مناظر دیکھ رہا تھا۔ افشاوند نے بتایا کہ وہ ایک چمکڑا بان کو اپنا قیمتی ہار رشت میں دے کر پڑاؤ سے نکل سکی ہے۔ افشاوند کو پڑاؤ سے نکالنے والی کورا تھی۔ وہ خود نہیں آ سکی تھی کیونکہ کچھ لوگ مسلسل اس کی نگرانی کر رہے تھے۔ تباہان نے افشاوند سے تفصیلات پوچھیں تو اس نے بتایا کہ سردار شلال کورا کے ارد گرد منتظر رہا ہے۔ کل رات اس نے ایک خواجہ سرا کے ہاتھ کورا کو پیغام بھیجا ہے کہ وہ خود کو اس کے ہالے کر دے۔ اسی میں اس کی نجات ہے۔ اگر اسے تباہان کی طرف سے کوئی گھمنڈ ہے تو غلطی پر ہے۔ تباہان کی حیثیت اب ایک مفرور قاتل کی سی ہے اور وہ پڑاؤ میں قدم رکھنے کی جرأت نہیں کر سکتا..... اس پیغام کے بعد کورا سخت پریشان تھی۔ وہ یہ بھی محسوس کر رہی تھی کہ چند خدامیں اس پر کڑی نگرانی رکھے ہوئے ہیں اور وہ خواتین کی خیمہ گاہ میں نظر بندی کی حالت میں ہے۔ آج علی الصبح سردار شلال نے خادمہ کے ہاتھ ایک اور پیغام بھیجا ہے اور کہا ہے کہ اس کے پاس صرف شام تک کی مہلت ہے اس کے بعد وہ کورا کو اپنی قوت بازو سے حاصل کر لے گا۔

اس پیغام کے بعد کورا نے افشاوند کو بچوں سمیت خیمہ گاہ سے نکال دیا تھا اور وہ ایک چمکڑا بان کی مدد سے تباہان تک پہنچ گئی تھی..... کورا کی مصیبت کا جان کر تباہان پوری جان سے تڑپ گیا۔ آخر وہی ہوا جس کا اسے غمزدہ تھا۔ اسے سردار شلال سے بھی زیادہ سکندر پر طیش آیا، جس نے اپنا وعدہ نبھانے کے لیے ایک خونی قاتل کو لوگوں کی عزتوں اور جانوں سے کھینچنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا تھا۔ بہت بڑی نا انصافی تھی یہ۔

تباہان نے سردار روہتاس سے کہا کہ وہ ان وقت پڑاؤ میں جائے گا اور کورا کو بحفاظت لے کر آئے گا۔ روہتاس نے کہا۔

”تباہان! ہوش سے کام لو۔ ہوا کا رخ کھینچنے کی کوشش کرو۔ تمہارے مخالف سرداروں نے پڑاؤ میں تمہارے لیے ایک آگ بھڑکا رکھی ہے۔ تم جذبات میں آکر خود کو اس آگ کا اندھن کیوں بنا رہے ہو۔ عین ممکن ہے کہ تمہیں الجھانے کے لیے ہی کورا کو یہ پیغامات بھیجے جا رہے ہوں۔ اگر تم کورا کی طرف سے زیادہ اندیشہ محسوس کر رہے ہو تو سکندر کو ایک نامہ ارسال کر دو۔ جس میں لکھو کہ اس نے شلال جیسے خطرناک مجرم کو آزاد چھوڑ کر خطرہ مول لے رکھا ہے اور اگر کورا کو کچھ ہوا تو ذمے دار سردار شلال ہو گا۔“

تباہان کھٹنے کھٹانے کی حد سے گزر چکا تھا۔ اس کے سینے کے صحرا میں ایک ندر آندھی چلنا شروع ہو گئی تھی۔ سردار روہتاس اور ہوشمند کے مشوروں کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ ہتھیار باندھ کر جھوپڑے سے نکلا اور گھوڑے تک آگیا۔ یہ وہی اسیل گھوڑا تھا جو معبد میں اسے شہزادی مارشا کی طرف سے دیا گیا تھا۔ یہ انگلیوں کی جنبش پر چلنے والا گھوڑا تھا۔ تباہان جست کر کے اس پر سوار ہوا اور اڑا لگا دی۔

چراگاہ سے چند سو گز آگے آ کر اسے اندازہ ہوا کہ سردار روہتاس اور ہوشمند بھی اس کے پیچھے آ رہے ہیں۔ تباہان ایک شدید خطرے کا سامنا کرنے جا رہا تھا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی دوسرا اس کے ساتھ ہو۔ یوں بھی اس کا اکیلے رہنا زیادہ مفید تھا۔ اس نے نیلوں کے اندر ایک محفوظ مقام پر گھوڑے کو روک لیا۔ جب روہتاس اور ہوشمند خاصے دور نکل گئے تب وہ اپنی پناہ گاہ سے برآمد ہوا اور ایک مختلف راستے سے پڑاؤ کی طرف بڑھنے لگا۔

اس کے سر پر چمکتا سورج تھا۔ بائیں طرف خودرو درختوں کے سلسلے تھے اور دائیں جانب دریا کا پانی ایک سفید لکیر کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ جوں جوں وہ پڑاؤ سے قریب ہو رہا تھا اس کی بے قراری بڑھتی جا رہی تھی۔ گھوڑا بھاگتا بھاگتا اسے اچانک ٹھٹک کر رکنا پڑا۔ اس نے لگائیں کھینچیں اور گھوڑا اپنی رفتار اچانک کم کر کے ٹھہر گیا۔ تباہان نے غور سے چاروں طرف دیکھا۔ اونچے نیلے سر اٹھائے کھڑے تھے۔ بالکل ویران اور سنسان۔ کہیں کوئی پرندہ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ نیلوں کے دامن میں کہیں کہیں سرخ اور نیلی جھنڈیاں گڑی تھیں۔ تباہان کی ریزہ کی ہڈی میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ روہتاس اور ہوشمند کو نجل دینے کی کوشش میں ایک خطرناک علاقے میں گھس آیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر غور سے چاروں طرف دیکھا شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ یہ علاقہ جنگ اسوس کی یادگار تھا۔ دریا کے بائیں کنارے سے یونانی فوج کی پیش قدمی روکنے کے لیے ایرانیوں نے یہاں گہری خندقیں کھودی تھیں اور انہیں شاخوں اور پتوں سے ڈھانپ دیا تھا۔ جنگ میں یہ خندقیں بیکار ہی ثابت ہوئی تھیں کیونکہ یونانی فوج نے چند اسٹیم دور جنگ وادی میں ہی ایرانی سپاہ کو ڈھیر کر دیا تھا۔ بعد ازاں جنگ گرفتار شدہ فوجیوں نے ان خندقوں کی نشاندہی کی تھی اور سکندر نے اپنے سپاہیوں کو حادثات سے بچانے کے لیے یہاں مختلف رنگوں کی جھنڈیاں نصب کرا دی تھیں۔ تباہان ان جھنڈیوں کو خاطر میں لائے بغیر بڑھتا چلا آیا تھا اور کافی دور پہنچ گیا تھا۔ خطرے کا احساس ہوتے ہی وہ گھوڑے سے

نیچے اتر آیا اور پریشانی سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ وہ جانتا تھا ان خفتہ خندقوں میں لکڑی اور لوہے کی بیڑیاں اس طرح ٹھوکی گئی ہیں کہ اندر گرنے والا گرتے ساتھ ہی چھلنی ہو جائے۔ دوسرے لفظوں میں ان خندقوں میں گرنا موت کے منہ میں جانا تھا۔ وہ بڑی احتیاط سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ راستے کا انتخاب کرتے ہوئے اسے زندگی میں کبھی اتنی مشکل پیش نہیں آئی تھی۔ چاروں طرف گہرا سناٹا تھا اور اس سانے میں ہانپے ہوئے گھوڑے کی پھنکاریں دور دور تک گونج رہی تھیں۔ جب اسے کچھ سمجھ نہیں آئی تو اس نے فیصلہ کیا کہ اپنے گھوڑے کے نقوش پاؤں چلتے ہوئے واپس لوٹ جائے۔ ابھی وہ واپسی کا سوچ ہی رہا تھا کہ اسے اپنے قدموں کے نیچے جنبش محسوس ہوئی۔ اس نے چونک کر دیکھا مٹی میں دراڑ نمودار ہو رہی تھی۔ اچانک اس کا گھوڑا زور سے ہنسنایا اور تباہان نے اس کی پچھلی ٹانگوں کو ایک خلا میں دھتے دیکھا۔ موت اپنی پوری حشر سامانیوں کے ساتھ تباہان کی آنکھوں میں ٹانج گئی لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کرتا یا کرنے کا سوچنا زمین اس کے پاؤں کے نیچے سے نکل گئی۔ وہ ہوا میں اڑتا ہوا کئی گز نیچے خندق میں گرا۔ چند لمحوں کے لیے اسے قطعی معلوم نہیں ہوا کہ وہ کہاں گرا ہے۔ سر پر لگنے والی چوٹ سے آنکھوں میں ستارے سے ٹانج گئے تھے۔ پھر اس نے دیکھا وہ اپنے گھوڑے پر اونچا ہوا ہے۔ چوٹی بیڑیاں گھوڑے کے جسم میں دھنسی ہوئی تھیں اور وہ جاں کنی کے عالم میں لرز رہا تھا۔ تباہان تڑپ کر گھوڑے سے نیچے اتر۔ خندق میں دور تک بیڑیاں گڑی ہوئی تھیں۔ ان کے نوکدار سرے کسی کے لیے بھی جان لیوا ثابت ہو سکتے تھے۔ تباہان کی خوش قسمتی تھی کہ وہ اپنے گھوڑے کے اوپر گرا تھا اور ٹانگ پر معمولی خراش کے سوا کوئی زخم نہیں آیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے گھوڑے کا جسم خون سے خالی ہو گیا۔ تباہان نے اس کی بے نور آنکھوں میں جھانکا اور دل موس کر رہ گیا۔ جیسے سکندر کو یوسی فاسس عزیز تھا یہ گھوڑا تباہان کو عزیز تھا۔ یہ اس کے لیے اس ہستی کی طرف سے تحفہ تھا جس پر تباہان اپنی ہزار زندگیاں بھی قربان کر سکتا تھا۔ اس نے نمناک آنکھوں سے گھوڑے کے ایال پر ہاتھ پھیرا اور خالی نظروں سے اس کے پستے خون کو دیکھنے لگا۔ یہی وقت تھا جب اسے خندق کے کنارے سے کچھ دوری پر انسانی آوازیں سنائی دیں۔ یوں لگا تھا کہ ان نیلوں کے درمیان کچھ لوگ موجود تھے اور انہوں نے تباہان کو خندق میں گرتے دیکھ لیا ہے۔ اب وہ ایک دوسرے کو پکارتے اور آپس میں تیز تیز باتیں کرتے خندق کی سمت آ رہے تھے۔ خندق کوئی چار ہاتھ چوڑی اور دس ہاتھ گہری تھی۔ کسی کی مدد کے بغیر اس میں سے باہر

لاڈلہ محض علاقے سے باہر نکلا گیا۔ اور پھر ایک بند گھوڑا گاڑی میں بٹھا کر نامعلوم منزل کی طرف روانہ کر دیا گیا۔

☆-----☆

گھوڑا گاڑی بڑی سرعت سے ایک نیم پنتہ راستے پر اڑی چلی جا رہی تھی۔ تہاں کو بہت جلد اندازہ ہو گیا کہ اسے پڑاؤ کی طرف نہیں لے جایا جا رہا۔ تو پھر..... وہ کہاں جا رہا تھا؟ کسی آخری نتیجے پر پہنچنے کے لیے اس کے پاس بہت کم وقت تھا۔ وہ ہنسا ہنسا میں کورا کے پاس بہت تھوڑی مسلت رہ گئی ہے۔ وہ بری طرح دشمنوں میں گھری ہوئی ہے اور گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ یہ گھبراہٹ ہو رہا ہے۔ تہاں نے اپنے پاؤں سامنے پھیلائے۔ ٹخنوں سے اوپر پنڈلیاں آہنی زنجیر میں جکڑی ہوئی تھیں۔ زنجیر کے دونوں سروں کو ایک زنگ آلود قفل سے مربوط کر دیا گیا تھا۔ ایسی ہی ایک زنجیر تہاں کے ہاتھ بھی جکڑ رکھے تھے۔ اسے پابند کرنے والوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں فائدہ ایسی زنجیروں کی تہاں کے سامنے کوئی حیثیت نہیں۔ وہ بارہا اس لوہے کو پھینکا چکا ہے۔ اس نے اپنے لمبے بالوں میں سے مخصوص آہنی چوٹی نکالی اور اس کے ذریعے قفل سے چیمیز چھڑا دیں مصروف ہو گیا۔ اس کے انداز میں غایت درجے کا شہماک پایا جاتا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد ناقابل شکست قفل اس کے ہاتھوں میں موم ہو گیا۔ پاؤں کی زنجیر کھلی تو ہاتھ بھی خود بخود بندش سے آزاد ہو گئے۔ تہاں نے اندازہ لگایا کہ گھوڑا گاڑی کے عقبی دروازے پر کوئی قفل موجود نہیں۔ اگر وہ کسی طرح یہ دروازہ کھولنے میں کامیاب ہو جاتا تو اس قید سے نجات مل سکتی تھی۔ وہ کچھ دیر اپنے ہاتھوں سے دروازے کو ٹوٹا رہا۔ دروازہ خاصا مضبوط تھا اور یہاں کوئی ایسی چیز بھی نہیں تھی جس سے اس طرح آزمائش کی جاسکتی۔ تہاں بجزرے میں بند شیر کی طرح گھوڑا گاڑی میں پکڑا لگا۔ اس کے سوا اب کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ وہ گاڑی کے رکنے کا انتظار کرے..... اس نے زنجیریں ایک بار پھر اپنے ہاتھوں اور پاؤں سے لپیٹیں اور خاموشی سے ایک گھوٹے میں سمٹ گیا۔

ابھی اسے بیٹھے چند لمحے ہی گزرے تھے کہ گاڑی کی رفتار اچانک کم ہونے لگی۔ اس کے ساتھ ہی غیر مانوس سا شور سنائی دیا۔ کچھ لوگ فارسی زبان میں زور زور سے باتیں کر رہے تھے پھر یکایک تلواریں چلنے کی آواز آئی۔ گاڑی کو بری طرح ہچکولے لگنے لگے۔ گھوڑے اگلے پاؤں چلتے ہوئے نیم دائرے کی شکل میں پکڑا رہے تھے۔ تہاں کو محسوس

نکل آنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ وہ بے تاب سے آنے والوں کا انتظار کرنے لگا۔ ان کی تعداد آٹھ دس سے کم نہیں تھی اور وہ اس علاقے سے اچھی طرح واقف تھے۔ جب آنے والے خندق کے بالکل نزدیک پہنچے تو تہاں کی امیدوں پر اس پڑ گئی۔ آنے والے یونانی زبان میں باتیں کر رہے تھے۔ یقیناً ان کا تعلق یونانی فوج سے تھا۔

تہاں کا اندازہ درست ثابت ہوا اس نے خندق کے کنارے پر یاد دہی سپاہیوں کی ایک لمبی قطار دیکھی۔ تہاں کو زندہ سلامت دیکھ کر وہ حیران ہو رہے تھے۔ تہاں کی دلی خواہش تھی کہ وہ پہچان نہ جائے لیکن آج دن ہی کچھ ایسا طلوع ہوا تھا۔ ہر کام اس کی خواہشات کے برعکس ہو رہا تھا۔ خندق کے کنارے کھڑے سپاہیوں میں سے ایک فربہ اندام سپاہی نے تہاں کو پہچان لیا اور سرگوشیوں میں اپنے ساتھیوں کو مطلع کرنے میں مصروف ہو گیا۔ حقیقت حال سے آگاہ ہوتے ہی یونانی سپاہی چوکس ہو گئے۔ ان میں سے چند ایک نے تیر مکان سمیٹ لے اور تہاں کو یوں گھورنے لگے جیسے انہوں نے اس کے پر تلاش کر لیے ہوں اور اب انہیں خطرہ ہو کہ وہ کسی بھی لمحے پرداز کر جائے گا۔ تہاں نے ان سے کہا کہ وہ اسے خندق سے نکالنے کا انتظام کریں۔ اس کا جلد از جلد سالار اعظم سکندر تک پہنچنا ضروری ہے۔ سپاہیوں پر تہاں کی اس دلیل کا مطلق اثر نہیں ہوا۔ تہاں کو پچھانتے ہی انہوں نے اپنے کان اس کی طرف سے بند کر لئے تھے۔

قریباً دو گھنٹیں تہاں کو اسی طرح خندق میں قید و تاب کھاتے ہوئے گزر گئیں۔ آخر کنارے پر چند اہم منصب دار نظر آئے۔ ان میں سے فرال روز کے ایک ایک صدی سردار کو تہاں اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ بھی فوراً ہی تہاں کو پہچان گیا اور اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے غصہ کی چنگاریاں چھوٹنے لگیں۔ اس نے نفرت سے تہاں کی جانب سے منہ پھیر لیا اور مدہم آواز میں ماتحتوں کو کچھ ہدایات دینے لگا۔ لگتا تھا کہ وہ لوگ تہاں کو خندق سے باہر لانے میں خاصی احتیاط کرنا چاہتے ہیں۔

اس کے لیے خندق میں رسی کی میڑھی پھینکی گئی۔ میڑھی پھینکنے سے پہلے تمام جہاز اس کے جسم سے اتروا لئے گئے تھے۔ جب تہاں میڑھی چڑھ رہا تھا تین تیر انداز کھنڈوں کے زہ پھینکنے بالکل تیار حالت میں کھڑے تھے۔ جوئی تہاں کنارے پر پہنچا اسے دبوچ کر نیچے گرا لیا گیا اور ہاتھ پاؤں زنجیر کر دیئے گئے۔ ایک صدی سردار نے تہاں کی پسلیوں میں مٹی ٹھوکریں رسید کیں اور اسے فرال روز کے قاتل کا خطاب دیا۔ تہاں یہ سب کچھ خاموشی سے سنتا رہا۔ سننے کے علاوہ وہ کر بھی کیا سکتا تھا..... اسے گھوڑے پر

ہوا کہ گھوڑا گاڑی کے یونانی محافظوں پر چند ایرانی گھڑسواروں نے بلہ بول دیا ہے۔ تہاں زور زور سے دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا اس کے ساتھ اس کے کان باہر سے آنے والی آوازوں پر بھی لگے تھے۔ جلد ہی گھوڑا، ڈی کے ارد گرد ہونے والی لڑائی کا فیصلہ ہو گیا۔ اس لڑائی میں نوادرد گھڑسوار کامیاب رہے اور یونانیوں کو ہتھیار کر دیا گیا یا بھاگ دیا گیا۔ گاڑی کا اگلوتا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور تہاں نے اپنے سامنے چند نقاب پوشوں کو دیکھا۔ ان کے ہاتھوں میں عریاں کھواریں تھیں اور وہ لڑائی کے سبب ہانپتے ہوئے تھے۔ دروازہ کھلتے ہی تہاں باہر نکل آیا۔

یہ درختوں سے گھری ہوئی ایک سنسان جگہ تھی۔ ایک گرد آلود راستہ درختوں کے درمیان سے مل کھاتا دور تک نکل گیا تھا۔ اس راستے پر تین یونانی سپاہیوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ ایک لاش گاڑی پر اس طرح پڑی تھی کہ نصف دھڑ ہوا میں جھول رہا تھا۔ ایرانی نقاب پوش اپنے طے اور طور اطوار سے قبائلی ڈاکو نظر آتے تھے۔ ان کا سردار گھٹے ہوئے جسم کا ایک نیم خیم خیمہ خیمہ تھا۔ اس نے اپنی خون آلود کھواریں نام میں رکھ کر نقاب اٹھایا تو تہاں ششدر رہ گیا۔ وہ اس کے ایک ہزاری دستے کا ایک سردار تھا۔ اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر تہاں کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور پھر فوجی انداز میں تعظیم پیش کر کے ساکت کھڑا ہو گیا۔

تہاں نے پوچھا۔ ”تم یہاں کیسے؟“

وہ بولا۔ ”سردار! آپ کے وفادار آپ کے لیے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتے تھے۔“

”کیا مطلب؟“ تہاں نے پوچھا۔

”سردار! پڑاؤ میں کچھ لوگ آپ کے خلاف سرگرمی سے کارروائیاں کر رہے ہیں۔ آپ کی پیادری کینز کورا کو بھی آپ سے وفاداری کی سزا دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ سردار شلال اس کے درپے ہے۔ وہ کسی بھی طرح اسے اپنے جال میں بکڑنا چاہ رہا ہے اور اگر میرے اندیشے رائیگاں نہیں تو وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی ہو چکا ہے۔“

تہاں کے رگ و پے میں بجلی سی کوند گئی۔ ”کیا کہہ رہے ہو؟“ اس نے اپنے ماتحت کا گریبان پکڑ کر اسے جھنجھوڑ دیا۔

وہ آزد دگی سے بولا۔ ”ابھی توڑی دیر پہلے معلوم ہوا ہے کہ کورا ایک خادمہ کا بھیس بدل کر پڑاؤ سے فرار ہو گئی ہے اور متلاشی دستہ اس کے تعاقب میں گیا ہے۔ مجھے

یقین ہے کہ کورا کو کسی جال میں الجھایا گیا ہے۔ سردار شلال پڑاؤ میں اس تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا تھا لہذا اس نے اسے جان بوجھ کر فرار ہونے کا موقع دیا ہے۔“

تہاں بات کی تہہ تک پہنچ رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس کا چہرہ زلزلوں کی آماجگاہ بننا جا رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا سردار شلال پڑاؤ میں ہے؟“

ماتحت سردار کا جواب نفی میں تھا۔ اس نے کہا۔ ”جناب! یہی بات تو زیادہ تشویش ناک ہے۔ سردار شلال بھی پڑاؤ میں نہیں ہے۔“

تہاں نے اپنے ماتحت سردار سے ضروری معلومات حاصل کیں۔ ضروری ہتھیار اور ایک تیز رفتار گھوڑا لیا اور کورا کی تلاش میں جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ ماتحت سردار نے خواہش ظاہر کی کہ وہ اور اس کے تمام ساتھی تہاں کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ لیکن تہاں نے انہیں سختی سے منع کر کے واپس بھیج دیا۔ وہ اپنے ان خیر خواہوں کو اپنے ساتھ خطرات میں جھونکن نہیں چاہتا تھا۔ انہوں نے جو کچھ کیا تھا یہ بھی ان کی استطاعت سے باہر کی بات تھی۔ ماتحت سردار اور اس کے ساتھی تہاں کو خیر اندیش نظروں سے دیکھتے ہوئے واپس لوٹ گئے۔ تہاں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور دریا کی طرف روانہ ہو گیا۔ ماتحت سردار کی فراہم کردہ اطلاع کے مطابق یونانی فوج کا متلاشی دستہ کورا کی تلاش میں اسی راستے پر روانہ ہوا تھا۔

☆-----☆-----☆

تہاں دریا کے ساتھ ساتھ شمال کی طرف جا رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ چند کوس آگے ایک برباد شدہ قلعے کے قدیم کھنڈر موجود ہیں۔ اگر کورا اس سمت میں گئی تھی تو اس وقت وہ کھنڈر ہی اس کا مسکن ہو سکتے تھے۔ ممکن تھا کہ وہ خود وہاں پھسپ گئی ہو اور زیادہ ممکن یہ تھا کہ سردار شلال یا اس کے ساتھی اسے قابو کر کے وہاں لے گئے ہو۔ تہاں کے ماتحت سردار نے بھی اس امکان کا اظہار کیا تھا۔

یہ سہ پہر کا وقت تھا۔ تیز چمیلی دھوپ میں ہر چیز اپنے اصل رنگ میں چمک دک رہی تھی۔ تہاں نے تھوڑا آگے جا کر عام راستہ ترک کر دیا اور ایک نسبتاً دشوار گزار راستے پر گھوڑا بھاگنا کھنڈرات کی جانب بڑھنے لگا۔ وہ شام سے تھوڑی دیر قبل ان کھنڈروں تک پہنچ سکا۔ گھوڑا کچھ فاصلے پر درختوں میں پاندھنے کے بعد وہ دے قدموں قلعے کی طرف بڑھا۔ قلعہ کی کاغشا یہ تھا کہ وہ اس مہم جوئی کے لیے اندھا پڑنے کا انتظار کرے لیکن صورت حال تاخیر کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ اگر کورا اس ختم المزاج

شمال کے قبضے میں آچکی تھی تو ہر لمحہ قیمتی تھا۔ وہ ایک نسبتاً محفوظ مقام سے کھنڈر میں داخل ہوا اور بڑی احتیاط سے اندرونی حصے کی طرف بڑھنے لگا۔ شمال کے شیطانی منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے یہ سنان جگہ بے حد موزوں تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں کھنڈر میں داخل ہوتے ہی تاہاں کو یہ احساس ہونا شروع ہو گیا تھا کہ سردار شمال اس طرف نہیں آیا۔ کھنڈر میں اتھاخ خاموشی تھی۔ گرد آلود قطعات پر کہیں قدموں کے نشان نظر آتے تھے اور نہ ہی کہیں کوئی گھوڑا بندھا ہوا تھا۔

تاہاں بڑی احتیاط سے کھنڈر کے اندرونی حصوں میں پہنچا لیکن اسے کہیں کوئی ذی نفس دکھائی نہیں دیا۔ اس کے دل میں امید کی کرن روشن ہونے لگی۔ کہیں اس کے خدشات غلط تو نہیں تھے۔ ہو سکتا تھا کورا واقعی فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی ہو یا پھر ماتحت سردار کی اطلاع ہی غلط ہو۔ وہ دیر تک قلعے کے پڑہیت کھنڈروں میں گھومتا رہا اور تہہ خانوں اور سرنگوں میں جھانکتا رہا۔ شام گہری ہو گئی اور کھنڈرات میں کچھ بھی دکھائی دینا بند ہو گیا تو اس نے گھوڑا سنبھالا اور ایک بار پھر دریا کے کنارے کنارے آگے بڑھنے لگا۔

اس رات تیسرے پہر تک وہ یونہی بھٹکتا پھرا۔ نہ کورا کا کوئی سراغ ملا اور نہ سردار شمال کا۔ آخر وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اب کورا کو پڑاؤ میں دیکھنا چاہئے لیکن پڑاؤ میں داخل ہونا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ یہ اپنے پاؤں پر چل کر موت کے منہ میں جانے والی بات تھی۔ تاہاں شدید تذبذب کے عالم میں ایک درخت تلے کھڑا تھا جب کسی کے کراہنے کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ درد و کرب میں ڈوبی ہوئی یہ آواز کچھ فاصلے پر زیتون کے تنہا درختوں سے آئی تھی۔ تاہاں تڑپ کر گھوڑے سے اترا اور تلواریں بے نیام کرتا ہوا آواز کی سمت بڑھلا۔ درختوں میں بیچ کر اس نے دیکھا ایک عمر رسیدہ یونانی سپاہی گھاس پر چپ پڑا کراہ رہا تھا۔ اس کی پسلیوں میں نیزے کا گھاؤ تھا۔ ہر سانس کے ساتھ اس کے چہرے پر کرب کے آثار نمایاں ہوتے تھے۔ اس کے قریب ہی ایک مشعل جل رہی تھی۔ یہ مشعل زین پر پڑی تھی اور اب بجھنے کے بالکل قریب تھی۔ تاہاں نے اپنے گھوڑے کی خرمین میں سے روغن نکال کر مشعل پر انڈیلا اور اسے زخمی کے قریب زمین پر گاڑ دیا۔ زخمی کے ہونٹ خشک تھے اور وہ "پانی پانی" کی پکار کر رہا تھا۔ تاہاں نے اسے پانی پلایا اور کندھوں سے تھام کر ایک تھوڑے درخت کے سارے بٹھا دیا۔ یہ زخمی یونانی سپاہی تاہاں کو نہیں پہچانتا تھا۔ اس نے اپنا نام شاکرت بتایا اور کہا کہ وہ ایک عقیقہ واردات کا گواہ ہے

اور مرنے سے پہلے اپنی یہ گواہی کسی معتبر سردار تک پہنچا دینا چاہتا ہے۔ تاہاں نے اس سے کہا۔

"میرا نام تاہاں ہے اور میں سکندری فوج میں ایک ہزاری سردار کے منصب پر فائز ہوں تم جو کچھ بتاؤ گے میں دے دار افراد تک پہنچانے کی پوری کوشش کروں گا لیکن فی الحال میں چاہتا ہوں کہ تمہیں ملے امداد پہنچاؤں۔ میری خرمین میں مرہم پنی کا سامان موجود ہے۔"

تاہاں اٹھنے لگا تو سپاہی نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "نہیں سردار!" وہ عاجزی سے بولا۔ "میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔ میری بات سن لو۔ میں شمال نامی سردار کے ساتھ ایک لڑکی کے تعاقب میں یہاں پہنچا تھا۔ یہ اب سے کوئی ڈھائی گھنٹے کی بات ہے۔"

شمال اور لڑکی کے ذکر نے تاہاں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ وہ ششدر لگا ہوں سے بوڑھے سپاہی کی جانب دیکھنے لگا۔ سپاہی تاہاں کی کیفیت سے بے خبر آنکھیں موندے اپنی بات کہتا چلا گیا۔ اس نے کہا "اس لڑکی کا نام کورا ہے۔ وہ پڑاؤ میں غورتوں کی خیمہ گاہ سے چوری چھپے نکلے تھی۔ راستے میں سردار شمال کے حکم پر ہم نے اس کے لیے گھات لگا رکھی تھی۔ اسے پکڑ لیا گیا اور سردار شمال کے حکم پر یہاں پہنچا دیا گیا۔ یہاں گھنے درختوں کے اندر پہلے سے ایک بند گھوڑا گاڑی موجود تھی۔ جتنی چلاتی لڑکی کو لے کر سردار شمال اس گھوڑا گاڑی میں گھس گیا۔ ہم لوگ باہر پہرے پر کھڑے رہے۔ رات کے دوسرے پہر شمال اس گاڑی سے برآمد ہوا۔ وہ نقشے میں پتہ تھا۔ واپس پڑاؤ میں جانے سے پہلے اس نے اپنے ماتحت سرداروں سے کہا کہ وہ بھی صبح تک باری باری گاڑی میں جاتے رہیں پھر لڑکی کو قتل کر کے ہمیں درختوں میں دفن کر دیں۔ میں یہ سب کچھ بات کرب کی حالت میں دیکھ رہا تھا۔ سردار شمال موقع سے واپس چلا گیا تو مجھے دیگر سرداروں کے سامنے بولنے کی جرأت ہو گئی۔ میں نے ان سے کہا کہ میں ایک ادنیٰ سپاہی ہوں۔ آپ سب سے کم حیثیت کا مالک ہوں لیکن عمر کے لحاظ سے میں تمہارے بزرگوں کی جگہ ہوں۔ اس جگہ ہم نے جو کچھ کیا ہے یہ دیوتاؤں کے ایوان لرزا دینے کے لیے کافی ہے۔ شکر کرو کہ آسمان ہم پر نرٹ کر نہیں گرایا زمین نے ہم کو نگل نہیں لیا۔ لیکن اب اپنے نامہ اعمال کو مزید سیاہ مت کرو۔ چند لمحوں کے لیے اپنے گھریار اور اہل و عیال کے بارے میں سوچو اور اس لڑکی پر رحم کرو۔ اگر اس بد قسمت کی تقدیر میں موت لکھی جا

پہلی ہے تو اسے فوراً مار دو۔ اس کی ہڈیاں ٹوٹ جائیں گی۔ کانٹوں پر اور مت گھسیٹو۔
 فٹے میں پتھر ایک سردار نے میری گردن دو بونج لی اور مجھے اٹھا کر ان درختوں میں پھینک
 دیا۔ نہ جانے میرے اندر اتنا حوصلہ کہاں سے آگیا تھا۔ میں اٹھ کر سردار کے قدموں سے
 لپٹ گیا اور اسے گاڑی کی طرف جانے سے روکنے لگا۔ دوسرے سردار قہقہے لگا رہے تھے
 اور مجھے پیچھے ہٹانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ اسی دوران گاڑی سے ایک سایہ برآمد
 ہوا۔ لوکھڑاتا ہوا دریا کی طرف بڑھا اور بلندی سے نیچے چھلانگ لگا دی۔ یہ وہی بد نصیب
 لڑکی تھی۔ لڑکی کو یوں ہاتھ سے جالتے دیکھ کر سردار بھڑک اٹھے۔ انہوں نے مجھے
 ٹھوکر ماریں اور ایک سردار نے سپاہی کے ہاتھ سے نیزہ پکڑ کر میرے سینے میں گھونپ
 دیا۔ وہ اپنی دانت میں مجھے مار گئے تھے لہذا مڑ کر میری طرف دیکھنا ضروری نہیں سمجھا۔
 کچھ دیر وہ دریا کے کنارے کھڑے چھپنے چلائے رہے، پھر گھوڑوں پر سوار دریا کے کنارے
 کنارے بہاؤ کی طرف چلے گئے۔

تاہم یہ بے سب کچھ سکتے کی کیفیت میں سنبھلے اس کی بصارت زائل، زبان ٹنگ
 اور سماعت ہلاک ہو چکی تھی۔ نگاہوں میں کورا کا خونچکاں چہرہ تھا اور کانوں میں صرف
 ایک ہی صدا گونج رہی تھی۔ ”تاہم! آخر سردار شلال اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔
 اپنے زخمی چہرے کے بدلے اس نے کورا کو عبرت نگاہ بنا کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ وہ
 کورا..... جو تیری زندگی کے جھلنے پھڑکنے میں پھلدار درخت کا گھنا سایہ تھی۔ کبھی ایک
 ہمدرد کی طرح تیرے دکھ سنی تھی، کبھی ایک بہن کی طرح تیرے جسم کے کانٹے پلکوں سے
 چٹتی تھی، کبھی ایک شفیق ہستی کی طرح تیرا چہرہ اپنی آغوش میں چھپا لیتی تھی..... ہاں
 اس کورا کو آج زندہ درگور کر دیا گیا اس کے نازنین بدن کو ہوس کے کانٹوں پر تھمیت کر
 تار تار کر دیا گیا..... اب تو بھی زندہ کیوں ہے۔ مرجایا مار دے۔ خود فنا ہو جایا شلال
 اور اس کے ٹوٹے کو فنا کر دے۔“ اس کی شفاف آنکھوں میں آنسو لرزنے لگے۔ جاں
 بلب سپاہی نے درخت سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ دفعتاً وہ لڑھک کر پھر گھاس پر گر گیا۔ تاہم
 نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ بہت دیر بولنے کے سبب اس کی سانس اکڑ رہی تھی۔
 تاہم نے محسوس کیا کہ وہ زیادہ دیر زندہ نہیں رہے گا۔ اس نے بوڑھے کے دونوں شانے
 تھام لئے اور ہلتی لہجے میں بولا۔ ”نہ بابا..... ابھی مرنا نہ..... تمہاری گواہی ہے حد
 ام ہے۔ میں تمہیں سکندر کے ڈیروں لے جاؤں گا۔ اسے ہٹاؤں گا کہ دیکھ یہ ہے وہ شخص
 جس نے تیرے پالتو کتوں کو ایک بے گناہ لڑکی کی بویاں نوپتے اپنی آنکھوں سے دیکھا

ہے.....“ کو شش کے باوجود بوڑھے کی آنکھیں بند ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ تاہم نے
 اس کے شانوں کو ایک بار پھر چھو ڈیا پھر اس کے منہ میں تھوڑا سا پانی پکایا اور اسے اٹھا کر
 اپنے کندھے پر لا دیا۔ گھنی جھاڑیوں اور سرکندوں میں سے راست بناتا وہ اپنے گھوڑے
 تک آیا۔ وہ بوڑھے کو اپنے گھوڑے پر سوار کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ اس کے جسم میں
 ایک جھرجھری نمودار ہوئی اور تاہم نے کندھے پر اس کا بوجھ یکدم بڑھ گیا۔ تاہم نے
 اسے سیدھا کیا۔ وہ مرچکا تھا..... وہ کوئی ناپید ہو چکی تھی جو سالار اعظم کی نظر میں
 سردار شلال کو مجرم ٹھہرا سکتی تھی۔

تاہم نے بوڑھے کا جسم بہ آہستگی زمین پر رکھ دیا۔ کچھ دیر اس کے سر ہانے بے
 حس و حرکت کھڑا رہا۔ پھر اچانک کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ گھوڑے کو اڑا لگی اور وہ
 سرپٹ شال کی طرف بھاگنے لگا۔ گھوڑے کی ٹانگیں تاہم کے کاسے سر میں گونج رہی تھیں۔
 اس کا ذہن گھڑوڑ کا میدان بنا ہوا تھا۔ ایسا گرد و غبار تھا کہ کچھ دکھائی اور بھائی نہیں دیتا
 تھا۔ کبھی اس کا جی چاہتا کہ اسی طرح سرپٹ گھوڑا دوڑاتا ہوا فوج کے پڑاؤ میں گھس
 جائے۔ سامنے آنے والے ہر شخص کو تیغ کر ڈالے اور اس وقت تک کھوار چلا تا رہے
 جب تک اس کے جسم کو سینکڑوں نیزوں میں پروں نہ دیا جائے۔ کبھی وہ سوچتا کہ سیدھا
 سکندر کے خیے میں پہنچے اور چلا چلا کر اس سے انصاف طلب کرے۔ کبھی اس کا دھیان
 شلال کی طرف چلا جاتا اور وہ تصوری تصور میں اس کی دھجیاں بکھیرنے لگتا۔ پڑاؤ کی
 جانب نصف سے زائد فاصلہ طے کر کے اس نے اچانک گھوڑا روک لیا۔ وہ جذبات کے
 بے پناہ گرد و غبار پر حوصلے اور قہل کے چھپنے دینے کی کوشش کرتے لگا۔ اس کی تندی و
 تیزی اس کے دشمنوں کو اس سے دور لے جاسکتی تھی۔ اپنی غلت کے سبب وہ بے موت
 مرجاتا تو یہ کورا کے قاتلوں کی بہت بڑی خوش بختی تھی۔ اس نے خود کو سمجھایا کہ وہ
 اندھا دھند پڑاؤ میں نہ گھے۔ اگر اسے کورا کے مجرم سے قرار واقعی بدلہ لینا ہے تو اپنے
 سینے پر برداشت کا بھاری پتھر رکھے اور سوچے کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اس نے گھوڑے کا
 رخ موڑا اور دریا کی طرف چلا گیا۔ ”دیا کے کنارے گھوڑا چلا تا وہ اس نیلے کے دامن میں
 پہنچ گیا جہاں سے عمر سیدہ سپاہی کے بقول کورا نے دریا میں چھلانگ لگائی تھی۔ وہ مختصری
 ہوئی سردی اور سنسان رات سے لافلق دریا کے کنارے بیٹھ گیا۔ اس کے کان پانی کے
 مدہم شور پر تھے۔ اس پانی نے کورا کو لگا تھا اور اس کی بے مراد زندگی سے آخری سانسیں
 چھینی تھیں۔ تاہم کو محسوس ہوا کہ اس کے رخساروں پر نمی ہے۔ وہ رو رہا تھا۔ لگتا تھا

آنکھوں سے پانی کی بجائے تیزاب کے آنسو ٹپک رہے ہیں۔ ایک سیال آتش میں اس کا چہرہ جھلتا چلا جا رہا تھا۔ اچانک اس کے دل میں امید کی ایک کرن روشن ہوئی۔ اس نے سوچا ہو سکتا ہے کورا ابھی تک زندہ ہو۔ پانی اسے بہا کر دور لے گیا ہو اور کسی کنارے پر پھینک دیا ہو۔ کیا وہ دوبارہ کورا کی صورت دیکھ سکے گا؟ "کاش ایسا ہو سکے!" اس کے دل کی گہرائیوں میں خیال ابھرا۔ "ایسا ہو جائے تو وہ کورا کے ہر زخم پر مرہم رکھ دے گا۔ اسے اتنی محبت دے گا کہ اس کے پاس زندہ رہنے کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہیں رہے گا۔ ہر اس چھوٹی سے چھوٹی کوتاہی کا مداوا کر دے گا جو کورا کے سلسلے میں اس سے ہوئی ہے۔"

وہ دریا کے کنارے بیٹھا رہا اور سوچتا رہا۔ دور مشرق سے سپیدہ سحر نمودار ہو رہا تھا۔ تہاں کا گھوڑا اب تازہ دم تھا۔ اس نے سوچا کہ اجالا ہوتے ہی وہ دریا کے ساتھ ساتھ نکلے گا اور کورا کو ڈھونڈے گا لیکن اسے یہ تردد کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ روشنی ہوتے ہی اسے کورا کی لاش نظر آگئی۔ وہ نئے دور دور ڈھونڈنے کا ارادہ کر رہا تھا وہ اس کے پاس ہی موجود تھی۔ صرف تین قدم کے فاصلے پر کورا کا بے جان جسم پانی کے اندر ایک جھاڑی سے لٹھا ہوا تھا۔ اس کے لیے ریشمی بال ایک شاخ سے یوں مل کھائے تھے کہ شب بھر پانی میں رہنے کے باوجود وہ نیچے کی طرف نہیں جاسکتی تھی۔ تہاں تڑپ کر اپنی جگہ سے اٹھا اور بھاگ کر کورا کے پاس پہنچ گیا۔ اس کا خونچکاں چہرہ بیت جانے والی قیامت خیز رات کی گواہی دے رہا تھا۔ یہ گواہی تہاں کے لیے اپنے چہرے پر سجا کر وہ بیش کے لیے خاموش ہو چکی تھی۔

تہاں نے کورا کے بال یہ آہستگی شاخوں سے چمڑائے اور اسے بانوں میں اٹھائے ہوئے پانی سے باہر آگیا۔ رات بھر سخت سردی میں رہنے کے سبب لاش اکڑ چکی تھی۔ اس نے اسے ایک ہموار پتھر پر لٹا دیا اور حویٹ سے دیکھنے لگا۔ اس کا چہرہ ہر تاثر سے عاری تھا۔ اس پر سکون سمندر کی طرح جس کے نیچے طوفان پلٹے ہیں۔ دفعتاً اسے چوکننا پڑا۔ کورا کی لاش پر کسی کا سایہ پڑ رہا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا اور بری طرح ٹھٹک گیا۔ چند قدم کے فاصلے پر گہروا لباس والا ایک تھوڑا بڑا مردار کھڑا تھا۔ وہ نہ جانے کب سے اسے دیکھ رہا تھا۔ تہاں کا ہاتھ بے اختیار اپنی کمر کی طرف بڑھا۔ اس وقت عقب نے اسے ایک بلند نعرہ سنائی دیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ گہروا لباس والے اور منڈے ہوئے سروں والے کم از کم دس گھڑ سوار تھوڑا سا گھبراہٹ سے اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ تہاں کی

آنکھوں میں فرال روز اور اس کے ساتھیوں کی موت کا منظر گھوم گیا۔ انہیں بھی ایسے ہی پراسرار افراد نے دریا کے اندر ہلاک کر ڈالا تھا اور موت تک وہ اسے باوجود پکڑے نہیں جاسکتے تھے۔ آج اس دیران مقام پر وہ تہاں پر حملہ آور ہو رہے تھے۔ موت تہاں کی آنکھوں میں ناچ گئی۔ فرال روز کی طرح وہ بھی شہزادی مارشا کا دعویدار تھا۔ وہ شہزادی مارشا جو گہروا لباس والوں کے لیے "مہادیوی" تھی اور جس کے تحفظ کی وہ قسم کھائے ہوئے تھے۔ تہاں کی توجہ چند ساعتوں کے لیے گھڑ سواروں کی طرف منعطف ہوئی۔ اس دوران سانسے کھڑے شخص نے بے دریغ تہاں پر چھلانگ لگائی اور اسے لپٹا ہوا نم آلود ریت پر گرا۔ وہ ایک گرا نڈیل شخص تھا۔ اس کے نیچے سے نکلے میں تہاں کو چند لمحے کی تاخیر ہوئی، گھڑ سواروں کے لیے اتنی ملت بست تھی، وہ موقع پر پہنچے اور گھوڑوں سے اتر کر تہاں سے لپٹ گئے۔ تہاں کو غیر مسلح کر کے ہر طرف سے دباؤ لیا گیا اور ایک ریشمی ڈور سے مٹکیں کس دی گئیں۔ زنجیروں کے خزاں رسیدہ درختوں سے ایک گھوڑا گاڑی پر آند ہوئی اور تہاں کے قریب آرکی۔ ایسی گھوڑا گاڑیاں تہاں کی بلی کارنیں کے معبد میں کئی بار دیکھ چکا تھا۔ ان میں دو ہم رنگ گھوڑے جوتے جاتے تھے اور گاڑی پر چاروں طرف چڑا منڈھا ہوا تھا۔ تہاں کو اٹھا کر اس گھوڑا گاڑی میں لاد دیا گیا۔ پھر کورا کی لاش ایک کھل میں لیٹی گئی اور اسے بھی تہاں کے قریب رکھ دیا گیا۔ گھوڑا گاڑی آگے بڑھی تو تہاں نے دیکھا کہ یہاں ایک اور جسم بھی موجود ہے۔ یہ اسی عمر رسیدہ شخص کی لاش تھی جسے سردار شلال اور اس کے ساتھی درختوں میں جاں بلب چھوڑ گئے تھے اور جس نے بعد میں تہاں کو کورا کے انجام سے آگاہ کیا تھا۔

☆-----☆-----☆

گھوڑا گاڑی کے سفر کے دوران ہی تہاں کو گہری غنودگی نے آن لیا تھا۔ کوئی خوشبو ہی اس کے نھتوں میں تھکی تھی اور وہ بتدریج نیند کی آغوش میں چلا گیا تھا۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ایک آراستہ کمرے میں پایا۔ بغور دیکھنے پر اسے یہ کمرہ جانا پہچانا محسوس ہوا اور پھر وہ یہ جان کر دنگ رہ گیا کہ یہ وہی کمرہ ہے جس میں وہ کئی ہفتے قیام کر چکا ہے۔ دمشق کے معبد میں مہمان چھاری کی حیثیت سے وہ اسی کمرے میں رہا تھا۔ وہی در و دیوار، وہی آرائش، وہی تھنٹھن کی دور افتادہ صدا سنیں اور بھینے بھینے خوشبو۔ وہ اٹھ کر دروازے پر پہنچا۔ دروازہ باہر سے مقفل تھا اس نے درپے کا پردہ ہٹا کر باہر بھاگنا۔ باہر دیکھی ہی راہداری نظر آ رہی تھی۔ درپے کے سینے سے طالع دان میں

کے باوجود وہ کوئی اندازہ قائم نہ کر سکا۔

اپنے خیالوں میں غلطی آخر تابان اس مقام تک پہنچ گیا جس سے آگے غلامیں اس کا ساتھ دینے سے قاصر تھیں۔ وہی بلند و بالا محرابی دروازہ اس کے سامنے تھا جس میں ایک بیش قیمت سفید پردہ جھول رہا تھا۔ دفعتاً تابان کو تواری جیشوں کا خیال آیا۔ ان جیشوں سے اولین ملاقات ہمیں پر ہوئی تھی۔ کیا وہ پھر اسے خوش آمدید کہیں گے؟ اس نے سوچا اور منتظر لگا ہوں سے پردے کی جانب دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد پردے میں جنبش ہوئی، ایک سیاہ ہاتھ باہر نکلا اور پھر ایک دیو قامت شخص تابان کے سامنے آگیا۔ تابان ایک دروازہ قد شخص تھا لیکن پردے کے پیچھے سے برآمد ہونے والا شخص اس سے بھی کئی پشت اونچا تھا یوں لگتا اس کا سر چھت کو چھو رہا ہے۔ تابان سمیت ارد گرد کی ہر چیز اس کے مقابلے میں حقیر دکھائی دیتی تھی۔ اس کا جسم بے ڈول تھا محسوس ہوتا تھا کہ غیر معمولی قد اس کے لیے زحمت بنا ہوا ہے۔ اس نے تابان کو اپنی غیر معمولی طور پر بڑی آنکھوں سے گھورا پھر جبکہ کر تعظیم پیش کی اور بولا۔

”خوش آمدید معزز مہمان! مادیوی آپ کو شرف ملاقات بخشا چاہتی ہیں۔“

یعنی یہی الفاظ تواری جیشوں نے تابان سے کہے تھے۔ صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ تواری جیشوں کی جگہ اس دیو قامت جشی نے لے لی ہے۔ شاید قصر نور کی محافظت کے لیے عجیب التلفت پیدا ہونا شرط اول کی حیثیت رکھتا تھا۔ تواری جشی پیدا کئی طور پر ایک دوسرے سے پیوست تھے جبکہ موجودہ محافظ ناقابل گمان حد تک طویل قامت تھا۔ تابان محرابی دروازے سے اندر داخل ہوا۔ طویل قامت جشی ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل جبکہ گیلیا اب پھر وہی مرحلہ درپیش آیا۔ انہیں چوپایوں کی طرح چلتے ہوئے مادیوی کے ایوان میں پہنچنا تھا۔ تابان جانتا تھا اگر اس نے یہ رسم پوری نہ کی تو اس کا قصر نور میں پہنچنا مشکوک ہو جائے گا۔ اور وہ ہر صورت وہاں پہنچنا چاہتا تھا۔ اگر مادیوی شہزادی مارشا ہی تھی تو وہ اس تک پہنچنے کے لیے سر کے بل چلنے کو بھی تیار تھا۔ وہ طویل قامت جشی کے پاس جبکہ گیا اور ہتھیلیوں اور گھٹنوں کے بل چلنے لگا۔ گلدستہ بدستور اس کے ہاتھ میں تھا۔ ایک طویل راہداری طے کر کے وہ ایک اور محرابی دروازے کے پاس پہنچے۔ یہاں پہنچ کر دیو قامت جشی رک گیا۔ آنکھوں آنکھوں میں اس نے تابان کو سمجھایا کہ اس سے آگے وہ اکیلا جائے گا۔ تابان آگے بڑھا۔ سامنے وہی خوبصورت ایوان تھا جس کا ہر منظر دودھیا دھند میں دھندلایا رہتا تھا۔ فرش سے نیم دائرے کی شکل میں سفید سیڑھیاں

اٹھتی تھیں اور قد آدم بلندی پر جا کر اوچھل ہو جاتی تھیں۔ تابان جانتا تھا کہ جب تک دیوی کی آواز نہ آئے وہ سر جھکائے رکھتے اپہند ہے۔ وہ چور نظروں سے بیڑھوں کے پانی سرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد دھند میں حرکت پیدا ہوئی اور سفید برق لباس میں ملبوس مادیوی اپنی نایاب نقشہ پر براہمن ہو گئی۔ تابان کا دل جیسے کپٹیوں میں دھڑک رہا تھا۔ وہ جلد از جلد مادیوی کا رخ زیادہ دیکھنا چاہتا تھا۔

”سراٹھاؤ؟“ مادیوی کی گونجتی ہوئی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ اس نے سر اٹھایا۔ اس کے سامنے ایک جانا پہچانا چہرہ تھا۔ لیکن یہ چہرہ شہزادی مارشا کا نہیں تھا۔ دیوی انگلیں کا تھا۔ تابان اہل بھگہ گیا۔ دیوی انگلیں جو معبد کی سرکردہ دیوی کملاتی تھی، آج مادیوی کی مسند پر بیٹھی تھی۔ اس کے سفید تاج میں سے مسور کن شعاعیں پھوٹ رہی تھیں اور اس تاج کے نیچے اس کا حسین چہرہ بے انتہا سنجیدگی لئے ہوئے تھا۔ تابان نے غور سے اسے دیکھا۔ یہ انگلیں دیوی تھی جو گلابی دھند میں لپٹی اس سے پہلوں راز و نیاز کیا کرتی تھی۔ اس کی دائیں تابان کے لیے اجنبی تھیں اور نہ اس کا جسم۔ لیکن آج وہ خود کو اس سے بہت دور محسوس کر رہا تھا۔ ان کے درمیان غیریت کی ایک بلند دیوار حائل ہو چکی تھی۔ تابان سوچنے لگا کہ اس نے انگلیں دیوی کو آخری بار کب دیکھا تھا۔ اسے یاد آیا۔ وہ دونوں ہفت رنگ پانی کے فوارے کے پاس موجود تھے۔ اچانک در دیوار گہری تاریکی میں ڈوب گئے تھے پھر تابان کو سینے پر زور دار دھکا لگا تھا۔ وہ سنگی فوارے کو توڑتا ہوا فرش پر ڈھیر ہو گیا تھا۔ کچھ دیر بعد جب روشنی لوٹی تھی تو انگلیں دیوی وہاں سے جا چکی تھی۔ اس واقعے کے کئی ماہ بعد وہ آج انگلیں دیوی کو دیکھ رہا تھا۔

حسب دستور وہ آگے بڑھا اور اس نے سفید گلدستہ سب سے نیچے زینے پر رکھ دیا۔ ”کیا یہ درست ہے کہ تم مادیوی مارشے محبت کا دم بھرتے ہو؟“ انگلیں دیوی کی آواز ابھری۔ یہ سوال بالکل اچانک اور غیر جرح تھا۔ تابان کو لگا جیسے اسے یہ سوال پوچھنے کے لیے ہی یہاں طلب کیا گیا ہے۔ انگلیں کی شعلہ بار سوالیہ نگاہیں اس کے چہرے پر جمی تھیں۔

تابان نے کہا۔ ”ہاں دیوی! مجھے اپنے جرم سے انکار کی تاب نہیں۔ میں شہزادی مارشا سے محبت کرتا ہوں۔ اب سے نہیں اس وقت سے جب وہ صرف شہزادی مارشا تھی۔ مادیوی نہیں تھی۔“

”تمہارا جرم ناقابل معافی ہے۔“ انگلیں کی بے لچک آواز ابھری۔ ”بہتر یہ تھا کہ مہادیوی خود یہاں جلوہ افروز ہو کر تمہیں سزا سنائیں لیکن وہ معبد میں موجود نہیں۔ ان کی غیر موجودگی میں یہ فرض مجھے ادا کرنا پڑ رہا ہے۔“ دیوی انگلیں نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا چھوٹا سا لکڑی کا عصا دو بار فرش پر مارا۔ طویل قامت جیشی سر جھکائے اندر داخل ہوا۔ اس کے عقب میں تین مسلح محافظ تھے۔ انگلیں دیوی نے بے حد سرد مہری سے تابان کو دیکھا اور بولی۔

”اسے کئے جاؤ“ اور مہادیوی کی واپسی تک بندی خانے میں قید رکھو۔ یاد رہے کہ اس کی موت واقع نہیں ہونی چاہیے۔“

تہاں کے لیے یہ فیصلہ کن لمحات تھے۔ وہ منہج سے بے پرواہ ہو کر مسلح محافظوں سے سخت گتھا ہو سکتا تھا لیکن مسئلہ ان محافظوں کو زیر کرنے کا نہیں اس معبد کی بھول بھلیوں سے نکلنے کا تھا اور وہ جانتا تھا یہاں سے نکلنا ناممکن ہے۔ راہداروں کے پتھروں میں جگہ جگہ ایسے ہم رنگ شیشے جڑے ہوئے تھے جن کے پیچھے سے ان گنت نگران آنکھیں نقل و حرکت کرنے والوں پر نگاہ رکھتی تھیں۔ یہ ایسا گورکھ دھندہ تھا جس کے پیچ و خم سے سر تو پھوڑا جا سکتا تھا رہائی حاصل نہیں کی جاسکتی تھی۔ ”تو کیا اسے نامعلوم مدت کے لیے کسی تاریک بندی خانے میں ڈال دیا جائے گا؟“ یہ سوال زہرناک تیر کی طرح اس کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ وہ قید و بند سے ڈرتا نہیں تھا لیکن سینے میں بھڑکتی ہوئی آگ نے اسے جل نکی میں مبتلا کر رکھا تھا۔ یہ کورا کے انتقام کی آگ تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اس آگ کے ساتھ بندی خانے میں چلا گیا تو چند راتوں میں جل کر بھسم ہو جائے گا۔

اس نے ہلکتی لہجے میں دیوی انگلیں نے کہا۔ ”دیوی! مجھے مت روکے۔ اس وقت میرے اور اس معبد کے دشمن ایک ہیں۔ میں سکندر کے چند اہم سرداروں کو عبرتناک موت دینے کی قسم کھا چکا ہوں۔۔۔۔۔۔ مجھے جانے دیجئے دیوی۔ اس میں میرا نہیں اس معبد کا اور معبد کی سادہ مٹی کے لیے لڑنے والوں کا بھی جھلکا ہے۔۔۔۔۔۔“ نمان نے انگلیں دیوی کے سامنے مختصر الفاظ میں کورا کی حریفانہ نصیحتیں کا جابجا بیان کیا اور اسے بتایا کہ اس کے سینے میں کورا کے قاتلوں کے لیے کیسی آتش بھڑک رہی ہے۔

تہاں کا خیال تھا کہ اس کی دلیلیں انہیں دیوی کو متاثر کریں گی اور اس کے دل میں تہاں کے لیے نرم گوشہ پیدا ہو جائے گا لیکن یہ خیال غلط نکلا۔ انہیں کا پھر بدستور

سردھری کے دبیر نقاب میں چھپا رہا۔ اس کی آنکھوں میں جھانک کر تاپان کو عجیب سا احساس ہوا۔ اسے لگا جیسے وہ خاموشی کی زبان میں اس سے مخاطب ہے اور کہہ رہی ہے "اے وقوف غلام! میں تمہاری دلیل کیوں سنوں جبکہ میں تمہیں معاف نہ کرنے کا عہد کر چکی ہوں۔ شنہادی مارشا تو صرف ایک بہانہ ہے۔ میں تمہیں اس فریب کی سزا دے رہی ہوں جو تم اپنے قیام کے دوران مجھے دیتے رہے ہو۔ تم نے مارشا کو رہانے کے لیے میرے قہیدے پڑھے۔ اپنی آواز اس کے کانوں تک پہنچانے کے لیے تم نے مجھے زیادہ بتایا۔ میرے دل کو کھلونا سمجھ کر کھینچتے رہے اور میرے جذبات کی نازک کوئیپوں کو اپنے بے جس قدموں سے کھینچتے ہوئے گزر گئے۔"

انہیں دیوی کے دلی جذبات کا اندازہ کرتے ہوئے تاجاں سے کہنا۔ ”مہادیوی! کیا میں آپ سے تنہائی میں کچھ عرض کر سکتا ہوں؟“

”اپنی زبان کو لگام دو غلام۔ تمہاری یہ زبان تمہیں اس انجام تک لائی ہے۔ اب اس انجام کو اپنی چرب زبانی سے اور بھی تک مت ہٹاؤ۔ جاؤ..... دور ہو جاؤ دھاری لگا ہوں۔“

انہیں، مہاروی کی سند پر بیٹھی کسی زخمی ٹائمن کی طرح بل کھا رہی تھی۔ تاہاں کو اپنی کج روی کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے واقعی انگلیں سے بے رحمانہ سلوک کیا تھا لیکن رد عمل اتنا سخت ہو گیا یہ بات کبھی اس کے ذہن میں نہیں آئی تھی۔

اس نے انگلیں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں اپنی صفائی میں کچھ عرض کر سکتا ہوں؟“

”تم اپنے جرم کا اقرار کر چکے ہو۔ تم نے مہادیوی کے حوالے سے اپنے دل میں ہٹاک سوچوں کو جگہ دی ہے اور یہ جرم اس چار دیواری میں ناقابل معافی ہے۔“

تباہی نے کہا۔ ”لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مجھے اس جرم میں نہیں کسی اور جرم میں سزا دی جا رہی ہے۔“ انگلیں دیوی کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گئیں جیسے تباہی نے اس کے دل کا چور پکڑ لیا ہو۔

”کیا کہنا چاہتے ہو تم؟“ وہ گرجی۔

وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ اس معبد کی ایک محترم ہستی اپنے ذاتی ستاروں کی بناء پر مجھے اس سزا کی بجائے جہنم تک رہتی ہے۔“

اٹھارہ فٹ ہو جاتی تھی۔ فیصلہ کیا گیا کہ کنارے اور فیصل کے درمیانی سمندر کو ایک پتھر لے راستے سے پاٹ دیا جائے۔ اس سلسلے میں مشہور مقدونی انجینئر دیادس کی صلاحیتیں بہت کار آمد ثابت ہو سکتی تھیں۔

ہنرمندوں کے صلاح مشورے کے بعد راستہ بنانے کی تجویز قابل عمل قرار پائی۔ بھاری بھر کمیشنوں کے ذریعے راستے کی تعمیر شروع کر دی گئی۔ وزنی چٹانوں اور پتھروں کو سمندر میں لڑھکایا جاتا اور جب وہ سطح آب تک پہنچ جاتیں انہیں ہموار کر کے 200 فٹ چوڑے راستے کی شکل دے دی جاتی۔ اس راستے پر جگہ جگہ لکڑی کے اونچے برج بھی تعمیر کئے جا رہے تھے تاکہ سپاہیوں کو آڑ میرا سکے۔ جوں جوں کام آگے بڑھ رہا تھا۔ شہر کے اندر سے مزاحمت میں شدت پیدا ہو رہی تھی۔ دن میں کئی مرتبہ فیصل پر سے اچانک سنگباری اور آتشباری شروع کر دی جاتی۔ جیشیتیں وزنی پتھر پھینکتیں۔ نفع اور رال سے بھرے ہوئے مرجان سنساتے ہوئے آتے اور پھٹ کر چپٹی چا دیہتے۔ ان تمام کارروائیوں کے باوجود مزدور و کاریگر شب و روز مصروف تھے۔ مرنے اور زخمی ہونے والوں کی جگہ فوراً نئے لوگ آ جاتے اور اسی جوش و خروش لے مصروف ہو جاتے۔ دیادس اور دوسرے انجینئروں نے ساحل پر واقع پرانے شہر کے کھنڈر کھود ڈالے تھے۔ اب اس شہر کا ملبہ راستے کی تعمیر میں استعمال ہو رہا تھا۔ یہ راستہ دیکھنے میں ایک شاخ کی طرح نظر آتا تھا جو ساحل کے تنے سے پھوٹ کر شہر کی طرف بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

صور کی فیصلیں قریباً ایک سو گز دور رہ گئیں تو تعمیر روکنا پڑی۔ اس تعطل کا سبب فیصل پر سے ہونے والی شدید آتشباری تھی۔ صلاح مشورے کے بعد سمندر نے مقدونی انجینئروں کو راستے کے آخری سرے پر بلند برج تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ ان برجوں کی بلندی شہر کی فیصل کے برابر تھی اور یہاں سے آتشباری روکنے کے لیے مؤثر اقدامات کئے جاسکتے تھے۔ یہ دیکھ کر صور کی فوجوں نے جوابی کارروائی کی۔ ان کا طاقتور بحری بیڑہ تو تعمیر شدہ راستے کی دونوں طرف نمودار ہوا اور زبردست حملے کرنے لگا۔ اب حالت یہ ہو گئی کہ شب و روز تیر، نیزے اور جیشیتوں کے پتھر برسنے لگے۔ ہلاکت کی اس موسلا دھار بارش میں ساحل اور برجوں کے درمیان نقل و حرکت ناممکن ہو کر رہ گئی۔ اس کا توڑ یونانی انجینئروں نے یہ کیا کہ راستے کے دونوں طرف لکڑی کے شہتیروں سے مضبوط پاڑھ بنائی شروع کی۔ اہل صور نے نملے پر دھلا مارتے ہوئے ان پاڑھوں کو فیصل پر سے اندھا دھند نشانہ بنا شروع کر دیا۔ لکڑی کی پاڑھوں پر جب دھن گرتا اور پھر آتشیں

خبر برسائے جاتے تو وہ دھڑا دھڑپنے لگتیں۔ یونانیوں نے جوابی کارروائی کے طور پر ان پاڑھوں کو ایک خاص قسم کے چھڑے سے ڈھانپ دیا اور وہ آگ سے محفوظ ہو گئیں۔

ایک طرف بحیرہ احمر کے پانیوں میں یہ ہنگامہ محشر برپا تھا اور دوسری طرف جبل الشیخ کے ایک سرد اور تاریک قید خانے میں تباہان قید و بند کی صعوبتیں جھیل رہا تھا۔ اسے ان معاصب میں گرفتار ہونے اب کی ماہ بیت چکے تھے۔ دوسرے قیدیوں کی طرح اس کے چہرے اور سر کے بال بھی جلاؤں کی صورت اختیار کر گئے تھے۔ برہنہ جسم پر میل پیکل کی خمیں تھیں اور مسلسل سختی کے جب کھال پھٹ چکی تھی۔ قید کی اس طویل سردرات میں اس کے تصور کے آسمان پر صرف دو ہی ستارے چمکتے تھے۔ کورا اور مارشا۔ وہ انہی کے خیالوں میں غم رہتا تھا۔ کورا کے قاتلوں سے انتقام لینا اور مارشا کو اس کے دشمنوں کے نرغے سے نکالنا یہی اس کی زندگی کی دو آخری خواہشیں تھیں لیکن قرآن بتاتے تھے کہ یہ آخری خواہشیں اس کے ساتھ ہی اس تاریک قید خانے میں دفن ہو جائیں گی۔ شروع شروع میں تباہان اس تہہ خانے سے نکلنے کے بارے میں پرامید تھا لیکن پھر ایک روز اس کی تمام امیدوں پر اداس دھڑکی تھی۔ اسے پابند سلاسل کرنے والوں کو کسی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ تباہان ثانی یہ قیدی بحیرہ انجینئر اور یونان میں ایک ایسے بھگوت غلام کے طور پر مشہور رہا ہے جو "نکل بھاگنے میں" اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ اسی روز سے تباہان کے لیے خاص احتیاطی تدابیر اختیار کی گئی تھیں اور وہ چھت سے جھولتے ہوئے اپنے بچرے میں قلعی بے بس ہو کر رہ گیا تھا۔ پھر دیرے دیرے تباہان نے حالات کے سامنے اختیار ڈال دیے تھے۔ اب وہ صرف کسی معجزے کے انتظار میں زندہ تھا۔ اس کے مردہ نوصلوں کی راکھ تلے امید کی ایک چنگاری تھی۔ وہی چنگاری اس کے مختصر ہوئے جسم میں زندگی کی حرارت باقی رکھے ہوئی تھی۔ شاید کوئی انمولی ہو جائے۔ شاید شب و روز کے رخ بستہ انبار میں سے کوئی سورج ایسا طلوع ہو جائے جس کی کرنیں اس کی زنجیروں کو کھٹکا ڈالیں۔ شاید۔ شاید۔

وہ ایک تاریک دن تھا۔ اس قید خانے میں ہر دن تاریک ہوتا تھا۔ صرف محاذوں کی آمد و رفت اور جبروں میں جھجکی جانے والی خوراک سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان پتھریلی دیواروں سے باہر کہیں دور نیلے آسمان پر سورج چمکنے لگا ہے۔ تباہان اپنے آہنی بچرے میں سب سُدھ پڑا تھا۔ اس کی نگاہیں کچھ دور ایک دوسرے بچرے پر مرکوز تھیں۔ یہ بچرہ خالی تھا۔ اس کا کہیں چند روز پہلے قید سے رہائی پا گیا تھا۔ بچرے کی قید سے بھی اور زندگی کی

قید سے بھی..... وہ کئی دن سے اپنے بچرے میں بے مدھ پڑا تھا۔ نہ کھانا کھانے پینے کے لیے اٹھتا تھا۔ پھر ایک روز اس کے گلے سے خور خور کی صدا نکلنے لگی تھی اور وہ صبح ہونے تک مر گیا تھا۔ محافظ کچھ دیر اسے لمبی چھڑیوں سے ٹوکے دیتے رہے تھے پھر بچرے سے نکال کر غلیظ فرش پر گھسیٹے ہوئے باہر لے گئے تھے..... مرنے والا ازبک تھا۔ عیش و عشرت کے ماحول میں آنکھیں کھولنے والا اور ناز و نعم میں پلنے والا رئیس زادہ..... وہ اس جان لیوا تاریکی میں بھلا کب تک زندگی کا بوجھ اٹھاتا..... وہ مر گیا تھا! ایک خوبو چرے کی جستجو میں اپنی زینت گنوا بیٹھا تھا اور اس سرد جہنم میں مرنے والا یہ کوئی پہلا قیدی نہیں تھا۔ ہر دوسرے تیسرے روز گوئی نہ کوئی نصیب کا مارا یونہی ”آزادی“ پا جاتا تھا۔ تاہاں کے ساتھ قید رہنے والے قریباً سبھی قیدی ایک ایک کر کے رخصت ہو چکے تھے۔ ایک وہی اب تک سینے پر سانسوں کے وار سہہ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کسی صبح وہ بھی اپنے بچرے میں بے حس و حرکت پایا جائے گا اور محافظ اسے طویل چھڑیوں سے ٹوکے دینے کے بعد اٹھا کر باہر لے جائیں گے۔ باہر..... جہاں زندگی اپنی تمام تر حرارت اور روشنی کے ساتھ موجود ہوگی لیکن وہ نہیں ہوگا۔

دفعتاً تاہاں کو اپنے خیالات سے چوٹنا پڑا قید خانے کا آہنی دروازہ کھلا اور اسے محافظوں کے ساتھ چند ایجنٹی افراد نظر آئے۔ وہ تعداد میں چار تھے اور انہوں نے ایرانی فوج کی وردیاں پہن رکھی تھیں۔ قید خانے میں پھیلے ہوئے شدید نقصان سے بچنے کے لیے انہوں نے اپنے منہ کپڑے سے ڈھک رکھے تھے۔ آہنی بچڑوں پر نظریں دوڑاتے ہوئے وہ تاہاں کے سامنے آ کرے۔ ایک شخص نے ناک سے کپڑا ہٹایا تو تاہاں اسے پہچان کر دنگ رہ گیا..... وہ سردار روہتاس تھا۔ کئی ماہ پہلے جب تاہاں افشاہہ کی اطلاع پر کورا کو پڑاؤ سے نکالنے گیا تھا تو روہتاس اور ہوشمند کو راستے میں ٹھل دے گیا تھا لیکن آج روہتاس کو دیکھ کر اسے یوں لگ رہا تھا کہ وہ اسی وقت سے اس کے تعاقب میں ہے۔ اسے کھو کر شب و روز اسے ڈھونڈتا رہا ہے اور آج اس تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ تاہاں کی حالت دیکھ کر روہتاس کی آنکھوں میں گہرا مسافہ ابھر آیا۔ یہی حالت ہوشمند کی ہوئی۔ وہ روہتاس کے پہلو میں کھڑا تھا۔ تاہاں اپنے قفس میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اسے آنکھوں پر بھروسہ نہیں ہو رہا تھا۔ روہتاس نے سخت لمبے میں بندی خانے کے محافظوں سے کوئی بات کہی۔ وہ جلدی جلدی اقرار میں سر ہلانے لگے۔ پھر چند محافظ ایک متحرک چوتروہ لے اندر داخل ہوئے۔ یہ چوتروہ قیدیوں کو بچڑوں سے نکالنے یا داخل کرنے کے لیے استعمال ہوتا

تھا۔ متحرک چوتروہ کی آمد کا مطلب تھا کہ تاہاں کو نکالا جا رہا ہے۔

کوئی ایک پہر بعد تاہاں ایک صاف ستھرا آرامت کمرے میں موجود تھا۔ اس کے بدن کو خوشبو لے نیم گرم پانی سے مل کر دھوا گیا تھا! آرام وہ ریشمی لباس پہنایا گیا تھا اور پھر اس پر حرارت گداز بستر پر پانچواں دیا گیا تھا۔ ہزار روہتاس اور ہوشمند اس کے ساتھ تھے۔ تاہاں نے سردار روہتاس سے کہا کہ وہ رات کی روشنی دیکھنا چاہتا ہے۔ سردار روہتاس نے کہا کہ یہ دن نہیں رات ہے..... ہاں وہ ستاروں کا منظر دیکھ سکتا ہے۔ اس نے پہلو میں واقع کھڑکی کا دھیر پردہ سرکا دیا۔ کچھ آسمان کا ایک ٹکڑا دکھائی دیا جس پر ستارے قدیوں کی طرح روشن تھے۔ اس آسمان کے نیچے ایک سرسبز قطعہ نظر آ رہا تھا۔ اس قطعے میں رنگین روشنیوں والے فوارے نئے اور خوبصورت روشیں تھیں۔ تاہاں کے لیے یہ مقام اجنبی نہیں تھا۔ دمشق کے معبد میں وہ ایسے خوشنما قطعے دیکھ چکا تھا۔ اس نے روہتاس سے وہ سوال پوچھا جو پچھلے کئی ماہ سے بچھو کی مانند اس کی سوچوں کو ڈس رہا تھا وہ سوال اس معبد کے بارے میں تھا۔ اس نے پوچھا۔

”سردار میں کس جگہ پر ہوں؟“

سردار بولا۔ ”یہ شیخ ابجل ہے۔“

”لیکن..... یہ معبد تو دمشق میں تھا۔“

”دمشق میں بھی تھا۔“ روہتاس نے ”جی“ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”جب دمشق کے معبد کو یونانی حملہ آوروں سے خطرہ پیدا ہوا تو اس معبد کی تعمیر کا آغاز کر دیا گیا تھا۔ اسے یحییٰ دمشق والے معبد کے نقشے پر بنایا گیا ہے۔ ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز کو ذہن میں رکھا گیا ہے۔“

”اس کی کیا ضرورت تھی؟“ تاہاں نے پوچھا۔

”بات ضرورت کی نہیں حکم کی تھی۔ معبد کے پجاریوں اور بیروکاروں کے لیے اپنے پیشواؤں کا حکم اٹل ہوتا ہے۔ جو بات پانچ مقدس ارواح کے ہوتوں سے نکلتی ہے وہ پتھر پر لکیر ہوتی ہے۔“

”پانچ مقدس ارواح؟“ تاہاں نے حیرانی سے کہا۔ ”میں تو ان کے بے جان جسموں کو پھانسی گھاٹ پر جھولتے دیکھ چکا ہوں۔“

”جسموں کی موت سے مقدس ارواح کب مرتیں؟“ وہ سیکٹکڑوں برس سے زندہ ہیں اور معلوم نہیں کب تک زندہ رہیں گی۔“

"کیا مطلب؟" تابان نے متحیر لہجے میں پوچھا۔

"مطلب یہ کہ 'مقدس ارواح' افراد کا نام نہیں یہ اس عقیدے کا نام ہے جو اس معبد کے پجاری صدیوں سے اپنانے ہوئے ہیں۔ مقدس روح کا روپ دھارنے والا کوئی شخص مر جائے تو اس کی جگہ دوسرا شخص لے لیتا ہے اور یہ سلسلہ یونہی چلتا رہتا ہے۔ لہذا مقدس ارواح اب بھی زندہ ہیں اور شاید مستقبل میں بھی زندہ رہیں گی۔"

ہوشمند نے کہا۔ "تو! کیا باتیں لے کر بیٹھ گئے ہو۔ یہ نہیں پوچھو گے ہم تم تک پہنچے کیسے؟"

تابان نے کہا۔ "ظاہر ہے یہ کوئی آسان کام نہیں رہا ہوگا۔ بہت بھاگ دوڑ کرنا پڑی ہو گی آپ کو۔"

"بھاگ دوڑ؟ ارے ہم تو ہوائی گھوڑے پر سوار رہے ہیں پچھلے آٹھ ماہ سے۔ غالباً ایک ایک چپہ دیکھ مارا ہے ہم نے ٹرائے سے یہاں تک۔"

ہوشمند اس روئیدار کو تفصیل سے بیان کرتا چاہتا تھا لیکن سردار روہتاس نے اسے روک دیا۔ تابان نے پوچھا۔ "یونانی فوج اب کہاں ہے۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ اور کورا کے بارے میں کچھ پتہ چلا ہے۔۔۔۔۔؟ جانتے ہو اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ان درندوں نے؟" آخری الفاظ کہتے کہتے تابان کا گلا رندہ گیا۔

روہتاس نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "سب معلوم ہو چکا ہے ہمیں سب معلوم ہو چکا ہے۔ تم خواہ مخواہ اپنے زخم مت کریو۔۔۔۔۔ اطمینان رکھو کورا کے قاتل عبرتاک انجام سے بچ نہیں سکیں گے۔ کورا کا بدلہ ہم سب پر قرض ہے اور یہ قرض چنگانے تک ہم اطمینان سے نہیں بیٹھیں گے۔ ہم ساری معلومات حاصل کر چکے ہیں۔ سردار شلال اس وقت سکندری فوج کے ساتھ 'صور' میں ہے۔ صور کو سکندری فوج نے محاصرے میں لے رکھا ہے اور وہاں زبردست جھڑپیں ہو رہی ہیں۔ اہل صور کی اعانت کے لیے کئی ایرانی دستے خشکی کے راستے صور میں داخل ہو چکے ہیں۔ میں بھی پانچ سو جانبازوں کے ایک ہتھے کے ساتھ جانے کے لیے تیار بیٹھا ہوں۔ مجھے صرف تمہاری فکر تھی۔ میں نے قسم کھا رکھی تھی کہ تمہاری صورت دیکھے بغیر کسی لڑائی میں حصہ نہیں لوں گا۔"

ہوشمند نے کہا۔ "آپ نے کچھ اور قسمیں بھی کھا رکھی تھیں ان کے بارے میں

جی بتا دیجئے۔" سردار روہتاس مطمئن انداز میں مسکراتے لگے۔ ہوشمند نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "جب سے تم گم ہوئے ہو غالباً۔۔۔۔۔ یہ بستر پر سوئے ہیں نہ پر تکلف کھانا کھایا ہے نہ عورت اور شراب کے قریب گئے ہیں۔ ہر طرح کی مسرت انہوں نے خود پر حرام کر رکھی تھی غالباً۔"

تابان حیرانی سے سردار روہتاس کی طرف دیکھنے لگے۔ پہلی بار تابان کو اندازہ ہوا کہ سردار روہتاس بہت کمزور اور خستہ حال نظر آ رہا ہے۔ اس کی فوجی وردی بھی بے حد خستہ اور پھٹی پرانی تھی۔

تابان نے کہا۔ "آپ نے یہ سب کیوں کیا سردار۔۔۔۔۔ مجھے تو لگ رہا ہے میری طرح آپ بھی یہ آٹھ ماہ کسی بندی خانے میں گزار کر آئے ہیں۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" سردار روہتاس مسکرایا۔ "لیکن اب اس بندی خانے کے بند در کھل چکے ہیں۔ اب تمہاری طرح ہم دونوں بھی آزاد ہیں۔ غنقریب ہماری آزادی ان لوگوں پر برق بن کر گرے گی جنہوں نے بے گناہ کورا کی آبرو اور جان لی ہے اور جو شہزادی مارشا کو تم سے دور رکھے ہوئے ہیں۔"

شہزادی مارشا کا نام سن کر تابان کے سینے میں ایک خشک لہری دوڑ گئی۔ "شہزادی کہاں ہے؟" بے اختیار اس کے ہونٹوں پر سوال آ گیا۔

سردار روہتاس نے کہا۔ "وہ سکندر کی تحویل میں ہے۔ اسے سخت پہرے میں رکھا جاتا ہے۔ کچھ اور باتوں کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ سکندر اس پر اکثر نوازشات کرتا رہتا ہے۔ ایک نوجوان بادشاہ کی ایک حسین و جمیل دوشیزہ پر نوازشات بے معنی نہیں ہیں۔ اگر ہم مارشا کو جلد اس ماحول سے نہ نکل نہ سکے تو حالات کچھ بھی ہو سکتے ہیں۔"

ہوشمند نے کہا۔ "ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم جلد از جلد صور پہنچ جائیں۔ صور ایک ایسا مضبوط قلعہ ہے جس نے بھی حملہ آوروں کے سامنے پر نہیں ڈالی۔ یونانی فوج کو بھی وہاں شدید ترین مزاحمت کا سامنا ہے۔ اگر اہل صور کو شہنشاہ دارا اور قبرص کے فرمانروا کی طرف سے مناسب کمک مل گئی تو سکندر کے دانت کھٹے ہو جائیں گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اسے شکست فاش ہی ہو جائے۔ اس وقت اہل صور کو افرادی قوت اور ہتھیاروں کی اشد ضرورت ہے۔ ایک ایک فرد اور ایک ایک ہتھیار قیمتی ہے۔"

تابان نے کہا۔ "اگر شہر محاصرے میں ہے تو ہم وہاں داخل کیسے ہوں گے؟"

روہتاس نے جواب دیا۔ "شہر کی ایک 'ہناب' خشکی سے ملی ہوئی ہے۔ اس

جی بتا دیجئے۔" سردار روہتاس مطمئن انداز میں مسکراتے لگے۔ ہوشمند نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "جب سے تم گم ہوئے ہو غالباً۔۔۔۔۔ یہ بستر پر سوئے ہیں نہ پر تکلف کھانا کھایا ہے نہ عورت اور شراب کے قریب گئے ہیں۔ ہر طرح کی مسرت انہوں نے خود پر حرام کر رکھی تھی غالباً۔"

تابان حیرانی سے سردار روہتاس کی طرف دیکھنے لگے۔ پہلی بار تابان کو اندازہ ہوا کہ سردار روہتاس بہت کمزور اور خستہ حال نظر آ رہا ہے۔ اس کی فوجی وردی بھی بے حد خستہ اور پھٹی پرانی تھی۔

تابان نے کہا۔ "آپ نے یہ سب کیوں کیا سردار۔۔۔۔۔ مجھے تو لگ رہا ہے میری طرح آپ بھی یہ آٹھ ماہ کسی بندی خانے میں گزار کر آئے ہیں۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" سردار روہتاس مسکرایا۔ "لیکن اب اس بندی خانے کے بند در کھل چکے ہیں۔ اب تمہاری طرح ہم دونوں بھی آزاد ہیں۔ غنقریب ہماری آزادی ان لوگوں پر برق بن کر گرے گی جنہوں نے بے گناہ کورا کی آبرو اور جان لی ہے اور جو شہزادی مارشا کو تم سے دور رکھے ہوئے ہیں۔"

شہزادی مارشا کا نام سن کر تابان کے سینے میں ایک خشک لہری دوڑ گئی۔ "شہزادی کہاں ہے؟" بے اختیار اس کے ہونٹوں پر سوال آ گیا۔

سردار روہتاس نے کہا۔ "وہ سکندر کی تحویل میں ہے۔ اسے سخت پہرے میں رکھا جاتا ہے۔ کچھ اور باتوں کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ سکندر اس پر اکثر نوازشات کرتا رہتا ہے۔ ایک نوجوان بادشاہ کی ایک حسین و جمیل دوشیزہ پر نوازشات بے معنی نہیں ہیں۔ اگر ہم مارشا کو جلد اس ماحول سے نہ نکل نہ سکے تو حالات کچھ بھی ہو سکتے ہیں۔"

ہوشمند نے کہا۔ "ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم جلد از جلد صور پہنچ جائیں۔ صور ایک ایسا مضبوط قلعہ ہے جس نے بھی حملہ آوروں کے سامنے پر نہیں ڈالی۔ یونانی فوج کو بھی وہاں شدید ترین مزاحمت کا سامنا ہے۔ اگر اہل صور کو شہنشاہ دارا اور قبرص کے فرمانروا کی طرف سے مناسب کمک مل گئی تو سکندر کے دانت کھٹے ہو جائیں گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اسے شکست فاش ہی ہو جائے۔ اس وقت اہل صور کو افرادی قوت اور ہتھیاروں کی اشد ضرورت ہے۔ ایک ایک فرد اور ایک ایک ہتھیار قیمتی ہے۔"

تابان نے کہا۔ "اگر شہر محاصرے میں ہے تو ہم وہاں داخل کیسے ہوں گے؟"

روہتاس نے جواب دیا۔ "شہر کی ایک 'ہناب' خشکی سے ملی ہوئی ہے۔ اس

Optimized by www.ImageOptimizer.net

طرف سے ہر طرح کی کمک و اہل شر کو پہنچ رہی ہے اور یہی بات محصورین کے حق میں جاتی ہے۔"

☆-----☆-----☆

ٹھیک چند روز بعد تابان اپنے محسن روہتاس اور دوست ہوشمند کے ساتھ صور میں موجود تھا۔ اہل صور کے حوصلے بلند تھے۔ شہریوں کے رویے سے اندازہ ہوتا تھا کہ انہیں اپنے دفاع پر مکمل بھروسہ ہے اور وہ یونانی فوج کے سامنے ہتھیار ڈالنے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ شہر میں نہ صرف روزمرہ کے معمولات جاری تھے بلکہ رات رات کی محفلوں اور دیگر تفریحات پر بھی کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ صور میں پہنچ کر سردار روہتاس نے پہلے تو تابان کی آزادی کا جشن منایا۔ نما دھو کر ریشمی لباس پہنا، شہر کی ایک مہنگی طعام گاہ میں پر تکلف کھانا کھایا اور رات بھر کے لیے شراب اور شباب میں ڈوب گیا۔ اس کے بعد وہ لوگ باقاعدہ سپاہ کے طور پر اپنا اندراج کرانے کے لیے چھانڈی چلے گئے۔ یہاں انہیں حسب قابلیت مختلف مراتب سوئپ دیئے گئے اور ہر سوئپ کارکنداروں کے ساتھ منسلک کر دیا گیا۔ تابان نے ان تمام مصروفیات کے دوران کسی جوش و خروش کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ایک عجیب طرح کی بے جسی اس پر طاری ہو چکی تھی۔ لگتا تھا اسے جنگ کے ہنگاموں سے کوئی سروکار ہے اور نہ اس بات میں دلچسپی کہ کون ہارتا ہے اور کون ہیتتا۔ اس کی آنکھوں میں جیسے گورا کی بربادی کا منظر ہم چکا تھا۔ اگلے روز سردار روہتاس اور ہوشمند اسے جنگ کی صورت حال دکھانے کے لیے فیصل پر لے گئے۔ فیصل کے گرد و نواح میں شور و محشر برپا تھا۔ تابان کو اپنے سامنے نشیب میں دور تک نظر آ رہا تھا۔ شمال میں حدنگاہ تک سمندر کا نیلیوں پانی تھا۔ اس پانی کو مشرق میں شام اور لبنان کے طویل ساحلوں نے روک رکھا تھا۔ فیصل کی بلندی سے صور کی دونوں بندرگاہیں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ جنوبی بندرگاہ کو مصری بندرگاہ کہا جاتا تھا، یہ تنگ سی کھاڑی تھی جسے اہل صور نے شہیروں سے بند کر دیا تھا جو بندرگاہ شمال کی طرف تھی اسے صید الی بندرگاہ کہتے تھے۔ یہ نسبتاً وسیع تھی اور اسے بند کرنے کے لیے وہاں جنگی کشتیاں لنگر انداز کر دی گئی تھیں۔ تابان کو وہ پتھریلا راستہ بھی نظر آیا جو اخبارہ فٹ گمرے سمندر میں آگے بڑھتا فیصل سے قریباً سو گز دوری پر پہنچ چکا تھا۔ راستے کے آخری سرے پر بلند دیوار برج تعمیر کر دیئے گئے تھے اور وہاں سے فیصل پر مسلسل تیر اندازی ہو رہی تھی۔ روہتاس، تابان اور ہوشمند دوسرے تک فیصل پر موجود رہے، جب وہ چھانڈی واپس جانے کی تاری کر رہے تھے، اتفاقاً

پتھر پیلے راستے کے ارد گرد ہونے والی جھڑیوں میں شدت آگئی۔ تاجبان نے دیکھا کہ ہند رگاہ میں ایک بڑی کشتی نمودار ہوئی۔ کشتی کے عقبی حصے میں بہت زیادہ ہوجھ رہا ہوا تھا جس کی وجہ سے اگلا حصہ اوپر کو اٹھ گیا تھا۔ اگلے حصے میں ہاتھ مستول بھی تھے جن کے ساتھ بڑی بڑی دیکیں لگ رہی تھیں۔ مستولوں کے نیچے خنک اپنڈھن کے گھٹھے بندھے ہوئے تھے۔ دور سے دیکھنے پر بھی اندازہ ہو جاتا تھا کہ ان شخصوں پر جنوب تارکول مل دیا گیا ہے۔ کشتی کے ملاح متوافق ہوا سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بڑی تیزی سے کشتی کو چلی بڑھوں کے پاس لے آئے اس سے پیشتر کہ یونانی سپاہی دفاعی کارروائی کرتے انہوں نے کشتی کو بڑھوں سے لگا دیا اور اس کے اگلے حصے میں چلتی ہوئی شعلیں پھینک کر پانی میں کود گئے۔ یونانیوں کے تعمیر کردہ بڑھوں میں یکبارگی آگ بھڑک اٹھی۔ کشتی کے عرشے کو بھی آگ لگ گئی۔ سامنے کے مستول گر کر بڑھوں سے ٹکرائے۔ مستولوں سے بندھی ہوئی دیکیں الٹ گئیں۔ ان دیگوں میں گندھک، تارکول اور تیل وغیرہ ابرار کیا تھا۔ یہ آتش گیر مادے نکل کر آگ میں گرے تو جیسے آتش فشاں پھٹ پڑا۔ چلی بڑھوں سمیت ارد گرد کی ہر چیز شعلوں اور دھوئیں میں چھپ گئی۔ فیصل پر سے یہ منظر دیکھ کر صور کے سپاہیوں نے فاتحانہ غرے بلند کئے..... تھوڑی دیر بعد جب آگ اور دھوئیں کے باہل چھٹے تو یونانی فوج کے تعمیر کردہ برج ٹائید ہو چکے تھے۔

ہوئے کہا۔ ”دیکھا تم نے..... صور کے جنگبویو میمنہ میماحت کرتے رہے تو سکندر کو بھاگنے کے لیے راستہ نہیں ملے گا۔“

تابان کا چروہ دستور ہے ماثرقا۔ اس نے کملہ "میرا خیال آپ سے مختلف ہے۔ میں نے سکندر کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ وہ بہت دور جانے کا عزم رکھتا ہے اور جنوں نے دور جانا ہوا ان کے ارادے بہت پختہ ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس کے شیر جلد ہی شہر کو تخریب کرنے کا کوئی نہ کوئی راستہ ڈھونڈ لیں گے۔"

اس کا وقار اور جھوم؟

تہاں افسردگی سے بولا۔ ”آپ مجھے کسی کا وفادار بھی مت سمجھیں۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں جنگ و جدل سے میرا دل بھر گیا ہے۔ کسی وقت مجھے لگتا ہے کہ اب میری تلوار

کبھی کسی کے حق میں نہ اٹھ سکے گی۔"

"مارشا اور کورا کے حق میں بھی نہیں؟" سردار روہتاس نے پوچھا۔
"وہ لڑائی نہیں۔ وہ تو ایک قرض ہے جو میں نے چکانا ہے اور شاید اسی کے لیے میں زندہ بھی ہوں۔"

روہتاس کچھ دیر اسے گہری نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر اس کے شانے جھنجھوڑ کر بولا۔ "تابان! تم موت کے منہ سے بچ آئے ہو۔ اب زندگی کی طرف لوٹو! زندگی کی طرف دیکھو۔۔۔۔۔۔ وہ دیکھو وہ ہے زندگی۔ تھرکتے شباب کے اس شہستان میں نیند گوانے کا نام زندگی ہے۔۔۔۔۔۔ آؤ! میں تمہیں زندگی دکھاؤں۔۔۔۔۔۔"

تابان نے دیکھا فیصل کے نیچے شہر کی فوج کے مخمور سپاہیوں کے گھیرے میں ایک لبنانی رقصہ لہک لہک کر گاری تھی۔

سردار روہتاس تابان کو فیصل سے نیچے لایا اور لبنانی رقصہ کا رقص دکھانے لگا۔ یہ ایک خوبصورت خانہ بدوش لڑکی تھی۔ اس کا جسم مچل رہا تھا اور سینکڑوں جلتی نگاہیں اس پر مرکوز تھیں۔ وہ ایک دلکش لبنانی گیت گاری تھی۔ گیت کے بول کچھ یوں تھے۔
اے پیار کرنے والے ہوشیار

وقت کی مخمور ہوا

تجھے لوریاں دے کر ملانہ دے

تیرے دل میں انتظار کا دیا بھانہ دے

کسیں ایسا نہ ہو کہ کسی بہانے

تیری بے کلی کو چین آجائے

تیری تنہا کسی کھلونے سے بھل جائے

میں قسم کھاتی ہوں ہماروں کی

اور زوئے زمین کے سب خوبصورت نظاروں کی

اور ہر اس چیز کی جس کی دید

جھٹکے سینوں میں ٹھنڈک اتارتی ہے

۔۔۔ جس آنکھ میں انتظار مارتا نہیں

اس آنکھ میں محبوب اترتا ہے

اس آنکھ میں محبوب اترتا ہے

رقاصہ کی دلنشین آواز نے تابان کے دل میں یاسیت بھری۔ وہ کوئی نظروں سے رقص کا منظر دیکھتا رہا۔ وہ جانتا تھا یہ حسین و جمیل رقصہ اس کی دسترس میں ہے۔ وہ رقصہ کی ہلکا سا اشارہ بھی دے تو سردار روہتاس منہ ماگی قیمت چکا کر اس رقصہ کو تابان کی خلوت میں پہنچا دے گا لیکن تابان کے دل میں ایسی خواہش کا گزرتا تھا۔ نہیں تھا۔ وہ تو رقصہ کے پڑوسزیت میں کھویا ہوا تھا۔ اس کی نگاہوں میں مارشا کی صورت گھوم رہی تھی۔ کورا کی موت ایک ایسے تند طوفان کی طرح تھی جس نے گرد و پیش کا ہر خوبصورت منظر گرد و غبار میں چھپا لیا تھا۔ پیچھے آٹھ دس ماہ میں یہ نہ ہلکا گرد و غبار مارشا کی یادوں پر بھی چھایا رہا تھا۔ وہ مارشا کو بھولا نہیں تھا لیکن جیسے شعلوں میں انگارے چھپ جاتے ہیں، مارشا کی یاد بھی کورا کے خیال میں چھپی ہوئی تھی۔

رقص ختم ہوا تو خانہ بدوش رقصہ اپنی سیلیوں کے ساتھ مل کر انگوٹھیاں فروخت کرنے لگی۔ ان انگوٹھیوں میں ایک ہی طرح کا نارنجی پتھر جڑا ہوا تھا۔ رقصہ کا دعویٰ تھا کہ یہ انگوٹھی پہننے والے کے دل میں اپنے محبوب کی یاد کا دیا سدا روشن رہے گا۔ پتھر کا نارنجی رنگ بھی اس وقت تک برقرار رہے گا جب تک انگوٹھی پہننے والے کو اپنے محبوب کا وصل نصیب نہیں ہو جاتا۔ سپاہی بڑے شوق سے یہ انگوٹھیاں خرید رہے تھے۔ تابان کی خواہش کا اندازہ کرتے ہوئے ہوشمند نے ایک انگوٹھی خرید کر تابان کی انگلی میں بھی پہنا دی۔ تابان عجیب محویت سے انگوٹھی کو دیکھنے لگا۔

سردار روہتاس بولا۔ "سایوں کے پیچھے مت بھاگو تابان۔ سائے محرومی کے سوا اور کچھ نہیں دیتے۔ ان انگوٹھیوں میں کیا رکھا ہے۔ زندگی پتھروں میں نہیں نرم و نازک سوچوں اور گداز جسموں میں ملتی ہے۔"

قریب کھڑا ایک اوجڑ عمر سپاہی بولا۔ "سردار! اس انگوٹھی کو معمولی نہ سمجھو۔ اس میں جڑا پتھر اس علاقے کا نایاب تحفہ ہے۔ یہ پتھر سونق الفت کے اس مشہور محل سے لایا گیا ہے جہاں ایک گنام شاعر کا روتا ہوا مجسمہ ان گنت زمانوں سے ایستادہ ہے۔"

"کون تھا وہ شاعر؟" ہوشمند نے پوچھا۔

"ایک عاشق تھا۔ اسے حبشہ کے ایک کماندار محب تابش کی بیٹی روبینہ سے عشق ہو گیا تھا۔ کماؤ کے مطابق وہ اپنی حلی کی چھت پر کھڑا ہر وقت محبوبہ کے بھرو کے کی طرف دیکھتا رہتا تھا۔ کچھ عرصہ بعد روبینہ نے بھی شاعر میں دلچسپی لیتا شروع کر دی۔ وہ کوئی ایسا نامور شاعر نہیں تھا لیکن محبت کی شدت نے اس شعروں کو حدت و سحر

دی۔ اس کا کام اہل حیض اور جافہ کے دلوں میں آتش بھڑکانے کا لیکن اس آتش نوا سے اس کی محبوبہ نے کوئی خاص اثر قبول نہیں کیا۔ شاعر حساس دل کا مالک تھا۔ وہ چاہتا تھا محبوبہ اس کی محبت کا جواب محبت سے دے۔ اس کی تمنا تھی کہ راہ الفت پر پیش قدمی بیکطرفہ نہ ہو۔ کہتے ہیں کہ اس نے اپنی حویلی کے باغ میں کپاس کا ایک پودا لگایا۔ پھر شب و روز اسے اپنے آنسوؤں سے سیرھا۔ جب آنسوؤں سے سیتی ہوئی کپاس تیار ہو گئی تو اس نے چاندنی راتوں میں بیٹھ کر اسے اپنے ہاتھوں سے کاٹا اور ایک کپڑے کی شکل دی۔ تب اس نے اپنے خون کو منگ ناف میں ملا کر ایک روشنائی تیار کی اور کپڑے کے ٹکڑے پر ایک محبت نامہ لکھ کر اپنی محبوبہ تک پہنچایا۔ اس کے بعد وہ اس انتظار میں بیٹھ گیا کہ محبوبہ محبت نامے کا جواب دے گی لیکن وہ ایک عورت تھی۔ رنگبست اس کی فطرت تھی۔ ”چاہئے“ کی بجائے وہ ”چاہے جانے“ کی خواہش رکھتی تھی۔ وہ اپنی جگہ مجبور تھی اور شاعر اپنی جگہ لاجور۔ یوں ان کی ”پیار کمانی“ نے عجیب و غریب رخ اختیار کر لیا۔ دنیا بھر کی ”پیار کمانیوں“ میں چاہنے والوں کے راستے میں زمانہ دیوار بنتا ہے لیکن اس کمانی میں چاہنے والے خود ہی اپنے راستے کی دیوار بن گئے۔ ان کے پیار کا دشمن کوئی نہیں تھا۔ ان کا ملاپ عین ممکن تھا لیکن انہوں نے اتنا کے بت کو اپنے پیار کا دشمن بنالیا۔ وہ شب و روز ایک دوسرے کے سامنے کھڑے رہے۔ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ ایک دوسرے کی پیش رفت کا انتظار کرتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ مہلت ختم ہو گئی جو قدرت کی طرف سے پیار کرنے والوں کو عطا ہوتی ہے۔ ایک رات دونوں نے ایک ہی خواب دیکھا۔ ایک منادی کرنے والے نے ان سے کہا: کل کا سورج تمہارے سروں پر چمکنے والا آخری سورج ہو گا۔ اگر اس سورج کی حدت میں تمہارے پتھر پیلے قدم موم ہو گئے تو بجا ورنہ بیش بیش کے لیے دریاں تمہارا مقدر ٹھہریں گی۔ اگلے روز سورج دیو کا رکھ اپنی سرخی گزر گاؤں پر گامزن ہوا تو وہ دونوں دیکھ رہے تھے۔ وہ دونوں اس پل پہل کر رتے وقت کو تمام کیا چاہتے تھے۔ اپنے ارادوں میں کچھ چلک پیدا کر لینا چاہتے تھے لیکن فیصلے کے بائیں قریب پہنچ کر وہ تذبذب کا شکار ہو گئے۔ اس دوران سورج دیو تاکے رکھنے اپنا سفر مکمل کر لیا۔ اچانک نیلگوں آسمان تاریکی میں چھپ گیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک طوفان بلائیز نمودار ہوا۔ ایک تند ہوا چلی اور روینہ کو اپنے دوش پر سوار کر کے ماعلوم فاسلوں پر لے گئی۔ ایک تاریک بادل سے صاعقہ لگی اور شاعر کو اس کے مقام پر پتھر کر گئی۔ وہ پتھر آج بھی سوئی الفت کے قریب ایک دیوانہ حویلی کی چھت پر موجود ہے اور دیکھنے

والوں کو ایک برباد محبت کی کمانی سنا ہے۔ شاعر کا وہ مجسمہ ایک عجیب و غریب چہرے پر کھڑا ہے۔ یہ گلینہ جو تم اپنی انگوٹھی میں دیکھ رہے ہو اسی چہرے کا ایک ٹکڑا ہے۔ اس ٹکڑے کو معمولی مت سمجھو۔ یہ حقیقت ہے کہ اسے پسینے والے کے دل میں اپنے محبوب کی یاد ایک نہ ختم ہونے والا خوشبو کی طرح سلگتی رہتی ہے۔

ادھیڑ عمر لبنانی سپاہی کے ساتھ بائیں کرتے کرتے وہ چھاؤنی کے قریب پہنچ چکے تھے۔ لبنانی کی باتیں سننے کے بعد وہ اس معمولی انگوٹھی کو نہایت غور و خوض سے دیکھنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اچانک انہیں بے پناہ ثر و غل سنائی دیا۔ چھاؤنی کے اداڑے میں سپاہی فلک و کاف غرے لگا رہے تھے اور تلواریں لہرا لہرا کر اپنے غیض و غضب کا اظہار کر رہے تھے۔ بہت سے چرے ایسے بھی نے جن پر جوش و خروش کی بجائے مردنی چھائی ہوئی تھی۔ تہاں وغیرہ کو اندازہ ہوا کہ کئی اہم واقعہ رونما ہو چکا ہے۔ وہ تیر قدموں سے چلتے چھاؤنی میں پہنچے۔ انہیں یہ خبر ملی کہ قبرص کی حکومت جس سے اہل سور کو بہت سی امیدیں تھیں، سکندر کی طرفدار ہو گئی ہے اور ایک سو بیس بحری جہازوں پر مشتمل قبرص کا عظیم الشان بحری بیڑا سکندر کی حمایت میں صیدا پہنچ گیا ہے۔ یہ ایک زبردست سیاسی کردار تھی۔ اب اہل سور بجا طور پر یہ اندیشہ کر سکتے تھے کہ علاقے کی دیگر طاقتیں بھی ان کی حمایت سے ہاتھ اٹھالیں گی۔

☆-----☆-----☆

صور کے ناقابل شکست دفاع کو زونے کے لیے سکندر نے زبردست حکمت عملی اور تندی سے کام لیا۔ روزِ رز اور جوئیل سے جہاز سازی کے ماہر بلائے گئے اور انہوں نے قبرصی جہازوں پر دیو بیکل بمبیتھیں نصب کر دیں۔ بڑے بڑے جہازوں پر دفاعی برج تعمیر کر دیئے گئے۔ ”کرین“ کے وہ افران نہیں بحری جنگوں کا وسیع تجربہ تھا مقدونیہ کے ہنرمندوں کو جنگی جہازوں پر بمبیتھیں اور دیگر اسلحہ استعمال کرنے کی تربیت دینے لگے۔ مختصر عرصے میں متحدہ یونانی فوج نے محض جنگی جہاز تیار نہ کر لیے بلکہ ایسی بحری فوج منظم کر لی جو محاصرے کے سامان، رسد کے ہاغات اور بمبیتھوں سے لیس تھی۔ اور پھر 332 ق م کے موسم گرما کا وہ قیامت خیز دن طلوع ہوا جب اہل سور نے اپنی مضبوط فصیلوں کے اوپر سے ایک دم بخود کرنے والا منظر دیکھا۔ ان کے ناقابل شکست حصار کو زیر و زبر کرنے کے لیے ایک زبردست بحری فوج فصیل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ یونانیوں کے تعمیر کردہ راستے کے دونوں طرف دور تک جنگی جہازوں کی قطاریں نظر آ رہی تھیں۔ ایک

صور کی ناقابلِ شکست فہیل بندرگاہ کی جانب سے اچانک گرجی۔ اس شگاف میں سے سینکڑوں یونانی سپاہی فلک شگاف نعرے بلند کرتے ہوئے اندر گھس آئے۔ ان کی تتواروں میں بجلی اور آنکھوں میں شعلے ترپ رہے تھے۔ اہل صور کی طرف سے انہیں کئی ماہ تک جان لیوا مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ بے شمار جانی و مالی نقصان کے باوجود یہ حصار توڑنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اب وہ سراپا وحشت و انتقام تھے۔ ان کا انداز گواہی دے رہا تھا کہ آج وہ صور کے باشندوں کو قتل و غارتگری کر کے رکھ دیں گے۔ تھوڑی سی دیر بعد ایک دوسرے مقام سے بھی فہیل ٹوٹ گئی۔ ان دونوں مقامات سے شعلہ فشاں یونانیوں کا ایک سیل رواں شرم میں داخل ہونے لگا۔ صور کے ہراول دستے ابھی تک اپنی طاقت کے گھمنڈ میں تھے۔ انہوں نے شدید مزاحمت کی۔ کئی مقامات پر زبردست دن پڑا۔ محوں میں کشکوں کے پستے لگ گئے۔ لیکن جلد ہی یونانی فوج کا دباؤ بڑھتا چلا گیا۔ ہر طرف ہتھیاروں کی جھکاڑ تھی۔ زمینوں کی چٹخ و پکار تھی اور جو شیلے سپاہیوں کے نعرے تھے۔ اس ہنگامہ محشر میں تابان جنگجو دستوں کے درمیان سے راستہ بناتا ایک طرف بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اس کی بے قرار نگاہوں کو کسی کی تلاش تھی۔ اس کے ہاتھ میں چمکتی تتوار کسی کے خون کی طلب میں ہانپ رہی تھی۔ وہ کہاں تھا؟ وہ کہاں تھا جس نے کورا کو اذیت تاک موت سے دوچار کیا تھا؟ جس نے اپنے انجام سے بے پرواہ ہو کر ایک کمزور عورت پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے تھے۔ گاہے گاہے یونانیوں سے تابان کا تصادم بھی ہو رہا تھا۔ وہ کسی سے پہلو بچا کر اور کسی سے ٹکرا کر آگے بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ اس کے سر پر اپنی خود تھا۔ کوئی اسے پہچان نہیں سکتا تھا۔ یہ جان نہیں سکتا تھا کہ مقدونی فوج کا خطرناک ترین جنگجو آج ایک اہم مقدونی سردار کو ختم کرنے کی مہم پر نکلا ہے۔ سکندر کے ترکش کا ایک کارگر تیر آج اسی کے ایک معتد سردار کی طرف محو پرواز تھا۔ تابان مار دھاڑ کرتا ہوا اب کافی آگے نکل آیا تھا۔ آخر اسے سردار شمال نظر آ گیا۔ وہ پیادہ تھا۔ تابان نے اسے اس کے دو سنہری پروں والے مخصوص خود سے پہچانا۔ وہ ان خاص محافظوں میں شامل تھا جو سالار اعظم سکندر کو چاروں طرف سے اپنے نرنے میں لئے ہوئے تھے۔ وہ سر تپا لوہے میں غرق تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک مضبوط کمان تھی۔ وہ بڑی تیزی سے مخالف سپاہیوں پر تیر چلا رہا تھا۔ تیر اندازی کے دوران وہ گاہے گاہے اپنی کمان بلند کرتا اور ایک فلک شگاف نعرہ لگاتا۔ اس کی آواز کسی جینے کی طرح کڑھت اور بھاری تھی۔ اس کا سراپا دیکھ کر تابان کے سینے میں آتش فشاں کے دھماکے ہونے لگے۔ اسے لگا اگر وہ سردار شمال پر

بھٹ نہ پڑا تو اس کا جسم پھٹ جائے گا۔ سینکڑوں کھنڈوں میں بٹ جائے گا پھر غضب کی شدت اسے بھاپ بنا کر اڑا دے گی۔ اس کے وجود کا ہر گ و ریشہ تن گیلہ ہر ذرے میں وہ اذیت سمٹ آئی جو کورا نے ان دیران جنگل میں اس بند گھوڑا گاڑی میں برداشت کی تھی۔ وہ دیوانہ وار سردار شمال کی طرف بڑھلا سردار شمال اور اس کے درمیان درمنوں آہن پوش چونکا ہو گئے۔ ان کی تتواریں تابان کو روکنے کے لیے انھیں لیکن وہ رکنے کے لیے نہیں بڑھا تھا۔ اس کا رکتا حلق ہی نہیں تھا۔ شاید وہ مر بھی جاتا تو اس کی لاش اپنے پاؤں پر چل کر شمال تک پہنچ جاتی۔ اس کے راستے میں آنے والے یونانی سپاہی و جنگی ہونی زونی کی طرح ہوا میں اڑے۔ کوئی دایمیں طرف گرا کوئی بائیں طرف۔ کوئی عضو بدن سے محروم ہوا کوئی روح بدن سے۔ یوں لگا ایک خوفی کبریٰ یونانی دستے کے درمیان لپک گئی ہے۔ تابان نے پندرہ بیس گز کا فاصلہ طے کر لیا تو جیت میں ڈوبے ہوئے محافظ بیسے ہوش میں آئے۔ وہ تتواریں سن کر تابان کے مقابل ہوئے۔ وہ تتاریاں کو روکنا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کوئی سربراہ جنگجو ان کے سالار اعظم تک پہنچنا چاہتا ہے۔ وہ اپنی پوری ہمت سے تابان کے سامنے اُت گئے لیکن انہیں معلوم نہیں تھا کہ وہ اس تتوار کے مقابل آنے کی غلطی کر رہے ہیں جو اپنی کٹ میں بے مثال اور برتری میں تسلیم شدہ ہے۔ چند ہی لمحوں میں تابان نے کئی لاشیں بچھا دیں اور دیوانہ وار چیتخت ہوا سردار شمال کی طرف بڑھلا۔ شمال کی چھٹی جس جیسے اسے موت کی آمد سے آگاہ کر چکی تھی۔ اس نے دہشت زدہ نگاہوں سے اپنی طرف لپکتے ہوئے تابان کو دیکھا اور یہ جانے بغیر کہ وہ کون ہے اور کیوں اس کی طرف آ رہا ہے رخ پھیر کر بھاگ گیا۔ یہ ایک حیران کن منظر تھا۔ مقدونی فوج کا ایک جری جنگجو رہا آہن میں غرق اور اپنے ساتھیوں میں گھرا ہوا ایک تما شخص سے خوفزدہ ہو کر بھاگ اٹھا تھا۔ معلوم نہیں اس نے فرشتہ اہل کے پروں کی پوز پوزا ہٹ سنی تھی یا تابان کی آمد کا منظر ہی ایسا ہیبت ناک تھا کہ وہ اپنے اعصاب پر قابو نہیں رکھ سکا تھا۔ وہ بھاگا تو تابان اسے اس کا فاصلہ دس قدم سے زائد نہیں تھا۔ ان لمحات میں تابان کو یوں محسوس ہوا کہ اس میدان جنگ میں سردار شمال کے سوا کوئی ذی روح باقی نہیں رہا۔ ارد گرد کا ہر منظر ان کی نگاہ میں دھندلا چکا تھا۔ بس شمال تھا اور وہ دس قدم کا دور مینی فاصلہ تھا۔ اسے لگا کہ اس کے دایمیں طرف چار پانچ قدم کے فاصلے پر سکندر کھڑا ہے۔ پھر اسے یہ پتہ بھی چلا کہ سکندر کا تتوار وہاں ہاتھ بلند ہوا ہے۔ اس نے سکندر کی تتوار اپنے سر سے ٹکرائے اور اپنے آہنی خود کے کرنے کی آوازیں سنیں لیکن اس

کی رفتار میں کوئی کمی واقع ہوئی اور نہ اس کی نگاہوں نے اپنا مرکز تبدیل کیا۔ وہ بلائے ناگہانی کی طرح شلال کی طرف لپک رہا تھا۔ اس کے پیچھے آوازوں کا جھوم تھا، نیزوں کی سنسانہت تھی اور قریب آتے قدموں کی گونج لیکن وہ بھانکتا چلا گیا..... فکار اور شکاری کے درمیان فاصلہ ختم ہو گیا۔ شلال کو "موت" سے دو رکھنے والے "دس قدم" طے ہو گئے۔

"رک جاؤ..... رک جاؤ۔" ایک توانا بازو تاجان کے گلے میں محاسل تھا اور ایک آواز اس پر چلا رہی تھی۔ وہ جانتا تھا یہ بازو سالار اعظم سکندر کا ہے اور یہ پات دار آواز بھی اسی کی ہے۔ وہ اسے روک رہا تھا۔ جیتیت متحدہ یونان کا سالار اعظم اسے روک رہا تھا لیکن تاجان رکنے اور ٹھہرنے کی حد سے گزر چکا تھا۔ اس نے ایک وحشیانہ ہست کے ساتھ شلال پر یلغار کی۔ اس کی وزنی تلوار شلال کی زرد توڑتی ہوئی کمر میں پیوست ہوئی اور ٹانف کی طرف سے باہر نکل آئی۔ سردار شلال ایک ہیبت ناک چیخ کے ساتھ اوندھے منہ گرا اور ترسپنے لگا۔ تاجان نے تلوار کھینچی تو وہ ایک جھٹکے سے سیدھا ہو گیا۔ اس کی آنکھیں تاجان پر ٹھیں اور ہڈیوں میں دنیا جہان کا خوف سمٹا ہوا تھا۔ تاجان نے دوسرا وار ان آنکھوں پر ہی کیا اور خون آلود تلوار اس موذی کے کاسے سر میں ارحسا دی..... اس وقت تک درجنوں آہنی بازو تاجان کو اپنی گرفت میں لے چکے تھے۔ ان میں دو بازو سالار اعظم سکندر کے بھی تھے۔

☆-----☆

صور فتح ہو چکا تھا۔ آٹھ ہزار شہری مارے جا چکے تھے۔ قریباً تین ہزار قید ہوئے تھے جن میں زیادہ تعداد عورتوں اور بچوں کی تھی۔ شہر کے کئی بازاروں کو نذر آتش کر دیا گیا۔ گھروں کو تاراج کر دیا گیا اور نوجوان عورتوں کو فتح کے نشے میں پور یونانی سپاہی اٹھا کر لے گئے۔ سکندر اور اس کے ساتھیوں نے ہر قتل کے مندر میں قربانی کی رسم ادا کی اور فتح کا جشن منایا۔ اسی روز تاجان کو "سکندر اعظم" کی طہی پر اس کے خیمے میں پیش کیا گیا۔ تاجان کی حیثیت ایک قیدی کی تھی۔ شاہی خیمے میں داخل ہوتے ہوئے تاجان کو اپنے انجام کے بارے میں کسی طرح کی خوش فہمی نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا وہ ایک غضب ناک دشمن کے خیمے میں قدم رکھ رہا ہے..... اس دشمنی کی ابتدا اسی گھڑی ہو گئی تھی جب سکندر نے تاجان اور کورا کے جانی دشمن شلال کو آزاد کیا تھا۔ نہ صرف اسے آزاد کیا تھا بلکہ ایک اعلیٰ منصب بھی بخشا تھا۔ پھر یہ جانتے ہوئے بھی کہ شہزادی مارشا تاجان کے جسم

میں جان کی طرح بسی ہوئی ہے۔ سکندر نے اس کی شادی اپنے منظور نظر فرال روز سے طے کرادی تھی۔ بعد میں جب قتل ہو تو اس کا الزام بھی تاجان پر لگایا گیا اور سکندر کے ہرکارے ابھی تک اسے ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ امیر شہزادی مارشا پر سکندر کی نوازشات کی خبر بھی تاجان تک پہنچی تھی اور اب جو رقی سہی کسرتھی وہ شلال کے قتل نے پوری کر دی تھی۔ سکندر براعظم اس قتل کا چشم دید گواہ تھا۔ اتنے ڈھیرے سارے حقائق کی موجودگی میں کوئی وجہ نہیں تھی کہ تاجان اپنے انجام کے بارے میں کسی خوش فہمی کا شکار ہو گا۔

خیمے میں داخل ہوتے ہی تاجان کو حیرت کا پہلا شدید جھٹکا لگا۔ اسے اندر لانے والے تلوار بردار محافظ اسے سکندر کے روبرو پھوڑ کر باہر چلے گئے۔ یہ قطعی غیر متوقع بات تھی۔ تاجان اور سکندر اب بچے میں تھاتھے۔ سکندر اس کے ساتھ نرمی سے پیش آیا اور بیٹھنے کے لیے اپنے قریب جگہ دی۔ کل وہ اپنی آنکھوں سے شلال کے قتل کا دردناک منظر دیکھ چکا تھا اس کے باوجود یہ سلوک حیران کن تھا۔ سکندر نے قتل کے واقعے کو زیر بحث لانے کی بجائے پوچھا۔

"تم اب تک کہاں تھے تاجان..... ہمیں امید نہیں تھی کہ تم یوں ہم سے بھاگے پھرو گے۔ حالات کیسے بھی نکلیں تھے، تمہیں ہم پر اعتماد کرنا چاہیے تھا۔ ہمارے سامنے اپنی صفائی پیش کرنی چاہیے تھی....."

تاجان نے نگاہ اٹھا کر سکندر کی طرف دیکھا۔ سنہری بالوں والے سر کو حسب عادت ایک طرف جھکائے ہوئے وہ قدرے مغموم نظروں سے تاجان کو دیکھ رہا تھا۔ تاجان نے ایک گہری سانس بھر کر کہا۔

"سالار اعظم! آپ کے چکو سردار میرے اور آپ کے راستے میں دیوار بن چکے تھے۔ انہوں نے آپ تک پہنچنے کی میری کوئی کوشش کامیاب نہیں ہونے دی۔ میں کئی مرتبہ آپ کے ملاقاتیوں کی قطار میں بیٹھ کر مایوس واپس لوٹ چکا ہوں۔"

"لیکن ہم سے ملاقات نہ ہونے کا مطلب یہ تو نہیں تھا کہ تم سردار فرال روز اور سردار شلال کو موت کے گھاٹ اڑ دیتے؟"

"میں نے فرال روز کو قتل نہیں کیا سالار اعظم۔ اور یہ بات اتنی ہی سچ ہے جتنی یہ کہ آج سورج مشرق سے نکل کر مغرب میں غروب ہوا ہے..... لیکن بے حد معذرت کے ساتھ میں ایک سوال آپ سے بھی پوچھنا چاہتا ہوں سالار اعظم! آپ نے یہ جانتے

”کون بے گناہ؟“ سکندر نے پوچھا۔

تابان کے چہرے پر غم و اندوہ کی پرجھپٹیاں لرا گئیں۔ وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے بولا۔
”صد افسوس کہ ہر مرحلے پر آپ سے حقائق چھپائے گئے۔ کورا کو سردار شال نے
قتل کر دیا ہے سالار اعظم۔ اسے ایک سازش کے تحت پہلے آپ کی حفاظت سے نکالا گیا
پھر پکڑا گیا اور ویران جنگل میں لے جا کر تاراج کر دیا گیا۔ اپنے ایک زخم کے بدلے
شال نے اس بد قسمت کو اذیت ناک موت مار دیا سالار اعظم۔“ تابان کا گلا رندھ
گیا اور آنکھوں میں آنسو چپکنے لگے۔

سکندر نے حیرت سے کہا۔ ”کیا تمہیں یقین ہے کہ سردار شال نے ایسا کیا ہے؟“
”موصوفہ یقین ہے سالار اعظم۔ یونانی فوج کا ایک اڈیٹر عمر سپاہی ان تمام واقعات کا
چشم دید گواہ تھا۔ افسوس وہ زخموں کی تاب نہ لا کر جاں بحق ہو گیا۔“ تابان نے شال کے
ساتھ ساتھیوں کے ہاتھوں زخمی ہونے والے باخیر سپاہی کی تمام روئیداد تفصیل کے ساتھ
سکندر کو سنائی۔ سکندر خاموشی سے سنتا رہا۔ اس کے چہرے پر اندرونی کرب کے آثار
تھے۔ آخر میں تابان نے آبدیدہ لہجے میں کہا۔ ”سالار اعظم! میرے ساتھ یہ سب کچھ اس
لے ہوا کہ میں آپ کی غنایات کے قابل نہیں تھا۔ آپ کی مہربانیوں کی بارش میرے
چہرے سے غلای کی کالک نہ دھو سکی۔ فوج کے سرداروں نے مجھے ہوش غلام سمجھا اور وہی
برتاؤ کیا جو غلاموں سے کیا جاتا ہے۔ میں سخت شرمندہ ہوں کہ میری کم نصیب ذات آپ
کے لیے پریشانیوں اور الجھنوں کا باعث بنی۔ آج میں ایک قاتل کی حیثیت سے آپ
کے سامنے موجود ہوں، مجھ سے کوئی رعایت نہ کیجئے سالار اعظم۔ انصاف کی زد سے میں
جس سزا کا مستحق ہوں وہ مجھے دیجئے۔“

سکندر یک تک تابان کو دیکھ رہا تھا۔ چوہر تاثیر سے عاری تھا۔ اس کی نیلی
آنکھوں کی تہ میں جھانکنا ناممکن تھا۔

تھوڑی دیر بعد تابان کو شامی خیمے سے رخصت کر دیا گیا۔ اس کی واپس قیدی کی
حیثیت سے نہیں ہوئی تھی۔ دو محافظوں نے احزام کے ساتھ اسے ایک آرام دہ خیمے میں
پہنچا دیا تھا۔

تابان اگلے روز دوپہر تک اسی خیمے میں موجود رہا۔ دوپہر کے کھانے کے فوراً بعد
شامی محافظ اسے دوبارہ سکندر کے پاس لے گئے۔ سکندر کا چہرہ آج شفاف اور روشن تھا۔
وہ تابان کے بارے میں جیسے کسی فیصلے پر پہنچا ہوا تھا مختصر تمہید کے بعد وہ اصل موضوع

ہوئے بھی کہ مارشا کا حصول میری زندگی کا پہلا اور آخری مقصد ہے آپ نے اسے کماندار
فرال روز کے حوالے کر دیا۔“

”کون کتا ہے ہم نے اسے فرال روز کے حوالے کر دیا۔ ہمیں اس معاملے کی
مطلق کوئی خبر نہیں۔ سالار پارمینو نے ہم سے درخواست کی تھی کہ ہم یہ معاملہ ان کے
سپردہ کر دیں۔ انہوں نے کہا تھا وہ انعام و تقسیم سے اس مسئلے کو سلجھانے کی کوشش کریں
گے اور تمہاری مرضی کے بغیر کوئی کام نہیں ہو گا۔ سالار پارمینو نے ہی ہم سے کہا تھا کہ یہ
مسئلہ حل ہو گیا ہے اور تم نے شہزادی مارشا کے حق سے دستبردار ہونے پر رضامندی ظاہر
کر دی ہے۔“

”یہ سراسر غلط بیانی ہے سالار اعظم! مجھے توقع نہیں تھی کہ سالار پارمینو جیسا معتبر
فہم ایسی جیلہ جوتی سے کام لے گا۔ مجھ سے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں ہوئی۔ میں
اس کی جھیل والی تفرقہ گاہ میں تھا جب مجھے پتہ چلا کہ شہزادی مارشا کو فرال روز کے
ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک کیا جا رہا ہے۔ اس وقت تک فرال روز معبد کے محافظوں
کے ہاتھوں قتل ہو چکا تھا۔“ سکندر کی کشادہ پیشانی پر الجھن کی سلوٹیں نظر آنے لگیں۔
اس کی نیلیوں آسمان جیسی آنکھوں میں حیرت کی بدایاں تیر رہی تھیں۔ تابان نے کہا۔
”سالار اعظم! میں آپ کی فہم و فراست پر شہرہ کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا لیکن اتنا کہنے
کی جرأت کروں گا کہ میرے خلاف ایک گھمبیر سازش کی گئی ہے۔ سردار شال پہلے دن
سے مجھے اپنا دشمن تصور کر چکا تھا اور فرال روز اس کا دیرینہ دوست تھا۔ فرال روز نے
شال کی سزائے موت معاف کرائی اور شال نے مجھے نچا دکھانے کے لیے فرال کو اس
بات پر تیار کیا کہ وہ شہزادی مارشا کو آپ سے اپنے لیے مانگ لے۔ یہ میری انتہائی بد قسمتی
ہے کہ سالار اعظم اپنی بے پناہ مصروفیات کے سبب میرے خلاف ہونے والی اس سازش
کے پیچ و خم پر غور نہ کر سکے اور میرے بدخواہوں نے مجھے سالار اعظم سے دور کر دیا۔“

سکندر نے بے قراری سے نشہ آور مشروب کا ایک گھونٹ بھرا اور بولا۔ ”لیکن
کچھ بھی تھا تمہیں کسی طور ہم تک پہنچنا چاہیے تھا! اپنا مقدمہ پیش کرنا چاہیے تھا۔“

”میں نے بت کو شش کی تھی سالار اعظم، لیکن سردار شال نے میری ایک نہیں
چلنے دی۔ وہ آپ تک پہنچنے سے پہلے ہی میرا کام تمام کر دینا چاہتا تھا۔ مایوس ہو کر میں نے
اپنی جنگ آپ لڑنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن افسوس کہ نہ خود کو بے گناہ ثابت کر سکا اور
نہ ایک بے گناہ کی جان بچا سکا۔“

پر آگیا۔ اس نے کہا۔

”ہاں! ہو سکتا ہے سازش کرنے والوں نے تمہارے دل میں ہماری طرف سے کچھ غلط فہمیاں پیدا کر دی ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہم تمہاری وفاداری کو ہر شک و شبہ سے بالاتر سمجھتے تھے اور سمجھتے ہیں..... ہمیں یقین تھا تم ایک نہ ایک دن ہم تک پہنچو گے‘ چاہے کسی حال میں پہنچو۔ جہاں تک شہزادی مارشا کا تعلق ہے وہ ہمارے پاس تمہاری امانت کے طور پر موجود ہے۔ ہم نے اسے اپنی تحویل میں کسی طرح کی تکلیف نہیں ہونے دی۔ وہ تمہیں خود بتائے گی کہ اسے یہاں خاص ممان کی حیثیت حاصل تھی۔ تم جب چاہو اسے ہمارے پاس سے لے جا سکتے ہو..... تم نے کل انصاف کی بات کی تھی۔ ہم نے تمہارے معاملات کی تحقیق کرائی ہے اور انصاف کی رو سے تم ظلم کی بجائے مدعی ثابت ہوتے ہو۔ دیوتاؤں نے چاہا تو دو تین دن میں سب کچھ تمہارے روبرو آ جائے گا اور تم سردار شلال کے جرم وار ساتھیوں کو اپنے سامنے چٹائی پر جھولنے دیکھو گے..... تاہم ایک بات ہم تم سے ضرور کہنا چاہتے ہیں۔ اس بات کا تعلق تمہاری اور مارشا کی سلامتی سے ہے۔ اس لئے نہ چاہنے کے باوجود ہم یہ بات کہنے پر مجبور ہیں۔“

تہاں کی سوالیہ نگاہیں سالارِ اعظم سکندر کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ خیے کی بیدار
روشنی میں زرنگار مسند پر بیٹھا وہ ایک سپہ سالار سے زیادہ ایک فلسفی نظر آ رہا تھا۔ کتابوں
میں کھویا رہنے والا، روئے زمین کے تصوراتی نقوشوں میں سر کھپانے والا اور باطل و
زمینوں کے مافوق الفطرت دیوی دیوتاؤں پر چلتے پھرتے رکھنے والا۔ اس نے جملہ شے
میں سے سرخ مشروب کا ایک جرہ لیا اور بولا۔

”ہم نے ہمیشہ اور ہر مقام پر عبادت گاہوں کے تقدس کو پیش نظر رکھا ہے تاہم کہیں جنگی ضروریات کے تحت ہمارے سپاہیوں کو ایسی جگہوں پر دھکوا بھی ہونا پڑا ہے۔ ہم اپنے ان اقدامات سے کبھی خوش نہیں ہوئے بلکہ ایسے واقعات کی یاد ہمارے دل میں ایک طرح کا اضطراب چکا دیتی ہے۔ دمشق کے معبد کا واقعہ بھی ایسے ہی معاملات میں سے ہے۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ شہزادی مارشا کو اس معبد میں مہادیوی کا درجہ دیا جا چکا تھا اور وہاں کے پجاری ابھی تک اس کوشش میں ہیں کہ شہزادی کو واپس اپنے حلقہ اثر میں لے جائیں اور مہادیوی کی مسند پر بٹھائیں۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ تم نے شہزادی کو اپنانے کی کوشش کی تو تم پر کوئی بھیانک مصیبت نازل ہو جائے گی۔ یہ مصیبت انسانوں کی طرف

سے بھی ہو سکتی ہے جیسے فرمال روز پر آئی اور ان طاقتوں کی طرف سے بھی جنہیں ہم دیوی دیوتاؤں کے نام سے پکارتے ہیں۔"

تاجان کا دل چاہا کہ وہ کھل کر کہہ دے کہ وہ دیوی دیوتاؤں کو ماننا ہی نہیں اور اگر اس نام کی کوئی مخلوق ہے بھی تو اس کی طرف سے تو نے والا ہر قسم کا شاک نام پر اسے ہزار جان سے تمہل ہے..... لیکن وہ خاموش رہا اس اتنا ہی کہہ رکھا۔ "سلا اور غصہ! مجھے اس بارے میں کچھ سوچنے کی مہلت عنایت فرمائیے۔"

☆-----☆-----☆

منظرِ صوَر کے عايشانِ محل کا تہلہ والسی صوَر کا یہ محل اب یونانی فوج کے تصرف میں تھا۔ محل کے فرش نہایت شفاف تھے۔ دیواروں پر بیشہ کاری کی گئی تھی اور منقش ستونوں سے پھولوں کی بنیلیں لپٹی ہوئی تھیں۔ ایک شاندار کمرے کے ادھ کھلے در پہلوں پر محلی پر دے لہرا رہے تھے اور ان کے درمیان سے دو بیچے سمندر کا جھاگ اڑا تا نیلگوں پانی نظر آتا تھا۔ کمرے میں تابان اور مارشا آنے سانسے کھڑے تھے۔ دو عسکی بختوں کی طرح ایک دوسرے کی طرف دیکھتے چلے جا رہے تھے۔ تابان کے چہرے پر نو دیتے جذبوں کا عکس تھا جبکہ مارشا کا چہرہ سنگ مرمر کی طرح شفاف اور سپاٹ تھا۔ تابان کی جذبات سے رندھی ہوئی آواز ابھری۔

”شہزادی! کب تک..... آخر کہاں تک..... میری امت جواب دے رہی ہے شہزادی۔ میں آپ کے ہونٹوں سے اپنی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ سننا چاہتا ہوں۔ مجھے بتائیے، مجھے مرنا ہے یا زندہ رہنا ہے۔ صرف ایک بار..... ایک بار میرے لیے اسے لیوں کو رحمت بخش دے دیجئے۔“

شہزادی نے اپنی خوبصورت پلکیں جھکائیں تو جیسے فلک کی روشن ترین کمکشائیں گلابی بدلیوں میں چھپ گئیں۔ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں گویا ہوئی۔ ”تم بے حد سنگین غلطی کر رہے ہو۔ تمہیں معلوم نہیں تم کیا چاہ رہے ہو۔ تم اپنے لیے ایسی مضیبتوں کو دعوت دے رہے ہو جو تمہیں زندہ درگور کر دیں گی۔ کیا تم جھکتے ہو کہ آتش پرست تمہیں معاف کر دے گا۔ ہرگز نہیں۔ وہ تمہیں عبرت نگاہ بنا کر چھوڑیں گے۔“

”عبرت لگا تو میں بن چکا ہوں شہزادی۔ اب مجھے کسی سزا کا خوف نہیں۔ نہ ہی کوئی اندیشہ میری شدت طلب میں کی واقع کر سکتا ہے۔ مجھے صرف ایک بار میرے سوال کا جواب دے دیجئے۔ صرف ایک بار بتا دیجئے، میں اپنے دل میں کسی آس کو جگہ دے سکتا

ہوں یا نہیں؟

شہزادی نے رخ پھیر لیا۔ اس کی روشن پیشانی پر ایک نمی سی چپکنے لگی تھی۔ وہ کراہ کر بولی۔ ”ہماری کچھ میں کچھ نہیں آتا۔ ہم تمہارے لائق سوال کا کیا جواب دیں۔ کیوں ہماری پریشانیوں میں اضافہ کر رہے ہو۔ اگر..... اگر تمہیں تھوڑا بہت بھی ہمارا خیال ہے تو چلے جاؤ یہاں سے۔ ایسا کر کے نہ صرف تم اپنی زندگی محفوظ رکھ سکو گے بلکہ..... ہم بھی تمہارے احسان مند ہوں گے۔“

تہاں گھٹنوں کے بل قالین پر گر گیا۔ اس کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسن گئیں۔ لمبے میں خود بخود اتنا درد ہے کی عاجزی اتری اور وہ سر تپا فریاد بن کر بولا۔ ”میں چلا جاؤں گا شہزادی..... آپ ہی کی قسم بیشک کے لیے آپ کی نگاہوں سے اوٹ ہوں گا لیکن اس سے پہلے اس سوال کا جواب دے دیجئے جو برسوں سے میرے دل میں دھکتے خنجر کی طرح بیوست ہے۔ مجھے آگاہ کر دیجئے کہ میرے بڑا دل کی گواہی کئی ہے۔ میں نے گاہے گاہے آپ کی حسین آنکھوں میں اپنے لیے جو ایک بے نام جذبہ دیکھا ہے وہ وہم نہیں حقیقت ہے۔ صرف ایک مرتبہ اس بات کا اقرار کر لیجئے شہزادی! پھر اپنی کم نصیبی کو گلے لگا کر میں آپ کی دنیا سے نکل جاؤں گا۔“

شہزادی کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں چپکنے لگیں۔ اس نے ایک نظر گھٹنوں کے بل جھکے ہوئے تہاں کو دیکھا۔ پھر تیز قدموں سے چلتی ہوئی در پیچ پر جا کھڑی ہوئی۔ کتنی چوکھٹ پر ٹپک کر اس نے پیشانی کو اپنی مومی انگلیوں میں تمام لیا۔ ”تم..... تم ہمیں پاگل کر دو گے۔ تم ہمارا پیچھا چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ ہم شہزادی ہو کر تم سے درخواست کرتے ہیں۔ ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو۔ جو بات تم چاہ رہے ہو..... وہ ناممکن ہے۔“

تہاں کو شہزادی کے لمبے میں پہلی بار ایک معمولی سی ٹپک کا احساس ہوا تھا۔ اس احساس نے اس کے سینے میں حوصلے کا پہاڑ کھڑا کر دیا۔ اس کی لڑکھاتی زبان کو ہمت نصیب ہونے لگی۔ وہ اور شدت سے اظہارِ تمنا کرنے لگا۔ اس کے الفاظ کچھ اور جاندار ہو گئے۔ ملتی لمبی کی اثر انگیزی کچھ اور بڑھ گئی۔ اس کی ہڈیانی کیفیت دیکھ کر شہزادی کو چپ سی لگ گئی۔ وہ بدستور تہاں کی طرف سے رخ پھیرے کھڑی تھی۔ مومی شمعوں جیسی انگلیاں ایک دوسری میں الجھ رہی تھیں۔ چہرے پر سرنی تھی۔ یہ حیا آمیز سرنی لمحہ بہ لمحہ گہمیر ہوتی جا رہی تھی۔ آخر اس نے بے بسی سے اپنے سر کو جنبش دی اور تیز قدموں

سے باہر نکل گئی۔

تہاں آراستہ کرے تیارہ گیا۔ اس کے گھٹنے گداز قالین پر گئے ہوئے تھے اور آہٹیں اس دروازے پر مرکوز تھیں جہاں سے ابھی شہزادی خوشبو میں بے ہوئے رنگین جہو کے کی طرح گزری تھی۔ تہاں سیدھا کھڑا ہوا۔ اس کے ہونٹ خشک تھے اور آنکھیں جل رہی تھیں۔ وہ سب فراری سے کمرے میں شلے لگا۔ بجیرہ روم کی خشک ہوا در پیچ کے ریشمی پردوں سے اٹھیلیاں کرتی کمرے میں چکرا رہی تھی۔ جھٹکا اڑاتے نیلیوں پانی کا شور نامراد عاشق کی سسکیوں کی طرح محل کے در و پام میں گونج رہا تھا۔ شلے شلے تہاں کی نگاہ آہنوس کی ایک نقش چوکی پر پڑی۔ کتابت کی اس خوبصورت چوکی پر لکھنے کا سامان رکھا تھا۔ ایک بے نام ہڈے کے تحت تہاں چوکی کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس کا ہاتھ خود بخود بلوری قلعہ دار کی طرف بڑھا اور مور کے پر والا قلم اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ اس نے مہین چرمی کاندھ پر یونانی میں لکنا شروع کیا۔

”شہزادی! اگر میں آپ کے دل کا حال جانے بغیر یہاں سے چلا گیا تو میرا وجود اس بے قرار روح کی مثال ہو گا جو بیشک زمین اور آسمان کے درمیان بھٹکتی رہتی ہے۔ مجھے اس عذاب مسلسل سے نجات دلانا آپ کے اختیار میں ہے شہزادی..... برسوں صورت کی فتح کا جشن منایا جا رہا ہے۔ شاہی محل میں ایک بڑی تقریب ہوگی۔ یقیناً آپ کو بھی اس بارے میں علم ہو گا..... آپ کے پاس زرد پھولوں والا ایک سفید لباس ہے۔ اگر آپ نے وہ لباس زیب تن کیا تو میں سمجھوں گا کہ میں دنیا کا خوش قسمت ترین شخص ہوں، کیونکہ ایک ایسی ہستی کے دل میں میری چاہت کا گزر ہوا ہے جو حسن صورت و سیرت میں حرف آخر ہے۔ بصورت دیگر میں خود کو دنیا کا بد قسمت ترین شخص تصور کرنے میں حق بجانب ہوں گا۔ تاہم دونوں صورتوں میں میں یہ شہر چھوڑ کر چلا جاؤں گا اور آپ کی آنکھوں کو کبھی میرا چہرہ دیکھنے کی زحمت نہیں ہوگی۔“

یہ خط تحریر کرنے کے بعد تہاں نے ریشم کی چھوٹی سی تھیلی میں سر بھر کیا اور شہزادی مارشاکی خادمہ خاص کے حوالے کر دیا۔

☆-----☆-----☆

شاہی محل میں نور بہا ہوا تھا۔ رنگوں اور روشنیوں کا ایک سیلاب تھا جس نے محل کے ساتھ ساتھ پورے شہر کو لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ ساحل کے ساتھ ساتھ سمندر میں کھڑے جنگی جہازوں کو بھی خوبصورت روشنیوں اور پرچموں سے سجایا گیا تھا۔ شاہی محل

کے ایوان خاص میں جیسے جھللاتے ستاروں کے جھرمٹ اتر آئے تھے۔ ذرق برق لباسوں والی حسین عورتیں 'روشن چہرہ مرد اور ان کے درمیان ساغر و مینالے کر چکراتے ہوئے انتہائی خوش پوش خدام۔ اس تقریب میں اہم ترین لوگوں کو مدعو کیا گیا تھا۔ سالار اعظم سکندر کی نشست پر ہونے میں ابھی دیر تھی، تاہم مہمان مسلسل ایوان خاص میں داخل ہو رہے تھے۔ تباہان کی منظر نگاہیں اس دروازے پر جمی تھیں جہاں سے گاہے گاہے معزز خواتین اندر داخل ہوتی تھیں اور سبز قالین سے ڈھکے ہوئے ایک راستے پر قدم رکھتی عورتوں کی نشست گاہ میں جا بیٹھتی تھیں۔ ان میں شاہی خاندان کی عورتیں تھیں۔ سرداروں اور منصب داروں کی بیگمات تھیں اور معزز ایرانی گھرانوں کی خواتین تھیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک حسین چہرہ موجود تھا۔ ایک سے بڑھ کر ایک روشن تارچہ رکھتا تھا۔ لیکن ان تاروں میں "چاند" کیسے نظر نہیں آ رہا تھا۔ تباہان نہیں جانتا تھا یہ چاند کب نظر آئے گا اور آئے گا تو کس رنگ میں نظر آئے گا۔ اس کی رنگوں میں گردش خون کی شدت جان لیوا ہوتی جا رہی تھی۔ دل جیسے پسلیاں توڑ کر باہر نکلتا چاہتا تھا۔ تباہان کے قریب بیٹھا ہوشمند بھی بے قراری سے پہلو بدل رہا تھا۔ گزرنے والا ہر لمحہ صدیوں پر بھاری تھا۔ اور پھر اچانک وہ نظر آئی۔ مابتاب جیسے اچھل کر بام پر آگید ستاروں اور چراغوں کی روشنی ماند پڑ گئی۔ وہ زرد رنگ کے پھولوں والے سفید لباس میں تھی۔ تباہان نے اسے دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ وہ اس کی محبت کا اقرار کر رہی تھی۔ یہ اعلان واضح تھا لیکن کوئی اسے سن نہیں سکتا تھا۔ تباہان جانتا تھا یہ جانتی تھی۔ جہکی جہکی پلکوں کے ساتھ اس نے سبز قالین والے راستے پر قدم رکھا اور اپنے بدن میں ہزاروں قیامتیں سینے دھیمی رفتار سے چلتی نشست گاہ میں داخل ہو گئی۔ تباہان کے دل کی گواہی بچ نکلی تھی۔ اس نے شہزادی مارشا کی آنکھوں میں محبت کا پتھر دیکھا تھا، سراب نہیں دیکھا تھا۔ تباہان کو محسوس ہوا اس کا دل دھڑکنے لگا ہوا ہے اور سانس کی آمد رفت رک گئی ہے۔ یہ شادی مرگ کی کیفیت تھی یا شاید اس سے بھی آگے کی کوئی بات تھی۔ اس کی مسلسل تڑپ رنگ لا چکی تھی۔ اس کے سینے میں برسوں سے بھرنے والی آگ کی چنگاریاں شہزادی مارشا کے برفاب سینے میں بھی مدت جگ پگھلی تھیں۔ یہ زرد پھولوں والا سفید لباس اس حقیقت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ معلوم نہیں شہزادی کے دل میں اس محبت نے کب جنم لیا تھا اور کب پرورش پائی تھی لیکن یہ محبت ایک اصل حقیقت تھی۔ اب دنیا کی کوئی طاقت تباہان کو مارشا کے قریب پہنچنے سے روک نہیں سکتی تھی۔ وہ کیوں دور رہتا

اس سے؟ وہ اس سے محبت کرتا تھا اور وہ بھی اس سے محبت کرتی تھی۔ اب کس میں جرأت تھی کہ ان کے درمیان آئے۔ تباہان کی آنکھوں کے سامنے ایک دھند سی چھانے لگی۔ وہ دنیا و مایہا سے بے خبر سا ہونے لگا۔ جیسے خواب کی حالت میں چلتا ہوا وہ خواتین کی نشست گاہ کی طرف بڑھا۔ وہ ایک ہزاری سردار کی وردی میں تھا۔ اس کے خوبصورتی سے ترشے ہوئے بال پیشانی پر بھول رہے تھے۔ اس کے سراپے میں مردانہ وجاہت کی متاثر کرنے والی ہلک تھی۔ اسے نشست گاہ کی طرف بڑھتے دیکھ کر ایک محبوب خادمہ اس کے قریب چلی آئی۔ تباہان نے اسے شہزادی مارشا کو بلانے کا حکم دیا۔ خادمہ نے جاکر شہزادی مارشا کے کان میں سرگوشی کی۔ اس نے سر اسد نظروں سے تباہان کی طرف دیکھا۔ اس کے ارد گرد معزز خواتین موجود تھیں۔ وہ ان کے سامنے کسی خاص رد عمل کا اظہار کرنا نہیں چاہتی تھی۔ خادمہ کی بات سن کر وہ انہی اور چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلتی تباہان کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ اس نے ہلکا سا ہنسا کر رکھا تھا۔ یہ ہنسا خوبصورت لباس کے ساتھ مل کر قیامت ڈھا رہا تھا۔ مرد و زن کی نگاہیں اس کی طرف اٹھتی تھیں تو ابھی رہ جاتی تھیں۔ وہ جان محفل بھی تھی اور مرکز محفل بھی۔ تباہان کے سامنے پہنچ کر اس کے چہرے پر شفق سی پھیلی اور پیکلی خود بخود جھک گئیں۔

"کیا بات ہے؟" وہ لہجے کو زیادہ سے زیادہ باوقار بنانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"بہت ضروری بات ہے شہزادی۔ میرے ساتھ آئیے۔"

"جو کچھ بھی کہتا ہے یہاں کہہ دو۔ خواہ مخواہ ہمیں نشانہ نہ بناؤ۔"

"بات یہاں کہنے کی نہیں شہزادی۔ کیا آپ میری یہ آخری خواہش پوری نہیں کریں گی؟"

یہی وقت تھا جب سکندر اعظم سرخ مٹلی پردوں کے پیچھے سے نمودار ہوا اور اپنی نشست سنبھالنے کے لیے قالین پوش راستے کی جانب بڑھ کر کائے محفل اپنے جگہوں پر کھڑے ہو گئے۔ سب کی توجہ اس کی طرف مبذول ہو گئی۔ تباہان نے اس موقع کو قیمت جانا اور ایک جرأت رندانہ سے شہزادی مارشا کا ہڈو تمام لیا۔ شہزادی کا لمس اس کے دل میں ہزاروں طوفان برپا کر گیا۔ اس نے بے پناہ شش سے اپنے بکھرتے لہجے کو سمیٹا اور غصہری ہوئی آواز میں بولا۔ "آئیے شہزادی! میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ مجھ پر بھروسہ کیجئے شہزادی۔"

تہاں نے کہا۔ ”شہزادی حضور! آپ کن مقدس ارواح کی بات کر رہی ہیں۔ مقدس ارواح کا کوئی وجود نہیں۔ صرف ایک خوف ہے جو صدیوں کے دوش پر سفر کرتا آپ تک پہنچا ہے اور آپ نے اسے اپنے ذہن میں بسالیا ہے۔ اس خوف کے حصار سے نکل آئیے شہزادی۔ آپ اب بھی ایک انسان ہیں۔ ایک انسان کی طرح اپنے دھنگ سے زندگی گزارنے کا پورا حق رکھتی ہیں۔ آپ جب اس حق کو استعمال کرنے کا عزم کر لیں گی تو کوئی مقدس روح کوئی بے جان مورتی اور کوئی طلسمی دیوار آپ کے راستے میں نہیں آسکے گی۔“

شہزادی نے کہا۔ ”تم کچھ نہیں جانتے ہو۔ تمہارا علم صفر ہے۔ دنیا میں وہی کچھ نہیں جو نظر آتا ہے۔ اس کے سوا بھی بہت کچھ ہے۔ وہ دیکھو..... اس کھڑکی سے باہر نگاہ ڈالو۔ آسمان پر طوفان کے آثار جمع ہو رہے ہیں۔ اگر تم نے اپنی حماقت سے ہاتھ نہ کھینچا تو یہ طوفان تمہارے لیے فرشتہ اہل کاروپ دھار لے گا۔“

تہاں نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ روشن آسمان پر ایک غبار سے پھیل رہا تھا۔ اس غبار میں چمکیلے ستارے تیزی سے اوٹھ رہے تھے۔ شہزادی نے کہا۔ ”تم یہ غبار آج دیکھ رہے ہو لیکن ہم ہر شب دیکھتے ہیں۔ یہ ایک ایسا خواب ہے جو مادیوی بننے کے بعد ایک رات کے لیے بھی ہماری آنکھوں سے جدا نہیں ہوا۔ ہر شب یہ غبار چاند تاروں کو لگاتا ہے۔ جب فلک پر گھٹا ٹوپ تیرگی کا راج ہو جاتا ہے تو پانچوں مقدس ارواح ہم پر ظاہر ہوتی ہیں۔ وہ بیک زبان ہمیں یاد دلاتی ہیں کہ ہم مادیوی ہیں اور ہمیں اپنی اس حیثیت کو ایک لمحے کے لیے بھی فراموش نہیں کرنا۔ وہ ہمیں بتاتی ہیں کہ اگر ”ہمیں معبود سے دور رکھنے والے“ ان ستاروں کی طرف لاتعداد اور ناقابلِ تسخیر بھی ہوئے تو موت جاںکس گئے۔“

تہاں نے ایک بار پھر بے پناہ جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے شہزادی کا سر مرس ہاتھ تھام لیا۔ ”یہ سب..... یہ سب آپ کا وہم ہے شہزادی۔ ایسے گردِ بادِ بحیرہ روم کے ساحلوں پر ہر روز نظر آتے ہیں۔ اگر یہ واقعی طوفانِ یاد و باراں ہے تو اسے کسی مقدس روح نے نہیں سمجھا۔ اسے سمجھنے والی ہی قدرت ہے جو اس دنیا کا نظام چلاتی ہے۔ ستاروں کو چمک دیتی ہے، سورج طلوع کرتی ہے اور موسم بدلتی ہے۔ یہ قدرت کسی بے جان مورتی میں نہیں۔ نہ ہی گیرو لباس والے عیاش پجاریوں میں ہے نہ چری کا کندوں پر لکھی ہوئی کسہ کتابوں میں۔ آپ بے فکر رہیں۔ یہ طوفان میرا یا آپ کا کچھ نہیں بگاڑے

شہزادی کی سرایتنگی دیدنی تھی۔ اس کا دقار ریزہ ریزہ ہو رہا تھا۔ اس نے متوجہ نظر سے دائیں بائیں دیکھا پھر تہاں کے ساتھ چل دی۔ وہ مبسوت سی ہو رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا تہاں کی وارفتگی کے منظر نے اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سلب کر لی ہے۔ دھولان پر بیٹے والی آپ جو کی طرح وہ تہاں کے ساتھ چلی جا رہی تھی۔ تہاں اسے محل سے باہر کھڑی گھوڑا گاڑیوں کے پاس لے آیا۔

وہ تیز سرگوشی میں بولی۔ ”کہاں لے جا رہے ہو ہمیں؟“ اس کا ہاتھ تہاں کے ہاتھ کی گرفت میں مزاحمت کر رہا تھا لیکن یہ مزاحمت اتنی شدید نہیں تھی کہ ارد گرد موبہود لوگ اسے محسوس کر سکیں۔

تہاں نے کہا۔ ”زیادہ دور نہیں شہزادی۔ مجھ پر بھروسہ کیجئے۔ مجھ سے آپ کو کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔ کیا آپ سوچ سکتی ہیں کہ میں آپ کو کوئی تکلیف دوں گا؟“

شہزادی بے چارگی کے گرداب میں تھی۔ ان دونوں کے ارد گرد کی افراد موجود تھے۔ وہ کسی شدید رد عمل کا اظہار کرتی تو انہیں دیکھنے والے لوگ چونک جاتے۔ تہاں اسے ایک آراستہ گھوڑا گاڑی کے پاس لے آیا۔ وہ ایک لمحے کے لیے ہچکچائی پھر گھوڑا گاڑی میں سوار ہو گئی۔ شاید اس نے سوچا تھا کہ سرعام تکرار کرنے کی بجائے وہ گھوڑا گاڑی میں تہاں کو سمجھانے کی کوشش کرے گی لیکن جو خبی وہ دونوں بند گھوڑا گاڑی میں داخل ہوئے۔ گاڑی بان کی نشست پر بیٹھے ہوئے ہوشمند نے ایک جھٹکے سے گھوڑے آگے بڑھا دیئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد گاڑی شر سے باہر جانے والے راستے پر اڑی جا رہی تھی اور گاڑی کے اندر شہزادی مارشکا چہرہ غصے سے لال بھوکا ہو رہا تھا۔ وہ بولی۔

”یہ تم کیا کر رہے ہو؟ یہ بے وقوفی کی انتہا ہے۔ تم جانتے نہیں اس دیدہ دلیری کا انجام کیا ہو سکتا ہے۔ گاڑی رکواؤ..... ہم کہتے ہیں گاڑی رکواؤ۔“

تہاں نے عاجزی سے کہا۔ ”شہزادی! میں آپ کو زیادہ دور نہیں لے جاؤں گا بس تھوڑی سی مسمت چاہتا ہوں آپ سے۔ پھر آپ چاہیں تو واپس آ جائیے گا۔“

شہزادی نے بے باکی سے تہاں کی طرف دیکھا اور دو لوگ الفاظ میں بولی۔ ”دیکھو! اگر تمہارے دل میں کوئی ایسا خیال ہے تو یہ خیال نکال دو۔ یہ ناممکن ہے۔ تمہارے لیے کیا کسی کے لیے بھی یہ ممکن نہیں۔ مادیوی کی مسند پر بیٹھنے کے بعد یہ بعید از قیاس ہے کہ ہم کسی سے منسوب ہوں۔ اگر کوئی ایسا سوچے گا تو مقدس ارواح اسے زندہ نہیں چھوڑیں گی۔“

جانے کتنے کوہ گراں اسے روندتے ہوئے نکل گئے۔ ایک طویل خاموشی کے بعد آخر آہان کو پھر ٹاپوں کی مدد سے آواز سنائی دی۔ بلاشبہ یہ اس کے لیے زوئے زمین کی حسین ترین آواز تھی۔ یہ ایک ایسا نغمہ تھا جس کی شیرینی اور لطافت کو احاطہ الفاظ میں لانا ناممکن تھا۔ گھوڑا گاڑی واپس لوٹ رہی تھی اس دفعہ گھوڑوں کی ٹاپوں میں کوئی ندی نہ تھی، ہواور آپ جو کی نرم روی تھی۔ وہ واپس لوٹ رہی تھی۔ وہ جو کسی کو دکھ نہیں دیتی تھی، جس کی آنکھیں پر اے غموں پر بھی بھر آتی تھیں، جو سربا کرم و عنایت تھی۔ وہ اپنے دیوانے کی طرف واپس آ رہی تھی۔ گھوڑوں کی ٹاپیں قریب آتی چلی گئیں۔ پھر آہان نے گھوڑا گاڑی کو تاریکی سے نمودار ہوتے دیکھا۔ کن خوش محنت آنکھوں نے ایسا دل پسند منظر دیکھا ہوگا۔ گھوڑے آہستگی سے چلتے محل نما ہوئی کے شلت دروازے پر آن رکے۔ ایک بار زور سے بجلی چمکی۔ آہان نے دیکھا زرد پتھروں سے سجے ہوئے سفید لباس والی 'رائیس' تھامے گاڑی بان کی نشست پر بیٹھی تھی۔ اس کے دروازے کی دھڑکیوں سے سر ہواؤں میں پھل رہے تھے۔ اس نے سرگھٹنوں میں چھپا رکھا تھا۔ آہان نے اس کی آوازیں نہیں سنی لیکن وہ جانتا تھا وہ رو رہی ہے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور مشعل تھام کر گاڑی کی طرف لپکتا چلا گیا۔ اسی دوران آسمان سے تابز توڑنی برسنے لگا تھا۔ آہان اور مادرشاہد گھوڑا گاڑی کے اندر داخل ہوئے تو اچانک طوفان بار و باران عروج پر پہنچ گیا۔ گمرے سیاہ بادلوں نے آسمان کو اور پانی کی دیر چادر نے گھوڑا گاڑی کو ڈھانپ لیا۔ برق ایک بار زور سے کونڈی اور دو چاہنے والوں کی خلوت میں جھانکنے کی ناکام کوشش کر کے بلند یوں کی طرف لوٹ گئی۔ آہان کی بے قرار ہانسیوں نے مادرشاہ کو سینے میں جذب کر لیا۔ وہ کسمائی اور پھر خود پسندی کی کیفیت میں کھو گئی۔ اس کی زلفوں نے آہان کا چہرہ ڈھانپ لیا۔ آہان نے سمندر ہونٹوں کو سانسے دیکھا تو اپنے ہونٹوں پر صدیوں کی پیاس سجائی۔ پھر وہ ایک ریشمی دھند میں کھوتے چلے گئے۔

☆-----☆-----☆

اسی شب کا ذکر ہے مغنود شہر عورت کے شاہی مہمان خانے میں اوجھتے ہوئے ہوشمند کی آنکھ اچانک کھل گئی۔ اس نے شمع دان کے قریب رکھی ریت گھڑی کی طرف دیکھا۔ یہ رات کا تیسرا پہر تھا۔ گھڑیوں سے باہر طوفان بار و باران کا زور تھا۔ کسی قریبی کمرے میں دو یونانی کماندار 'نزدیکی' شہر غزہ اور اس کے دفاع کے بارے میں عسکری نوعیت کی بحث میں مصروف تھے۔ ہوشمند کو ان معاملات سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ کل

اور آہان سکندری فوج کو خیرباد کہنے کا حتمی فیصلہ کر چکے تھے۔ دفعہ ایک چیز پر جم کر رہ گئی۔ یہ ایک انگوٹھی تھی، جو باقی دانت کی بنی ہوئی تھی۔ یہ آہان کی انگوٹھی تھی۔ وہ شام کو تقریب پر روانہ ہوئے۔ بھول گیا تھا۔ ہوشمند نے شمع دان اٹھایا اور چپائی کے سامنے بیٹھ کر دیکھنے لگا۔ اس نے دیکھا، انگوٹھی میں جڑے ہوئے نا ہے۔ وہ ششدر رہ گیا۔ اسے خانہ بدوش رقصہ کی بات یاد آئی۔ اس نے دعویٰ اس پھر کارنگ اس وقت تک نارنجی رہے گا جب تک انگوٹھی پہننے والے کو اپنے محبوب کا وصل نصیب نہیں ہو جاتا۔ اور نارنجی رنگ تبدیل ہو چکا تھا۔ ہوشمند حیرت سے اس عجیب و غریب پتھر کو دیکھتا چلا گیا۔ ایسے میں اس کے کانوں میں بلبلی رقص گیت گونجنے لگا۔ اس کی صدا ہوا کے دوش پر سڑکتی ہوئی ہوشمند کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔

میں قسم کھاتی ہوں ہماروں کی
اور زوئے زمین کے سب خوبصورت نظاروں
اور ہر اس چیز کی جس کی دید
تھلے سینوں میں لھندک اتارتی ہے
کہ جس آنکھ میں انتظار مرتا نہیں
اس آنکھ میں محبوب اترتا ہے
اس آنکھ میں محبوب اترتا ہے

☆-----☆-----☆

KHAN BOOKS
& LIBRARY
MARI A BAZAR, KARACHI
GH-40034 - 0345-5048559
P.O. Box 1000
Karachi